قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 24 ◆ شمارہ 11 ◆ اکتوبر 2014ء

ماہنامہ
کراچی

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

قارئین کرام!
السلام علیکم!

ایک خبر کو تقریباً تمام چینلز نے خصوصی طور پر دکھایا۔ اخبارات نے صفحۂ اول پر شائع کیا۔ خبر کے مطابق، روایتی اصطلاح میں، دو وی وی آئی پی افراد کو مسافروں نے زبردستی جہاز سے اتار دیا۔ ان پر الزام لگا تھا کہ ان کی وجہ سے پرواز میں تاخیر ہوئی ہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارے ہاں وی آئی پی کلچر اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے۔ جس کی وجہ سے عوام الناس کی زندگی اجیرن ہوتی جارہی ہے۔ کوئی اہم شخصیت گزر رہی ہو تو سڑک بند، کسی اہم شخصیت کا گھر ہے تو محلے والوں کو آنے جانے میں دشواری، کوئی اہم بندہ جا رہا ہو تو اس کے انتظار میں فلائٹ لیٹ...... آخر ایسا کلچر کیوں فروغ پا رہا ہے۔ اس کلچر کا خاتمہ ضروری ہے کیونکہ ہم اس دین کی راہ پر چلنے والے لوگ ہیں جس دین میں نہ عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر فوقیت حاصل ہے۔ ہم سب برابر ہیں، کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کرنا چاہیے مگر ہم ان مسافروں کے جارحانہ برتاؤ کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ کسی بھی شہری کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ زبردستی کسی کی راہ روکے۔ یہ سراسر قانون شکنی ہے۔ اس رویے پر بھی روک لگنا چاہیے مگر یہ المیہ بھی ہے کہ عوام میں غصہ پھیل رہا ہے، کہیں یہ غم و غصہ سیلاب نہ بن جائے بقول زہرہ نگاہ

قدم قدم پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ
انہیں بجھاؤ تو صبحِ وطن کی بات کریں

معراج رسول

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد شعیب خان	0333-2168391
نمائندہ لاہور		0323-2895528
نمائندہ لاہور	فرید علی	0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے سالانہ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پرنٹر : عذرا رسول

مقامِ اشاعت : C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر : جمیل حسن

مطبوعہ : ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ◆ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

سرگزشت

لندن میں اوبرائن فیملی کافی اچھی شہرت کی حامل تھی۔ اس خاندان میں پڑھنے لکھنے کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ تقریباً سب کو تصنیف و تالیف سے لگاؤ تھا۔ مسز اوبرائن کی تصنیفات کو خاصی پذیرائی ملی تھی ان کی دس سے زائد کتابیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچ چکی تھیں۔ اوبرائن کی حویلی میں 17 اپریل 1857ء کو اس کے پوتے مارما نے جنم لیا۔ گھر میں لکھنے پڑھنے کا رجحان زیادہ تھا اس لیے مارما کو بھی بچپن سے ہی ادبی ماحول ملا اور وہ درسی کتب کے علاوہ دیگر اصناف پر لکھی گئی تحاریر بھی پڑھتا رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ جوانی کی منزل پر پہنچتے پہنچتے وہ ایک جانی پہچانی شخصیت بن گیا۔ اس کی ایک پہچان بن گئی۔ اس دور میں عام کہاوت تھی کہ برطانوی سلطنت کی حدود میں سورج چمکتا ہی رہتا ہے اور لندن برطانوی حکومت کا مرکز تھا۔ وہ مرکز میں رہ کر بہت کچھ کر سکتا تھا مگر اس نے سوچا کہ اس شہر سے نکل کر دیکھا جائے۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ لندن سے نکل پڑا۔ 1894ء کے جنوری میں وہ پُراسرار بہت کی سرزمین مصر پہنچا مگر اسے یہاں وہ باتیں نظر نہ آئیں جس کی جستجو اسے کھینچ لائی تھی پھر بھی یہاں آنے کا ایک فائدہ اسے ہوا۔ وہ یہاں کے لوگوں کی زندگی کا گہری نظروں سے مطالعہ کرنے لگا۔ لوگوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے و سمجھنے اس کے اندر ایک عجیب سا تبدیلی آنے لگی۔ وہ مصر کے لوگوں سے زیادہ ان کے مذہب میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اسے اسلام میں کشش محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے اسلام کو سمجھنے کے لیے آپ کی احادیث مبارکہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک کے بعد ایک اس نے تمام معتبر کتابوں کو حفظ کر لیا۔ اب اس کی سمجھ میں یہ بات آ چکی تھی کہ جس کے اقوال (حدیث) اتنی گہرائی والے ہیں وہ عام انسان ہو ہی نہیں سکتا تب اس نے حدیث کو سمجھنے کے لیے قرآن پاک کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ ایک ایک آیت پر گھنٹوں غور و فکر کرتا۔ بالآخر وہ سمجھ گیا کہ یہ آسمانی کتاب ہے ہم جن کتابوں کو آسمانی کہہ رہے ہیں وہ اس کتاب کے آگے پھیکی ہیں۔ ابھی وہ اسلام کا مطالعہ کر ہی رہا تھا کہ اسے سوئٹزرلینڈ منتقل ہونا پڑ گیا۔ ابھی اسے وہاں پہنچے دو ہی سال ہوئے تھے کہ لارڈ کرومر نے اسے مصر آنے کی دعوت دی اور وہ اسلام شناسی کو دوبارہ شروع کرنے کے لیے مصر آ گیا۔ اس کا زیادہ وقت مصر کے مختلف شہروں میں لوگوں سے ملنے ملانے میں گزرتا۔ اس دوران میں اس نے بہت سا وقت بیروت میں بھی گزارا۔ بیروت میں رہتے ہوئے اس نے عربی زبان پر عبور حاصل کیا۔ جبکہ انگلش کے علاوہ فرانسیسی، اطالوی، جرمن، ہسپانوی زبان پر عبور وہ پہلے ہی رکھتا تھا۔ 1913ء میں وہ ترکی منتقل ہو گیا۔ یہیں اس نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کے بعد وہ تبلیغ دین کے لیے کوشاں ہو گیا۔ جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہی وہ برطانیہ لوٹ گیا اور لندن میں رہتے ہوئے ادارہ معلومات اسلامی سے منسلک ہو گیا۔ اب وہ عالم اسلام میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ 1920ء میں محترم عمر سبحانی نے انہیں ہند آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے دعوت قبول کرتے ہوئے ممبئی آنے پر ہامی بھر لی۔ ممبئی پہنچ کر ہند کے ایک بڑے اخبار ممبئی کرانیکل کی ادارت سنبھال لی۔ 1924ء تک وہ بطور مدیر خدمت انجام دیتے رہے پھر انہیں نظام آف حیدرآباد دکن نے اپنے پاس بلا لیا اور انہیں چادر گھاٹ ہائی اسکول کا پرنسپل مقرر کر دیا۔ 1927ء میں انہوں نے اسلامی کلچر کے نام سے ایک سہ ماہی رسالے کا اجرا کیا۔ اس رسالے کا منشور تھا کہ غیر اسلامی دنیا کو اسلامی تہذیب و ثقافت اور علم و فنون سے روشناس کروایا جائے۔ تقریباً دس سال تک وہ اس رسالے سے منسلک رہے۔ جنوری 1935ء میں وہ حیدرآباد ایجوکیشن سروس سے مستعفی ہو کر لندن چلے گئے۔ لندن میں رہتے ہوئے انہوں نے "اسلامی کلچر" کی ادارت جاری رکھی۔ بالآخر 27 مئی 1936ء کو مختصر سی علالت کے بعد وہ انتقال کر گئے اور لندن میں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

Oriental Encounters, Said the fisher man, The children of the nile, With the truk in wartime,Vciled womcn, Tales from five chimneys, The house of war, Knighl of araby, Tho cuttural sido of islam,

کے علاوہ بھی انہوں نے پچاس ایک کتابیں لکھیں۔ خطبات اور مضامین کا تو شمار نہیں۔ دین حق کے اس مبلغ کو دنیا محمد مارما ڈیوک پکتھال کے نام سے پہچانتی ہے۔

☆☆☆

☆ شاہد جہانگیر شاہد، پشاور سے لکھتے ہیں۔ ''صرف فلسطین کے مسلمانوں پر ہی نہیں عالم اسلام کے کئی ممالک میں مسلمانوں پر خدا کی زمین تنگ کی جارہی ہے۔ یتیم بچے، مظلوم بیٹیاں اور بیوہ مائیں آج پھر کسی محمد بن قاسم کو پکار رہی ہیں کہ ان کی داد رسی کی جائے۔ قبلہ اوّل پھر کسی صلاح الدین ایوبی کی راہ دیکھ رہا ہے کہ وہ آئے اور یہودی پنجہ استبداد سے اسے آزاد کروائے لیکن عرب کی مٹی نے مجاہد پیدا کرنے بند کر دیے ہیں۔ کوئی خالد بن ولید کوئی سعد بن ابی وقاص، کوئی نورالدین زنگی اب عرب و افریقا کے ریگ زاروں سے نہیں آئے گا کیوں کہ تیل سے حاصل شدہ دولت کی فراوانی نے عربوں کو آرام طلبی اور ہر قسم کی عیاشی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ایسے میں صرف ایک ہی ملک رہ جاتا ہے یعنی پاکستان۔ جسے کبھی اسلام کا قلعہ ہونے کا فخر حاصل تھا لیکن پاکستان بھی تو مدتوں، مذہبوں، فرقوں اور لسانی جھگڑوں، اندرونی و بیرونی سازشوں کا شکار ہے۔ مشرقی، مغربی دونوں سرحدوں پر ملک دشمنوں سے برسر پیکار ہے۔ افواج پاکستان جس کا شمار دنیا کی بہترین افواج میں ہوتا ہے۔ اپنی پاک سرزمین کو دہشت گردوں کے ناپاک وجود سے پاک کرنے میں مصروف ہے۔ معیشت کا یہ حال ہے کہ گلے گلے تک پاکستان غیر ملکی قرضوں میں دھنسا ہوا ہے۔ عرب ممالک نے بھی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ آج اگر عرب غیر ملکی بینکوں سے اپنی رقوم نکال کر پاکستان کو قرضوں کے بوجھ سے آزاد کرا دیں اور کوئی قائداعظم جیسا سچا اور مخلص رہنما پھر سے پاکستان کو میسر آجائے تو نہ صرف افواج پاکستان بلکہ پاکستان کا بچہ بچہ نہ صرف قبلہ اوّل بلکہ فلسطین اور پورے عالم اسلام کی حفاظت کے جذبے سے سرشار ہے۔ اب آتے ہیں نئے شمارے کی طرف۔ شمر پہلے ہی ہمارے کر محکمہ ڈاک کی مہربانی سے 6 اگست کو بھیجا ہوا تبصرہ بقول دفتر والوں کے 23 اگست کو کراچی پہنچا۔ ناسازیٔ طبع کے باعث ابھی تک شہر خیال کے علاوہ چیدہ چیدہ صفحات ہی پڑھے ہیں جن پر تبصرہ حاضر ہے کہ شاید محکمہ ڈاک کو رحم آجائے اور بروقت تبصرہ پہنچ جائے۔ خطائے اوّل، ڈاکٹر ساجد امجد صاحب حسب معمول ایک بھرپور تحریر کے ساتھ آئے ہیں اور اپنے مضمون کو قرآن اور دیگر آسمانی صحائف اور تاریخی حوالوں سے خوب سجایا سنوارا ہے اور خطائے اوّل مکمل پس منظر کے ساتھ اجاگر ہو گیا ہے۔ مضمون پڑھ کر نہ جانے کیوں منیر نیازی مرحوم کا یہ شعر ذہن میں تازہ ہو گیا۔ جرم آدم نے کیا اور نسل آدم کو سزا بہ کاٹتا ہوں زندگی بھر میں نے جو بویا نہیں۔ خطا در خطا حکمرانوں کی خطا، غلط فیصلے اور جنگی خطائیں یہ سب ایسے عبرت اثر واقعات کی عکاسی کرتے ہیں جنہوں نے تاریخ عالم پر دیرپا اثرات چھوڑے ہیں لیکن تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کوئی ان واقعات سے عبرت حاصل نہیں کرتا بلکہ بار بار وہی غلطیاں دہرائی جاتی ہیں۔ مریم کے خان غلط نظریے کے عنوان سے ایک بہت خوب صورت اور معلوماتی تحریر کے ساتھ آئی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ نت نئے تجربات پرانی تحقیق کو غلط ثابت کرتے اور نئے نظریات سامنے لاتے رہتے ہیں۔ جاپانی کی دیوی قدیم ہندوستان تہذیب و تمدن اور درس گاہوں کے پس منظر میں رونما ہونے والی محبت کی ایک خوب صورت کہانی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت چاہے تو بڑے بڑے پرہیزگاروں کے ایمان کو ڈگمگا سکتی ہے۔ محبت ایک ایسا عالمگیر جذبہ ہے جس کی شدت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ منظر امام صاحب کا معلومات لئے کاروان عیسوی کیلنڈر کے نویں مہینا یعنی ستمبر میں پہنچا ہے۔ خاص نمبر ہونے کے باعث مضمون مختصر ہے۔ ستمبر کا مہینا کئی لحاظ سے پاکستان کی تاریخ میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ خاص طور پر 6 ستمبر اور 11 ستمبر ایسی تاریخیں ہیں جنہیں کسی طور نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ 6 ستمبر 1965 وہ یادگار تاریخ ہے جب مختلف فرقوں اور مذاہب میں بٹی ہوئی پاکستانی قوم اپنے ازلی دشمن بھارت کے خلاف اس طرح یک جان اور متحد ہو گئی تھی کہ جیسے ان میں کبھی کوئی اختلاف ہی نہ تھا۔ ایسے مواقع پاکستان میں کم کم ہی آتے ہیں اور اب پھر اسی جذبے کو کہیں دیکھا ہے۔ اسی طرح 11 ستمبر 1948 کو برصغیر پاک و ہند کے ایک بہت بڑے رہنما بانیٔ پاکستان بابائے قوم محمد علی جناح کی وفات کا المناک واقعہ وقوع پذیر ہوا۔ غرض دونوں تاریخیں پاکستان کی تاریخ میں بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ یوں نظرانداز کرنا کسی طور بھی مناسب نہ تھا جب کہ بعض انجانی مصروفی اور غیر اہم واقعات شامل مضمون ہیں۔ سرورق کی کہانی انجام خفا سمندر کے سینے سے اپنے اور دوسرے لوگوں کے لیے رزق حلال کمانے والے مچھیرے کی جدوجہد اور محبت کی دل کو چھو جانے والی

کہانی ہے۔ شہر خیال، طاہر الدین بیگ صاحب کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ وحید ریاست بھٹی، احمد خان توحیدی، محمد عمران جونانی، قیصر عباس، نازن تبصرے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول فرمائیں۔ اس بار سدرہ بانو ناگوری، سید انور عباس شاہ، وحید ریاست بھٹی، اعجاز حسین سنمار، منشی محمد عزیز سنے کے تبصرے پسند آئے۔ طاہرہ گلزار بھی میری طرح تاخیر سے پہنچیں۔ پشاور میں رہنے کا یہ صلہ تو ملنا ہی تھا۔“

☆ امتیاز حسین بھرگڑی ٹنڈو جان محمد سے لکھتے ہیں۔ ”السلام علیکم معراج رسول! کیا پیارا نام ہے انکل آپ کا۔ نام دل میں عقیدت بھر رہا ہے۔ آپ کیسے ہوں گے۔ آپ کی شخصیت کیسی ہوگی۔ یہ جاننے کے لیے میں کراچی ضرور آؤں گا۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ دوسرا اعزاز اگست میں میرا نام شامل ہونا۔ تیسرا اعزاز آج میرے بھائی سید انور عباس شاہ نے مجھے یاد کیا۔ انور شاہ وڑی مہربانی ادا۔ طاہر الدین بیگم کرسی صدارت مبارک ہو، سوچ تو بھائی کرسی بچانے کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ آج مورخہ 14-9-1 کو اس ماہ کا شمارہ ملا ہے۔ صرف دوستوں کی محفل اور اندین حرافہ کی کہانی پڑھی ہے اس لیے تبصرہ نہیں کر رہا۔ اب دوستوں سے باتیں۔ اعجاز حسین سنمار ہمت پکڑیں۔ منشی عزیز سنے! آپ کا خط پڑھنے سے پہلے ہی خمار چھا جاتا ہے۔ راہ سلطان مسعود، ادی شبانہ حنیف، احمد خان توحیدی، انجم فاروقی ساحلی۔ سدرہ ناگوری اللہ آپ سب کو خوش رکھے!! محمد عمران جونانی، قیصر عباس، محمد جاوید پاشا، لیاقت علی لاہور۔ میں آپ کا بھائی خاموش قاری ہوں۔ اُمید ہے ہمت افزائی کریں گے۔ ادی طاہرہ گلزار دیر نہ کیا کریں۔“

☆ غلام یاسین نوناری چوک سرور شہید سے رقم طراز ہیں۔ ”طویل ترین انتظار کے بعد 29 اگست کو ماہنامہ سرگزشت کا خاص نمبر ”خطا نمبر“ موصول ہوا۔ فہرست پڑھ کر سسپنس بڑھ گیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر ”خطائے اوّل“ پڑھی جس میں بہت سی اہم اور نئی معلومات منکشف ہوئیں۔ البتہ مصنف نے ایک بات کی وضاحت نہیں کی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس درخت کے پھل سے منع فرمایا گیا تھا وہ کون سا تھا؟ بہرحال تحقیق اچھی تھی۔ اس کے فوراً بعد اپنی فیورٹ اسٹوری ”سراب“ پڑھی جو گزشتہ 89 ماہ سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ شہباز کا سادہ ہمیت انڈیا سے صحیح سلامت نکل آنا جہاں خوش کر گیا وہیں نیئر کی موت پر بہت افسوس ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر بہت اچھی لگی۔ محترم امام نے تبصرے کے حوالے سے عمدہ معلومات پیش کیں۔ سچ بیانوں میں خطا کار ہوں، اتہام خطا، بے نام خطا اور غفلت کی سزا نمبر ان رہیں۔“

☆ محمد سلیم قیصر نے نیو سینٹرل جیل ملتان سے لکھا ہے۔ ”عرصہ دراز سے ماہنامہ سرگزشت سے وابستہ ہوں۔ گزشتہ تین چار ماہ سے اپنے خیالات اور جذبات صفحہ قرطاس کی زینت بنا کر تحریروں کے روپ میں روانہ کر رہا ہوں۔ لیکن دلی دور است۔ کال کوٹھڑی میں مقید ہوں۔ محدود وسائل کے سبب رسالہ ملنے میں دشواری کا سامنا بھی ہوتا ہے۔ ہفتے میں ایک بار ملنے والوں کو خطوط پوسٹ کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں کوشش کرتا ہوں کہ پہلے ہی ہفتے خط پوسٹ ہو جائے تاکہ بروقت رسالے کا حصہ بن سکے لیکن نہ جانے کیوں (وقت پر پہنچنے والے خطوط ضرور چھپتے ہیں) رسالہ بہترین ہے اور میں کہتا ہوں کہ اس رسالے کو ترتیب دینے والے اور وابستہ قارئین سب کے سب قابل تحسین ہیں۔ کہانیاں تو بھلی لگتی ہی ہیں لیکن تبصروں سے بھی خوب لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میں نے اپنی پہلی تحریر میں بھی جو رسالے کا حصہ نہ بن سکی لکھا تھا کہ میں جس مشکل میں ہوں اسلام آباد اور راولپنڈی کے پیارے بای اس مشکل کے ازالے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر قرۃ العین اور دیگر دلچسپی لیں تو یقیناً میری کافی مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ ”لیلیٰ الف لیلیٰ“ اور ”مقابلہ بیت بازی“ مجھے پسند ہے۔ میں آپ کی پوری ٹیم اور وابستہ قارئین کرام کی سلامتی اور درازی عمر کی دعا کرتا ہوں۔ میری طرف سے عبدالخالق بھٹی، راؤ محمد شاہد، سدرہ بانو ناگوری، ڈاکٹر قرۃ العین، محمد اشفاق، قیصر عباس، محمد عمران جونانی، رودالرحمٰن، منشی عزیز سنے، بشریٰ افضل، بھی فردوس، احمد نعیم خان، ڈاکٹر خالد شفیع و دیگر کو السلام علیکم۔“

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے لاہور سے لکھا ہے۔ ”غلطی تو ہمارے رہبر و رہنما آج کل بہت کر رہے ہیں۔ کسی کو خیال نہیں ہوتا ہے کہ مسائل پیدا کر دینے کے بعد اور مسائل سامنے آجانے کے بعد ان سے کیسے نمٹنا ہے۔ غلطیاں کرنے میں سبقت لینے کی کوشش کی جا رہی ہے اور قوم اس سوچ میں غلطاں ہے کہ ہم نے اپنے مستقبل کی باگ ڈور کن لوگوں کو تھما دی ہے۔ معراج رسول صاحب دبے لفظوں میں بھی باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہرام بروا کی حالت جذب میں بھی ظاہری آنکھ والے حاکم کی نظر میں خطا کار ٹھہرے۔ شہر خیال کے دوست ہمارے خطا کو انتظار گاہ میں لے جانے کو انتظامیہ کی غلطی قرار دے کر اشاعت کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ لہٰذا ان سب کا شکریہ اور طاہر الدین بیگ کو مبارک باد۔ تخلیق کے بعد انسان کی خطائے اوّل نے اسے جنت بدر کر دیا۔ لہٰذا واپسی کے لیے اب جنت میں جانے کا واحد راستہ یہی ہے کہ ایسی کوئی خطا نہ کی جائے جس کی معافی نہ ہو، یہ بتا رہے تھے ہمیں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب۔ کاشف خان نے خطائے مسلمان کی خطا در خطا کا ایسا نقشہ کھینچا کہ ہمیں جھرجھری آگئی۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اپنے بھائی سلیمان بن عبدالملک کو خلیفہ بنا کر اقربا پروری کی جو بنیاد ڈالی یہ اسی کا شاخسانہ ہے کہ مسلمان اپنے نقطہ عروج کو چھونے کے بعد زوال کا شکار ہوئے اور خلافت کا انتظام سیاسی طور پر ناکام ہو گیا۔ ہمارا ماضی اس وقت تک شاندار رہا جب تک ہم قابلیت و اہلیت کو فوقیت دیتے رہے اور اسے چھوڑ دینے کی غلطی نے ہمیں آج ذلیل و رسوا کر کے موجودہ حال کو پہنچا دیا ہے۔ کے زیڈ خان کی سنو تو وہ خطائے مشرق کے ذریعے حکمرانوں کی خطائیں گنوا رہے تھے جنہوں نے آج حکمرانوں کی طرح اپنے عوام کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ چین کے ایک بادشاہ نے اپنے دشمن تک پہنچنے کے لیے آٹا پیسنے والی چکیوں سے راستہ بنا کر ایک کروڑ انسان بھوک سے مار دیے۔ مصر کے حکمرانوں نے زر انگوٹھیوں کو الگ تھلگ بنا کر قسمت دیا بود ہونے کا سامان کیا۔ آج کے حالات دیکھ کر تو

موجودہ اسلام آباد بھی ہمیں حکمرانوں کی غلطی ہی محسوس ہو رہا ہے۔ سائنسی خطائیں اکثر غلط نظریہ قائم کر کے اس لیے شرمندہ ہوتی ہیں کہ وہ منصب سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔ ہمارے مسلمان سائنس دانوں نے جو سائنسی نظریے قائم کیے بعد میں تحقیق کے بعد وہی درست ثابت ہوئے لیکن یہ اہلِ یورپ کی بددیانتی ہے کہ انہوں نے صدیوں بعد ان کا سہرا اپنے لوگوں کے سر باندھا۔ ڈارون کا نظریہ ارتقا کہ انسان پہلے بندر ہی کی اولاد تھا تو ڈی این اے نے غلط ثابت کر دیا کہ آج کا ہر انسان لاکھوں سال پہلے موجود بچنے والی ایک ہی ماں کی اولاد ہے۔ ہمارے قرآن نے تو چودہ صدیاں پہلے ہی بیان کر دیا تھا اور موجودہ شمارے میں خطائے اوّل اس کا ثبوت ہے۔ مریم کے خان کی سچ بیانی کا۔ خطائے مشرق کے بعد خطائے مغرب کا تذکرہ روا ہی کر رہی تھیں۔ صاحبِ اقتدار کی خطائیں قوموں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ قیصر روم ہوں یا صلیبی جنگوں کے حکمران، سکندرِ اعظم ہوں یا ہٹلر سب ہی نے اپنے اپنے غلط فیصلوں سے کروڑوں انسانوں کو تہِ تیغ کر دیا جو آج تک جاری ہے۔ بس نام تبدیل ہو کر بش، سینئر، بش جونیئر اور اوباما ہو گئے ہیں۔ آصف ملک نے خطائے رزم کے عوض مختلف ممالک کی جنگی خطائیں سمجھانے کی کوشش سے ہمیں صرف یہ سکھایا کہ جنگیں ہوتی ہی کسی نہ کسی کی خطا کی وجہ سے ہے۔ ہم یہ بھی سمجھتے تھے کہ قتل ہونا بذاتِ خود بڑی غلطی ہے لیکن عبدالرب بھٹی نے ثابت کیا کہ دولت کی خاطر قتل خطا سب سے بڑی غلطی ہے۔ انڈیا کی پاسپانسکو پر ہی کیا موقف ہم تو اپنے ملک کے مختلف چوکوں پر نظر آنے والی انگر اور غنڈہ ریڈوں پر حیران ہیں کہ وہ دنیا کے سامنے کس دھڑلے سے بغیر ردِ عمل نظر آ رہی ہیں۔ شاید ہماری ریاست کو آئین و قانون پڑھنے سے فرصت ملے تو اس طرف توجہ دیں۔ بکی الف لیلہ میں حضرت امیر خسرو اور حضرت نظام الدین اولیا کا تذکرہ اس خطائے انداز بھرے ماحول میں دل کو پُرسکون کر گیا۔ نعمان احمد اعوان کو کمار نے سوچا تو وہ ملازمین کی معمولی چوک پر ناراض ہو گئے اور ان کی یہ ناراضگی اس لیے بجا تھی کہ ان کی معمولی چوک سے سینکڑوں انسانی زندگیاں ضائع ہو گئیں۔ زین مہدی کا کہنا تھا کہ تباہی کی دیوی نے بستیوں کی بستیاں صرف اس لیے اجاڑ دیں کہ دو دلوں نے خطائے محبت کی تھی۔ اب ہم اس پر کیا کہتے یہ تو ازل سے ہوتا چلا آ رہا ہے بھلا محبت بھی بغیر نفرت کے محبت ثابت ہوئی ہے۔ صائمہ اقبال پہلے بھی کمرے کا قہر کے ساتھ کسی شمارے میں آ چکی ہیں لیکن اس مرتبہ یہ ایمپریس آف آئر لینڈ نامی بحری جہاز کی خطائے کپتان تھی جس کے اندازے کی ایک غلطی نے ایک ہزار مسافروں کو لقمۂ اجل بنا دیا۔ ابن کبیر تلاشِ منزل میں خطائے رہبر تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے میں کامیاب ہوئے کہ رہبر بعض اوقات رہزنوں سے بدتر ثابت ہوتے ہیں۔ محمد ایاز راہی خطائے جلد باز کے مرتکب ہوئے لہٰذا ان کی عجلت کی سزا یہ ہے کہ ان کی تحریر اب ہم آرام سے پڑھیں گے اور رائے دینے میں کوئی غلطی بھی نہیں کریں گے۔“

☆ طاہرہ گلزار کی ناراضی پشاور سے۔ ”آج یکم تحریر کو سرگزشت ملا۔ دل تو 28 اگست سے خفا تھا کیوں کہ مجھے عمران جونانی بھائی نے بتا دیا کہ باقی آپ ایک بار پھر B.List میں آرام کر رہی ہو۔ سن کر بہت دکھ ہوا کہ میں جو سب کی باتیں اور پھر بھی شہر خیال سے باہر ہوں۔ جب سرگزشت ہاتھ لگا تو جلدی جلدی B.List کو چیک کیا اور اپنے ساتھ تبسم عباس بابر بھائی کو بھی دیکھا۔ تحریر کھلی آنکھوں سے پڑھی۔ مجھے تو اپنے ملک کی اور خاص کر راست محمدی کی اس بے حسی اور بے رخی پر بہت سخت غصہ آتا ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے کہ ہم اقتدار کو کھو چکے ہیں۔ بندہ حرص، دولت کی طاقت کی لت میں دھنس چکا ہے۔ ہمیں اپنے علاوہ سچا اور نیک کوئی اور نظر نہیں آتا لیکن افسوس صد افسوس ہمارے ان بے حس اور بے غیرت حکمرانوں کو ان مظلوم عوام پر رحم نہیں آتا۔ ہر ایک اپنی دکان سجاتا ہے اور اس میں جھوٹے سچے وعدے سجاتے ہیں اس تیز روشنی میں عوام بے چاروں کی آنکھیں بند، دماغ سن اور سوچ بند ہو چکی ہیں۔ ہمارے پیارے ملک پر اللہ رحم کرے۔ (آمین ثم آمین)۔ روایت کے مطابق یک کی ہی مشہور بزرگ صوفی بہرام سقا عرف بہرام بدو والی کے بارے میں پڑھا۔ واقعی ان کے بارے میں تاریخ کے صفحات خاموش ہیں۔ چلو تھوڑا سا سنجیدہ پن چھوڑ کے دوستوں کے خطوط کی چھیڑ پھاڑ کرتے ہیں۔ پہلے تو طاہر الدین بیگ بھائی فرسٹ آنے کی مبارکباں، بھائی معنف اس لیے خاموش ہے کہ اس کو مسلمان ہونے کا احساس کمتری ہے۔ ورنہ پاکستان زندہ 14 اگست کی بجائے ہر سال 27 رمضان کو مناتے۔ تلاوم وہی کرتا ہے جو حاکم کہتا ہے۔ سلطان محمود بھائی آپ کا پُراثر اور ہمارے معاشرے کی بے حسی پر تنقید بھرا خط پڑھا تو ایک پاکستانی اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے بہت شرم آئی اور نظریں جھک گئیں۔ بھائی میں تو ایک دکھی عورت ہوں لیکن آپ سے ایک سوال کرتی ہوں میرے اور بھائی بھی خفا نہ ہوں ہر گند آپ مرد کرتے ہو لیکن بدنام عورت کو کر رہے ہو۔ بہن شبانہ حنیف اللہ آپ کو بھی خوش رکھے اور روبینہ انصاری کے شوہر کو بھی اللہ صحت عطا کرے۔ احمد خان تو حیدی بھائی کا خط بھی بہت پُراثر تھا۔ وحید ریاست بھٹی بھائی کا تبصرہ بھی شاندار رہا۔ بھائی بخاری آپ کا خط بھی بہت پُراثر رہا۔ میں نے آپ کا خط پہلی بار پڑھا آپ کے خیالات اچھے لگے۔ پیارے بھائی خوش رہو۔ سسٹر سدرہ! ہم سب مجبور ہیں صرف آنسو ہی بہا سکتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے ہم سب مظلوموں کے یہ آنسو ایک بار سمندر ضرور بنیں گے اور اس میں تمام ظالم ہلاک ہو جائیں گے۔ باقی آپ کے تبصرے پر کیا کہوں تعریف کے لیے لفظ نہیں ملتے۔ سویٹ سسٹر! عمران جونانی بھائی اتنا مختصر خط مجھے یاد کرنے کا شکریہ۔ قیصر عباس بھائی یاد رکھنے کا شکریہ میں ہر بیچے خط تحقیق کی ہوں لیکن شاید ڈاک خانے والوں کو سخت ناپسند ہوں۔ اسلامیات میں ماسٹر کرنے کے باوجود بھی پروفیسر جیسے مقدس عہدے پر فائز نہیں۔ میں کالج میں Lab Assitt کی پوسٹ پر ہوں اور تین سالوں میں اب بہت جلد گریڈ BP-16 اور انشاء اللہ پھر 17 گریڈ ملے گا۔ قیصر بھائی واقعی کالا جادو بہت خطرناک ہے۔ کچھ سال پہلے مجھ پر بھی کیا گیا تھا۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اللہ کے کلام سے ایسا انتظام کیا کہ اب میں محفوظ ہوں۔ بے شک اللہ کا کلام بہت بابرکت ہے۔ اللہ جبرئیل بی بی پر اور ہم سب پر اپنا کرم کرے (آمین ثم آمین)۔ رانا محمد شاہد بھائی! اپنا مبارک ہو۔ شاہد بھائی خط آپ کا بہت دلچسپ اور شاندار رہا لیکن سوال ہے کہ بہن کو یاد کیا ہو۔ اتنی مشہور شخصیت محمد جاوید پاشا صاحب

بھی اس بار ہمارے شہرِ خیال میں حاضر تھے۔ وعلیکم آتے رہا کریں۔ اعجاز حسین سنجرانی انکل اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اپنے محبوب کے صدقے صحت کاملہ عطا کرے اور کسی کا محتاج نہ بنائے (آمین ثم آمین)۔ انکل اعجاز آپ کی تحریر ہمیشہ سے مجھے پسند ہے۔ تنقی عزیز سے صرف آپ بزدل نہیں ہم سب ایک ہی کھیت کی مولیاں ہیں۔ مطلب آپ کی طرح بزدل ہیں ویسے مجھے یاد رکھنے کا شکریہ۔ علیکم السلام بھائی۔ سید انور عباس شاہ کا تبصرہ آخری خط ثابت ہوا جس میں احمد رشدی کے بارے میں بہت کچھ تحریر تھا۔ آتے رہا کریں بھائی۔ اب حسبِ عادت پہلے تیکی کہانیوں پر تبصرہ حاضر ہے۔ پہلی کہانی انجام خطا کیسی بھی کہانی تھی۔ آخر رانی ایسے کیوں تھی ہر دو تیجی مرد کی عقل پہ ماتم کرنے کو دل کرتا ہے۔ دوسری کہانی سازش، انسانی نفرت کی عکاسی کرتے ہوئے بہترین کہانی تھی جس میں انسانی جذبات و احساسات بدرجہ اتم موجود۔ وہ اچھے اور وہ برے نفرت کے لوگوں کی کہانی رہی جو فساد اور سازش کی جڑ تھی اس کے انجام پر دل بہت خوش ہوا۔ عالیہ اور شبیر احمد نیک اور اچھی فطرت کے لوگ تھے اس لیے اللہ نے بھی آخر ان کو ملا دیا۔ تیسری کہانی بے نام خطا پڑھ کر دکھ بھی ہوا اور عالیہ کی قربانی پر ڈھیروں پیار بھی آ گیا۔ اس نے سچ کہا کہ زندگی بے کیف گزرتی ہے اگر یہی مجبوری بلکہ یہی عالیہ میں ہوتی تو فرحان کبھی اس سے شادی نہ کرتا۔“

☆ سدرہ بانو ہاگوری کا تبصرہ کراچی سے ”عشق ناکام نمبر اور پُراسرار نمبر کی طرح خطا نمبر بھی ہر لحاظ سے بھرپور اور دلچسپ رہا۔ معنی خیز سرورق اور خطاؤں سے بھری تحریریں۔ تمام تحریریں اپنی مثال آپ تھیں۔ اداریے میں معراج انکل ملکی صورتِ حال پر اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے تھے لیکن انکل ہمیں آپ کے ایک جملے سے اختلاف ہے۔ آپ نے لکھا کہ کون صحیح اور کون غلط ہے یہ تو اہلِ سیاست بتا سکتے ہیں لیکن کیا ہمارے ملک میں سیاست داں صحیح اور غلط فیصلہ کرنے کے قابل ہیں۔ ہمارا ملک اس وقت اپنے سیاستدانوں کے طفیل ایک نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ٹی وی کی چنگھاڑتی اسکرین جب ہمیں اسلام آباد کی سڑکوں پر ہمارے سیاستدانوں کے کارناموں کے نظارے دکھاتی ہے تو مارے شرم کے نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ ہم اتنا تو جانتے ہیں کہ ہر شاخ پہ اُلّو بیٹھا ہے مگر اس بات سے بے خبر ہیں کہ انجامِ گلستاں کیا ہوگا۔ شہرِ خیال کی محفل میں پہنچے تو صدارت کی کرسی پر طاہر الدین بیگ اپنے عمدہ تبصرے کے ساتھ بڑی شان سے براجمان نظر آئے۔ دیگر ساتھیوں نے بھی اچھا تبصرہ کیا جن صاحبان نے ہمارا تبصرہ پسند کیا ان کا شکریہ۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے لکھی گئی تحریر خطائے اوّل زبردست رہی۔ ہم نے آدم کی اس خطا کو متعدد بار پڑھا مگر جس باریک بینی سے ساجد امجد نے حقائق سے پردہ اٹھایا اس کے لیے صاحب داد کے مستحق ہیں۔ حاتم اقبال کی کہرے کا قہر میں خطاؤں سے زیادہ تجزیات کا عمل دخل رہا۔ تلاشِ منزل ابنِ کبیر کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی تحریر کو دھڑکتے دل کے ساتھ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ موت کا ایسا بھیانک روپ اس سے پہلے ہماری نگاہوں سے نہیں گزرا کہ ظالم بھوک نے انسان کو وحشی بنا ڈالا۔ منظر امام کی معلوماتی تحریر September منفرد رہی۔ عکی حج بیانی انجام خطا پڑھ کر قدرت کی کرم نوازی پر حیران رہ گئے کہ محبوب کو زہر دینے کی خطا دشمنوں کے لیے بھیانک انجام کا باعث بن گئی۔ خطائے بزرگاں میں بزرگوں کی خطاؤں کو پڑھ کر مسکرانے سے گریز کیا کہ زندگی نے ہمارے ساتھ وفا کی اور ہم پر بڑھاپے کا بوجھ آن پڑا تو...... لیکن یہ لوگ ہوتے بڑے دلچسپ ہیں۔ پچھلے دنوں ایک بزرگ ملنے آئے تو ماضی کا ذکر چھیڑ بیٹھے۔ کہنے لگے کراچی میں ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ بس اسٹاپ پر سفر کرنے والے قطار لگا کر کھڑے ہوتے تھے۔ دو قطاریں لگا کرتی تھیں۔ ایک ان لوگوں کی جو بیٹھ کر سفر کرنا پسند کرتے تھے دوسرے وہ لوگ جو جلدی جانے کے متمنی ہوتے چنانچہ وہ کھڑے ہو کر بھی سفر کرنے پر رضامند ہوتے۔ بس آ کر کھڑی ہوتی تو بیٹھ کر سفر کرنے والوں کی قطار پہلے چلتی اور جب سیٹیں پُر ہو جاتیں تو پھر وہ لوگ جو بس میں سوار ہو چکے تھے اور سیٹ نہ ملنے پر کھڑے ہوتے وہ ایمانداری سے باہر آ جاتے اور دوسری قطار میں کھڑے ہو جاتے۔ پھر کھڑے ہو کر سفر کرنے والوں کی قطار چلتی یوں سفر ہوتا تھا۔ اب تو بس یہی سوچتے ہیں کہ ماضی میں خواب دیکھا تھا یا اب کوئی بے ہنگم خواب دیکھ رہے ہیں۔“

☆ سلیم خورشید کا نوازش نامہ لاہور سے ”سرگزشت کا خطا نمبر پڑھ رہا ہوں۔ سرورق پر پالا سنگھ حیدر بھارت موجود ہے اور دیگر خوب صورت تصاویر سے رسالہ سج گیا ہے۔ خطا نمبر میں حکمرانوں کی خطائیں، جنگی خطائیں، مسلمانوں کی خطائیں اور دیگر اقوامِ عالم کے ممالک جیسے جرمنی، فرانس، افریقا وغیرہ کی غلط پالیسیوں پر بہت خوب صورت مضامین پڑھ کر تاریخِ انگلستان جو سلیبس میں پڑھی تھیں یاد آ جاتی ہیں۔ مسلمانوں کو زوال ہمیشہ ان کی غلط اصلاحات اور تکبر کی وجہ سے ہوا۔ جناب آفاقی صاحب نے حضرت شیخ نظام الدینؒ کے بارے میں تحریر فرما کر روح کو قلبی سکون مہیا کیا ہے اور کامیڈی اداکاروں کے بارے میں مضمون بھی ایک خوب صورت اور پاکستانی فنکاروں کے دور کی یاد دلاتا ہے۔ ویسے تو کامیڈین دیگر فنکار بھی تھے جیسا کہ زلفی، خلیفہ نذیر وغیرہ ان کے علاوہ ننھا، رنگیلا مرحوم بھی ایک کامیڈی فنکار تھے۔ رنجیت مرزا، اسد جعفری، چارلی لطیف بھی مزاح میں ایک مقام رکھتے تھے۔ احمد شیخ کی آپ بیتی خطا کار ہوں ایک خوب صورت اور سبق آموز ہے۔ ہمارے معاشرے میں عوام کے ساتھ جو رویہ ان لوگوں کا ہوتا ہے وہ پاکستان کے ہر شخص کو معلوم ہے۔ خدا پاکستانی قوم میں جذبۂ حب الوطنی اور ہمدردانہ سوچ پیدا کر دے۔ کیمیاگر بھی ایک نہایت عمدہ تحریر ہے۔ جس طرح جوان قوم انٹرنیٹ اور موبائل فون کا غلط استعمال کر رہی ہے اور دین سے دور ہو رہی ہے۔ انہیں ایک ایسے ہی مسیحا کی ضرورت ہے۔ خطائے بزرگاں ایک فارسی شعر پر پوری کہانی جس انداز سے پیش کی گئی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ ہمارے روزانہ ٹیلی وژن پر جو عشقیہ ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں ان کا مقصد صرف معاشرے میں محبت کے عنصر کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ بعض ڈراموں میں بڑی عمر کے بزرگوں کو جوان لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کرتے دکھایا جا رہا ہے اور کنواری لڑکیاں شادی شدہ مردوں سے محبت میں گرفتار نظر آتی ہیں جب کہ ان کی اولاد جوان دکھائی جاتی ہیں۔ اس معاشرے میں ایسی مثالیں موجود ہیں لیکن ان

خیالات کو ڈرامے میں دکھا کر کون سی ترقی کی جا رہی ہے۔ اصل مسئلہ جہیز کی لعنت ہے۔ جس کی وجہ سے گھروں میں تعلیم یافتہ لڑکیاں شادی سے محروم بیٹھی ہیں۔ بے نام خطا قربانی کی ایک بے مثال ہے۔ ایسی کہانی پہلے بھی پڑھی تھی جس میں خاوند اور بیوی کے رشتہ ازدواج نہ ہونے کی وجہ سے لڑکی نے یہ بات نہ بتلائی بلکہ اسی خاوند کے ساتھ ہی زندگی گزاری اور فوت ہو گئی۔ جب اس کو دفنایا گیا تو اس کی قبر سے ایسی خوشبو جاری ہوئی کہ لوگ حیران ہو گئے۔ تب خاوند نے اپنی بیوی کے صبر کرنے کا بتایا۔ دنیا میں ہر قسم کے واقعات قدرت دکھاتی ہے کہ سبق حاصل کریں۔ اس وقت ملک میں بارشوں اور سیلاب کی آفت اور وزیرستان سے مہاجر بنے لوگوں کا قیام ہر پاکستانی کے لیے تکلیف کا باعث بنا ہے۔ جنگ ستمبر 65ء میں ایک نعرہ تھا ایک پیسا ایک ٹینک۔ قوم کے بچے، بوڑھے، جوانوں نے لبیک کہا اور ملک کی حفاظت کے لیے آگے آئے اور اپنے فوجی جوانوں اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کی۔ آج بھی وہی جذبہ درکار ہے اور مذہب، صوبائیت اور سیاسی اختلافات بھلا کر ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہونے کا وقت ہے اور ہر قسم کی مدد کرنے کے لیے ہر پاکستانی کو آگے آنا چاہیے اگرچہ دکھ، تکلیف تو خدا کی ذات دور کر دیتی ہے لیکن وہ قومیں ذلیل ہو جاتی ہیں جو اپنے آقا اور احکامات خداوندی سے روگردانی کرتی ہیں۔ خدا ہم سب کو مزید کوئی خطا کرنے سے محفوظ فرمائے اور وطن پاک کی حفاظت فرمائے، آمین۔''

☆ احمد خان توحیدی کا تجزیہ راولپنڈی سے ''سرگزشت 25 اگست کی شام کو ملا۔ مطالعہ میں تاخیر کی وجہ کراچی سے راولپنڈی روانگی ہے۔ سرگزشت ساتھ لے آیا تھا۔ معراج رسول صاحب، ہم سے بعد میں آزاد ہونے والے وقت کو ضائع نہیں کرتے۔ ہم فضول دھرنوں کے سوا کون سا کام وقت پر کرتے ہیں؟ ٹیکنالوجی کی دنیا میں فیصل آباد کا ایک ہم تھا۔ ذاتی مفاد پر لیبیرے ڈیم تو درکنار بارش کا پانی بھی نہیں سنبھالتے۔ ادھر انڈیا کس چالاکی سے ڈیم بنا کر ہمیں کیا چبانے کو تیار ہے۔ ایک کپی میں بہرام پوروانی کا مختصر تعارف کا شکریہ۔ شہر خیال میں طاہر الدین بیگ کو کرسی صدارت پر بیٹھے مبارک ہو۔ باقی ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے انور عباس بھکر کا تبصرہ اچھا مگر طویل تھا۔ سلطان مسعود بہاولپور، انگلینڈ میں قانون، مجرم کو پکڑتا ہے۔ یہاں کا قانون ٹک ٹک کرتا ہے۔ اکثریت ساتھیوں نے شمارہ اگست کو زبردست قرار دیا۔ جی ہاں جناب نہیں۔ سرگزشت کا معیار ہی ایسا ہے کہ ہر آنے والا شمارہ پچھلے سے اچھا لگتا ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ خطائے آدم، مسلم غیر مسلم سب حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ آدم نے گندم کا دانہ کھا کر غلطی کی تھی۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ یعنی وہ انسان ہی نہیں جس سے غلطی نہ ہو۔ نعمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب بزرگوں کے مزار کی نایاب تصاویر، حالات صوفی یادداشتیں دینے کا شکریہ۔ انجام خطا میں راتو نے شاید تنگ کی جگہ جو بے بار روائی ڈال دی۔ سازش میں عالیہ عظیم شہری لڑکی تھی بیٹا پاگل ملا۔ کیمیا گر، بقول اقبال نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ شگفتہ نے اپنے ساتھ کتنوں کی زندگی سنوار دی۔ بے نام خطا میں فرحان نے عالیہ کو بتا دیا تھا کہ مرد کی نسبت عورت کو ازدواجی تعلق کی زیادہ ضرورت تھی۔ شادی کرنا عالیہ کی غلطی ہے۔ خطا نمبر اچھا شمارہ ہے۔''

☆ سید انور عباس شاہ کا بھکر سے۔ ''خطا نمبر 29 اگست کو ملا۔ اقتباسات سے ہوتے ہوئے شہر خیال میں پہنچے۔ ہمیشہ کی طرح محسن بھائی خوب چمکار رہے تھے۔ محمد جاوید پاشا کا خط پڑھ کر ہمیں افسوس اس بات کا ہوا کہ اس قدر نایاب ہستی اب تک سامنے کیوں نہیں آئی۔ آپ کے سینے میں جو معلومات کا خزانہ ہے اسے سامنے لائیں تاکہ ہم بھی مستفید ہو سکیں۔ راؤ محمد شاہد بیٹے کی پیدائش پر صدق دل سے مبارک باد۔ خط بھرپور تھا۔ سلطان مسعود کا خط دل دہلا دینے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی تھا۔ شاہد جہانگیر شاہد اس دفعہ تو شہر خیال کی زینت بنے اور نہ ہی ان کا نام بلیک لسٹ میں شامل تھا۔ (ان کا خط پریس میں جانے کے ایک ہفتے بعد پہنچا جب کہ ڈاک خانے کی مہر سے پتا چلا کہ 18 دن میں پہنچا ہے) شہر خیال کی ہمیشہ زینت بننے والی طاہرہ گلزار ایک دفعہ پھر بلیک لسٹ ہو گئیں۔ یہ تو محکمہ ڈاک ہی کی مہربانی ہے افسوس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اظہر احمد، فقیر غلام حسین ضیا اور مریم قیصر بہت ہی مختصر خط کے ساتھ حاضر ہوئے۔ اس کے علاوہ طاہر الدین بیگ، شبانہ حنیف، احمد خان توحیدی، وحید ریاست بھٹی، سید محمد عظیم شاہ بخاری، محمد عمران جوہانی، قیصر عباس، اعجاز حسین سعادت، لیاقت علی اور منشی محمد عزیز سے کے خطوط شاندار رہے۔ سچ بیانیوں میں خطا کار ہوں جیسی کہانی اس سے پہلے بھی ہم پڑھ چکے ہیں۔ لگتا ہے اسی کہانی کو توڑ مروڑ کر دوبارہ پیش کر دیا گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ (اگر اس کہانی کی فوٹو کاپی بھیج دیں تو نوازش ہوگی تاکہ مصنف کو آئینہ دکھایا جا سکے)۔ کیمیا گر ایک بہترین اور سبق آموز تحریر تھی۔ انجام خطا سسپنس اور ایکشن سے بھرپور تحریر تھی۔ منظر امام صاحب کی گاڑی اپنا سفر تیزی و خوبی طے کرتی ہوئی اپنے 9 ویں اسٹاپ پر پہنچ چکی ہے ابھی اس کے تین اسٹاپ باقی ہیں۔ بحری سفر پر مبنی تحریر کیمرے کا قہر ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی اور اپنی مثال آپ تحریر تھی۔ واقعی ایک معمولی سی خطا نے اتنے بڑے حادثے کو جنم دیا۔ باقی کہانیاں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔''

☆ عمران جوہانی کا خلوص نامہ شہر کراچی سے۔ ''خطا نمبر کی سج دھج ابتدا ہی سے نرالی ہے۔ وضع قطع میں خوب صورت تبدیلیاں نمایاں ہیں۔ انتظار رائیگاں نہیں گیا۔ انجانی سے تلے انداز میں حضرت آدم کے قصے سے شمارے کا آغاز ہوا۔ مدلل طریقے سے غیر ضروری طوالت سے بچتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے قدم بڑھائے۔ ترتیب کے اعتبار سے مریم کے خان کی غلط نظریہ دو بھلا قریب ہے جس نے سچ مچ میں اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ اچھی طرح تحقیق اور بھلے بھلے انداز میں لکھے گئے اس مضمون نے سائنسی نظریات کو کھنگالا۔ آفاقی صاحب کے مضمون کی ابتدا اس مرتبہ حضرت نظام الدین اولیا کے مبارک تذکرے سے ہوئی جس نے دل کی سوکھی زمین پر پھوار کا کام کیا۔ خان آصف صاحب کی افسر

کے سفیر اس حسن کے مضامین کا بہترین مجموعہ ہے۔ زین مہدی کی تباہی کی دیوی مختصر مگر دلچسپ بحث نامہ ثابت ہوئی۔ جب انسان فطرت کے اصولوں کے خلاف چل کر خود کو کچلنے کی سعی کرتا ہے تو تباہی قریب ہوتی ہے لیکن یہاں تباہی نے نہ جانے کتنی جانیں لی ہوں گی۔ صائمہ اقبال کی تحریر میں منظر نگاری کا جواب نہیں ہوتا۔ قاری کو کردار چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ تلاش منزل ابن کبیر نے ضرورت سے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھی۔ ہم اس تکلیف کا آج کے اس ترقی یافتہ دور میں اندازہ نہیں کر سکتے جو اس دور کے مسافر اٹھاتے تھے۔ عمران خان بھی اسی طرح آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سچ بیانیوں میں خطائے بزرگاں عجیب سی کہانی ہے۔ شہر خیال کا تذکرہ کریں تو سلطان مسعود کی بات ہو جائے۔ سچ کہا آپ نے اتنا اندھیر اتنا ظلم کم کہیں اور دیکھنے کو ملتا ہے؟ سید انور عباس کا خط آخر میں ہے لیکن سب سے زیادہ جامع محسوس ہوا۔ احمد رشدی کے بارے میں معلومات خاصے کی چیز ہے۔ سید بخاری خان پور کٹورہ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ پرانے پڑھنے والوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ پرانے شماروں میں ایک اور خان پور سے تھا۔ وین پوری کا تذکرہ جا بجا نظر آتا تھا۔ سدرہ بانو وعلیکم السلام۔ سراب کے بارے میں آپ کے تبصرے سے مکمل اتفاق ہے۔ قیصر عباس کی ساتھیوں سے علیک سلیک پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سچ بیانیوں پر بھی اچھا لکھا۔ محمد جاوید پاشا صاحب جیسے تجربہ کار انسان کو اپنے درمیان پا کر دل خوش ہوا۔ معلومات دلچسپ ہیں۔ اس کے علاوہ شبانہ حنیف، وحید بخشی، اعجاز حسین اور محمد عزیز سمے کے خطوط بھی قابل تعریف ہیں۔“

☆ اویس شیخ کی نوبہ ٹیک سنگھ سے آمد۔ ”29 اگست کو جونہی خطا نمبر مارکیٹ میں آیا خرید لیا۔ سب سے پہلے سچ بیانیاں پڑھیں۔ انجام خطا اچھی تھی۔ سازش بھی کافی پسند آئی۔ سمجھ نہیں آتی لوگ کس طرح اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کا گلا آسانی سے گھونٹ دیتے ہیں۔ حالیہ اسرائیلی جارحیت سامنے ہے جس نے صرف 1988 گز زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے 2200 فلسطینیوں کو شہید کیا۔ ایسی سازشیں کسی اور قوم کے نصیب میں نہ آئیں۔ بے نام خطا میں عورت ذات بازی لے گئی۔ ان نازک آبگینوں نے ایک بار پھر مجسم وفا ہونے کا ثبوت دیا جو مردوں میں آج کے دور میں دوربین سے بھی نظر نہیں آتی۔ خطائے بزرگاں اچھی نہیں لگی۔ لیکن کیا کروں لوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے کیسٹ اب کہیں نہیں ملتے ہیں۔ جو انسان کی روح میں اک نئی جان ڈال کے اس کو اصل جینے کا مقصد بتاتے ہیں لیکن ہم عوام ان بے چاروں کو کم ہی فالو کر پاتے ہیں پھر نتیجہ وہی نکلتا ہے۔ خطائے بزرگاں گرفتن نیست۔ خطا کاروں پڑھی تو آبدیدہ ہو گیا۔ کسی نے کہا تھا کہ انتقام کا بھی انتقام ہوتا ہے۔ یہی کچھ اس سچ بیانی میں نظر آیا۔ خطائے اوّل پڑھی کافی معلومات ملیں۔ اس کے بعد خطا در خطا حکمرانوں کی خطا، جنگل خطا کیں، غلط فیصلے، ایسی تحریریں پڑھنے کا شوق تو بہت ہے مگر ان سے پالا پہلی بار پڑا۔ جس محنت سے یہ تحریریں لکھی گئیں ان رائٹرز کو سلام پیش کرتا ہوں۔ نقش خطا، معراج صاحب میرے خیال میں یہ کرن نہیں جانتا کہ جیسا کیا ایک بے رغبت کا تاج حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتیں۔ لہٰذا اس پر تبصرہ بے کار ہے۔ کمی الف لیلیٰ اور عنبر مناسب تحریریں تھیں۔ تباہی کی دیوی پڑھ کر مجھے اختر عباس کا لکھا ہوا کالم در دل پہ دستک یاد آیا۔ چند جملے لکھتے ہیں۔ ”لڑکیاں ماں کی انگلی کی پوروں میں ہوتی ہیں۔ ان کی چال ڈھال اٹھنے بیٹھنے، اوڑھنے پہننے میں ذرا سا فرق آئے تو ماں کے دل پر لگے اٹھنے پر تو راسکنل آ جاتا ہے۔“ اس لیے تباہی کی دیوی کا لقب عورت کو زیب نہیں دیتا۔ معمولی چوک، کہرے کا قہر، تلاش منزل اور غفلت کی سزا یہ تحریریں نہیں بلکہ ہمارے لیے اور عقل والوں کے لیے عبرت کا سامان تھیں۔“

☆ وحید ریاست بھٹی کلر سیداں راولپنڈی سے فرماتے ہیں۔ ”ماہ ستمبر کا شمارہ جو کہ خطا نمبر تھا۔ 31 اگست کو موصول ہوا۔ بڑی شدت و بے تابی سے کچھ انتظار تھے۔ بے تاب تمنا دل کو جب سکون پذیر ہوتا محسوس کیا تو سب سے پہلے آپ کے پُر فکر اداریہ کو پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ نے چند سطور میں دیگر اقوام عالم سے خوب موازنہ فرمایا کہ ہمارے بعد آزاد ہونے والے ممالک معاشی پاور بن چکے ہیں مگر ہم ہیں کہ اپنے جاتے ہوئے اقتدار کو سہارا دینے کے لیے قومی اسمبلی کا مشترکہ اجلاس تو بلا لیتے ہیں اور آئین اور جمہوریت کے حوالے سے ٹیپو سے کراچی کے تمام زعمائے سیاست عجیب و غریب دلائل دیتے نظر آتے ہیں۔ جمہوریت کی شان میں قصیدہ گوئی بھی نہیں سوچتے کہ ہم جوش خطابت میں اپنے ہی ملک کے عسکری و خفیہ اداروں کے بخیے ادھیڑ رہے ہیں۔ کہیں ہم نادانستگی میں اپنے پڑوسی کی خوشی کا سامان تو نہیں کر رہے؟ مقدس ایوان میں کچھ چہرے ایسے بھی ہیں جو ابھی چند سال قبل تک ایک ڈکٹیٹر کے دست راست بنے ہوئے تھے۔ پھر پانچ سالہ زرداری دور کے لیے بھی باعث تقویت تھے اور اب قوم کے وسیع تر مفاد میں آئین اور جمہوریت کی بقا کا درس دے رہے ہیں۔ کتنا ہی اچھا ہوتا جو یہ عوامی نمائندے عوام کے دیرینہ مسائل پر گفتگو کرتے۔ کالا باغ ڈیم یا اس کا متبادل حل پیش کرتے۔ بڑھتی مہنگائی کی روک تھام کے لیے بات کرتے مگر انہیں ان عوامی مسائل کا کیا ادراک وہ تو اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے اقتدار کی حفاظت کے متعلق ہی سوچتے رہتے ہیں۔ ایسے حکمرانوں کے متعلق مشہور شاعر ساحر لدھیانوی نے کہا تھا: ”یہ دین کے تاجر، یہ وطن بیچنے والے، انسانوں کی لاشوں کے کفن بیچنے والے، یہ محلوں میں بیٹھے ہوئے قاتل یہ لٹیرے، کانٹوں کے عوض روح چمن بیچنے والے۔“ اس کے بعد آگے بڑھے تو ایک کی زیست نامہ میں بہرام مقام عرف بہرام بہروانی کے متعلق پہلی دفعہ آشنائی ہوئی۔ معراج انکل جنوری 1991ء سے لے کر ستمبر 2014ء تک 250 سے زائد شمارے آپ شائع کر چکے ہیں۔ اگر ایک کی سرگزشت کے مشاہیر کے حالات زندگی ہی کتاب بند کر دیے جائیں تو 300 صفحات کی کتاب بن جائے گی۔ اگر آپ اس کو شائع کر دیں تو ایک بڑی خدمت کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔ شہر خیال کی جانب عازم سفر ہوئے تو سب سے پہلے تو کہانی

بنیادوں پر اپنے نام پر نظر پڑی۔ کلمہ شکر بجا لائے کہ ہم معمولی سے لوگوں کی آپ ضرورت سے زیادہ قدر فرما رہے ہیں۔ میں محمد عمران جونانی، انور عباس شاہ، احمد خان توحیدی و دیگر احباب کا ممنون احسان ہوں جو ہمارے ٹوٹے پھوٹے حروف کی قیمت کچھ زیادہ ہی لگا دیتے ہیں۔ سب احباب سلامت رہیں۔ محترمی طاہر الدین بیگ کو کرسی صدارت پر متمکن ہونے پر ہم دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ انجم فاروق ساحلی صاحب تو ہمیشہ میرے ساتھ ہی تشریف فرما ہوتے ہیں۔ رانا محمد شاہد کو تعلیم مکمل ہونے پر مبارک باد عرض کرتا ہوں۔ معراج انکل! آپ سے ایک گزارش کرنا چاہوں گا کہ آج کل سیاست کا ماحول بہت گرم ہے ہم اس کشیدہ ماحول کے پیش نظر آپ سے التماس کریں گے کہ کسی سیاستدان کی سرگزشت ہی شائع کر دیں۔ جناب عمران خان کی سرگزشت تو چند سال پہلے ہم پڑھ چکے ہیں اگر جناب الطاف حسین کی جدوجہد کی کہانی بھی نذر قارئین سرگزشت فرما دیں تو نوازش ہوگی۔ میں جناب نواز شریف، مولانا فضل الرحمٰن، ڈاکٹر طاہر القادری، محمود خان اچکزئی، آصف علی زرداری، چوہدری شجاعت، شیخ رشید وغیرہ کے حوالے سے گزارش کروں گا کہ ان کے متعلق بھی لکھا جائے۔"

☆ محمد شکیل حیدر رواصو، جھنگ سے لکھتے ہیں۔ "بالآخر سرگزشت کے خطا نمبر نے اپنی جھلک دکھا ہی دی۔ صرف تین دن میں ہی ہر مصروفیت کو بالائے طاق رکھ کر سارا سرگزشت پڑھ ڈالا۔ سرورق لاجواب تھا۔ اداریے میں انکل معراج باقی ممالک کی ترقی اور وطن عزیز کی ترقی معکوس کا ذکر کرتے ہوئے نظر آئے۔ مختصر سرگزشت میں بہرام بھروانی کی سرگزشت اچھی تھی۔ شہر خیال میں مسند صدارت طاہر الدین بیگ صاحب کے حصے میں آئی، بھائی مبارک ہو۔ باقی خطوط بھی معیاری تھے۔ خطائے اوّل ایک شاہکار تحریر تھی۔ باقی سب خطائیں بھی معلومات سے بھرپور تھیں۔ حکمرانوں کی خطائیں، غلط فیصلے، تلاش منزل اور خطائے محبت میں تباہی کی دیوی سب انتہائی شاہکار اور معلومات سے بھرپور تحریریں تھیں۔ بھارتی حسینہ کی خطا بھی اچھی لگی اگرچہ مختصر تھی۔ لکی الف لیلہ میں مزاحیہ اداکاروں پر مختصر لکھا گیا اس ضمن میں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ میں نے آپ سے کچھ فرمائش بھی کر رکھی ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے اگر یہ بات حیرت انگیز ہے تو بتا دیتا ہوں کہ میں نے اپنے فلمی کیریئر (فلمیں دیکھنے کا آغاز) لڑکپن میں ایسی دو اداکاروں غلام محی الدین کی آخری جنگ اور محسن چکرورتی کی فلم کا بڑھاوا دے کیا تھا اس لیے ان کے حالات زندگی اور فلموگرافی کے بارے میں جاننے کا تجسس ہے۔ آذری صاحب قلم کیسے تنی ہے؟ اس پر بھی تفصیل سے لکھیں۔ سچ بیانیوں میں انجام خطا اور خطا کاریاں نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ باقی سب سچ بیانیاں بھی اچھی تھیں مجموعی طور پر خطا نمبر ایک شاہکار نمبر تھا۔ اتنی عمدہ تخلیق پر میں ادارے کے ہر کارکن کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ایک تجویز ہے کہ آئندہ اگر خاص نمبر نکالا جائے تو صفحات کی تعداد بھی بڑھا دی جائے اور قیمت بھی بڑھا دی جائے۔ (تجویز نوٹ کر لی) سال میں ایک بار زیادہ قیمت ادا کرنا قاری کے لیے مسئلہ نہیں بنے گا اور اب ان احباب کا خاص طور پر شکریہ جنہوں نے مجھے شہر خیال میں پہلی دفعہ آنے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید کہا ان میں احمد خان توحیدی، وحید ریاست بھٹی، منشی محمد عزیز سمے، سید انور عباس شاہ اور خاص طور پر عمران جونانی جنہوں نے نہ صرف مجھے خوش آمدید کہا بلکہ ہندوستان کے سفرنامے کے سلسلے میں میری بھرپور رہنمائی کی اور دو کتابوں کے نام بھی بتائے۔"

☆ رانا محمد شاہد نے بورے والا سے لکھا ہے۔ "سرگزشت کے خصوصی شماروں میں خطا نمبر ایک خاص اضافہ ہے۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ بہت حساس موضوع پر تھا۔ عرض یہ ہے کہ ہماری سیاست اور سیاستدان ابھی اتنے میچور نہیں ہوئے کہ ملکی معیشت کو استحکام دے سکیں۔ جرمنی، جاپان، ملائیشیا اور فلپائن جیسے ممالک ترقی کی دوڑ میں ہم سے آگے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کا جمہوری سسٹم بہت مضبوط اور اخلاقی اقدار بہت اعلیٰ ہیں۔ ہماری سیاست تو رضیہ غنڈوں میں پھنس گئی کے مصداق چل رہی ہے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کیا یہی وہ جمہوریت ہے جس کے لیے قربانیاں دی جاتی ہیں۔ اپنے اپنے مفادات کو تحفظ دینے کا نام ہمارے سیاستدانوں نے جمہوریت رکھ دیا ہے اور جہاں مفادات کی بندر بانٹ جاری ہو وہاں نہ تو معیشت ترقی کرتی ہے اور نہ ہی مصائب کم ہوتے ہیں۔ شہر خیال میں سلطان مسعود کا تبصرہ بھی حقیقت کو اجاگر کرتا نظر آیا۔ انہوں نے جن دو واقعات کا ذکر کیا وہ مغرب کے مضبوط سسٹم کی روشن دلیل ہیں۔ وہاں تو جانوروں تک سے برا سلوک کرنے پر جرمانے کے ساتھ ساتھ سزا بھی ہوتی ہے۔ جب کہ یہاں بچوں، بچیوں کو جب انصاف نہیں ملتا تو آخری حل ان کے پاس خودکشی ہوتا ہے اور ایسا کمزور اور بے حس معاشروں میں ہوتا ہے بے حس اس لیے کہ لوگ صرف اپنے اپنے انصاف کے لیے چیختے ہیں جب کہ اجتماعی انصاف کے لیے جدوجہد نہیں ہوتی۔ بے حسی اور بے انصافی اس نظام اور معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ احمد خان توحیدی ہر سال تحریر میں ایک نشان حیدر پر تفصیلی تحریر ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ سید عظیم شاہ بخاری آپ کی یہ بات دل کو لگی کہ ہم کسی دانشور کی بات کو تو ریفرنس کے طور پر دیتے ہیں جب کہ اکثر ان دانشوروں کی باتوں کی بنیاد قرآن و حدیث سے لی گئی ہوتی ہے۔ اس المناک صورت حال کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے قرآن و حدیث کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کی بجائے مغرب کے دانشوروں کو علم کا محور بنا لیا۔ سدرہ بانو ناگوری! یہ سچ ہے جیسا آپ نے لکھا کہ ہم اسرائیل کے فلسطین پر مظالم کے حوالے سے بے بس ہیں مگر ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ ان اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیں جو ہمارے اختیار میں ہیں۔ محمد عمران جونانی! تجویز کی پسندیدگی کا شکریہ۔ پی ٹی وی ڈراموں خواجہ اینڈ سنز اور شب ریگ کا ذکر کرکے آپ نے کیا دور یاد کرا دیا۔ خواجہ اینڈ سنز میں علی اعجاز اور شب ریگ میں عرفان ہاشمی کی اداکاری کی وجہ سے آج بھی یاد ہے۔ اعجاز حسین سجاد! کوریئر والوں کا حال بھی کچھ اچھا نہیں۔ سید انور عباس کا آرٹیکل حافظ احمد رشدی کے بارے میں تھا۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔ مختصر یہ کہ خطا نمبر کی تمام تحریریں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ معلوماتی اور انفرادیت کی حامل۔ تحریریں جو دستاویز کا درجہ رکھتی ہیں۔ سب سے اہم بات کہ آپ نے ہر شعبے کی ایک

ایک خطا وہاں کر کے اس نمبر کو یادگار بنا دیا۔ (بہت شکریہ۔ ہماری کوشش تھی کہ ہر شعبے کی صرف ایک خطا کار منتخب کر لیا جائے)۔''

☆ **عظمیٰ شکور** نے سرگودھا سے لکھا ہے۔ ''ستمبر کہ جب موسم سے گرمی کا احساس قدرے کم ہو جاتا ہے ایسے میں سرگزشت کی آمد دل کو مسرور کر گئی۔ خطا نمبر پڑھنے کے لیے معراج رسول کے تاثرات پڑھے۔ پھر شہر خیال میں داخل ہوئے۔ منشی عزیز اور سید انور عباس شاہ کے خطوط میں ہم راز کر گئے۔ بھئی واہ اچھا لگا۔ بلکہ بہت اچھا لگا۔ تو صاحبو! ہم لکھو ذاتی کہانی اور بہت عرصے سے پوسٹ بھی کر آئے اور انگلیوں پر دن گننے لگے کہ جیسے ہی مہینا ختم ہو تو بھاگ کر لے آئیں سرگزشت۔ یقیناً انتا کر لگ کے رہے گی ہماری کہانی (ضرور لگے گی تھوڑا صبر کر لیں)۔ اب بڑھتے ہیں سرگزشت میں شائع ہونے والی کہانیوں کی طرف۔ جان محمد کی لکھی انجام خطا پڑھی بہت خوب تحریر تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو ایسا لگا کہ گویا ہم سمندر کے پانی میں کھڑے ہیں۔ زبردست تحریر تھی۔ تلاش منزل ابن کبیر کی یہ اسٹوری ٹی وی پر آ چکی ہے۔ سرواژ تھا ان کا نام۔ (سچا واقعہ ہے تو کیا امریکا، انگلینڈ والے اس پر قلم نہیں چلائیں گے؟ نائن الیون کا ستمبری ظلم بھی ٹی وی اور کئی کتابیں بھی لکھی گئیں)۔ عالیہ شبیر احمد کی سازش اچھی کاوش تھی۔ ادبی تحریروں کے باعث ہی سرگزشت ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ بہتر تفریح بھی فراہم کرتا ہے۔''

☆ **قیصر عباس خان کا شوق ذمہ بھکر سے**۔ ''اداریے میں انکل جی نے صرف ایک صنعت کی تباہی کا ذکر کیا ہے جب کہ پورے ملک کے ادارے بد منتظمین کا رونا نے وغیرہ تباہی پر ہیں۔ ہمارے کا سارا آوا بگڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ہمارے ملک کی حفاظت کرے اور ترقی دے، آمین۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر اور خان صاحب بہت اچھے طریقے سے ملک کو چلائیں گے اور ان شاء اللہ ترقی بھی ہوگی۔ ترقی پر کام شروع ہوگا۔ دعا ہے خداوند کریم سے جو ہوا اچھا ہو۔ اس مرتبہ خطا نمبر کمال کا اور لاجواب تھا۔ بالکل پچھلے خاص نمبروں کی طرح۔ سرگزشت ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔ بہت بہت مبارک ہو (شکریہ کہ آپ نے حوصلہ افزائی کی) ایسی خطائیں، تاریخ میں ہوئیں ہیں جن کا پتا نہیں تھا اور جو چھپی ہوئی تھیں۔ میں کیا کہوں سب لاجواب تھیں۔ انجام خطا محبت ایک لازوال جذبہ ہے۔ موت کو قریب سے دیکھ کر پھر بھی محبت کو ترجیح دی۔ یہ جذبہ ہم میں نہیں ہے، افسوس ہے۔ بے نام خطا، انجام خطا کے برعکس یہ جذباتی فیصلہ تھا۔ جس کو اب بھی اچھے طریقے سے حل کیا جا سکتا ہے ورنہ ڈیلے ہو جائے گی۔ یہ لازمی ہوگا۔ سازش، عالیہ تبسم اور شریف کی تھوڑی سی آزمائش تو آئی تھی۔ خطا نے بڑے رنگ دکھائے، ایک بہت پیارا سبق ملتا ہے۔ کہا گیا روحانیت سے مجرم راب بھی خطا کار ہوں۔ مجھے شیخ صاحب سے ہمدردی کے ساتھ اعتراض ہے۔ آپ کو اللہ نے کیا نہیں دیا۔ یتیم ہوئے، بے سہارا ہوئے تو سہارا ملا۔ پہلے دن سے آپ کو اللہ نے بیس روپے کی صورت میں اور دوسرا اسکول کے شوق نے۔ رحمت دی، زندگی کو آسان کیا چھوٹی سی عمر میں اور آخر میں آپ پر آزمائش کیا آئی آپ نے جان ہی لے لی۔ جو کہا تھا کہ میں زندہ رہا تو آپ کے واسطے برا ہوگا۔ وہی کیا آپ نے اور ایک معذور لڑکی سے شادی اور ضمیر کی ملامت اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے یہ جرم خوب سوچ کر کیا تھا کیوں کہ اتنے بڑے مکینک کی یہ خطا نہیں سوچی سمجھی سازش ہے۔ ہماری دعا ہے اللہ سے آپ کو سکون ملے، آمین۔ طاہر بیگ جاندار تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر، بہت مبارک۔ باقی تبصرے جو پسند آئے سلطان مسعود، توحیدی صاحب، وحید بھٹی، محمد عمران جونانی، حاجی اعجاز، درانا شاہد، منشی عزیز اور بھکر کے پیارے دوست سید انور عباس شاہ کافی اچھے تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ رانا شاہد کو بہت مبارک باد اور ساتھ وقت دینے کی اپیل ہے۔ فائزہ مسعود بانو ناگوری اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں لیکن ڈاکٹر فرزانہ حسین صاحبہ اور ڈاکٹر روبینہ تبسم صاحبہ نہیں تھیں اور سب سے زیادہ افسوس کو آیا طاہرہ گلزار پھر بلیک لسٹ تھیں تاخیر میں نام پڑھ کے بہت افسوس ہوا۔ پتا نہیں ڈاک خانے والے مخالف ہیں یا مصروفیت کی وجہ سے لیٹ لکھتی ہیں بس ہماری دعا ہے خیریت سے ہوں اور اگلے ماہ میں حاضر ہوں۔ ڈاکٹر فرزانہ حسین صاحبہ دو ماہ سے لاپتا ہیں خدا خیر کرے۔ اور تبسم صاحبہ خیریت سے ہوں ساحل ڈی آئی خان والے بہت عرصے سے حاضر نہیں ہو رہے؟ اللہ کرے خیریت سے ہوں۔''

☆ **بشریٰ افضل کا اظہار بہاولپور سے**۔ ''سرگزشت 29 اگست کو ملا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو زاہد دولت کا تبصرہ سرے سے ہی غائب تھا۔ روٹی کی نوکری نے نکلوا دیا یا ڈاک کی بے پروائی کی نذر ہو گیا۔ افسوس کرنے تو آگے بڑھے۔ طاہر الدین بیگ کو کرسیِ صدارت پر بیٹھے باد ہو بیسے اس کرسی کے لیے لوگ کتنے جتن کرتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کو ہی لے لیں یہ تو حد ہو گئی۔ طاہر الدین بیگ مبارک ہو۔ وحید ریاست بھٹی، محمد عمران جونانی، قیصر عباس، سب نے ہمیں دعاؤں میں یاد رکھا۔ کالا جادو واقعی خطرناک ہے لیکن خدا سے بڑا تو کوئی نہیں ہوتا اگر ایک بندے کو زچ کر دیا جائے اور وہ بے بس ہو جائے اس کو چاہیے کہ خدا کی ڈوری پکڑ لے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا جن لوگوں نے مجھے نشانہ مشق بنایا خود ہی اس گڑھے میں گر گئے۔ یہ دوسرا واقعہ ہے میرے ساتھ جن جن لوگوں نے زیادتیاں کیں خود ہی اس میں گرے۔ خدا کی شان ہے دل دکھتا ہے ان کو اس حال میں دیکھ کر خدا ان کو معاف کر دے، آمین۔ میں نے معاف کر دیا ہے۔ خدا نے مجھے دشمنوں کے ہر وار سے بچایا۔ آپ لوگوں نے دعاؤں میں یاد رکھا سب کا شکریہ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ احمد خان توحیدی یاد رکھنے کا شکریہ۔ سلطان مسعود ہمارے شہر کے باسی تبصرہ اچھا تھا۔ جو واقعات انہوں نے بتائے اگر ہماری حکومت بھی اسی طرح عمل درآمد کرے تو کسی کی مجال نہیں کہ ایسا قدم اٹھائے۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

طاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔ محمد شایان سعید، شیخوپورہ۔ امریز احمد، کوٹ ادو۔ شازیہ جلیبی۔ ستار حسن، لاہور۔ کاشف اسماعیل، منڈی بہاؤالدین۔ وقار حسن، جہلم۔ اشتیاق الحسن، ملتان۔ مذہب سائیں، جیون آباد۔ ذوالفقار علوی، کراچی۔

ڈاکٹر ساجدہ امجد

جب دل پر لگا قفل ٹوٹتا ہے اور ایمان کی روشنی دل و دماغ کو منور کرتی ہے تو کفر کا قلعہ زمیں بوس ہو جاتا ہے۔ تاریخ میں ایسے کئی نام ہیں جن کی زندگی کفر و الحاد اور گناہوں سے بھری تھی مگر جب طیبہ سے نور ہویدا ہوا تو سیاہ دل بھی منور ہو گئے۔ حضرت ابو ذر غفاری جو انتہائی شقی القلب ڈاکو تھے جن کا قبیلہ صرف ڈاکا زنی پر پلتا تھا ان کی نظر حضور اکرمؐ کے چہرۂ منور پر پڑی تو موم سے بھی نرم دل بن گئے۔ جمع شدہ زر و مال لٹا کر درِ حبیبِ خدا کے گدا بن گئے۔ ایسے صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد نظر آتی ہے۔ ان میں حضرت مابہ کا مقام سب سے بلند ہے کہ صحابہ کرام میں ان کی شخصیت سب سے جدا ہے۔ انہیں حضور اکرم نے اپنے اہل بیت میں شامل ہونے کا مقام عطا کیا۔ اللہ اللہ ایسا مرتبہ حاصل کرنے کی خواہش کسے نہ ہو گی مگر کفر کی گود میں پل کر جوان ہونے والے حضرت مابہ کو ہی یہ مقام ملا اور وہ عجمی ہوتے ہوئے بھی عربوں پر فضیلت پا گئے۔

ایمان کی تلاش میں مارا مارا پھرنے والے ایک نوجوان کا تذکرہ

نگہبانی کراپنے بڑے بیٹے سے تو کوئی اُمید ہی نہیں تھی کہ وہ سدا کا بے پروا تھا۔ اس نے چھوٹے بیٹے کو آواز دی جسے وہ عزیز بھی رکھتا تھا اور زرتشت کا وارث بھی سمجھتا تھا۔ اس کی ذہانت کا بھی قائل تھا۔

"جی پدرِ بزرگوار! آپ نے مجھے بلایا۔"

"ہاں مابہ میں نے تمہیں آواز دی ہے۔"

"کہیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"مابہ مجھے تمہارے بڑے بھائی مہدی فرورح سے تو کوئی اُمید ہے ہی نہیں کہ وہ تو سدا کا لاابالی ہے۔ میری امیدوں کا مرکز صرف تم ہی ہو۔"

"زرتشت کی قسم! میں آپ کی امیدوں پر پورا اتروں گا۔"

"میں اپنی مصروفیت کے سبب کئی روز سے جاگیروں پر نہیں جا سکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم وہاں چلے جاؤ اور دیکھ بھال کر آؤ۔ یوں بھی میں سمجھتا ہوں میرے بعد ان جاگیروں کی دیکھ بھال تمہی کو کرنی ہو گی، اچھا ہے تجربہ ہو جائے گا۔"

"آپ کے حکم کے مطابق میں ابھی جاتا ہوں۔"

"جانِ پدر، تمام کام نمٹا کر جلدی آ جانا۔ تمہاری تاخیر مجھے پریشان کرے گی۔ چاہو تو کسی ملازم کو ساتھ لے جاؤ۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ قصبہ "جی" کے سردار ہیں اور میں آپ کا بیٹا ہوں پوری بستی ہماری ملازم ہے۔ مجھے کس سے خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"جاؤ بیٹا، جلدی آنا۔"

مابہ والد کے حکم کے مطابق جاگیر کی طرف روانہ ہوا، بستی سے نکل کر جب وہ جاگیر کے قریب پہنچنے ہی والا تھا کہ اس کا گزر عیسائیوں کے ایک گرجے سے ہوا۔ وہ تجسس کے تحت اس عمارت کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے کانوں میں کچھ آوازیں آئیں۔ اسے مزید تجسس ہوا۔ وہ عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں کچھ لوگ عبادت میں مشغول تھے۔ یہ طریقۂ عبادت اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑے ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ لوگ کبھی کھڑے ہو جاتے تھے کبھی دو زانوں بیٹھ جاتے تھے۔

مابہ مجوسیوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے آتش کدوں میں اپنی عبادت بھی دیکھی تھی۔ لوگ آگ کے

کر و بیٹھ جاتے تھے اور قدیم اور مقامی زبان میں کچھ کلمات ادا کرتے تھے جو اس کی سمجھ میں کبھی نہ آئے جبکہ یہ لوگ کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر عبادت کر رہے تھے۔ عبادت کے بعد جب وہ لوگ دعا کرنے لگے تو ''خداوند'' کا لفظ بار بار ان کی زبانوں پر آرہا تھا۔

اسے یہ طریقہ عبادت اچھی لگی اور وہ وہیں بیٹھا رہا۔ جب وہ لوگ عبادت سے فارغ ہو لیے اور ایک لڑکے کو بیٹھا دیکھا تو سخت حیران ہوئے۔

''اے لڑکے تم کون ہو اور یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

''میں قصبہ جی کا رہنے والا ہوں۔ اپنے والد کی جاگیر کی دیکھ بھال کے لیے نکلا تھا کہ یہاں آگیا۔''

''یہاں کیوں آگئے۔''

''کچھ آوازوں نے مجھے متوجہ کیا۔ دیکھا تو آپ لوگ عبادت پڑھ رہے تھے۔ یہ مجھے اچھی لگی۔''

''کیا مطلب! کیا تم عبادت نہیں کرتے؟''

''ہماری عبادت آپ لوگوں سے مختلف ہے۔ میرے والد مجوسی ہیں اور میں بھی۔''

''اوہ تو یہ بات ہے۔ کیا تمہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ تم آگ کی پرستش کرو جو تمہیں نقصان تو پہنچا سکتی ہے مگر فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔''

''پتہ نہیں لیکن ہمیں تو یہی سکھایا گیا ہے۔''

''کیا تمہیں یہ اچھا نہیں لگے گا کہ تم اس کی عبادت کرو جس نے نہ صرف آگ کو بنایا بلکہ دنیا میں جو کچھ ہے سب اسی نے بنایا ہے۔''

''آپ لوگ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے تو آپ کی طرح عبادت کرتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔''

''ہم مسیحی ہیں یعنی یسوع مسیح کو پیغمبر ماننے والے اور اس خداوند کو ماننے والے جس نے یسوع کو پیدا کیا۔ ہم چیزوں کی نہیں خدا کی پرستش کرتے ہیں کہ ہمارے نبی نے ہمیں یہی بتایا ہے۔''

''آپ کی باتیں تو بڑی دلچسپ ہیں۔ مجھے کچھ اور بتایئے۔''

''اگر تم یہاں آتے رہے تو بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ تم گھر جاؤ گھر پر تمہارا انتظار ہو رہا ہوگا۔ اگر تمہارے گھر والوں کو شک ہو گیا تو وہ تمہیں یہاں آنے بھی نہیں دیں گے۔''

وہ باتوں باتوں میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ کس مقصد سے گھر سے نکلا تھا۔ سورج زرد ہونے کے قریب تھا۔ وہ گرجا سے نکلا تو سخت پریشان ہو گیا۔ جاگیر تک پہنچتے پہنچتے تو اندھیرا پھیل جائے گا اور پھر گھر بھی جانا ہوگا۔ اس نے جاگیر کا دورہ ملتوی کر دیا۔ اس نے سوچا والد کو کیا پتا چلے گا۔ میں ان سے کہہ دوں گا کہ جاگیر سے ہو آیا۔

اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اب اتنی دیر ہو گئی ہے کہ اس کے والد نے اس کی تلاش میں لوگوں کو دوڑا دیا ہوگا۔ ہوا بھی یہی تھا۔ اس کے والد اس سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ذرا سی تاخیر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جب وہ گھر نہیں پہنچا تو انہوں نے ایک ملازم کو جاگیر کی طرف بھیجا۔ اس نے آکر یہ خبر دی کہ مالک تو جاگیر پر گیا ہی نہیں۔ راستے ہی میں کہیں گم ہو گیا۔

یہ خبر ہی ایسی تھی کہ تحسانی کے ہوش اڑ گئے۔ ابا تو نہیں کہ اسے کوئی درندہ اٹھا کر لے گیا۔ وہ گھبرا کر اپنے محل نما مکان سے باہر نکل آئے۔ کبھی مکان کے اندر چلے جاتے تھے کبھی باہر آجاتے تھے۔ عجیب اضطراب کا عالم تھا اتنے میں شور مچا کہ مابہ واپس آگیا ہے۔ وہ بھاگتے ہوئے گئے اور مابہ کو چمٹا کر بے اختیار اس کا منہ چومنے لگے۔

''جان پدر، تو کہاں چلا گیا تھا۔''

''وہیں جہاں آپ نے بھیجا تھا۔ وہاں کام زیادہ تھا اس لیے دیر ہو گئی۔''

''مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ تم جاگیر پر گئے ہی نہیں۔''

''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔''

''میرے وفادار ملازم نے جس کو میں نے تمہاری تلاش میں تمہارے پیچھے بھیجا تھا۔ سچ بتاؤ تم کہاں گئے تھے اور کہاں اتنی دیر لگا دی۔''

جب چوری کھل ہی گئی تو اسے بتانا پڑا۔

''میں جاگیر کی طرف جا رہا تھا کہ ایک عمارت سے کچھ لوگوں کی آوازیں کانوں میں آئیں۔ اس عمارت کے اندر جا کر دیکھا۔ وہ لوگ اپنی عبادت کر رہے تھے۔ مجھے ان کی عبادت بہت اچھی لگی۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا اور ان کے مذہب کی باتیں پوچھتا رہا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہیں دیر ہو گئی۔ جاگیر پر جاتا تو اور دیر ہو جاتی لہٰذا سیدھا گھر واپس آگیا۔''

''جان پدر! یہ تو نے کیا دیکھ لیا اور کیا چیز تجھے اچھی لگی۔ جو کچھ آیا اس میں قطعاً کوئی بھلائی نہیں۔ تیرا اپنا اور

تیرے باپ دادا کا مذہب اس سے کہیں بہتر ہے۔ آیندہ وہاں مت جانا۔"

ماہ نے اس وقت بحث کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن دل میں سوچتا رہا کہ وہ مذہب ہمارے مذہب سے کہیں بہتر ہے جس کا وہ مشاہدہ کر آیا ہے۔ اس نے دل میں سوچ لیا کہ جب بھی موقع ملا وہ وہاں جائے گا ضرور۔

اس واقعے کے بعد تھسانی کو اپنے بیٹے کی طرف سے فکر لاحق ہوگئی تھی۔ کہیں وہ عیسائیوں کی صحبت میں رہ کر عیسائی نہ بن جائے۔

ایرانیوں اور رومیوں میں صدیوں سے دشمنی چلی آرہی تھی۔ اس لیے کسی ایرانی کا عیسائیت قبول کرنا ایرانیوں کے نزدیک ناقابلِ برداشت جرم تھا۔

تھسانی نے اس دن کے بعد سے اپنی بے پناہ محبت کے باوجود ماہ پر سختی شروع کردی۔ باہر نکلنے پر مکمل پابندی عائد کردی اور کڑی نگرانی کرنے لگا۔ صرف مکتب جانے کی اجازت تھی اور وہ بھی اس طرح کہ دو طالب علموں کے ذمے یہ کام لگا دیا کہ وہ ماہ کو اپنے ساتھ مکتب لے جائیں اور چھٹی ہونے کے بعد واپس گھر چھوڑ جائیں۔

تھسانی پابندیاں عائد کر رہا تھا لیکن قدرت راستے کھولتی جارہی تھی۔ یہ دونوں طالب علم جو ذرا بڑی عمر کے تھے اور جنہیں ماہ کا نگراں بنایا تھا ایک نصرانی کے گھر جایا کرتے تھے اس سے عیسائی مذہب کی باتیں پوچھا کرتے تھے۔ اب جو ماہ ان کے ساتھ ہولیا تو ان لڑکوں کو فکر ہوئی کہ اب وہ اس نصرانی کے گھر کیسے جاسکیں گے۔ اگر گئے تو راز کھل جائے گا۔ اس نصرانی نے پہلے ہی ہدایت کردی تھی کہ کسی کو تمہارے یہاں آنے کا علم نہ ہو۔

وہ لڑکے چند دن تو خاموش رہے لیکن پھر ماہ کو ہم خیال بنانے کی ٹھان لی۔

"ماہ ہم اسکول کے بعد ایک اور استاد کے پاس جاتے ہیں جو ہمیں تعلیم دیتا ہے۔ جب سے تم ہمارے ساتھ آنے جانے لگے ہو ہمارا استاد کے گھر جانا چھوٹ گیا ہے۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں۔"

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جایا کرو۔"

"تمہیں دیر ہوجائے گی تو تمہارے والد ہم سے باز پرس کریں گے۔"

"تمہارے گھر والے تم سے نہیں پوچھتے؟"

"ہم اس استاد کے گھر روز نہیں جاتے دوسرے تیسرے دن جاتے ہیں۔ گھر والوں سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں سبق یاد نہیں تھا اس لیے اسکول میں دیر ہوگئی۔"

"میں بھی یہی کہہ دوں گا۔"

"نہیں بھائی، تمہارے والد گاؤں کے سردار ہیں۔ فوراً اسکول پہنچ جائیں گے۔"

"نہیں اگر انہیں فرصت ہوتی تو مجھے خود اسکول چھوڑنے آیا کرتے۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلا کرو لیکن ایک شرط ہے تم اس کا کسی سے ذکر نہیں کروگے۔"

ماہ نے ان کی شرط مان لی اور ایک روز جب وہ دونوں لڑکے عیسائی پادری کے گھر جانے لگے تو اسے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ پادری اس وقت عبادت کر رہا تھا۔ ماہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ ویسی ہی عبادت تھی جو وہ گرجا میں دیکھ چکا تھا۔ اس کا مطلب ہے یہ عیسائی ہیں۔ ہماری طرح آتش پرست نہیں۔ اسے بڑی خوشی ہوئی کہ گرجا جانے سے بچ گیا۔ اس مذہب کے بارے میں ضروری باتیں ان سے معلوم ہوجایا کریں گی۔

وہ پادری جب عبادت سے فارغ ہوا اور اس کی نظر ماہ پر پڑی تو وہ ان دونوں لڑکوں پر سخت برہم ہوا۔

"جب میں نے تمہیں کسی کو ساتھ لانے سے منع کیا تھا تو یہ کس کو اپنے ساتھ لے آئے۔"

"یہ ہمارا دوست ہے۔ ہمارے ساتھ اسکول آتا جاتا ہے۔ ہم نے ان سے کہہ دیا ہے یہ کسی سے نہیں کہے گا کہ یہ یہاں آیا تھا۔"

"دو سے تین ہوں تو راز کھل ہی جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے اب میں اس بستی میں زیادہ دن رہنے والا نہیں۔ کاش! تم اسے یہاں لانے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیتے۔"

اب ضروری ہوگیا تھا کہ ماہ ان سے معذرت کرے۔

"میں ان کی طرف سے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ انہیں واقعی آپ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ کسی کے گھر میں اجازت کے بغیر داخل نہیں ہونے لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا راز کسی پر نہیں کھلے گا۔"

"ان دونوں نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتایا ہے۔"

"انہوں نے کچھ نہیں بتایا لیکن میں نے آپ کو عبادت کرتے ہوئے دیکھ کر اندازہ لگالیا کہ آپ یسوع مسیح کی

تعلیمات پر عمل کرنے والوں میں سے ہیں۔ ہمارا دین آپ سے پہلے کا ہے لیکن آپ کی تعلیمات ہم سے بہتر ہیں۔"

"تم ہماری تعلیمات کے بارے میں کیسے جانتے ہو۔"

"میں ایک گرجا میں گیا تھا۔ وہاں کے پادری نے مجھے کچھ باتیں بتائی تھیں۔ میرا وہاں جانا مشکل ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔"

وہ پادری اس کی دل نشین گفتگو سن کر بے حد متاثر ہوا اور اسے اجازت دے دی کہ وہ بھی کبھی اس کے پاس آسکتا ہے۔ اس کے بعد وہ باقاعدگی سے اس پادری کے پاس جانے لگا۔ پادری اسے انسان کی پیدائش، زمین و آسمان کی تخلیق اور جنت دوزخ کی ماہیت کے بارے میں ایسی دلچسپ باتیں بتانے لگا جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ یہ پادری تثلیث کی بجائے عقیدہ توحید کا قائل تھا یعنی عیسائیوں کے اس فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے۔

ماہ بہ کی عمر اس وقت ایسی تو نہیں تھی کہ گہری باتوں کو سمجھ سکتا لیکن توحید کا سبق اسے اچھی طرح یاد ہوگیا۔ اس کی چھوٹی سی عقل اس بات سے متاثر ہوئی کہ خدا کو ایک مانا جائے۔

وہ پابندی سے اسکول بھی جا رہا تھا اور اس پادری کے گھر بھی۔

اس کے والد نے اسے مصروف رکھنے کے لیے حکم دیا کہ وہ اسکول سے آنے کے بعد آتش کدے کی خبر گیری میں لگ جایا کرے۔ دوسرے لفظوں میں اسے آتش کدے کا خادم بنا دیا۔

اب وہ تین راستوں پر ایک ساتھ چل رہا تھا۔ اسکول میں فارسی کا درس لے رہا تھا جس میں وہ ایران کی قدیم تاریخ اور جنگوں کے احوال پڑھتا تھا۔ پادری کے گھر جا کر عیسائیت کی تعلیمات سے واقف ہوتا تھا اور آتش کدے میں آ کر آگ کی پرستش بے دلی سے سہی مگر کرتا تھا۔ تینوں راستے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

آتش کدے میں جو بوڑھے پجاری تھے وہ ماہ بہ کی کیفیت دیکھ کر اور بعض اوقات اس کے عجیب و غریب سوالات سن کر پریشان ہوجاتے تھے۔

"کیا ہمارے باپ دادا اور ان کے باپ دادا یہی لباس پہنتے تھے جو ہم پہنتے ہیں؟" ایک دن اس نے پوچھا۔

"نہیں ان کے لباس مختلف تھے۔ کیا تم نے تصویروں میں نہیں دیکھے۔"

"ہم وہ بھی کپڑے کیوں نہیں پہنتے۔"

"وقت کے ساتھ ساتھ ہماری عقلوں نے ہمیں سکھایا کہ ہم ان کپڑوں میں تبدیلی کریں جو وہ پہن رہے تھے۔ ہمارے کپڑے ان سے بہتر ہیں۔ مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جب ان کے کپڑے پرانے ہوگئے ہیں تو ان کا مذہب کیوں پرانا نہیں ہوا۔ ہم اب تک ان کا مذہب اختیار کیے ہوئے ہیں۔"

"خبردار! تم نے یہ کیسی بات کی۔ مذہب کبھی نہیں بدلتا۔ وہ نور ہی رہتا ہے۔"

"میں نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے۔ مذاہب بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ ہم آگ کو خود روشن کرتے ہیں اور خود ہی اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس میں تو اتنی طاقت بھی نہیں کہ خود روشن ہو جائے۔"

پجاریوں کو اس کی باتوں سے بغاوت کی بو آنے لگی تھی۔ وہ سب یکجا ہو کر ماہ بہ کے باپ کے پاس گئے۔

"تم اپنے بیٹے ماہ بہ پر نظر رکھو۔ وہ بے دین ہوگیا ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"یہ ہوگیا ہے۔ وہ کہتا ہے آگ کی پرستش غلط ہے۔ ہمیں مذہب تبدیل کر لینا چاہیے۔"

"وہ کس مذہب کا قائل ہوا ہے۔"

"یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔ یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔"

"وہ کبھی نہیں بتائے گا۔ ہمیں تو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ آج کل کس کے پاس اٹھ بیٹھ رہا ہے۔"

اس کے والد نے اس سے کچھ نہ پوچھا کہ کہیں وہ ہوشیار نہ ہوجائے۔ بس اتنا کیا کہ اس کی نگرانی پر ایک آدمی کو معمور کردیا۔ اس نے جلد ہی آ کر بتایا کہ ماہ بہ اور اس کے ساتھ کے دو لڑکے اس نصرانی کے پاس جاتے ہیں جو بستی میں نیا نیا آیا ہے اور معبد بنا کر رہنے لگا ہے۔

تخشانی کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ اس نصرانی نے اس کے بیٹے کو بھڑکایا ہے۔ اگر دیر ہوگئی تو دوسرے لڑکے بھی اس پادری کے حلقہ اثر میں آجائیں گے۔ اس سے پہلے کہ ایسا ہو اس پادری کو یہاں سے نکال دینا چاہیے۔

تخشانی نے آتش کدے کے پجاریوں کو ساری بات بتائی اور پھر قصبے کے بااثر لوگوں کو جمع کیا۔ سب نے طے کیا کہ پادری کو بستی سے نکال دیا جائے ورنہ یہ سب کو بے دین کردے گا۔

تخشانی سردار تھا۔ اس کی بات سب مانتے تھے لہٰذا وہ

سب مل کر اس پادری کے پاس پہنچ گئے اور اس پر فرد جرم عائد کر دی۔

"یہ بستی مجوسیوں کی ہے اور تم نصرانی ہو۔ اس کے باوجود ہم نے تمہیں یہاں رہنے دیا تھا لیکن تم تو ہمارے لڑکوں کو بگاڑ رہے ہو لہٰذا سردار کا حکم ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں تو انہیں بھلائی اور نیکی کی باتیں ہی بتاتا ہوں جو ہر مذہب میں ہوتی ہیں۔"

"ہم نے تمہیں بحث کی اجازت نہیں دی ہے۔ حکم سنا دیا اب تم اس پر عمل کرو۔"

پادری اس حکم کے برخلاف کیسے کر سکتا تھا۔ وہ وہاں سے چلا گیا۔

باپ اور اس کے دوستوں کو معلوم ہوا تو انہیں سخت افسوس ہوا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وقت پھر جس طرح گزر رہا تھا اسی طرح گزرنے لگا لیکن اس نصرانی کی باتوں نے دل میں جو ایک شمع روشن کر دی تھی وہ جلتی رہی۔ کائنات اور خالقِ کائنات کے بارے میں وہ غور کرتا رہتا۔ بہت سے سوال سامنے آتے۔ کچھ سوالوں کے جواب اس کے سامنے ہوتے کچھ کے نہ ہوتے۔ وہ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگتا۔ الجھنیں بڑھتی چلی گئیں لیکن اس تلاش و جستجو میں وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مجوسیت روحانی معاملات اور مسائل حیات کے حل میں مکمل رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں اور یہ مقصد یقیناً کوئی الہامی مذہب ہی پورا کر سکتا ہے۔ اس وقت عیسائیت ہی ایک ایسا مذہب تھا جو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا اور اس کے الہامی ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ اسے حقیقت تک پہنچنے کے لیے کسی کامل رہنما کی ضرورت تھی۔ ایک ایسے رہنما کی جو مختلف ادیان کا مطالعہ کر کے یہ بتا سکے کہ بہترین کون سا ہے۔ اگر عیسائیت ہے تو اس کے مکمل اصول و ضوابط کا علم ہونا ضروری ہے۔

اس کے باپ نے یہ سوچ کر اسے اسکول سے اٹھا لیا کہ وہاں کے لڑکوں کی صحبت نے اسے دین کی طرف سے باغی کر دیا تھا۔ اب وہ ایک معلم کے گھر جانے لگا جو چند لڑکوں کو اپنے گھر پڑھایا کرتے تھے۔ باپ کی خوشیاں یہاں بھی کم نہیں ہوئیں۔ اسے یہ تجسس بے چین رکھتا تھا کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے۔ سب کا معبود کون ہے؟ ہمیں کس کی پرستش کرنی چاہیے۔ وہ معلم سے بھی اسی قسم کے سوالات کرتا رہتا تھا۔ اس نے ان سے بھی عیسائیت کے

اللہ تیرا شکریہ

شیخ سعدیؒ کا دورانِ سفر جوتا ٹوٹ گیا تو اللہ تعالیٰ سے اپنی مفلسی کا شکوہ کرنے لگے کہ میں نیا جوتا خریدنے سے قاصر ہوں۔ آگے پہنچے تو دیکھا ایک آدمی کے دونوں پاؤں نہیں ہیں۔ شیخ سعدی نے پاؤں نہ ہونے کی تکلیف کا پوچھا۔ معذور کہنے لگا۔ میرے صرف پاؤں نہیں ہیں۔ آنکھیں بفضلِ خدا سلامت ہیں۔ بھلا مجھے کیا تکلیف ہے۔ شیخ صاحب اللہ تعالیٰ سے اپنے ناشکری الفاظ کی معافی مانگنے لگے کہ میں جوتا ٹوٹنے پر شکوہ کناں ہوں اس کے پاؤں نہیں تو بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ ہر حال میں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ڈیل کارنیگی

24 نومبر 1888ء میں میری ول منزوری (امریکا) میں پیدا ہوا۔۔۔ لازوال شہرت کی حامل کئی کتب تحریر کیں جن سے پوری دنیا میں کارنیگی کو شہرت دوام ملی۔ اس کی ہر کتاب کا دنیا کی بے شمار زبانوں میں ترجمہ ہوا اور ہر کتاب کروڑوں کی تعداد میں بکی اور اب بھی بک رہی ہے۔ ڈیل کارنیگی نے گفتگو اور تقریر کے فن سے روشناس کے لیے بے شمار ادارے چلائے تاکہ لوگ بنا کسی پریشانی اپنے روزمرہ مسائل سے بخوبی نمٹ سکیں۔ وہ اس فن کا بانی کہلاتا ہے۔ اس نے ساری عمر اس بات پر زور دیا کہ "یقین اور اعتماد کی ڈور کو اپنے ہاتھ سے نہ چھوٹنے دو پھر آپ کی خواہشات کی پتنگ نیلگوں آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہوگی۔" 1955ء میں اس نے وفات پائی۔

مرسلہ: اسرار احمد۔ جنوئی ضلع مظفر گڑھ

حافظہ

امام بخاری کے ایک ہم عصر ساتھی کہتے ہیں کہ امام بخاری ہم لوگوں کے ساتھ ایک استاد کے پاس جایا کرتے تھے۔ ہم لوگ لکھتے اور بخاری ویسے ہی واپس آ جاتے۔ کئی روز گزرنے کے بعد ہم نے ان سے کہا۔ "تم تو وقت ضائع کرتے ہو۔" وہ چپ ہو گئے جب کئی مرتبہ کہا تو کہنے لگے تم نے دن ہی کر دیا لاؤ تم نے کیا لکھا؟ ہم نے اپنا مجموعہ حدیث جو پندرہ ہزار حدیثوں سے زیادہ تھا نکالا تو انہوں نے ان سب کو زبانی سنا دیا۔ ہم دنگ رہ گئے۔

ماخوذ: حکایاتِ صحابہؒ

مرسلہ: عبدالغفور خان ساغری خٹک۔ اٹک

بارے میں سوالات کیے۔ ان کی معلومات ظاہر ہے محدود تھیں۔ وہ اسے مطمئن نہ کر سکے بلکہ اسے الٹا ڈانٹ دیا۔

"دیکھو، میں تمہیں مذہب پڑھانے کے لیے یہاں نہیں بیٹھا ہوں۔ میں تمہیں فارسی زبان و ادب پڑھاتا ہوں مجھ سے اسی کے بارے میں سوال کیا کرو۔"

وہاں موجود ایک لڑکا اس کے سوالوں کو بڑے غور سے سنا کرتا تھا۔ اس وقت بھی سن رہا تھا۔ جب معلم ادھر اُدھر ہوا تو اس لڑکے نے ماہ سے کہا۔

"کیا میں تمہیں ان لوگوں کا پتا نہ بتا دوں جو عیسائیت کے بارے میں تمہارے سوالوں کے جوابات دے سکیں۔"

"میں تو ایسے ہی لوگوں کی تلاش میں ہوں۔ مجھے ضرور بتاؤ۔"

"پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے معلم سے جلدی چھٹی لے لو۔ میری چھٹی تو ہو گئی ہے۔ میں باہر تمہارا انتظار کروں گا۔ پھر ہم ایک جگہ چلیں گے۔"

اس نے پیٹ کے درد کا بہانہ کیا اور معلم سے چھٹی لے لی۔ باہر وہ لڑکا اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے لے کر ایک طرف چل دیا۔ کچھ فاصلے پر ایک پہاڑ تھا۔ پہاڑ کے دامن میں چند گھر بنے ہوئے تھے۔ وہ لڑکا یہیں رہتا تھا۔ ماہ کو معلوم تھا کہ یہاں اس کا گھر ہے۔

"تم تو مجھے اپنے گھر لے جا رہے ہو۔"

"نہیں۔ ہم اس پہاڑ پر جائیں گے۔"

"اس پر چڑھنا تو بہت مشکل ہے۔"

"میں یہیں رہتا ہوں اس لیے مجھے ایسا راستہ معلوم ہے جہاں سے چڑھنا آسان ہے۔"

"اس پہاڑ پر آخر ایسا کیا ہے جو تم مجھے وہاں لے جا رہے ہو؟"

"وہاں کچھ دنوں سے عیسائی راہب آئے ہوئے ہیں۔ میں اکثر وہاں چلا جاتا ہوں اور انہیں عبادت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ان کی عبادت ہم سے بہت مختلف ہوتی ہے لیکن ضروری تو نہیں کہ وہ ہم مجوسیوں سے بہتر ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

ماہ نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اس کے ساتھ پہاڑ پر چلا گیا۔ وہاں راہب موجود تھے۔ دنیا سے کنارہ کش ہو کر اس پہاڑ پر عبادت میں مصروف تھے۔ اس نے انہیں ویسی ہی عبادت کرتے ہوئے دیکھا جس کا مشاہدہ وہ گرجا میں کر چکا تھا۔ ان راہبوں سے اس کی کچھ باتیں بھی ہوئیں لیکن اپنے ساتھی طالب علم کی موجودگی میں وہ ان سے زیادہ باتیں کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے جلد ہی واپس آ گیا۔

اس نے راستہ دیکھ لیا تھا چنانچہ اکیلا ہی پہاڑ پر جانے لگا۔ ان راہبوں سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا اور پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ ہر تیسرے دن وہاں چلا جاتا اور ان سے ان کے دین کے بارے میں باتیں کرتا۔

یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس نے ابھی اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا لیکن مجوسیت کے بارے میں بہت سے شبہات اس کے دل میں پیدا ہو گئے تھے جنہیں وہ کسی پر ظاہر نہیں کر رہا تھا۔

اس کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی اور وہ اعتبار عمر جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہا تھا۔ پہاڑ پر رہنے والے راہب کسی اور طرف چلے گئے تھے۔

باپ کے کہنے کے مطابق آتش کدے کی خدمت میں مشغول تھا لیکن ایک بے کلی سی تھی جو ہر وقت پریشان کیے رہتی تھی آخر اس نے اس کا یہ حل نکالا کہ ایک دن خاموشی سے اس گرجا گھر میں پہنچ گیا جو اس کی جاگیر کے راستے میں پڑتا تھا اور پھر وہ وہاں باقاعدگی سے جانے لگا۔

☆☆☆

شہر اصفہان کے نواح میں قصبہ "جیّ" واقع تھا۔ یہاں کی کل آبادی مجوسیوں پر مشتمل تھی بلکہ پورے ایران میں یہی مذہب سرگرم تھا۔ یہ لوگ آگ کی پرستش کیا کرتے تھے۔ ان کے آتش کدوں میں ایک پل کے لیے بھی آگ بجھ نہ پاتی تھی۔ ایسے خدمت گار ہر وقت موجود رہتے تھے جو آگ کو ہمیشہ روشن رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ابلق (کچھ سفید کچھ سیاہ) گھوڑے کی بھی پرستش کرتے تھے۔

اصفہان میں بادشاہت قائم تھی۔ ایران کا بادشاہ خود کو شہنشاہ کہلواتا تھا اور شاہی خاندان کے جو دیگر افراد مختلف صوبوں اور علاقوں کے حکمران بنائے جاتے تھے وہ بادشاہ کہلاتے تھے اور ان شاہی خاندان کے جو افراد بادشاہ بننے سے رہ جاتے تھے وہ اپنے علاقے کے سردار یا دہقان کہلاتے تھے۔ دہقان بڑا معزز عہدیدار سمجھا جاتا تھا۔ لوگ زرعی مشوروں کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات بھی وہی نمٹاتا تھا۔ ماہ کا باپ شاہی خاندان کا ایک فرد اور قصبہ "جیّ" کا سردار تھا۔

شاہی خاندان سے تعلق کے علاوہ ان لوگوں کی اہمیت یہ بھی تھی کہ ان کا شمار شاہ سواران کسریٰ میں ہوتا تھا۔

ساسانی عہد میں بطور خاص ان پر توجہ دی گئی۔ یہ لوگ چاق وچوبند شہسوار تھے۔ شہسواری کے ساتھ ساتھ تیراندازی میں بھی اس قدر مشاق تھے کہ ان کا کوئی تیر خطا نہ جاتا تھا۔

☆☆☆

ماہ بہ کی نئی نئی جوانی تھی۔ جوش کا زمانہ تھا۔ چاہتا تھا کہ جو کچھ حاصل کرنا ہے فوراً حاصل کرلے۔ مقامی پادریوں نے اس کی تشنگی کو دور کرنا چاہا لیکن اس کی تشنگی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ پھر اسے یہ محسوس ہوا جیسے یہ چشمہ خشک ہوگیا ہے ماہ بہ کے پانی میں پیاس بجھانے کی سکت نہیں رہتی ہے۔

''آپ لوگوں کے مذہب کا سرچشمہ کہاں ہے؟''

آخر ایک دن اس نے ان پادریوں سے پوچھ ہی لیا۔

''اس کے لیے تو تمہیں ''شام'' جانا پڑے گا۔''

''میں شام'' جانے کے لیے تیار ہوں۔ بس آپ لوگ انتظار کریں کہ جب کوئی قافلہ شام جانے لگے تو مجھے اطلاع کردیں۔''

''اطلاع کرنے کی کیا بات ہے۔ پرسوں تاجروں کا ایک قافلہ یہاں پہنچے گا اور دو دن بعد یہاں سے روانہ ہوگا۔ تم اس کے ساتھ شامل ہوکر شام جاسکتے ہو۔''

اس نے دن اچھی طرح گن لیے اور جب قافلے کی روانگی کا دن آیا تو اس نے گھر چھوڑ دیا۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ زندگی ناز ونعم میں گزری تھی۔ اب سب کچھ چھوڑ کر سفر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے نکلنا پڑ رہا تھا۔ نہ معلوم آئندہ کیا حالات پیش آئیں۔ صبر وبرداشت کی کیسی کیسی منزلیں طے کرنا پڑیں۔ شفیق باپ کی صورت دوبارہ دیکھنی نصیب ہوتی ہے یا نہیں۔ وطن بھی چھوٹ رہا ہے اور گھر بھی۔ کئی مرتبہ دل نے روکا۔ ماہ بہ مت جاؤ! تمہیں اگر عیسائیت اختیار کرنی ہے تو یہاں رہ کر بھی کرسکتے ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ باپ تمہیں گھر سے نکال دے گا۔ وطن تو نہیں چھوٹے گا۔ اس نے جواب دیا۔ میں اگر یہاں رہ کر عیسائی بن گیا تو باپ کے دل کو کتنی تکلیف ہوگی۔ اگر یہاں سے چلا گیا تو انہیں یہ سوچ کر صبر آجائے گا کہ میں کہیں گم ہوگیا ہوں۔

وہ اپنے آپ سے لڑتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ پیچھے مڑ مڑ کر گھر کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گرجا کے قریب پہنچ گیا۔ قافلہ روانگی کے لیے تیار تھا۔

سفر شام شروع ہوگیا۔

کئی دن کی مسافت کے بعد قافلے والوں نے اسے

یاد رہے

☆ چند سال قبل تک رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک روس تھا مگر اب چین اور کینیڈا ہے۔

☆ سب سے موٹی کھال ڈھیل مچھلی کی ہوتی ہے۔ گزشتہ دنوں شکار کی گئی ایک ڈھیل مچھلی کی کھال دو فٹ موٹی نکلی۔

☆ لوہے سے بھی زیادہ وزنی گیس کا نام ریڈون ہے جو فولاد سے بھی چار گنا زیادہ وزنی ہے۔

☆ زمین پر تیز رفتاری سے دوڑنے والے ''ایمو'' نامی پرندے آسٹریلیا میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے دوڑنے کی رفتار 31 میل فی گھنٹا ہے اور وہ ایک ہی رفتار سے دس میل تک دوڑ سکتے ہیں۔

☆ مسالوں کے درختوں میں سب سے بلند درخت ''یوکلپٹس'' کے ہوتے ہیں۔ آسٹریلیا میں پائے جانے والے یوکلپٹس اور ریلوگم کے درختوں کی اونچائی 400 فٹ تک ہوتی ہے۔

☆ جواہرات میں یہ چار پتھر شمار ہوتے ہیں۔ ہیرا، لعل، نیلم اور پنا۔

مرسلہ: ردا بتول۔ کراچی

سب سے سخت

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تیرے رب کی مخلوقات میں سب سے زیادہ سخت پہاڑ ہیں مگر انہیں لوہا پاش پاش کردیتا ہے اور لوہے کو آگ کھا جاتی ہے اور آگ کو پانی بجھا دیتا ہے اور یہ آسمان وزمین کے درمیان جو بادل ہیں یہ پانی کو اٹھائے پھرتے ہیں لیکن بادلوں کو ہوا لے جاتی ہے اور ہوا سے انسان زور باندھ کر کے غالب آجاتا ہے اور نشہ انسان پر غالب آجاتا ہے اور نیند نشے پر غالب آجاتی ہے مگر غم نیند کو بھی روک دیتا ہے تو تیرے رب کی مخلوق میں سب سے زیادہ سخت ''یہ غم ہوا''۔

مرسلہ: عبدالغفور خان ساغری تھنگ۔ ضلع اٹک

شام پہنچادیا۔ دروازۂ شہر میں داخل ہوتے ہی اس نے لوگوں سے پوچھنا شروع کردیا کہ یہاں علم وفضل کے اعتبار سے سب سے بڑا شخص کون ہے۔ کئی لوگوں سے پوچھنے کے بعد ایک شخص نے ایک گرجا گھر کی نشاندہی کی کہ وہاں کا بڑا پادری تمہارا مقصد پورا کرسکتا ہے۔ وہ نہایت عالم وفاضل اور قدآور شخص ہے۔

وہ بازاروں کی رونق کو نظرانداز کرتا ہوا گرجا کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے پادری سے ملاقات کی اور اپنا احوال اسے سنایا۔

"میں تمہارے مذہب سے رغبت رکھتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تمہاری صحبت میں رہ کر تمہاری اور کلیسا کی خدمت کروں تم سے علم وتربیت حاصل کروں اور تمہارے ساتھ عبادت کرنے کی سعادت حاصل کروں۔"

پادری نے اس کا اشتیاق دیکھ کر اسے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ جب قربت زیادہ بڑھی تو مابہ پر اس پادری کی حقیقت کھل گئی۔ وہ بظاہر جیسا نظر آتا تھا ویسا نہیں تھا۔ لوگ اس پر اعتبار کرتے تھے اور وہ ان کو دھوکا دیتا تھا۔ لوگ اسے صدقہ وخیرات کی رقوم دیتے تھے اور وہ مسکینوں کو ایک کوڑی بھی نہیں دیتا تھا۔ سب کچھ اپنے لیے جمع کرلیتا تھا۔ مابہ نے اس کے پاس زروجواہر سے بھرے ہوئے سات مٹکے دیکھے مگر اس شخص کی ہوس پھر بھی پوری نہیں ہورہی تھی۔

اس کے پاس رہتے ہوئے مابہ کو سخت روحانی کوفت ہورہی تھی لیکن اس اجنبی شہر میں اور کہاں جاتا۔ قدرت نے اس کی کوفت کو زیادہ دن برقرار نہ رکھا۔ اس پادری کا انتقال ہوگیا۔ لوگ اسے نیک آدمی سمجھتے تھے۔ اس کے انتقال کا سن کر صفِ ماتم بچھ گئی۔ لوگ اس پادری کی نیکیوں کا ذکر کررہے تھے اور رو رہے تھے۔ مابہ چاہتا تو زروجواہر سے بھرے ہوئے مٹکوں پر قبضہ کرسکتا تھا لیکن اس کی دیانت نے یہ گوارا نہیں کیا۔ وہ چند لوگوں کو لے کر اس کوٹھری میں گیا جہاں یہ مٹکے رکھے ہوئے تھے۔

"یہ کیا ہے۔" لوگوں نے مٹکے دیکھ کر کہا۔

"یہ وہ درہم ودینار اور سونا چاندی ہے جو یہ پادری غریبوں کے نام پر لوگوں سے وصول کرتا تھا اور اپنے لیے ذخیرہ کرلیتا تھا۔ مسکینوں کو کچھ دینے کا وہ روادار نہ تھا۔"

ان لوگوں نے کوٹھری سے باہر آکر شور مچادیا کہ پادری ہرگز نیک آدمی نہیں تھا۔ وہ زندگی بھر ہمیں دھوکا دیتا رہا۔

اس کی تدفین میں شرکت کرنے کے لیے دور ونزدیک سے عیسائی بڑی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو یہ سنا تو سخت مشتعل ہوگئے۔ وہ سب قسمیں کھا کر کہنے لگے کہ اس بدبخت کو ہم ہرگز دفن نہیں ہونے دیں گے۔ یہ سزا کا مستحق ہے نہ کہ دفنانے کا۔ چنانچہ انہوں نے اس کی نعش کو صلیب پر لٹکا کر سنگسار کیا۔

اس کے بعد انہوں نے اس عہدے کے لیے ایک اور آدمی کا انتخاب کیا۔ مابہ اس کے ساتھ رہنے لگا۔ گرجا کی دیکھ بھال کرتا اور پادری کی خدمت میں لگا رہتا۔

یہ پادری نہایت نیک اور عبادت گزار تھا۔ دن رات عبادت الٰہی میں مشغول رہتا اور جو وقت بچتا وہ مابہ کی تربیت میں صرف کرتا۔ مابہ خوش تھا کہ اسے اس کی منزل مل گئی لیکن یہ صحبت زیادہ دن برقرار نہ رہ سکی۔ اس پادری کا وقت آخر قریب آگیا۔

"مجھے بشارت ہوگئی ہے کہ میں اب مرجاؤں گا۔"

"استادِ مکرم! آپ کے بعد میرا کیا ہوگا۔ مجھے وصیت فرمائیے کہ میں کسب فیض کے لیے کس کے پاس جاؤں۔"

"میں ایک شخص کا پتا تمہیں بتاتا ہوں۔ وہ "موصل" شہر میں رہتا ہے۔ جب میرا انتقال ہوجائے تو تم اس کے پاس چلے جانا۔ میرا سلام کہنا اور ان کی خدمت میں جا رہنا۔ کسی اور کے پاس گئے تو راہ سے بھٹک جاؤ گے۔"

پادری نے اس شخص کا نام اور پتا اسے سمجھا دیا۔

پادری کی تدفین کے بعد مابہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور عراق چلا گیا جہاں "موصل" کا شہر واقع ہے۔ یہاں پہنچ کر اس بزرگ تک پہنچنا مشکل نہیں تھا جس کا نام بتایا گیا تھا۔ ان بزرگ نے اپنے دوست کا سلام قبول کیا، مابہ کی باتیں توجہ سے سنیں اور اپنے ہاں قیام کی اجازت دے دی۔

مابہ کے نصیب میں جو عظمت لکھ دی گئی تھی قدرت اسے قدم بہ قدم اس منزل کے قریب کرتی جارہی تھی۔

ان بزرگ کی خدمت کرتے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ فرشتۂ اجل ان کے بستر کے سرہانے بھی آکھڑا ہوا۔ ان کی موت قریب آئی تو مابہ ایک مرتبہ پھر بے سہارا ہوگیا۔

"میں شام سے عراق آپ کے پاس آیا تھا۔ آپ بھی مجھے چھوڑ کر جارہے ہیں۔ مجھے یہ تو بتاتے جائیں کہ فیض

صحبت اٹھانے کے لیے اب کس کے پاس جاؤں۔“

”خدا گواہ ہے اس زوال پذیر دور میں کوئی نہیں جو میرے عقیدہ توحید پر قائم ہو، سوائے ایک شخص کے جو الجزیرہ کے شہروں میں سے ایک شہر ”نصیبین“ میں رہتا ہے۔ یہ شہر موصل سے شام جانے والے قافلوں کے راستے میں آتا ہے۔ تم موصل سے چلو گے تو چھ روز کی مسافت کے بعد یہ شہر آئے گا۔“

ان کی وفات کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر عازم سفر ہوا۔ ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو کر نصیبین کے ان بزرگ کی خدمت میں پہنچ گیا جن کا نام بتایا گیا تھا۔ شومئی قسمت کہ یہ صحبت بھی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ ان بزرگ کا پیمانہ عمر بھی لبریز ہو گیا۔ انہوں نے شہر ”عموریہ“ میں ایک شخص کا پتا بتایا کہ وہ ان کے پاس چلا جائے۔

شہر عموریہ ملک ترکیہ کے علاقے اناطولیہ میں استنبول کے پاس واقع تھا۔

اس شہر میں آنے کے بعد مابہ نے ان بزرگ سے ملاقات کی اور اپنی گزر اوقات کے لیے تجارت بھی شروع کر دی۔ اللہ نے برکت دی اور اس کے پاس کافی بھیڑ بکریاں جمع ہو گئیں۔ اپنی روحانی تربیت کے لیے وہ ان بزرگ کے پاس قیام کیے رہا۔ کبھی کبھی یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ اپنے والد کے پاس لوٹ جائے اور انہیں مجوسیت سے چھٹکارا دلائے۔ شاید وہ زندہ ہوں اور عیسائیت قبول کر لیں لیکن پھر ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہو گیا کہ وہ اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اس عیسائی پادری نے اسے ایک خوش خبری سنائی۔

”کیا میں تمہیں وہ خبر نہ سناؤں جس کی خوش خبری یسوع مسیح نے بھی سنائی تھی۔“

”استاد مکرم! جب تک وہ خبر آپ مجھے سنا نہیں دیتے میں بے قرار ہوں گا۔“

”ایک پیغمبر کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہے۔ وہ پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے دین و ملت پر مبعوث ہو گا۔“

”یہ ظہور کہاں ہو گا۔“

”اس کا ظہور سرزمین عرب سے ہو گا پھر وہ ایسے مقام کی طرف ہجرت کرے گا جو دو حرّوں (سنگلاخ میدانوں) کے درمیان واقع ہے اور وہاں کھجور کے درخت ہیں۔“

”میں اگر اس مقام تک پہنچ بھی گیا تو انہیں پہچانوں گا کیسے۔“

”اس پیغمبر کی نبوت کی علامتیں واضح ہوں گی۔ وہ ہدیہ قبول کرے گا لیکن صدقہ نہیں کھائے گا اور ان کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہو گی۔ اگر تم سے ہو سکے تو ان علاقوں میں چلے جاؤ اور ہدایت پاؤ کیونکہ اب عقیدہ توحید پر کاربند ایک بھی ہستی اس روئے زمین پر باقی نہیں رہا۔ اسی لیے تو نئے پیغمبر کی آمد کی ضرورت پیش آئی ہے۔“

وہ بزرگ شاید اس لیے یہ نصیحتیں کر رہا تھا کہ اس کا وقت قریب آ گیا تھا کیونکہ چند روز بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اب مابہ کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے یا تو وہ گھر واپس چلا جائے یا اس پیغمبر کی تلاش میں نکلے جس کے بارے میں مرنے والے عیسائی راہب نے اسے بتایا تھا۔ اس نے گھر لوٹنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس انتظار میں ٹھیرا رہا کہ ملک عرب کی طرف جانے کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے۔ طویل انتظار کے بعد قبیلہ کلب کے تاجروں کا گزر اس طرف سے ہوا۔ مابہ ان کے پاس گیا اور اپنی بھیڑ بکریوں کے عوض ان سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے ملک لے چلیں۔ وہ مان گئے اور اپنے اونٹوں میں سے ایک اونٹ اسے دے دیا کہ سوار ہو کر قافلے میں شامل ہو جاؤ۔

قافلے کے سردار نے دیکھا کہ وہ نوجوان ہے، صحت مند ہے اور اکیلا ہے۔ اگر اسے غلام بنا کر بیچ دیا جائے تو اچھے خاصے پیسے مل جائیں گے۔

مابہ ان کے ارادوں سے بے خبر قافلے کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ جب یہ لوگ یہودیوں کی بستی ”وادی القریٰ“ میں پہنچے تو ان کا یہ ارادہ پختہ ہو گیا۔ وہ تجارتی مقاصد کے تحت کچھ عرصہ کے لیے اس بستی میں رک گئے اور ان میں سے چند لوگ کسی خریدار کی تلاش میں نکل گئے۔

جلد ہی انہیں ایک ایسا یہودی مل گیا جو غلام کا متمنی تھا۔ وہ اس کے ساتھ قافلے میں آئے اور مابہ کو انہیں دکھا دیا۔ وہ یہودی اس ہٹے کٹے غلام کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ قافلے کے سردار نے ان سے کہا کہ یہ غلام ہم سے محبت کرتا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر کہیں جانے کو تیار نہیں اور ہمیں پیسوں کی ضرورت ہے اس لیے اسے بیچ رہے ہیں۔ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ ہم اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور تمہیں ایک کاغذ لکھ کر دے دیتے ہیں کہ ہم نے اسے تمہارے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ جب یہ ہمیں نہیں پائے گا اور یہ

کاغذ لکھا دیکھے گا تو تمہاری خدمت پر اسی طرح آمادہ ہو جائے گا جس طرح ہماری خدمت کرتا رہا ہے۔ وہ یہودی تیار ہو گیا۔ قافلے والے وہیں ٹھہر گئے اور رات میں کسی وقت جب ماہ بے خبر سو رہا تھا تو اسے چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ یہودی وہیں بیٹھا رہا۔ جب صبح ہوئی اور ماہ کی آنکھ کھلی تو یہودی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ قافلے والوں کا نشان بھی وہاں نہیں تھا۔ ماہ نے قافلے والوں کے بارے میں پوچھا تو یہودی نے دستاویز دکھا دی۔

''میں نے رقم دے کر تمہیں خریدا ہے۔ اب تم ان کے نہیں میرے غلام ہو۔ اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔''

''میں ان کا غلام کبھی بھی نہیں تھا۔ میں تو معاوضہ دے کر ان کے قافلے میں شامل ہوا تھا۔''

''کیا تم سچ کہتے ہو۔''

''اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے۔''

''مجھے اس سے غرض نہیں کیا سچ ہے کیا جھوٹ۔ میں نے تمہیں رقم دے کر خریدا ہے۔ اب تم میرے ساتھ چلو اور کام دھندوں میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔''

ماہ اس کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا۔ میرا بچپن کس ناز و نعم میں گزرا ہے اور اب میں کسی کا غلام ہوں۔

وہ اس یہودی کے ساتھ ایک مقام سے گزرا۔ یہ کھجوروں کا باغ تھا۔ وہ ان درختوں کی طرف اشتیاق سے دیکھنے لگا شاید یہ وہی بستی ہے جس کا تذکرہ میرے بزرگ نے وصیت میں فرمایا تھا۔ اگر یہ وہی جگہ ہے تو میرا گوہر مقصود بھی یہیں ملے گا۔ غلامی کا بوجھ ہلکا معلوم ہونے لگا۔ وہ اس یہودی کے ساتھ تیز تیز چلنے لگا۔ اس یہودی کے ذریعے مجھے رہنے کا ٹھکانا تو مل ہی جائے گا۔ پھر میں خود ہی اپنی منزل تلاش کروں گا۔

وہ اس یہودی کے ساتھ رہنے لگا۔ اسے خوش رکھنے کے لیے سخت محنت سے کام کر رہا تھا۔ وہ یہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے خواب یہیں اس سرزمین پر کہیں پورے ہوں گے۔ اس نبی کا ظہور یہیں ہوگا جس کے بارے میں اس پادری نے اسے بتایا تھا۔

وادی القریٰ میں رہتے ہوئے کچھ عرصہ ہوا تھا کہ اس یہودی کا چچازاد بھائی اس سے ملنے آیا۔ اس غلام (ماہ) کو محنت سے کام کرتے ہوئے دیکھا تو بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے بھائی سے ماہ کو خرید لیا اور مدینہ منورہ لے آیا۔ ماہ نے

اس شہر کو بغور دیکھا تو اپنے بزرگ کی بتائی ہوئی نشانیوں سے اچھی طرح پہچان لیا کہ واقعی یہ وہ شہر ہے جو پیغمبر آخرالزماں کا دارالہجرۃ ہے۔

قبا، مدینہ منورہ سے دو تین میل کے فاصلے پر ایک بستی تھی۔ یہاں بنی قریظہ کا نخلستان تھا۔ ماہ کے نئے آقا کا تعلق بھی بنی قریظہ سے تھا اور اس کے پاس بھی کھجوروں کا ایک بڑا باغ تھا۔ ماہ کو اس باغ کی دیکھ بھال سونپی گئی۔

اس کا قیام جب یہاں ہوا تو اس کے کانوں تک یہ باتیں پہنچنے لگیں کہ مکہ میں ایک نبی کی بعثت ہوئی ہے۔ پھر یہ باتیں پہنچنے لگیں کہ اہل مکہ اس کے ساتھ بہت برا سلوک کر رہے ہیں۔ وہ صرف اتنا ہی سن سکتا تھا جتنا ایک غلام کو حق ہے۔ اس کے کانوں تک اس سے زیادہ باتیں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

دن پر دن گزرنے رہے۔ وہ اس دن کے انتظار میں تھا جب اس عیسائی پادری کے مطابق وہ نبی ہجرت کرے گا۔ پادری نے کہا تھا۔

''پھر وہ ایسے مقام کی طرف ہجرت کرے گا جو دو حرّتوں (سیاہ سنگلاخ میدانوں) کے درمیان واقع ہے اور وہاں کھجور کے درخت ہیں۔''

وہ جلے ہوئے پتھروں کے میدان کے درمیان آ گیا تھا۔ یہاں کھجوروں کے درخت بھی تھے۔ اب وہ اس دن کے انتظار میں تھا جب اس کا منظور نظر ہجرت کر کے یہاں پہنچے گا۔ اس کی آنکھیں راستوں پر لگی ہوئی تھیں۔ جب وہ پکی ہوئی کھجوروں پر کپڑا ڈالنے یا انہیں توڑنے کے لیے درختوں پر چڑھتا تو دور دور تک دیکھا جاتا کہ شاید کوئی قافلہ آتا ہوا نظر آئے۔ شاید وہ موہنی صورت نظر آ جائے۔ اس کا آقا اس کی دلی کیفیات سے بے خبر اسے دیکھ دیکھ خوش ہوتا تھا کہ اس کا غلام کتنی محنت سے کام کر رہا ہے۔ ایک درخت پر چڑھتا ہے تو گھنٹوں لگا دیتا ہے۔ اسے کیا خبر تھی کہ بلند درختوں پر چڑھ کر وہ کیا دیکھا رہتا ہے۔

کتنے ہی گرم دنوں کی دھوپ اس کے سر سے گزر گئی۔ کئی قافلے اس نے دیکھے ضرور لیکن ان میں وہ چہرہ نہیں تھا۔ کوئی خبر نہیں تھی جو اس کے ارمانوں پر شبنم کی طرح گرتی۔

ایک دن وہ حسب معمول ایک درخت پر چڑھا ہوا تھا۔ اس کا آقا نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے آقا کا بھائی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آ رہا ہے۔ وہ سخت گھبرایا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ماہ نے اوپر سے دیکھا تو اسے تشویش

ہوئی کہ ایسی کیا خبر ہے جس نے اسے پریشان کر دیا ہے۔ اس نے اپنی ناعتوں کے دروازے کھول دیے اور نیچے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

''انصار کا برا ہو کہ وہ سارے قباء میں ایک شخص کے پاس جمع ہو رہے ہیں جو آج ہی مکہ سے آیا ہے۔ انصار سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے۔ ان کا برا ہو۔''

ماہ کے کانوں تک جیسے ہی یہ الفاظ پہنچے اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ قریب تھا کہ اوپر سے نیچے گر جائے۔ وہ فوراً ہمت کر کے نیچے آ گیا اور خبر کی تصدیق کے لیے لب کھولے کہ جو اس نے سنا ہے کیا وہی سنا ہے۔

''آپ ابھی کیا کہہ رہے تھے؟ کیا خبر سنا رہے تھے؟''

اس کے آقا نے اس کے منہ پر زوردار طمانچہ مارا۔ ''تجھے ان باتوں سے کیا سروکار۔ جا اور اپنا کام کر۔''

اب اس میں کسی درخت پر چڑھنے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ گرے ہوئے پھلوں کو سمیٹنے اور باغ کی صفائی ستھرائی میں لگ گیا۔

جب رات ہوئی تو کچھ پکی ہوئی کھجوریں اپنے ساتھ لیں اور وہاں پہنچ گئے جہاں آپ ٹھہرے ہوئے تھے (راویوں نے لکھا ہے کہ وہ کلثوم بن الہدم انصاریؓ کا گھر تھا)

''مجھے خبر ملی ہے کہ آپ نیک آدمی ہیں اور آپ کے ساتھ آپ کے کچھ غریب اور حاجت مند ساتھی بھی ہیں۔ یہ کھجوریں آپ لوگوں کے لیے صدقے کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں۔ میرے خیال میں آپ لوگوں سے بڑھ کر کوئی اور اس کا حق دار نہیں۔''

آنحضرتؐ نے مسکرا کر ماہ کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے کھانے کے لیے فرمایا لیکن خود کچھ نہیں کھایا۔ ماہ نے دیکھا تو دل میں سوچا ایک علامت تو پوری ہوئی۔ عیسائی پادری نے کہا تھا وہ صدقہ نہیں کھائے گا۔

دو ایک دن گزر جانے کے بعد ماہ نے پھر کچھ کھجوریں ساتھ لیں اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

''میں نے دیکھا ہے کہ آپ صدقہ نہیں کھاتے اس لیے آپ کے اعزاز میں یہ ہدیہ لایا ہوں۔''

آنحضرتؐ نے خود بھی کھایا اور اپنے صحابہ کو بھی شریک کیا۔

ماہ نے دل میں سوچا یہ نشانی بھی پوری ہوئی کیونکہ اس عیسائی پادری نے کہا تھا، وہ ہدیہ قبول کرے گا۔ اب ایک ثبوت اور رہ گیا تھا۔ اس کے استاد نے ایک نشانی یہ بھی بتائی تھی کہ پیغمبر کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ اس مہر نبوت کو کیسے دیکھا جائے؟

اس اثنا میں اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور اکرمؐ قبا سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے ہیں۔ ماہ آزاد تو تھا نہیں کہ جب جی چاہتا مدینہ کی راہ پکڑتا۔ اسے اپنے آقا کی اجازت کی ضرورت تھی۔ اس کا سال تو یہ تھا کہ نخلستان کو پانی دینے کے لیے کنوئیں سے اس طرح پانی کھینچتا تھا جیسے اونٹ کھینچتا ہے۔ بھلا ایسے محنتی آدمی کو اس کا آقا ایک دن کی چھٹی بھی کیسے دیتا۔ اسے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ جس شخصیت سے وہ دوبار مل چکا ہے وہی پیغمبر آخرالزماں ہیں۔ مہر نبوت کی آخری حجت بھی پوری ہو جائے گی کہ وہ اسے دیکھ لے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا میں عیسائیت کو ترک کر دوں گا؟ وہ اب تک عیسائیت پر کاربند رہے تھے۔ اسے یاد آیا کہ وہ ایک مرتبہ ایک عیسائی راہب کے پاس جیجا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ عنقریب ایک رسول آنے والے ہیں۔ میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں شاید ان تک نہ پہنچ سکوں لیکن تم انہیں پا سکتے ہو۔ اگر ان کی زیارت ہو تو ان کی نبوت کی تصدیق کرنا اور ان کی پوری پوری پیروی کرنا۔ ماہ کو یاد آیا کہ اس نے ان بزرگ سے کہا تھا کہ اگر وہ پیغمبر مجھے عیسائیت ترک کرنے کا حکم دیں تو پھر کیا کروں۔ اس پر ان کا جواب تھا کہ ہاں عیسائیت بھی ترک کر دینا کیونکہ وہ جو کچھ کہیں گے وہی برحق ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی ماہ کی ڈھارس بندھ گئی۔ طے کر لیا کہ مہر نبوت کی تصدیق ہوتے ہی وہ ان پر ایمان لے آئے گا اور عیسائیت ترک کر کے ان کے دین پر مکمل پیرا ہو جائے گا۔

سوال پھر بھی یہی تھا کہ آقا سے دن بھر کی چھٹی کیسے لے۔ قبا سے مدینہ دو میل کی دوری پر تھا لیکن وہ سوچتا تھا کیا خبر وہاں کتنی دیر لگ جائے۔ آقا کی اجازت کے بغیر جا بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ انتظار کی کٹھن گھڑیاں کاٹنے لگا۔

ایک روز اس نے سنا کہ اس کا آقا اپنے بھائی سے ملنے قبا سے باہر جا رہا ہے اور کوئی ایسی بات ہے کہ بہت خوش بھی ہے۔ اس کی خوشی کو دیکھ کر اس کی ہمت ہو گئی۔ اس نے آقا سے التجا کی کہ وہ اسے ایک دن کے لیے کام سے چھٹی

دے دے۔

"میرا ایک رشتہ دار ہے جو مدینہ میں کسی کے پاس غلامی کرتا ہے۔ میں ایک دن کے لیے اس کے پاس جا کر رہنا چاہتا ہوں۔"

"جبکہ میں یہاں نہیں ہوں اس وقت تو تمہارا یہاں رہنا اور بھی ضروری ہے۔"

"میں دن کے کچھ حصے کے لیے جاؤں گا۔"

اس کے آقا کو اس پر اعتبار ہو چکا تھا اور اس وقت وہ خوش بھی بہت تھا لہٰذا اس نے اجازت دے دی۔

ماہبہ مدینہ پہنچا تو اسی روز میزبان رسول حضرت کلثوم بن الہدم انصاریؓ کا انتقال ہوا تھا اور ان کی تدفین قبرستان بقیع میں ہو رہی تھی۔ ماہبہ بھی وہیں پہنچ گیا۔ جنازے میں رحمت دو عالم بھی شریک تھے۔

جب تدفین ہو چکی اور حضور قبرستان میں تشریف فرما ہو گئے۔ صحابہ کرام پروانہ وار فدا ہو رہے تھے۔ ماہبہ نے بھی سلام عرض کیا۔ رحمت مجسم نے پہچان کر سلام کا جواب دیا۔

اب ماہبہ کو مہر نبوت کی فکر ہوئی۔ وہ آپ کے گرد پھر کر مہر نبوت دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ آنحضرتؐ کے جسم اطہر پر دو موٹی چادریں تھیں۔ ایک آپ اوڑھے ہوئے تھے دوسری کا تہبند باندھے ہوئے تھے۔ حضورؐ نے جب اس غلام کو یوں چکر کاٹتے ہوئے دیکھا تو مقصد سمجھ گئے۔ آپؐ نے پشت مبارک سے چادر ایک طرف ہٹا دی۔ مہر نبوت سامنے جلوہ گر تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جھکا اور مہر نبوت پر لب رکھ دیے۔ نہ جانے کب تک روتا رہا اور مہر نبوت کو بوسے دیتا رہا۔ حضور پرنور اس کی جانب متوجہ ہوئے اور سامنے آنے کو کہا۔ اب آنکھوں کے آنسو زبان پر آ گئے۔ حدیث درد کہہ سنائی اور درخواست کی کہ یہودی کی غلامی سے آپؐ اسے اپنی غلامی میں قبول کر لیں۔ حلقہ بگوش اسلام فرما لیں۔

عیسائیت ترک کی اور اسلام میں داخل ہو گیا۔

حضورؐ نے نام پوچھا تو "ماہبہ" بتایا گیا۔ اس نام کے معنی "ہم بہتر ہیں" تھے۔ یہ نام نسلی تفاخر اور خاندانی تفوق کو ظاہر کرتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ اس نام کو بدل لو۔ آپ ہی نے سلمان نام تجویز کیا اور فارس سے تعلق ہونے کی وجہ سے تاریخ اسلام میں سلمان فارسی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی۔

سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت سلمانؓ کا لقب "الخیر" تھا۔

قبول اسلام کے وقت حضرت سلمان فارسیؓ ایک یہودی کے غلام تھے۔ اسی غلامی کی وجہ سے وہ بدر اور احد کے غزوات میں شریک نہ ہو سکے۔ اس عرصے کے دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمانؓ کو اپنے آقا سے مکاتبت کرنے کا مشورہ دیا۔ آقا کو کچھ رقم دے کر یا کوئی کام کر دینے کی شرط پر آزاد ہونا مکاتبت کہلاتا تھا۔

حضرت سلمانؓ نے جب اپنے یہودی آقا کو اپنی تبدیلی مذہب کی خبر پہنچائی تو وہ چراغ پا ہو گیا اور جب مکاتبت کی تجویز سامنے رکھی گئی تب تو اس کی برہمی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

"قیامت آ جانے میں اس وقت تک تجھے اپنی غلامی میں رکھوں گا۔"

حضرت سلمان کی طرف سے اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔

اس وقت تک مسلمانوں کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ یہودی کو یہ خوف بھی دامن گیر ہو رہا تھا کہ مسلمان اس کی طرف سے آمادہ جنگ نہ ہو جائیں۔ ایسے مخلص غلام کو آزاد کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ آخر اس نے مکاتبت میں ایسی شرط رکھ دی کہ جسے یا تو حضرت سلمانؓ پورا نہ کر سکیں یا پھر شرط پوری کرنے میں طویل عرصہ لگ جائے اور وہ اس وقت تک آقائی کے مزے اڑاتا رہے۔ جب اصرار بہت بڑھا تو اس نے مکاتبت کے لیے دو شرطیں رکھیں۔ ایک کا تعلق رقم سے تھا ایک کا کام سے۔

تم مجھے اپنی آزادی کے بدلے میں چالیس اوقیہ چاندی دو گے اور فقیر کے مقام پر تین سو کھجور کے پودے لگاؤ گے۔ ان کی دیکھ بھال کرو گے اور انہیں پانی دو گے۔ جب وہ ثمر دار ہو جائیں گے اس وقت تم آزاد ہو گے۔

چالیس اوقیہ چاندی بہت بڑی قیمت تھی۔ ایک اوقیہ ڈھائی تولہ کے ہم وزن تھا۔ اس لحاظ سے چالیس اوقیہ چاندی، سو تولے کے قریب بنتی تھی۔ 52 تولے چاندی ساڑھے سات تولے سونے کے برابر سمجھی جاتی تھی لہٰذا چند رہ تولہ سونا درکار تھا۔

دوسری شرط اس سے بھی زیادہ دور طلب تھی۔ معمول کے مطابق کھجور کے پودے سات آٹھ سال کے بعد پھل دینے کے قابل ہونے لگتا۔

یہودی نے اسی لیے ایسی شرط رکھی تھی کہ اس طویل

مدت تک حضرت سلمانؓ آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک معجزہ اس کے انتظار میں ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو۔ انہوں نے پودوں کے ذریعے مدد کی۔ صحابہ کرام اپنی اپنی حیثیت کے مطابق پودے لے آئے حتیٰ کہ تین سو پودے جمع ہو گئے۔ حضور اکرمؐ نے حضرت سلمانؓ کو حکم دیا کہ جاؤ اور زمین میں گڑھے کھودو۔ جب کام سے فارغ ہو جاؤ تو مجھے اطلاع کر دینا۔ میں خود وہاں جا کر اپنے ہاتھ سے پودے لگاؤں گا۔

اس اظہارِ مہربانی سے حضرت سلمانؓ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

حضرت سلمانؓ نے گڑھے کھودے۔ ساتھی صحابہ نے بھی آپ کی مدد فرمائی اور بہت جلد یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا جب کام مکمل ہو گیا تو حضورؐ کو اطلاع کر دی گئی۔ حضورؐ بہ نفس نفیس وہاں تشریف لے گئے اور ایک ایک پودے کو اپنے دست مبارک سے ان گڑھوں میں رکھ دیا۔

اتنے پودے ایک ساتھ لگائے جائیں تو کچھ زندہ رہتے ہیں کچھ مر جاتے ہیں لیکن خدا کی قدرت سے ان میں سے ایک پودا بھی نہیں مرا۔

پودے لگانے کی شرط پوری ہو گئی تھی۔ اب حضرت سلمانؓ رقم کی ادائیگی کے لیے پریشان تھے۔ حضور اکرمؐ نے قرض کی ادائیگی کے لیے ایک دعا سکھا دی تھی۔ دن رات اسے پڑھتے رہتے تھے اور روتے رہتے تھے۔ اسی اثنا میں رسول پاکؐ کے پاس مرغی کے انڈے کے برابر سونے کی ایک ڈلی آئی۔ آپؐ نے حضرت سلمانؓ فارسی کو بلایا۔

”یہ سونا لو اور اس سے وہ رقم ادا کر دو جو تمہارے ذمے ہے۔“

”حضورؐ، جو وزن مجھ پر واجب الادا ہے اس سے تو وہ وزن پورا نہ ہوگا۔“

”اچھا یہ ڈلی ادھر لاؤ۔“

آپؐ نے یہ ڈلی اپنے ہاتھ میں لے لی اور زبان مبارک پر پھیرا ”جاؤ اب وزن پورا ہو جائے گا۔“

جب سونے کی ڈلی ترازو میں رکھی گئی اور دوسری طرف مطلوبہ وزن کے باٹ رکھے گئے تو سونے کا وزن زیادہ تھا۔

مکاتبت کی دونوں شرطیں پوری کرنے کے بعد حضرت سلمان فارسیؓ کو آزادی مل گئی۔

عربوں میں یہ رواج اور قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی غلام کو آزاد کرا دیتا تو وہ آزاد کردہ غلام اس کا مولیٰ و دوست اور ساتھی کہلاتا تھا۔ اسلام نے بھی حوالات کے اس نظام کو باقی رکھا تھا لہٰذا حضرت سلمانؓ کی قسمت نے انہیں یہ اعزاز بخشا کہ وہ مولیٰ الرسول کہلائے۔

مسجد نبوی میں ایک چبوترہ تھا۔ غریب صحابہ کرام جن کا گھر بار نہیں ہوتا تھا یا جو اسلام کی محبت میں گھر بار چھوڑ کر آ جاتے تھے وہ اس چبوترے پر ٹھہر جاتے تھے۔ یہ لوگ اصحاب صفہ کہلاتے تھے کیونکہ ”صفہ“ چبوترے کو کہتے ہیں۔

اصحابہ صفہ یہاں رہ کر قرآن و حدیث کے معارف اپنے سینوں میں جمع کرتے رہتے تھے۔ حضرت سلمانؓ ان مجالس کی زینت تھے۔ کچھ مل جاتا تو شکر الٰہی بجا لاتے ورنہ صبر و شکر کرتے۔

یہ شب و روز جاری تھے کہ قریش مکہ کے حملہ آور ہونے کی خبر پہنچی۔ معلوم ہوا کفار کا لشکر دس ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل ہے۔ مکہ سے برابر خبریں پہنچ رہی تھیں۔ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔

حضرت سلمان فارسیؓ پہلی مرتبہ رسول اللہؐ کے ہمراہ آزاد مرد کی حیثیت سے شریک جنگ ہو رہے تھے لہٰذا ان کا جوش و ولولہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

عام مسلمانوں میں بھی اس وقت سخت جوش تھا۔ غزوہ احد میں حادثاتی شکست نے انہیں اس بات پر آمادہ کر رکھا تھا کہ وہ اس شکست کا بدلہ لیں۔ کفار مکہ میں بھی سخت جوش تھا کیونکہ وہ جنگ احد میں فتح حاصل کر چکے تھے۔ مسلمان اس سے فکرمند بھی تھے کہ گنتی کے اعتبار سے ان کا لشکر کم تھا۔ اس جنگ میں یقینی فتح کے لیے طرح طرح کے مشورے پیش کیے جا رہے تھے۔ حضرت سلمانؓ بھی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

”اے اللہ کے رسولؐ! ہم فارس والے جب بھی محصور ہو جاتے تھے تو اپنے اردگرد خندق کھود لیا کرتے تھے۔ آپ بھی ایسا ہی فرمایئے۔ مدینہ کے گرد ایک چوڑی اور گہری خندق کھدوایئے تاکہ دشمن اسے پار نہ کر سکے۔ ہم تو اپنے شہر میں ہوں گے۔ مکہ والے صحرا میں پڑے ہوں گے بالآخر تھک ہار کر واپس چلے جائیں گے۔“

کچھ لوگوں نے مخالفت بھی کی لیکن حضورؐ کو یہ مشورہ پسند آیا۔

حضور اکرمؐ نے زمین کے ایک حصے پر خندق کا نشان لگایا اور دس دس آدمیوں کے گروہ بنا کر ہر گروہ کے لیے چالیس ہاتھ زمین کھودنا لازمی قرار دیا۔

حضرت سلمانؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ زمین کھودتے ہوئے نیچے داخل ہوئے۔ کچھ گہرائی میں جانے کے بعد خندق کے درمیان ایک گول چٹان نکل آئی۔ چٹان اتنی سخت تھی کہ کدالیں ٹوٹ گئیں مگر چٹان نہ ٹوٹی اب مزید کھدائی کرنا دشوار ہوگیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ خندق کے اوپر چڑھے اور حضور اقدسؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پیش آنے والی رکاوٹ سے آگاہ کیا۔

"حضورؐ! ایک تو یہ ہوسکتا ہے کہ چٹان کو اس کے حال پر چھوڑ دیں اور اس سے ذرا ہٹ کر کھود لیں۔ ہم چونکہ آپ کی اجازت کے بغیر مقررہ نشان سے ادھر اُدھر ہونا پسند نہیں کرتے لہٰذا جیسا حکم ہو ہمیں فرمائیں تاکہ ہم ویسا کریں۔"

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "اے سلمان! ذرا مجھے اپنی کدال دکھائیے۔" آپؐ نے کدال ہاتھ میں لے لی اور خندق میں اتر گئے اور کدال اس چٹان پر ماری۔ ضرب کے ساتھ ہی ایک ایسی چمک پیدا ہوئی کہ پورا مدینہ روشن ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی آنحضرتؐ نے تکبیر کہی۔ تمام صحابہ نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ پھر آپؐ نے دوسری ضرب لگائی۔ اس سے بھی اسی طرح چمک پیدا ہوئی اور پھر آپؐ نے تیسری ضرب لگائی۔ اس سے بھی پہلے کی طرح روشنی پیدا ہوئی اور چٹان ٹوٹ گئی۔ پھر آپؐ خندق سے باہر نکل آئے۔

حضرت سلمانؓ نے عرض کیا۔ "یارسول اللہؐ! میں نے ایسی چیز کا مشاہدہ کیا ہے کہ اس جیسی چیز اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔"

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "آپ نے درست فرمایا۔ میں نے پہلی ضرب لگائی اور جو روشنی تم نے دیکھی اس میں میرے لیے حیرہ کے محلات شاہی اور مدائن کسریٰ روشن کر دیے گئے تھے۔ گویا وہ کتوں کے دانت ہیں۔ جبرائیلؑ نے مجھے خبر دی کہ میری امت ان پر غالب آئے گی۔ دوسری ضرب کی روشنی میں ارض روم کے سرخ محل دندان سگاں کے مانند میرے لیے نمایاں کیے گئے اور جبرائیلؑ نے اطلاع دی کہ میری امت کا غلبہ ان پر بھی ہوگا۔ تیسری ضرب کی روشنی جو تم نے دیکھی اس میں مجھے صنعا یمن کے محل کتوں کے دانتوں کی طرح چمکتے ہوئے دکھائی دیے۔ جبرائیل علیہ السلام نے ان کے ساتھ ہی یہ خوش خبری سنائی کہ میری امت کا ان پر قبضہ ہوجائے گا۔ پس تمہیں خوش خبری ہو۔"

منافقین نے ان فتوحات کی پیش گوئی سن کر کہا تھا۔ اے مسلمانو! تمہیں حیرانی نہیں ہوئی کہ تمہارا رسول تمہیں سبز باغ دکھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ یثرب میں سے حیرہ اور مدائن کسریٰ کو دیکھ رہا ہے اور مزید کہ تم انہیں فتح کرو گے حالانکہ حالت تو تمہاری یہ ہے کہ اپنے بچاؤ کے لیے خندق کھود رہے ہو۔

منافقین کا یہ طعنہ محض طعنہ ہی رہا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مخبر صادقؐ نے جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ چند سالوں میں... ہی پوری ہوگئیں۔ یمن تو عہد نبویؐ میں ہی فتح ہوگیا تھا۔ ایران، عراق، شام، مصر وغیرہ تمام ممالک خلافت راشدہ کے عہد میں مسخر ہوئے۔

قریش کا لشکر جرار جب مدینہ منورہ پہنچا اور اس نے اپنے سامنے وسیع و عریض خندق کو پایا تو ششدر رہ گئے۔ یہ طریقہ جنگ ان کے لیے بالکل نیا تھا اور ان کی توقع کے یکسر خلاف تھا۔ حضرت سلمان فارسیؓ کا نام تو ان قریش تک بھی پہنچا کہ جن کی تجویز نے انہیں ہراساں کر دیا تھا۔

حضرت سلمانؓ اس لحاظ سے مہاجر تھے کہ انہوں نے حق و صداقت کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑا اور انصار ہونے کا شرف بھی رکھتے تھے کیونکہ وہ ہجرت سے پہلے مدینہ طیبہ میں مقیم تھے اور حضورؐ کی تشریف آوری پر مدد پیش کرنے کی بھی سعادت حاصل کی تھی۔ مہاجرین کہتے سلمان ہم میں سے ہیں اسی طرح انصار بضد تھے کہ وہ ان میں سے ہیں۔ اللہ اللہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ جب رسول اللہؐ نے یہ سنا تو فرمایا سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں۔

یہ کوئی کم مرتبہ نہیں تھا کہ خدا کا رسولؐ انہیں اپنے اہل بیت میں شمار کرے۔ یہ سن کر دوسرے صحابہ کرام بھی حضرت سلمانؓ کی عزت و تکریم کرنے لگے۔ حضورؐ نے بھی حضرت سلمانؓ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ حضرت سلمان بیعت رضوان کرنے والوں میں بھی شامل تھے۔ ایرانی بادشاہ خسرو پرویز کا وفد حضور اقدسؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ترجمانی کے فرائض انجام دینے کے لیے حضرت سلمانؓ موجود تھے۔ یہ وفد ٹھہرا بھی حضرت سلمانؓ کے گھر تھا۔ عہد نامہ خیبر مرتب ہوا تو گواہوں میں حضرت سلمانؓ شامل تھے۔

خیبر سے فارغ ہوکر حضور اکرمؐ اپنے لشکر کے ہمراہ وادی القریٰ کے یہودیوں کی طرف روانہ ہوئے۔ یہودیوں نے مقابلے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ حضرت

سلمان لشکر اسلام میں شامل تھے۔ یہ بھی عجیب منظر تھا۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ آپ یہاں غلام بنا کر بھیجے گئے تھے اور اب فاتح قوم کے ایک مایہ ناز فرزند کی حیثیت سے اس سرزمین پر قدم رکھ رہے تھے۔

مکہ فتح ہوا تو حضرت سلمانؓ فاتحین مکہ میں شامل تھے اور اپنی قسمت پر ناز کر رہے تھے۔

حنین کی جنگ ہوئی۔ یہاں بھی آپ پیش پیش تھے۔

اس کے بعد طائف کا محاصرہ ہوا۔ بنو ثقیف نے بڑی مضبوط قلعہ بندی کر رکھی تھی۔ لشکر اسلام کو کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

حضرت سلمان فارسیؓ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔

''اب تو ایک ہی صورت ہے کہ بڑے بڑے پتھر قلعے کی فصیلوں اور دیواروں کی طرف پھینکے جائیں جس سے دیوار ٹوٹ جائے۔''

''یہ ممکن کیسے ہوگا۔ کون ہے جو ان بھاری پتھروں کو اس بلندی تک پھینک سکے۔'' کئی اصحاب بول اٹھے۔

''میں نے ملک فارس میں منجنیق دیکھی ہے۔ جو قلعہ شکنی کے لیے پتھر پھینکنے کے موثر ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ آپ کہیں تو میں منجنیق تیار کر دوں جس سے پتھر پھینکے جا سکتے ہیں؟''

حضورؐ نے اجازت دے دی۔ حضرت سلمانؓ نے صحابہ کی مدد سے منجنیق تیار کی اور اسے نصب کر دیا گیا۔ خندق کھودنے کے مشورے کے بعد یہ دوسرا اعزاز تھا جو سلمانؓ نے عربوں کو دیا۔

حضور سرور کائناتؐ نے رحلت فرمائی تو مسلمانوں پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ حضرت سلمانؓ کی تو دنیا ہی اجڑ گئی۔ حضور اکرمؐ کو آپ سے محبت مثالی تھی۔ حضورؐ آپ کو اپنے گھرانے کا ایک فرد قرار دے چکے تھے۔ حضرت زیدؓ کے بعد شاید حضرت سلمانؓ ہی واحد فرد تھے جنہیں سب سے زیادہ قرب رسول حاصل تھا۔ رات کے وقت پہروں رسول پاکؐ اور ان کے درمیان راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس وقت کسی اور شخص کو مخل ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اب جو حضورؐ کی رحلت ہو گئی تو حب رسول کا تقاضا تو یہ تھا کہ گریبان چاک کر لیں لیکن مسلمانوں کا یہ وتیرا نہیں۔ اس صدمے کو بار بد تر برداشت کیا اور غالباً یہ عہد بھی کر لیا تھا کہ جب تک زندہ رہیں گے مدینہ نہیں چھوڑیں گے۔ خانوادہ رسول کو کیا خبر کس وقت ان کی ضرورت پیش آ جائے اور وہ وہاں نہ ہوں۔

نبوت ختم ہو گئی تھی لیکن کار نبوت باقی تھا جسے ہمیشہ باقی رہنا تھا۔ قرب رسالت میں صحابہ کرام کی تربیت ایسی ہو گئی تھی کہ تبلیغ کا فریضہ انجام دے سکیں۔ حضرت سلمانؓ کو دین کی نعمت بڑی جدوجہد کے بعد میسر آئی تھی اس لیے ہر وقت یہی کوشش رہتی تھی کہ دوسرے لوگوں کو اس نعمت کی قدر کرائی جائے۔ وصال محبوب کے بعد آپ یہ فریضہ بخوبی انجام دے رہے تھے۔ باتوں باتوں میں حضورؐ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات اس طرح ذکر فرماتے کہ تبلیغ کا فریضہ بھی ادا ہو جاتا اور محبوب کی یاد میں گم ہونے کا موقع بھی مل جاتا۔ ابو عثمان الہندی کا بیان ہے کہ ایک روز میں حضرت سلمانؓ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ وہ اچانک اس درخت کی ٹہنی پکڑ کر اسے ہلانے لگے اور ایسا کرنے سے اس کے سارے پتے جھڑ گئے۔ آپ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے، اے ابو عثمان! تم نے مجھ سے یہ نہ پوچھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے کہا، حضرت آپ خود ہی بتا دیجیے۔ ارشاد فرمایا، میں بھی ایک دفعہ حضور نبی کریمؐ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے تھا۔ آپؐ نے بھی اسی طرح ٹہنی کو ہلایا تھا اور سب پتے جھڑ گئے تھے پھر حضورؐ نے فرمایا تھا کہ اے سلمان! تم پوچھتے کیوں نہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ حضورؐ بتا دیجیے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا تھا کہ جب کوئی مسلمان اچھی طرح سے وضو کرتا ہے اور پانچوں نمازیں خوب ادا کرتا ہے تو اس کی خطائیں اس سے ایسے ہی جھڑ جاتی ہیں جیسے کہ یہ پتے جھڑ گئے۔

حضرت سلمانؓ نے اس عمل سے نہ صرف ایک حدیث بیان کر دی کہ حضورؐ کا فرمان ہے بلکہ اتباع سنت کا مظاہرہ بھی کر دیا کہ اسی طرح درخت کی شاخ پکڑ کر ہلائی جس طرح حضورؐ نے ہلائی تھی اور اسی طرح سوال جواب بھی کیے۔

پیغمبر خدا نے حضرت سلمانؓ کو زہد اختیار کرنے کی وصیت فرمائی تھی اور فرمایا تھا کہ تمہارا سامان زیست مسافر سوار کے زادراہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے چنانچہ انہوں نے اس نصیحت پر حرف بہ حرف عمل کیا اور پوری زندگی فقر محمدی میں بسر کر دی۔ گھر کا اثاثہ مختصر رکھا۔ اس کے باوجود جب دنیا سے رخت سفر باندھنے کا وقت ہوا اور گھر کی چیزوں پر

نظر بزرگی تو بے چین ہو گئے۔

عہد صدیقیؓ کے اواخر میں ان کے انصار بھائی ابوالدرداؓ اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب چونکہ اسلام کی کرنیں دوسرے خطوں تک پھیلنے لگی ہیں تیزی سے فتوحات ہو رہی ہیں لہٰذا رشد و ہدایت کے لیے ان علاقوں تک جایا جائے اور وہاں رہ کر جہاد و تبلیغ میں حصہ لیا جائے۔ نو مسلموں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ باہمی مشاورت سے حضرت ابوالدرداؓ شام کی طرف روانہ ہوئے اور حضرت سلمانؓ نے عراق میں رہائش اختیار کر لی۔

ان کی سادگی اور زہد کا مظاہرہ عراق میں بھی ہوتا رہا۔ ایک ایرانی طرز کا پاجامہ اور ایک بڑی چادر یہی ان کا لباس تھا۔ وہ خود بھی تکلفات سے مبرا تھے اور دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتے تھے۔ ان کے انصاری بھائی حضرت ابوالدرداؓ نے اپنی خوش حالی کے بارے میں انہیں خط لکھا۔

"تم سے جدا ہونے کا صدمہ تو ہے لیکن یہاں مجھے خدا نے مال و دولت اور آل و اولاد سے بہت نوازا ہے۔"

حضرت سلمانؓ نے جواب میں لکھا۔

"محض مال کی کثرت اور اولاد کی زیادتی میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ بھلائی تو اس میں ہے کہ تمہارے علم میں اضافہ ہو۔ تمہارا وہ علم تم کو فائدہ بھی پہنچائے یعنی اس پر عمل کرنے کی توفیق بھی میسر ہو۔"

حضرت سلمانؓ عراق میں رشد و ہدایت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ پھر آپ کسی کام سے مدینہ آئے۔ ایک دوست کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا حضرت عمرؓ سے مل آؤ۔ آپ نے انکار کر دیا۔

"اب وہ خلیفہ ہیں" اگر میں خود ان کے پاس گیا تو ممکن ہے کوئی یہ سمجھے کہ میں ان سے کچھ طلب کرنے آ گیا ہوں:

"کیا تم ان سے ایسا گمان کرتے ہو؟ لوگوں کی زبانیں کون بند کرے گا۔ ہاں وہ خود مجھ سے ملنے آئیں تو مضائقہ نہیں۔"

حضرت عمرؓ کو اس گفتگو کے بارے میں علم ہو گیا یا انہوں نے خود سوچا۔ حضرت سلمانؓ کے مقام و مرتبہ کا خیال آیا اور ان سے ملنے چلے گئے۔

حضرت سلمانؓ نے جب ان کی تشریف آوری کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ حضرت عمرؓ تشریف فرما ہوئے تو آرام سے بیٹھنے کی خاطر تکیہ پیش کیا۔

"سلمانؓ، یہ کیا تکلف ہے۔"

"میں نے حضورؐ سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے پاس آئے اور وہ اس کے اکرام کے لیے تکیہ پیش کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کر دیتا ہے۔"

حضرت عمرؓ آبدیدہ ہو گئے۔ "سلمانؓ! آپ نے حضورؐ سے محبت کا حق ادا کر دیا ہے۔"

اس وقت عراق و ایران کی مہمات کا آغاز ہو گیا تھا۔ اسلامی فوجیں روانہ ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر ان مہمات کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ حضرت عمرؓ کو اسی وقت خیال آیا کہ اگر ان مہمات میں حضرت سلمانؓ کو شریک کیا جائے تو خاطر خواہ فوائد حاصل ہوں گے۔ یہ ان علاقوں سے بھی واقف ہیں اور وہاں کی زبان سے بھی۔ قرآن و سنت پر بھی انہیں عبور ہے۔

"سلمانؓ! کیا تم اپنے تجربے سے اسلامی فوجوں کو مالا مال نہیں کرو گے؟"

"جہاد فی سبیل اللہ تو مومن کی آرزو ہوتی ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے اس وقت ایران میں ہماری فوجیں لڑ رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ اس میں شریک ہوں۔ آپ کے حسب الحیثیت داعی اور رائد کے عہدے ہوں گے۔ آپ انہیں قبول کیجیے۔"

"مجھے کوئی عہدہ نہ بھی ملا ہوتا تو میں اس جہاد میں شریک ہونے سے گریز نہ کرتا۔"

داعی کے فرائض میں افواج کفار کو حملے سے پہلے اسلام کی دعوت دینا اور تین مشہور شرائط پیش کرنا شامل تھا۔

اسلام قبول کر لو۔

جزیہ ادا کرو اور اپنے مذہب پر قائم رہو۔

مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

"رائد" کے فرائض میں فوج کے افراد کو خوراک اور جانوروں کے چارے کی سپلائی شامل ہوتا تھا اور یہ بالعموم ہر اوّل دستے کا سردار بھی ہوتا تھا۔

عراق اس وقت ایرانی ساسانی سلطنت کا ایک جزو تھا۔ عراق سے جنگ کا مطلب ایران سے جنگ تھا۔ حضرت سلمانؓ اپنے ہم وطنوں سے جنگ کے لیے روانہ ہوئے۔

عراقی مہمات میں معرکہ بویب پہلی جنگ ہے جس میں حضرت سلمانؓ نے شرکت کی۔ سپہ سالار حضرت مثنیٰؓ تھے اور داعی و رائد حضرت سلمان فارسیؓ۔

دریائے فرات کے ایک طرف لشکر اسلام تھا اور دوسری طرف لشکر کفار۔ حضرت سلمانؓ نے داعی کے فرائض انجام دیتے ہوئے شرطیں پیش کیں لیکن ایرانی لڑنے پر بضد رہے۔ ایرانیوں نے کشتیوں کا پل پار کیا اور مقابلے پر آ گئے۔ حضرت سلمان ہراول دستے میں تھے۔ پہلا مقابلہ انہی سے ہوا۔ انہوں نے شمشیر زنی کا وہ مظاہرہ کیا کہ دشمن کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ پھر عام جنگ شروع ہوئی۔ حضرت مثنیٰ نے پل توڑ دیا۔ ایرانیوں کو راہ فرار کا موقع نہ مل سکا۔ کچھ تلواروں سے کٹے کچھ دریا میں ڈوب مرے اور شکست ہو گئی۔

ابھی اس معرکے کو ایک سال ہی ہوا تھا کہ جنگ قادسیہ کا آغاز ہو گیا۔ یہ جنگ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے نہایت اہم تھی۔ ایک لاکھ بیس ہزار کا ایرانی لشکر مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس کے مقابلے میں اسلامی لشکر تیس ہزار پر مشتمل تھا۔ اس جنگ کی اہمیت کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے بذات خود کمان کرنے کی خاطر مدینہ سے نکلنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن اکابر صحابہ نے مشورہ دیا کہ آپ کا مرکز خلافت میں رہنا نہایت ضروری ہے چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو سپہ سالار مقرر کیا حضرت سلمان اس جنگ میں بھی راعی اور رائد کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

یہ جنگ فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ اتنے بڑے لشکر کے ساتھ ایرانیوں کی شکست نے ان کے حوصلے پست کر دیے۔ اس کے بعد بھی وہ مقابلے پر آتے رہے لیکن اب ان میں وہ دم خم نہیں تھا۔

مسلمان برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ فتوحات ان کے قدم چوم رہی تھیں۔

ایک اور جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں مسلمان کسریٰ کے سفید محل تک پہنچ گئے۔ یہ شاہ ایران کا وہی سفید محل تھا جس کے فتح ہونے کا اللہ کے رسول نے وعدہ فرمایا تھا۔ اب مدائن سامنے تھا۔ یہ شہر کسریٰ ایران کا پایۂ تخت تھا۔ یہ شہر دریائے دجلہ کے کنارے پر واقع تھا۔ مسلمانوں کے پہنچتے ہی کسریٰ مدائن سے بھاگ گیا۔ مسلمان اس وقت کنارے پر تھے مدائن تک پہنچنے کے لیے دریا پار کرنا تھا اور دریا میں سخت طغیانی تھی۔ کسی کو امید نہیں تھی کہ دریا پار ہو جائے گا بس اللہ پر توکل کیے ہوئے تھے۔ حضرت سلمانؓ نے اس موقع پر پیش گوئی کی۔

"مسلمانوں کے لیے سمندر بھی اسی طرح مسخر کر دیے گئے ہیں جیسے کہ زمین۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں سلمان کی جان ہے مسلمان اس دریا سے اسی طرح فوج در فوج نکلیں گے جیسے کہ فوج در فوج اس میں داخل ہوئے تھے۔"

آپ کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ وہ تمام لوگ دریا سے اسی طرح باہر نکلے جس طرح کہ حضرت سلمانؓ نے فرمایا تھا۔ نہ کوئی چیز گم ہوئی اور نہ کوئی شخص ڈوبنے پایا۔

ایرانیوں نے جب مسلمانوں کو گروہ در گروہ دریا سے نکلتے دیکھا تو پکار پکار کر کہنے لگے ہمارا مقابلہ انسانوں سے نہیں جنوں سے ہے۔

مدائن کا سفید محل (قصر ابیض) کسریٰ ایرانی شہنشاہ یزدگرد کا مسکن تھا۔ وہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی یہاں سے بھاگ چکا تھا۔ اس کی فوج قلعہ بند ہو گئی۔ مسلمانوں نے محاصرہ کر لیا۔

حضرت سلمان فارسیؓ نے قلعہ بند ایرانیوں کو دعوت اسلام دی۔

"لوگو سنو! بے شک میں تمہارا ہم وطن بھائی ہوں۔ میں تمہارے سامنے تین چیزیں پیش کرتا ہوں۔ ان میں سے کوئی قبول کر لو۔ اگر اسلام قبول کر لو تو تم ہمارے دینی بھائی بن جاؤ گے یا پھر جزیہ دے کر ہماری ضمانت میں آ جاؤ ورنہ تیسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ تم سے قتال کیا جائے گا۔

قلعہ کے اندر سے جواب آیا کہ ہمیں جزیہ دینا قبول ہے۔

قلعہ کے دروازے کھل گئے اور ایران کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ایرانیوں کی باقی ماندہ فوج نے ایران کے شہر "جلولہ" میں پناہ لے لی اور شہر کے گرد خندق کھود کر مقابلے کی تیاریاں کرنے لگے۔ ایرانیوں کو یہاں بھی شکست ہوئی۔

حضرت عمرؓ ہی کے دور خلافت میں انہیں بے حد اصرار کے بعد مدائن کی گورنری سونپی گئی۔ یہ عہدہ بھی ان کی سادگی اور فقر میں کوئی تبدیلی نہ لا سکا۔ سرکاری اقامت گاہ میں کبھی نہیں ٹھہرے۔ مسجد میں اپنا بستر بچھا لیتے اور سو رہتے۔ بستر بھی کیا تھا بس ایک چادر تھی۔ وہی اوڑھنا تھا وہی بچھونا۔ اسی چادر میں جمعہ کا خطبہ دے لیا کرتے۔ بازار سے گزرتے تو کوئی محافظ ساتھ نہ ہوتا۔

انہی دنوں ایسا ہوا کہ ایک شخص شام سے آیا۔ اس

کے پاس انجیروں کی ایک ٹوکری بھی۔ وہ کسی مزدور کی تلاش میں سرِ راہ کھڑا ہو گیا جو اس کی گٹھری کو اٹھا کر منزلِ مقصود تک پہنچا سکے۔ اسی وقت حضرت سلمانؓ اس طرف سے گزرے۔ اونچا پاجامہ اور عبا زیب تن کیا ہوا تھا۔ صورت سے بھی غریب سی نظر آتے تھے۔

"اے مزدور! یہ گٹھری اٹھا کر میرے گھر تک پہنچا دو۔ جلدی کرو تمہاری مزدوری تمہیں مل جائے گی۔"

حضرت سلمانؓ آگے بڑھے اور گٹھری اٹھا کر سر پر رکھ لی۔ وہ شخص امیرانہ شان سے آگے آگے چلنے لگا۔ کچھ ہی دور چلے تھے کہ لوگوں نے آپ کو پہچان کر اس شخص سے کہا۔

"تو نے یہ کیا غضب کر دیا۔ اپنا بوجھ کس کے سر پر رکھ دیا۔ جانتا بھی ہے یہ کون ہے۔ یہ تو یہاں کے حاکم ہیں۔ تو نے انہیں مزدور سمجھ لیا۔"

اب تو وہ شخص سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔

"آپ مجھے معاف فرما دیں۔ بخدا مجھے علم نہیں تھا ورنہ کبھی ایسی تکلیف نہ دیتا۔"

"نہیں کوئی بات نہیں۔ لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے ہی تو میں حاکم بنایا گیا ہوں۔ اب تو یہ بوجھ تمہاری منزل تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔"

وہ شخص سزا کے خوف سے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ لاکھ چاہا کہ ان کے سر سے بوجھ اتار کر اپنے سر پر رکھ لے لیکن آپ نے اس کی ایک نہیں سنی اور سامان اس کی منزل تک پہنچا کر دم لیا۔

حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ اپنے گورنروں کے تقرر کے وقت ان کی جائداد کی فہرست مرتب کرایا کرتے تھے اور جب وہ عہدوں سے سبکدوش ہوتے تو فہرست بنا کر جائداد کا جائزہ لیا جاتا۔ اگر جائداد تنخواہ کی مناسبت سے زیادہ ہوتی تو اسے بیت المال میں جمع کرا دیتے۔

حضرت سلمانؓ گورنری سے فارغ ہوئے تو ان کی حالت سب سے انوکھی تھی۔ جب تقرر ہوا تھا اس وقت بھی کوئی جائداد نہ تھی، عہدے سے فارغ ہوئے تو اس وقت بھی ہاتھ خالی تھے۔

حضرت عمرؓ نے بیت المال سے پانچ ہزار دینار سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ وظائف بیت المال اور اسلامی خدمات پر دیے جاتے تھے۔ امہات المومنین کے بعد سب سے زیادہ وظیفہ اصحابِ بدر کا مقرر ہوا تھا یعنی پانچ ہزار درہم۔ حضرت سلمانؓ کو بھی اتنا ہی وظیفہ دیا گیا حالانکہ وہ بدری نہیں تھے۔ غالباً اس لیے کہ حضورؐ نے انہیں اپنے گھرانے کا ایک فرد فرمایا تھا۔

مدائن فتح ہونے کے بعد سے یہ شہر عراق کا صوبائی صدر مقام چلا آ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ محسوس کیا کہ جو عرب مجاہدین مدائن میں بستے ہیں وہ جسمانی لحاظ سے کمزور ہو گئے ہیں۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں۔ انہیں ایک ایسا شہر آباد کرنے کا خیال آیا جہاں کی آب و ہوا اچھی ہو۔ انہوں نے سپہ سالار حضرت سعدؓ کو لکھ بھیجا کہ وہ حضرت سلمان فارسیؓ کو ایسی جگہ کی تلاش میں بھیجیں جہاں کی آب و ہوا موافق ہو اور جانوروں کے لیے چارے کی بہم رسانی آسان ہو۔ وہ جگہ ایسی ہو جہاں میرے اور اس جگہ کے درمیان کوئی پل یا دریا حائل نہ ہو۔

حضرت سلمانؓ تلاش میں نکلے۔ دریائے فرات کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے لیکن کوئی جگہ پسند نہ آئی بالآخر کوفہ کی جگہ پہنچے۔ اور اسے تعمیر کے لیے پسند کر لیا۔ حضرت عمرؓ کے دور ہی میں اس شہر کی تعمیر ہوئی۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کا آخری حصہ تھا۔ جنگوں اور فتوحات سے کسی حد تک فرصت مل چکی تھی۔ حضرت سلمانؓ نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ کچھ فطری ضرورت بھی کچھ اتباعِ سنت کا خیال تھا۔ عمر بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ سوچ کر شادی کا ارادہ کیا۔

آپ کی شادی کے بارے میں کئی روایتیں مشہور ہیں۔

اپنے مواخاتی بھائی حضرت ابوالدرداؓ سے اپنی شادی کے بارے میں گفتگو کی۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر بنی لیث کی ایک نیک خاتون کا رشتہ ان کے ذہن میں آیا۔ انہوں نے حضرت سلمانؓ سے وعدہ کر لیا کہ وہ بہت جلد بنی لیث کے گھرانے میں جائیں گے اور ان کے لیے رشتے کی بات کریں گے۔

حضرت ابوالدرداؓ بنی لیث کے اس گھرانے میں گئے اور حضرت سلمانؓ کے تعارف کے طور پر ان کی فضیلت اور سبقتِ ایمانی کو خوب بیان کر کے رشتہ طلب کیا۔ ان لوگوں نے حضرت سلمانؓ کو رشتہ دینے میں پس و پیش کیا البتہ وہ لوگ اس پر بضد تھے کہ اس خاتون سے ابوالدرداؓ شادی کر لیں۔

ابوالدرداؓ اس بات چیت کے بعد واپس ہوئے اور

حضرت سلمانؓ سے ملاقات کی۔

"بھائی بات ایسی ہوئی ہے کہ مجھے کہتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس وہ مجھ سے اصرار کر رہے ہیں کہ میں وہاں شادی کر لوں۔"

یہ سن کر حضرت سلمانؓ کہنے لگے "بھائی حقیقت میں تو میں اس بات کا زیادہ مستحق ہوں کہ تم سے شرماؤں کیونکہ میں نے وہ رشتہ اپنے لیے طلب کرنے کی جسارت کی حالانکہ وہ رشتہ تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسمت میں لکھ دیا تھا۔"

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت سلمانؓ کافی عرصہ باہر رہنے کے بعد مدینہ منورہ میں آئے اور امیر المومنین حضرت عمرؓ سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے ان سے اپنے خاندان میں شادی کرا دینے کی خواہش کا اظہار کیا حضرت عمرؓ اس وقت تو خاموش ہو گئے مگر ان کے جانے کے بعد اپنے رشتہ داروں میں سے ایک جگہ حضرت سلمانؓ کے لیے رشتے کی بات چیت کی بلکہ سخت تقاضا بھی کیا۔ وہ لوگ حضرت عمرؓ سے تو کچھ نہ کہہ سکے لیکن انہیں یہ رشتہ قبول نہیں تھا۔ وہ لوگ وہاں آئے جہاں حضرت سلمانؓ ٹھہرے ہوئے تھے اور ان سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ انہیں زیادہ مجبور نہ کیا جائے اور اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے۔

دراصل حضرت سلمانؓ کا فقر و فاقہ دیکھ کر کوئی رشتہ دینے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ ابھی تک انہوں نے رہنے کے لیے کوئی گھر تک نہیں بنایا تھا۔

ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے کسی کنیز سے شادی کی تھی جس کا نام بقیرہ تھا۔

ایک دوسری روایت یہ ہے کہ بیوی کا نام تو بقیرہ ہی تھا لیکن وہ کوئی کنیز نہیں تھیں بلکہ بنی کندہ کے ایک گھرانے کی خاتون تھیں۔ یہ گھرانا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔

بہرحال مختلف روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے شادی کی تھی۔

شادی کے بعد انہوں نے اپنی سسرال ہی میں قیام فرمایا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ عربوں کا رواج تھا کہ دولہا تین روز تک اپنی سسرال کے پاس رہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت سلمانؓ کا اب تک کوئی ذاتی مکان نہیں تھا۔

جب نکاح کے بعد آپ مکان کے اندر داخل ہونے لگے تو در و دیوار کو منقش پردوں سے آراستہ دیکھا۔ آپ کو یہ تجاوت پسند نہیں آئی۔

آپ نے فرمایا "مکان کو بخار چڑھا ہوا ہے یا خانہ کعبہ بنی کندہ میں آ گیا ہے۔"

گھر کے لوگ شرمندہ ہو گئے۔ آپ اس وقت تک گھر میں داخل نہیں ہوئے جب تک صدر دروازے کے علاوہ باقی تمام پردے اتار نہ دیے گئے۔

گھر میں داخل ہوئے تو بہت سا ساز و سامان رکھا دیکھا۔ فرمایا "یہ کیا ہے؟" گھر والوں نے کہا۔ "یہ تمہارے اور تمہاری بیوی کے لیے ہے۔"

یہ سن کر فرمایا "میرے خلیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مجھے اس بات کی وصیت کی تھی کہ میرا سامان مسافر سوار کے زاد راہ کی طرح ہونا چاہیے۔ اسے یہاں سے ہٹا لو۔"

حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد حضرت عثمانؓ نے تخت خلافت پر قدم رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عمر و صحت میں برکت دی تھی۔ وہ عہد عثمانی میں بھی نہایت چاق و چوبند تھے چنانچہ 32 ھ میں یہ عہد عثمانی "بلنجر" کی دوسری مہم میں شریک ہوئے تھے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں ایران کی سرزمین "بلنجر" میں یہ جنگ لڑی گئی تھی۔ اس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی لیکن حضرت عثمانؓ کے عہد میں یہاں بغاوت ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ لشکر روانہ کیا۔ پہلی مہم کی طرح اس دوسری مہم میں بھی حضرت سلمانؓ شریک تھے۔

اسلامی لشکر شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ ترکوں کی کمک آ گئی اور صورت حال تبدیل ہو گئی۔ لڑائی شروع ہوئی لیکن اچانک یہ حادثہ ہو گیا کہ سپہ سالار عبدالرحمٰن بن ربیعہ شہید ہو گئے۔ مسلمان چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر گئے فرار کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ وقت حضرت سلمانؓ پر بہت بھاری تھا۔ باقی لوگ تو ایسے راستے پر ہو لیے جو نسبتاً آسان تھا لیکن حضرت سلمانؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ دشوار گزار راستے پر جا پڑے۔ یہ دونوں لڑتے لڑتے جیلان اور جرجان کی پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے بالآخر اپنے علاقے میں پہنچ گئے۔

تھکے ہارے پہنچے ہی تھے کہ دمشق میں ان کے مواخاتی بھائی حضرت ابو الدرداء کے وصال کی خبر ملی۔ تھکن اتارنے کی فرصت کسے تھی۔ فوراً پاپیادہ دمشق کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ حضرت ام الدرداء کی تعزیت کر سکیں۔

یہ سفر آپ کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔

واپس آتے ہی بیمار پڑ گئے۔ بیماری پیٹ کی تکلیف یعنی اسہال وغیرہ تھی۔ آپ کئی دن سے صاحب فراش تھے۔ کمزور ہو گئے تھے۔ چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی تھی۔ لوگ ان کی عیادت کے لیے آ رہے تھے۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ مرض کی تکلیف کی بجائے آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔

امام حسنؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سلمانؓ کا وقت وفات قریب آیا تو وہ رونے لگے۔ ان سے پوچھا گیا ''اے ابوعبداللہ! آپ کو کیا چیز رلاتی ہے حالانکہ حضور نبی کریمؐ نے مفارقت اختیار کی تو وہ آپ سے راضی تھے۔ فرمانے لگے بخدا میرا یہ رونا خوف مرگ کی وجہ سے نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ پیغمبر خدا نے ہم صحابہ سے ایک عہد لیا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک کا دنیا سے سامان زیست سوار کے زاد و راہ کی طرح ہونا چاہیے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو روز مدائن عیادت کے لیے آئے تو انہیں وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

''جب تم کوئی فیصلہ کرو یا حکم صادر کرو تو اس وقت خدا ترسی کو پیش نظر رکھو۔ اسی طرح جب تم مال تقسیم کرو تو تقسیم کے وقت تقویٰ شعار کرو اور ایسے ہی جب کوئی عزم و ارادہ کرو تو اس وقت خوف خدا سے کام لیا کرو۔ دوستوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

''تم میں سے جس کسی سے ہو سکے تو اس حالت میں جان دے کہ وہ حج یا عمرہ کے سفر میں ہو یا راہ خدا میں شہادت حاصل کرے یا پھر علوم قرآن کی تحصیل میں اپنی جان اپنے خدا کے سپرد کرے۔ تم میں سے ہرگز کوئی ایسی حالت میں نہ مرے کہ وہ قاتل ہو یا خیانت کرنے والا ہو۔''

وقت وفات قریب آیا تو آپ نے زوجہ کو بلایا اور ان سے پوچھا۔

''وہ مشک جو میں لنجر سے لایا تھا کہاں ہے؟''

''آپ کے حکم کے مطابق میں نے اسے محفوظ کر لیا تھا۔''

''اسے پانی میں ڈال دو اور اچھی طرح حل کرو پھر اسے میری چارپائی کے اردگرد چھڑک دو کیونکہ اب میرے پاس ایسے افراد آنے والے ہیں کہ جو انسان ہیں اور نہ جن۔''

ان کی بیوی نے جب اس خوشبو کو ان کی چارپائی کے گرد چھڑک چکیں تو آپ نے ان سے فرمایا میرے قریب سے ہٹ جاؤ۔ کچھ دیر بعد آنا۔

کچھ دیر بعد آپ کی زوجہ اور کچھ دوسرے لوگ واپس آئے تو آپ داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔

نماز جنازہ حضرت امام حسنؓ نے پڑھائی۔

سرزمین مدائن میں طاق کسریٰ کے جنوب مشرق میں آپ کو دفن کیا گیا۔ یہ مقام اب ان کی نسبت سے ''سلمان پاک'' کہلاتا ہے جہاں کربلائے معلیٰ سے گزرنے والا ہر زائر حاضر ہونا اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

روایات کے مطابق آپ کی تین بیٹیاں تھیں۔ ایک اصفہان میں اور دو مصر میں بیاہی گئیں۔

حضرت سلمانؓ کے توکل کا یہ عالم تھا کہ جو ملتا راہ خدا میں لٹا دیتے۔ سامان زیست مسافر سوار کے زاد راہ کی طرح جمع کیا تھا۔ ایک دو گدے، ایک آدھ چٹائی، ایک کپڑے دھونے کا برتن، ایک پانی کا گھڑا، تھوڑے سے کھانے کے برتن اور چند درہم نقد۔ یہ کل کائنات تھی جو انہوں نے ترکہ چھوڑا۔ اس کو بھی وہ کالے ناگ قرار دیتے تھے۔

احباب نے اس سامان کی قیمت کا اندازہ لگایا تو اندازہ ہوا کہ بیس تیس درہموں سے زیادہ کا سامان نہیں تھا۔ وہ بھی کچھ زیادہ درہم تھے جو گھر سے نکلے۔

☆☆☆

حضرت سعید بن المسیبؒ، حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا مجھ سے حضرت سلمانؓ نے فرمایا ہم دونوں میں سے جو شخص پہلے مر جائے تو وہ مرنے کے بعد اپنے ساتھی سے ملنے ضرور آئے۔ میں نے فرمایا کہ کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ حضرت سلمانؓ نے فرمایا ہاں کیونکہ مومن کی روح آزاد ہوتی ہے۔ حضرت سلمانؓ کی وفات حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے پہلے واقع ہو گئی۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز دوپہر کے وقت اپنی چارپائی پر پڑا قیلولہ کر رہا تھا کہ مجھے اونگھ سی آ گئی۔ حضرت سلمانؓ تشریف لائے اور مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا اور پوچھا اے ابوعبداللہ کیسے حال ہیں۔ فرمایا حال اچھا ہے۔ پھر پوچھا آپ نے وہاں کس عمل کو افضل پایا۔ جواب میں فرمایا۔ میں نے تو توکل کو عجب چیز پایا۔ اپنے اوپر توکل کو لازم کر لو توکل بڑی عمدہ چیز ہے۔''

ماخذات

سیرت سلمان فارسی، علامہ فضل احمد عارف

طبقات ابن سعد (اردو ترجمہ)

شکیل صدیقی

ایک معمولی سا جریدہ جس نے عروج و زوال کے مختلف ادوار سے گزر کر عالمی مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا۔ صحافت کا پیمانہ مقرر کیا جسے آج کے جرائد معیار سمجھ کر اپناتے ہیں۔ یہ کامیابی کوئی ایک دو دن میں حاصل نہیں ہوئی اس کے لیے انہیں نے کیا کیا پاپڑ بیلے یہ بھی کم دلچسپ قصہ نہیں ہے۔

لوگوں نے اخبار پڑھنا کب شروع کیا؟ یقیناً اس وقت سے جب کاغذ ایجاد ہوا۔ اخبار پڑھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیوں کہ وہ اپنے بارے میں تو جانتا ہی تھا لیکن دوسروں کے بارے میں بھی کچھ، بلکہ بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ ریڈیو کے آنے کے بعد بھی اخبار کی حیثیت ختم نہیں ہوئی۔

اخبار کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے وہ اس کے بعد کوئی اسے ہاتھ نہیں لگاتا ہے۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ خبریں

باسی ہوگئیں۔ والٹس ورلن نے سوچا کوئی ایسی چیز شائع کی جائے جو کم از کم مہینا یا ہفتہ بھر قارئین کی دل بستگی کا سامان کرے۔ چنانچہ میگزین شائع کیا گیا۔ ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہنامہ۔ ان میں خبروں کے علاوہ وہ سب کچھ ہوتا تھا جس میں قارئین دلچسپی رکھتے ہیں۔ مثلاً مضامین، سیاست، امور خانہ داری، صحت، صحافت، فلم و اسٹیج، ڈراما۔ ابتدا میں صرف پڑھنے کی چیزیں ہوتی تھیں، دیکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس لیے کہ تصویر کی چھپائی کا طریقہ رائج نہیں ہوا تھا۔ بہرحال وہ وقت بھی آگیا جب پرنٹنگ کے شعبے میں ترقی ہوئی اور تصاویر بھی شائع ہونے لگیں۔ مختلف سائز اور رنگ ڈھنگ کے میگزین بک اسٹالوں کی زینت بننے لگے۔

قارئین کو لبھانے اور ان کا دل میگزین سے چسپاں کرنے کے لیے نت نئے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ جن میں قسط وار کہانیاں، فوٹوگرافی اور لالہ رخوں کی ہوشربا اور قاتل تصاویر بھی شامل تھیں۔ میگزین کی دنیا میں اونچا مقام حاصل کرنے والے جرائد میں لائف سب سے مشہور ہے جو عرصہ 36 برس تک شائع ہوتا رہا اور پھر بند ہوگیا۔ بہرحال اس کی ایک تاریخ ہے۔۔۔ اور شاندار تاریخ۔

مشہور زمانہ امریکی میگزین لائف (LIFE) دو نسلوں تک لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتا رہا۔ یہ عرصہ 37 برس پر محیط ہے۔ اس دوران میں امریکا میں کتنی حکومتیں تبدیل ہوئیں اور کتنے صدور برسراقتدار آئے۔ لیکن کسی معاملے میں لائف پر عتاب نہیں آیا اور لوگ اس سستے اور معیاری میگزین کو اسٹالوں سے خریدتے رہے۔ وہ اشاعتی لحاظ سے بہت بڑا میگزین تھا لیکن اس کے مالکان نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس کی قیمت زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ ابتدائی دور میں اس کی قیمت صرف دس سینٹ تھی۔

اس میگزین کی اشاعت سے پیشتر فوٹوگرافی متحرک نہیں ہوئی تھی۔ فوٹوگرافر کو باقاعدہ پوز دینا پڑتا تھا اور دیر تک کیمرے میں منہ ڈال کر جس چیز کی تصویر کھینچنا مقصود ہو اسے دیکھنا پڑتا تھا۔ گرمیں کی دہائی کی ابتدا میں 35 ملی میٹر کا کوڈک کیمرا ایجاد ہوگیا کہ آپ جب چاہیں اور جہاں چاہیں تصویر اتار لیں۔ کوڈک کے اس کیمرے کی قیمت صرف ایک ڈالر تھی۔ لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میگزینوں میں تصاویر شائع کرنا آسان ہوگئیں۔ چنانچہ ٹائم کے مالک ہنری لوکس اور اس کے ساتھیوں نے منصوبہ بنایا! کہ TIME کے علاوہ ایک ایسا میگزین بھی شائع کیا جائے جس میں تصاویر کی صفحات کی تعداد زیادہ ہو۔ ان کا یہ خواب لائف میگزین کی شکل میں سامنے آگیا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ دنیا جہان کے سارے میگزینوں کا انحصار مدیر اور مصنفین پر ہوتا ہے لیکن لائف وہ میگزین تھا جو اپنے فوٹوگرافروں کے ذریعے سے چلتا تھا۔ ماہر فوٹوگرافر اس کے دفاتر کے گرد چکر کاٹتے تھے کہ انہیں کسی طرح سے اس کے اسٹاف میں شامل کرلیا جائے۔ جب کوئی فوٹوگرافر لائف کے اسٹاف میں شامل ہوجاتا تھا تو اسے تربیت دی جاتی تھی پھر کام پر لگایا جاتا تھا۔ اس کے نمائندے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے جو اہم واقعات کی تصاویر کھینچتے رہتے تھے۔

لائف کے نام سے 1883ء سے 1936 تک ایک معلوماتی میگزین شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ میگزین سٹی آرٹسٹ اسٹوڈیوز برادرز سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے دو پارٹنر تھے، جان مچل اور ایڈرو بوطر۔ مچل ستر فی صد کا حقدار تھا جب کہ باقی تیس فی صد بوطر کو ملتے تھے۔ ان کی موت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر چونکہ معاشیات میں ماہر تھا اس لیے رسالے کا حساب کتاب اور اس کے اخراجات پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کاغذ کس ملک میں سستا ملتا ہے اور کون سا آرٹسٹ کتنی رقم میں اچھے کارٹون بنا سکتا ہے۔ کس فوٹوگرافر کی کھینچی ہوئی تصاویر کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ اس لیے میگزین کامیابی سے چلتا رہا۔

37 سالہ مچل دس ہزار ڈالر لے کر میدان میں آیا تھا۔ یہ رقم اسے اپنے والد کی طرف سے ترکے میں ملی تھی۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور لائق شخص تھا۔ اس لیے ایڈیٹوریل سے لے کر مضامین تک اس کا انتخاب عمدہ ہوتا تھا۔ وہ قارئین کی دل چسپی سے کما حقہ واقف تھا۔ اس لیے لوگ اس رسالے کا انتظار کیا کرتے تھے۔

جب پرنٹنگ کے شعبے میں پیش رفت ہوئی اور جست کی پلیٹیں چھپائی کے لیے تیار کی جانے لگیں تو مچل نے اس سے فائدہ اٹھایا اور انہیں لائف کی چھپائی کے لیے استعمال کرنے لگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ چھپائی کا معیار بڑھ گیا اور میگزین پہلے کی نسبت دیدہ زیب ہوگیا۔ لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی اور اس کی اشاعت میں بھی اضافہ ہوگیا۔

لائف ایک معیاری میگزین تسلیم کیا جاتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کا مقابلہ کسی اور رسالے سے نہیں

تھا۔ "جج" اور "پک" نامی دو رسالے قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے رکھتے تھے۔ اس لیے کہ وہ رسالے کو کسی کے لیے نہیں بلکہ عام لوگوں کی دل چسپی کے لیے شائع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ میگزینوں میں عریانیت اور فحاشی کو بطور ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک کامیابی کی پہلی سیڑھی یہی تھی۔ مقصد براری کے لیے انہوں نے بہت سی ماڈل گرلز کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں جو اسٹوڈیوز میں حسب منشا پوز کھچوانے میں دریغ نہیں کرتی تھیں۔

لائف رسالے کا پہلا ادبی مدیر جیڈ فورڈ مارٹن تھا۔ اس نے انہی دنوں ہارورڈ یونی ورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔ اس نے رسالے کا پہلا سلوگن کچھ اس طرح سے بنایا تھا کہ جہاں زندگی (LIFE) ہوتی ہے، وہیں اُمید ہوتی ہے۔

اس نے پہلے اداریے میں لکھا تھا۔ "ہماری خواہش ہے کہ ہم آپ کو نت نئی دلچسپیاں فراہم کریں۔ دنیا میں جہاں اس وقت نااتفاقی اور بے راہ روی کا دور دورہ ہے وہاں ہم آپ کے لیے خوشیاں مہیا کریں گے اور محبت و اخوت کے گیت گنگنائیں گے۔ ہم مذہب، سیاست، فیشن، سوسائٹی، ادب، اسٹیج، اسٹاک ایکسچینج اور پولیس اسٹیشنوں کی کارکردگی کے بارے میں بھی بہت کچھ چھاپیں گے جو ہمیشہ سے آپ کے دل پسند موضوعات رہے ہیں۔ یقین جانیے کہ ہم کسی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھ دیانت داری برتیں گے اور جو کچھ ہمارے سامنے ہے، اسے بلا کم و کاست بیان کر دیں گے۔ ڈھکی چھپی باتوں سے اجتناب کریں گے۔

اس وقت کے بہترین لکھنے والے اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور انہوں نے باقاعدگی سے اپنی تحریریں رسالے کو ارسال کرنا شروع کر دیں۔ ان کے علاوہ ملک کے بہترین کارٹون بنانے والوں نے بھی اپنی تخلیقات میگزین کو ارسال کرنا شروع کر دیں۔ یوں بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہر فرد اس رسالے سے متعارف ہو گیا اور اسے اپنے مزاج کے مطابق مواد حاصل ہونا شروع ہو گئے۔

میگزین چونکہ سیاست پر بھی اپنے خیال افروز مضامین شائع کر رہا تھا، اس لیے لوگ اسے نظر انداز نہیں کر پاتے تھے۔ اپنے بے لاگ تبصروں کی وجہ سے لوگ اسے خریدتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ کسی بھی معاملے میں اس کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یعنی لائف اس معاملے میں کیا رائے رکھتا ہے؟

چنانچہ جب جرمنی نے 1914ء میں بلجیئم پر حملہ کیا تو مچل نے اس کے خلاف زبردست اداریہ لکھا۔ اس کے بعد ایسی مہم چلائی کہ امریکا کو مجبوراً اس جنگ (پہلی عالمی جنگ) میں 1917ء حصہ لینا پڑا۔ لائف نے جرمنی کے حکمراں کو خونی درندے کا خطاب دیا جس نے امریکا کی توہین کی اور بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جرمنی کے حکمراں نے ریڈ کراس کی نرسوں پر گولی چلوادی تھی اور ان پر الزام عائد کیا تھا کہ وہ امریکا کے لیے جاسوسی کرتی ہیں۔

لائف کا مدیر مچل 1918ء میں آنجہانی ہو گیا لہٰذا دوسرے مدیر گبسن نے اس رسالے کو دس لاکھ ڈالر میں خرید لیا مگر وہ لائف کو چلا نہیں سکا، اس لیے اسے اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد لوگوں کا لائف اسٹائل اور رجحانات تبدیل ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ جن خواتین کی تصاویر شائع کرتے تھے وہ فرش تک رگڑ کھانے والے اسکرٹ پہنتی تھیں جب کہ اسکرٹ سمٹ کر گھٹنوں سے اوپر چلا گیا تھا۔

لائف کے مدیر کی کوشش تھی کہ میگزین سارے خاندان میں پڑھا جائے۔ عریانیت اور فحاشی اسے چھو کر بھی نہ گزرے۔ جب کہ وہ رسالے جن میں جنس اور فحاشی پر زور تھا اپنی اشاعتیں بڑھا رہے تھے۔ چنانچہ رسالے کے مالک نے "نیو یارکر" اور "ٹائمز" نامی رسالے کے مدیر کو زیادہ تنخواہ کا لالچ دے کر لائف کی ادارت میں شامل کر لیا۔

اس نے رسالے میں انقلابی تبدیلیاں کیں جو قارئین کو پسند آئیں۔ حد یہ ہے کہ "نیو یارکر" نام کے ایک رسالے نے جب 1925ء میں اپنی اشاعت کا آغاز کیا تو اپنا انداز لائف جیسا رکھا۔ اس کے اداریے کا انداز بالکل ویسا ہی تھا اور آرٹ کے شعبے میں نقل کر کے اسے لائف جیسا بنا رہا تھا۔ اسی اثنا میں دو رسالے اور اس کی نقل کرتے ہوئے چھپنا شروع ہو گئے جس سے لائف کی اشاعت پھر متاثر ہو گئی۔

رسالے کا مالک گبسن ان واقعات سے اتنا بددل ہوا کہ وہ لائف سے دست بردار ہو گیا اور اس نے مالکانہ حقوق کلیئر میکس ویل کو سونپ دیے۔

لائف کے قارئین کی تعداد 1920ء میں ڈھائی لاکھ ہوچکی تھی لیکن نت نئے رسالوں کا مقابلہ نہ کرپانے سے اس کی اشاعت روبہ زوال تھی۔ اس کے سالانہ خریدار کم ہورہے تھے۔ نئے پبلشر میکس ویل اور اس کے مدیر جارج اینگلسٹن نے فیصلہ کیا کہ رسالے کو ہفت روزہ سے ماہانہ کردیا جائے۔ اس زمانے میں رسالے کا اداریہ لوگ شوق اور جستجو سے پڑھتے تھے تاکہ میگزین کا نقطہ نظر معلوم ہو اور امریکا کس معاملے میں کیا پالیسی اختیار کررہا ہے اس کا پتا چلتا رہے۔

ہنری لوکس ایک قدیم سیاسی میگزین ''ٹائم'' کا مالک تھا جو 1923ء سے باقاعدگی سے شائع ہورہا تھا۔ اس کے سیاسی تجزیوں اور مضامین کی بنا پر سنجیدہ افراد اسے شوق سے پڑھتے تھے اور اس کا ریکارڈ رکھا کرتے تھے۔ اس نے 1930ء میں لائف کے مالک میکس ویل سے اس کا میگزین خریدنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میکس ویل اس پر تیار ہوگیا۔

سیاسی خبریں دینے والے میگزین ''ٹائم'' کے مالک ہنری لوکس نے لائف رسالے کے مالکانہ حقوق خرید لیے تاکہ وہ خود اسے شائع کرسکے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی اشاعت بہتر بنا سکتا ہے۔ اس نے یہ میگزین بانوے ہزار ڈالر میں خریدا تھا۔ اس نے پرانے مالکان سے کہا تھا کہ لائف اب نئی انتظامیہ کے تحت شائع ہوگا اور باقی چیزیں فروخت کرنے کا اسے اختیار ہوگا۔ میکس ویل نے اس سے اتفاق کیا۔

ہنری لوکس نے میگزین ''جج'' کے مالکان کو لائف کے سالانہ خریداروں کی فہرست، فیچرز اور تصاویر فروخت کردیں تاکہ نئے انداز سے کام شروع کیا جائے اور کسی پرانی چیز کا عکس نہ آئے۔

لائف کے اسّی سالہ مدیر ایڈورڈ سینڈفورڈ مارٹن (یہ اس کا تیسرا مدیر تھا) نے وقت رخصتی تمنا لکھا تھا جو قابل مطالعہ ہے۔ ''اب لائف نئے مالکان کے ہاتھ میں جارہا ہے جو ہم سے زیادہ صحافتی تجربہ اور فہم و دانش رکھتے ہیں۔ ہم وہ ہیں جنہوں نے 1883ء میں اس کی بنیاد رکھی تھی۔ حالات جس طرح سے تبدیل ہورہے ہیں اور دنیا نت نئی حقانیت سے آشنا ہورہی ہے اس سے اپنے لوگوں کو آگاہ کرنا ضروری ہے۔ ہم ایک بڑی لکھی اور دانش ور قوم ہیں اس لیے ہمارا فہم اور ادراک دوسروں سے سوا ہونا چاہیے۔ ہم اس کے لیے کوشاں رہیں گے کہ دنیا کو سمیٹ کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچاتے رہیں۔''

لوکس کے پاس میگزین شائع کرنے کا وسیع تجربہ اور مہارت تھی اس لیے کہ ہائی اسکول کے زمانے ہی سے اسے خبروں، اخبار اور تحریروں سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں اس کا ایک دوست بریٹن ہیڈن بھی اس کا ساتھ دیتا تھا۔ دونوں اسکول کے میگزین کے اخبار کے انتظامی مدیر ہوگئے۔ ان کا اشتراک کالج میں بھی جاری رہا۔ انہوں نے ییل ڈیلی نیوز بھی شائع کیا۔ 1921ء میں ہیڈن 'بالٹی مور نیوز' کے لیے کام کرنے لگا۔ اس اثنا میں ان دونوں کو خیال آیا کہ کیوں نہ وہ خود اپنا میگزین شائع کریں۔ ادھر ادھر کام کرنے کے بجائے کچھ اپنا ہونا چاہیے۔ انہوں نے اس کا نام 'ٹائم' تجویز کیا۔ ڈگریاں لے کر انہوں نے 1923ء سے میگزین شائع کرنا شروع کردیا۔ وہ اس میں ساری دنیا کی خبریں دینا چاہتے تھے اور اسے سنجیدہ اور باوقار بنانا چاہتے تھے۔ تصاویر اور واقعات سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔

لوکس نے لائف کو ہفت روزہ کردیا جس میں سیاست، معاشرت، حالات حاضرہ اور فلم آرٹ سب ہی کچھ تھا۔ وہ بڑے سائز کا ایک میگزین تھا جسے میز پر رکھنے کے بعد میز سجی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور صاحب خانہ اعلیٰ ذوق نظر آتا تھا۔

ہنری لوکس نے لائف کا پہلا شمارہ 23 نومبر 1936ء میں شائع کیا۔ اس سے پیشتر لوکس نے 'ٹائم' اور 'فارچون' جیسے دو رسالے اور سنبھال رکھے تھے۔ لائف کا نیا انداز یہ تھا کہ کیمرے سے کھینچی ہوئی تصاویر کو اہمیت دی جائے۔ دراصل اس وقت تک قارئین کی نظر میں اہمیت اختیار نہیں کرتا جب تک کہ اس کی تصویر نہ شائع کی جائے۔ لائف کے پہلے شمارے کی قیمت پانچ سینٹ تھی۔ جس میں الفریڈ آئن اسٹائن پر چھوٹا سا مضمون اور بہت سی تصاویر تھیں۔

لائف کے مالک ہنری لوکس نے اداریہ لکھا تھا۔ ''لائف کو دیکھنے کا مطلب ہے کہ آپ دنیا دیکھ رہے ہیں۔ دنیا میں ہونے والے واقعات کے آپ عینی شاہد ہیں۔ دنیا کتنی خوش شکل اور بدشکل ہے یہ آپ کو میگزین سے معلوم ہوجائے گا۔ دنیا میں جتنی حیرت ناک چیزیں ہیں اور جو واقعات رونما ہورہے ہیں انہیں آپ لائف میں دیکھ سکیں گے۔ نئی ایجادات، مشینیں، افواج، چاند

اور زمین کے دور دراز گوشوں میں جو کچھ موجود ہے وہ لائف میں موجود ہے۔

لائف یعنی زندگی رواں اور متحرک ہے۔ یہ سب افراد کے متحرک رہنے سے ممکن ہوا ہے۔ انسان [illegible] بناتا ہے، نئے وطن دریافت کرتا، میلوں دور کی چیزیں دیکھ لیتا اور وہ چیزیں بھی دیکھ لیتا ہے جو پس دیوار ہوتی ہیں۔

انسان دنیا میں تنہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ قدرت نے عورت کو بھی پہلو سے لگایا ہوا ہے۔ لائف مرد، عورت اور بچوں کو اپنے صفحات پر شائع کرتا ہے تاکہ آپ کو پتا چل جائے کہ دنیا میں کتنی بوقلمونی ہے اور خاندان کیا ہوتا ہے۔

جب لائف کا پہلا شمارہ نئی انتظامیہ کے تحت شائع ہوا تو ریاست ہائے متحدہ امریکا مایوسی میں گھرا ہوا تھا اور دنیا بتدریج جنگ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایڈولف ہٹلر سارے خطے پر چھایا ہوا تھا اور اس کے ارادے نیک نہیں تھے۔ اسپین میں جنرل فرانکو کی باغی فوج میڈرڈ تک پہنچ چکی تھی۔ جرمنی کے طیارے اسپین پر منڈلا رہے تھے۔ اٹلی کے ڈکٹیٹر میسولینی نے ایتھوپیا کو اپنا حلیف بنا لیا تھا۔

لوکس نے فضا میں جو خوف طاری تھا اسے یکسر نظرانداز کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ خبریں تو سب ہی سنتے اور اخبارات میں پڑھتے ہیں۔ اس نے گرما گرم واقعات اور ان کی تصاویر زیادہ سے زیادہ شائع کیں۔ اس شمارے میں تصاویر کے پچاس صفحات تھے۔ رسالے کو اعلا کاغذ پر شائع کیا گیا تھا۔ قارئین پسند کرتے تھے۔ لوکس نے پیش گوئی کر رکھی تھی کہ لائف کی اشاعت میں تقریباً دو لاکھ کا اضافہ ہو جائے گا لیکن چار ماہ بعد رسالے کی اشاعت 380,000 سے بڑھ کر دس لاکھ ہو گئی تو سب کی آنکھیں فرط حیرت سے وا ہو گئیں۔

اگست 1942ء جب ڈیٹرائٹ میں مزدوروں کی صورت حال بگڑنے لگی اور وہ مطالبات منوانے کے لیے سڑکوں پر آ گئے تو لائف نے اپنے اداریے میں لکھا کہ صورت حال ناگفتہ بہ ہو رہی ہے۔ امریکی قوم کو چاہیے کہ وہ بیدار ہو جائے اور اس مسئلے پر سر جوڑ کر بیٹھے۔ وہ ڈیٹرائٹ جس کی فوج ہٹلر کو پسپا کر سکتی ہے اگر اس کا رخ امریکیوں کی طرف ہو گیا تو وہ اس کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا سکتی ہے۔

ڈیٹرائٹ کا میئر اس اداریے کو پڑھ کر مشتعل ہو گیا اور اس نے بیان دے ڈالا کہ ڈیٹرائٹ کے لوگ اتنے ہی محب وطن ہیں جتنا کہ کسی اور ریاست کے لوگ۔ لائف میں شائع ہونے والا اداریہ محض بے پر کی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسے لاف گزاف کا پلندا کہنا بہتر ہوگا۔ لائف زرد صحافت کی نمائندگی کر رہا ہے۔ میری گزارش ہے کہ اس کے الٹے سیدھے تجزیوں کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے۔

اس اداریے کا امریکی حکومت نے نوٹس لے لیا اور اس پر پابندی لگا دی۔ شمالی امریکا کے باہر اس کی جتنی بھی کاپیاں فروخت کی گئی تھیں انہیں بک اسٹال سے واپس لے لیا گیا اور تلف کر دیا گیا۔

1941ء میں جب امریکا نے جنگ میں حصہ لینے کے لیے قدم اٹھایا تو لائف نے بھی اس کی کوریج دینے کے لیے پوری تیاری کر لی۔

لائف نے جولائی 1942ء میں فوجیوں کے لیے مصوری کا ایک مقابلہ منعقد کیا۔ اسے ہر عہدے پر فائز فوجی کی طرف سے ڈیڑھ ہزار تصاویر موصول ہوئیں۔ جج صاحبان نے ساری تصاویر دیکھنے کے بعد بہترین مصور کو ایک ہزار ڈالر انعام کا مستحق ٹھہرایا۔ ان میں سے لائف نے مصوری کے سولہ نمونوں کو اپنے رسالے میں شائع کرنے کے لیے بھی منتخب کر لیا۔ واشنگٹن کی نیشنل گیلری نے بھی ان میں سے 117 پینٹنگز کی نمائش کی۔

جنگ کے دوران ہی 1944ء میں ٹائم اور لائف کے چالیس جنگی نمائندہ نگار صرف مرد نہیں تھے، بلکہ ان میں چھ خواتین بھی شامل تھیں۔ جنگ کے دوران ہی لائف کے کئی فوٹوگرافر بارودی سرنگوں پر پاؤں پڑنے سے ہلاک ہو گئے۔ ان میں وہ فوٹوگرافر بھی شامل تھا جس نے نارمنڈی کے ساحل پر پڑے تین مردہ امریکیوں کی تصاویر کھینچی تھیں۔ ان تصاویر کو شائع کرنے سے پیشتر لائف کو محکمۂ دفاع سے رجوع کرنا پڑا۔ اس لیے کہ مردہ امریکیوں کو دیکھ کر ساری قوم کا حوصلہ پست ہو سکتا تھا۔ یہ امریکی فوجی تابوت میں لیٹے تھے اور نہ امریکی پرچم میں لپٹے ہوئے تھے۔ جب محکمۂ دفاع نے یہ سوچ کر اجازت دے دی کہ یہ حقیقت ہے اور اس سے منہ نہیں موڑا جا سکتا تو لائف نے اپنے سرورق پر وہ تصویر چھاپی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی لائف نے اپنے جنگی نامہ نگار سارے محاذوں پر پھیلا رکھے تھے اور اپنی قوم کو جنگ کے بارے میں مکمل معلومات اور تصاویر فراہم کر رہا

تھا۔ یورپ سے لے کر امریکا تک جنگ کی ساری خبریں اس میں موجود ہوتی تھیں۔ کئی موقعوں پر حکومت نے اسے اپنے پروپیگنڈے کے لیے بھی استعمال کیا۔

قاہرہ کی کونسل آف منسٹرز نے مئی 1950ء میں مصر میں لائف پر پابندی عائد کر دی اور حکم جاری کر دیا کہ اس کی ساری کاپیاں جو بک اسٹالوں پر رکھی ہیں انہیں ہمیشہ کے لیے ضبط کر لیا جائے۔ اس حکم نامے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی تھی لیکن حکومتی ارکان کو لائف کی 10 اپریل 1950 کی اشاعت پر برہمی تھی جس میں مصر کے شاہ فاروق کے بارے میں ایک کہانی بعنوان 'مصر کا اذیت ناک بادشاہ' شائع کی گئی تھی جو ان کے نزدیک مصر کے لیے توہین آمیز تھی۔

پچاس کے عشرے میں لائف کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا اس لیے کہ اس میں دنیا کے ہر بڑے مصنف نے اپنی تحریریں بھیجنا شروع کر دی تھیں۔ لائف نے 1952 میں ادب کے بڑے مصنف ارنسٹ ہیمنگوے سے ایک ناول لکھنے کا معاہدہ کیا۔ چنانچہ ہیمنگوے نے ناول دی اولڈ مین اینڈ دی سی لکھنا شروع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد ہیمنگوے سے لائف نے ایک اور معاہدہ کیا جس میں لائف نے فرمائش کی کہ وہ ان کے لیے بل فائٹنگ پر چار ہزار الفاظ میں ایک مضمون لکھے۔ ہیمنگوے نے دس ہزار الفاظ کا ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون انہوں نے اسپین جا کر بل فائٹنگ دیکھ کر 1959ء میں قلمبند کیا تھا۔ جسے لائف نے اپنے میگزین میں شائع کرنے کی بجائے علیحدہ سے ناول کی صورت میں 1985ء میں دی ڈینجرس سمر کے نام سے شائع کیا۔

امریکی صدر ہیری ایس ٹرومین جب اپنی معیاد پوری کر کے رخصت ہو رہے تھے تو انہوں نے اعلان کیا کہ ان کی تحریر کردہ یادداشتوں کو لائف میگزین ذمے داری سے اپنے پاس محفوظ کرے گا۔ صدر نے کہا کہ 1954ء میں ان پر کوئی پابندی نہیں ہوگی اس لیے وہ یہ کھل کر بتائیں گے کہ ان کے دور حکومت میں ان کی انتظامیہ نے کیا کچھ کیا تھا اور کیا انہیں نہیں کرنے دیا گیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ اس سے پہلے لائف میگزین نے جتنے بھی صدور کی یادداشتیں شائع کی تھیں وہ نہایت دبیدہ زیب اور دل فریب تھیں۔

دسمبر 1954ء میں دورِ حکومتی ڈیڈ رج روڈیکلی امریکی

مگر افریقی نژاد خاتون تھی جس کی تصویر لائف نے اپنے سرورق پر شائع کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ نیگرو قوم کو بھی اہمیت دیتا ہے اور حقیقت سے منہ نہیں موڑتا۔

آر جے ریسن نے 1957ء میں اپنا ایک تحقیقاتی مضمون لائف میگزین میں شائع کرایا جس میں بتایا گیا تھا کہ ایک خاص قسم کی کھمبی سے نہ صرف یہ کہ نشہ آور ادویہ بنائی جاتی ہیں بلکہ اب منشیات فروش نے اپنی توجہ بھی اس کی طرف مبذول کر لی ہے اور ایل ایس ڈی جیسا نشہ بھی اس سے بنایا جانے لگا ہے۔ اس مضمون کی اشاعت سے امریکا بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے بعد لائف میگزین نے اپنی ایک نمائندہ وٹوھی لیرنی کو خاص طور پر میکسیکو بھیجا۔ اس نے واپس آکر اس کی تصدیق کی کہ میکسیکو میں حقیقت میں ایک ایسی کھمبی پائی جاتی ہے جس سے نشہ آور چیزیں تیار کی جا رہی ہیں۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد سائنس سے شغف رکھنے والے کئی اور مضمون نگاروں نے اپنے تحقیقی مقالات لائف میگزین کو اشاعت کے لیے روانہ کیے۔

جنگ کے دوران میں لائف میگزین کا یہ سلوگن بہت مشہور ہوا کہ اگر دنیا کو دیکھنا ہو تو لائف کو دیکھیے۔

لائف میگزین کی اشاعت 1950ء میں گرنا شروع ہو گئی۔ مئی 1959 میں لائف کی انتظامیہ نے اعلان کیا کہ اس کی قیمت میں کمی کی جا رہی ہے اور اب یہ 25 سینٹ کی بجائے 19 سینٹ میں دستیاب ہوگا۔ اشاعت گرنے کی واحد وجہ ٹیلی وژن کا آغاز تھا جس میں پڑھنے کی بجائے دیکھنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ جیتی جاگتی اور متحرک زندگی!

ساٹھ کی دہائی شروع ہوتے ہی لائف میگزین میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سیاست اور معاشرت کے علاوہ اس میں فلم پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ فلمی اداکاراؤں اور اداکاروں کی تصاویر اور ہدایت کاروں کے رنگین انٹرویوز شائع ہونے لگے۔ عوامی دلچسپیوں سے مرصع میگزین اپنی اشاعت میں کوئی بڑھوتری تو نہیں کر سکا لیکن کچھ عرصے کے لیے اس کی گرتی ہوئی اشاعت ٹھہر گئی۔

صدر کینیڈی اور ان کا خاندان، ویت نام کی بے مقصد جنگ اور اپالو پروگرام اس زمانے میں اس کا خاص موضوع تھے۔ 1964ء کی ایک اشاعت میں الزبتھ ٹیلر اور رچرڈ برٹن کے ساتھ اس کا عشق، لائف کا موضوع بن گئے۔

۔ان کی عشقیہ کہانی کی جزئیات جاننے کے لیے ایک نمائندے رچرڈ میری مین نے الزبتھ ٹیلر کے ساتھ نیویارک، کیلیفورنیا اور پیرس تک اس کے ساتھ سفر کیا۔ اس کے بعد ایک دھماکا خیز مضمون شائع کیا جس میں الزبتھ ٹیلر نے کہا کہ وہ کوئی سیکس کوئن یا سیکس سمبل نہیں ہے۔ ایسی عورتیں تو اکثر کے گرد چکر کاٹتی نظر آتی ہیں۔ میں ایک باعزت اداکارہ ہوں اور معاشرے میں اپنا مقام جانتی ہوں۔ میں رچرڈ برٹن سے محض عشق نہیں لڑا رہی ہوں، اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔

لائف میگزین کو قومی سطح پر عزت اور مقام حاصل ہو چکا تھا لہٰذا مارچ 1967ء میں اسے کولمبیا یونی ورسٹی گریجویٹ اسکول آف جرنلزم کی طرف سے نیشنل میگزین ایوارڈ دیا گیا۔

لائف ویت نام میں ہونے والی جو تصاویر شائع کر رہا تھا اس کی بنا پر اسے اہمیت حاصل تھی۔ 1969ء میں اس نے امریکی مشن برائے تسخیر ماہتاب کی تصاویر شائع کیں جو بہت سنسنی خیز تھیں۔ اس کا مدیر سارے ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا مگر اس کی اشاعت روز بہ روز کم ہو رہی تھی۔ چنانچہ جنوری 1971ء میں لائف کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ اسے ساڑھے آٹھ لاکھ کی بجائے سات لاکھ شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اشتہارات کا نرخ بھی کم کر دیا۔ ایک سال بعد لائف سات لاکھ کی بجائے ساڑھے پانچ لاکھ شائع ہونے لگا۔ 14 اگست 1972ء کی اشاعت میں اس کے پبلشر گیری واک نے اعلان کیا کہ لائف کے اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں جب کہ اس کی آمدنی گھٹ رہی ہے۔

جنوری 1972ء میں اس کی شہرت کو اس وقت ٹھیس پہنچی جب کلفورڈ آروِنگ نے ہاورڈ ہیوز کی سوانح حیات قسط وار شائع کی۔ قارئین نے اسے دھوکا اور فریب سے تعبیر کیا کیوں کہ ہاورڈ ہیوز حقیقت میں ایسا نہیں تھا جیسا کہ مصنف نے اسے بتایا تھا۔

ایک بار پھر اس کی اشاعت کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ بک اسٹال پر فروخت ہونے کی نسبت اس کی چھیانوے فی صد فروخت سالانہ خریداروں کے ذریعے سے ہو رہی ہے۔ لائف کا ادارتی اسٹاف کم کیا جانے لگا۔ بالآخر 29 دسمبر 1972ء کو اس کا آخری شمارہ شائع ہوا۔ اس کے بعد 1972ء سے 1978ء تک لائف خاص خاص موقعوں پر شائع کیا جاتا رہا۔ ان خاص نمبروں کی اشاعت پانچ لاکھ سے دس لاکھ تک ہوتی تھی اور اس کی قیمت دو ڈالر فی کاپی تھی۔ پھر اسے ماہنامے کی شکل دے دی گئی اور یہ 1978ء سے 2000ء تک ماہنامے کی حیثیت سے شائع ہوتا رہا۔

ٹائم انکارپوریٹڈ نے اس کی پچاسویں سال گرہ 1986ء میں منائی۔ اس موقع پر ایک خاص نمبر شائع کیا گیا تھا جس میں 1936ء سے لے کر 86ء تک سارے سرورق شائع کیے گئے۔ گلف وار کے دوران 1991ء میں اس کے چار خاص نمبر شائع کیے گئے۔ 1993ء میں اس کا سائز ٹائم کے برابر کر دیا گیا۔ گویا اس کی وہ خصوصیت ختم ہو گئی جس کی بنا پر وہ منفرد نظر آتا تھا۔ 1999ء میں میگزین کی معاشی حالت ابتر ہو گئی۔ تاہم وہ عوام کی دل چسپی کا مواد چھاپ رہا تھا۔ اسی ضمن میں اس نے ہزار برس میں ہونے والے اہم واقعات اور اہم شخصیات کی تصاویر شائع کیں۔ اس فہرست پر لوگوں کو اعتراض ہوا کہ اس میں صرف مغرب سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو کیوں شامل کیا گیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ چین نے بہت سی ایجادات ہم سے پیشتر کر ڈالی تھیں۔ اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ شخصیات کی فہرست میں بھی صرف مغرب سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے نام تھے۔ تنقید کرنے والوں نے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا جہالت کی تاریکی میں سوئی ہوئی تھی اور صرف امریکا جاگ رہا تھا۔ سائنس دانوں میں تھامس ایڈیسن کو نمبر ایک سائنس داں قرار دیے جانے کو بھی چیلنج کیا گیا کہ اور بھی بہت سے سائنس داں مثلاً انٹرنل کمبسچن انجن کا موجد، آٹو موبائل کا موجد، بجلی بنانے کی مشین کا موجد بھی اس سے آگے تھے۔ پھر یہ کہ سائنس داں، موجد اور مصوروں کو باہم ملا دیا گیا تھا۔ اس لیے اسے بھی پسند نہیں کیا گیا۔

ٹائم انکارپوریٹڈ نے اسے اخبار کے ضمیمے کے طور پر 2004ء سے 2007ء تک شائع کیا۔ پھر ادارہ ٹائم کی درخواست پر حکومت نے اسے اخبارات کی فہرست میں شامل کر لیا۔ مارچ 2009ء سے جنوری 2012ء تک اسے ویب سائٹ پر پابندی سے رہا جاتا رہا۔

لائف کو بند کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ٹائم کے مالکان اس کی رقم بچا کر دوسرے میگزینوں پر لگانا چاہتے تھے

جن کی انہوں نے حال ہی میں اشاعت شروع کی تھی۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ 2001ء سے لائف خاص موضوعات پر اپنے نمبر شائع کر رہا ہے۔ اس نے 9/11 پر اپنا ایک میگزین مارکیٹ میں رکھا۔ یہ میگزین ریز کاغذ پر شائع ہوتے تھے اور میگزین سے زیادہ کتاب معلوم ہوتے تھے۔

کتابی حیثیت سے لائف کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی اس لیے کہ موضوعاتی کتابوں کی پہلے ہی سے مارکیٹ میں بہتات تھی۔ چنانچہ ایک بار پھر فیصلہ ہوا کہ اسے ہفت روزہ اخبار کر دیا جائے۔ اکتوبر 2004ء میں اسے ہفتہ وار اخبار کی شکل دے دی گئی۔ اس وقت دو بڑے اخبارات پہلے ہی شائع ہو رہے تھے پریڈ اور یو ایس ویک اینڈ اسے جیسے اسٹال پر رکھا گیا تو بڑی تعداد میں شائع ہونے والے روزناموں سے مقابلہ کرنا پڑا جن میں واشنگٹن پوسٹ نیویارک ڈیلی نیوز، لاس اینجلس ٹائمز، شکاگو ٹریبون، ڈینور پوسٹ اور سینٹ لوئی پوسٹ ڈسپیچ شامل تھے۔ تاہم انکارپوریشن نے بہت سے نیوز پیپر پبلشرز سے معاملات طے کیے کہ وہ لائف کے چھپنے کی مدد کریں۔ اسے بک اسٹال پر معقول جگہ دی جائے۔

اب اس کی لوح کے نیچے لکھا جانے لگا ”امریکا کا ویک اینڈ میگزین“ اس کی لمبائی ساڑھے گیارہ انچ اور چوڑائی ساڑھے نو انچ تھی۔ یہ گلوسی پیپر پر شائع ہوتا تھا اور پہلے صفحے سے آخری صفحے تک رنگین تھا۔ پرانے قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا مگر اس کی اشاعت اتنی نہیں ہوتی کہ اسے باقاعدہ فروخت کیا جاتا لہٰذا اس کے صفحات مالکان کو کم کرنا پڑے۔ 15 ستمبر 2006ء میں اس کے صفحات صرف بیس ہو گئے۔ یہ معاملہ تین برس تک چلتا رہا۔ اس کے بعد ٹائم کے مالکان نے اعلان کیا کہ 20 اپریل 2007ء سے لائف کو بند کیا جا رہا ہے اور اب یہ صرف ویب سائٹ پر دیکھا جا سکے گا۔

لائف نے گوگل سے 18 نومبر 2008ء سے اشتراک کر لیا اور گوگل نے اس کی تصاویر اور مضامین دینا شروع کر دیے۔ بہت سے مضامین ایسے بھی تھے جو اس سے پہلے کبھی لائف میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ گوگل نے یہ سہولت دی ہے کہ آپ 1936ء سے لے کر لائف کے 1972ء تک کے شمارے تلاش کر سکتے ہیں۔

لائف دنیا کا معتبر ترین اور اخراجاتی طور پر مہنگا ترین میگزین تھا۔ اس کے اخراجات اس بنا پر روز بہ روز بڑھتے چلے گئے۔ ہر چند کہ دنیا کے سارے صدور، وزرائے اعظم اور عظیم ہستیاں چاہتی تھیں کہ ان کی تصویر یا بیان اس میگزین میں شائع ہو مگر اس رسالے کو کوئی مالی امداد یا اتنے عطیات نہیں ملتے تھے اس لیے اسے چھاپنا دشوار ہوتا چلا گیا۔

دنیا... بھر میں ہونے والے واقعات کو جلد از جلد حاصل کرنے اور انہیں قارئین تک پہنچانے میں لائف سب سے بازی لے جانا چاہتا تھا اس لیے کسی خاص جگہ تک اپنے نمائندے کو پہنچانے میں اگر کوئی طیارہ چارٹر بھی کرنا پڑے تو لائف کے مالکان اس سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ (چارٹر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس طیارے میں صرف ایک مخصوص شخص بیٹھے گا اور وہ شیڈول کا خیال کیے بغیر اسی وقت محو پرواز ہو جائے گا)

شہنشاہ ایران کی تاج پوشی کے موقع پر انہوں نے خود لائف کے مالکان کو فون کیا اور اس کے نمائندے کو ایران بھیجنے کی درخواست کی۔ نمائندہ ایران گیا اور تاج پوشی کی رسم کے بعد اس واقعہ کی دو صفحاتی تصاویر رسالے کی تازہ اشاعت میں شامل کی گئیں۔

یہ میگزین ہر ہفتے ایک کروڑ چھتیس لاکھ کی تعداد میں شائع کیا جاتا تھا۔ صدر ہیری ایس ٹرومین، مسٹر ونسٹن چرچل اور جنرل ڈگلس میک آرتھر نے اس میں اپنی یادداشتیں قلم بند کرنے میں فخر محسوس کیا۔

رسالے کے سرورق پر ہر ہفتے کس شخصیت یا واقعہ کی تصویر شائع کی جائے۔ اس کے لیے بھی گھنٹوں بحث مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ امریکا کے تقریباً سب ہی صدور کی تصاویر رسالے کے سرورق پر شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ مشہور اداکار اور اداکارائیں یا شہرۂ آفاق ہستیاں سرورق پر جلوہ گر ہوئیں۔ 27 اگست 1945ء میں سرورق پر شائع ہونے والی تصویر سب سے بہترین قرار دی گئی جس میں ایک سپاہی اپنی سالگرہ کے موقع پر ایک نرس کو گود میں اٹھائے ہوئے تھا۔

لائف کے پاس خود اپنی بلڈنگ 19 ویسٹ کی اکتیسویں سڑک پر تھی۔ جسے ایک ماہر نقشہ نویس کی نگرانی میں بنوایا گیا تھا۔ یہ عمارت 1894ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ بعد میں اس کا ہیڈ کوارٹر ٹائم اینڈ لائف بلڈنگ راک فیلر پلازا میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئرلائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئرلائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب و روز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

کینیڈا کو الوداع کہنے کے بعد میں تلاشِ روزگار کی خاطر ٹورنٹو سے براستہ نیویارک اور لندن جدہ کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ نیویارک ائرپورٹ پر میں برٹش ایرویز کی ٹرمینل میں لاؤنج کے باہر ٹہل رہا تھا۔ فلائٹ کے روانہ ہونے میں ابھی کافی وقت باقی تھا۔ چیک اِن کاؤنٹر بھی نہیں کھلا تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں سامنے والے ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے کوک اور سینڈوچ کا آرڈر دیا۔ کوک کا گلاس سامنے آیا تو میں وہیں کاؤنٹر کے

سامنے اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا اور چسکی لینے لگا۔ میرے برابر والے اسٹول پر ایک لڑکی بیٹھی تھی، خاصی جاذبِ نظر۔ اس سے باتوں کا سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہا گرچہ اس کی باتیں سو میرے پوچھنے پر پتا چلا کہ اس کا تعلق اسرائیل سے ہے۔ نام رفیقہ شلومی۔ اپنی کوک ختم کرنے کے بعد اس نے الوداع کہا، اپنا بیگ اٹھایا اور لاؤنج کی طرف چلی گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ریسٹورنٹ کا ماحول حسین اور خوبصورت ہو گیا۔ کچھ بھی ہو یہودی عورتوں کا حسن مشہور ہے مگر کیا کرتا کہ یہ یہودی مجھے کبھی پسند نہ آئے اسی لیے میں نے اس کے جاتے ہی راحت محسوس کی اور خاموشی سے اپنا سینڈوچ کھاتا رہا، سینڈوچ ختم کرنے کے بعد میں بھی لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔ لاؤنج میں سیٹوں کی پچھلی قطار میں رفیقہ بیٹھی ہوئی تھی اس نے مجھے دیکھا اور مسکرانے لگی پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے وہیں آنے کو کہا۔

میں اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ باتوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ گویا خلا کے بعد مزید خلا کی راہ کھلنے لگی تھی۔

رفیقہ نے اسی سال اپنی پڑھائی ختم کی تھی اور اب پڑھائی کا بوجھ سر سے اترنے کی خوشی میں دو مہینے پیشتر اپنی بہن کے پاس نیویارک گھومنے آئی تھی۔ اپنے ملک سے باہر نکلنے اور مغربی دنیا دیکھنے کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ وہ مجھے اپنے نیویارک میں گزارے ہوئے وقت کی تفصیلات بتا رہی تھی۔ پھر یکایک اس نے پینترا بدلا۔ ”اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تم کو پہلے اسلام چھوڑنا پڑے گا۔“

میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ گھنٹا آدھ گھنٹا لمبا عرصہ نہیں ہوتا ہے کہ اس میں اس قدر ہولناک عشق ہو جائے کہ آدمی شادی کے سمندر میں کود کر خودکشی کر لے۔

اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ خودکشی کے اس گناہ کے لیے مسلمان سے یہودی بن کر اپنا دوزخ کا قیام بھی یقینی بنا لے لیکن ایک دم سے رفیقہ کا دل توڑنا بھی برا لگا۔ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ غور طلب معاملہ ہے۔ اس پر سوچنا بہت ضروری۔ کچھ وقت لگے گا۔“

پرواز کا وقت آ چکا تھا۔ چیک ان کاؤنٹر کھل چکا تھا۔ میں اور رفیقہ اپنا اپنا سامان اٹھا کر بورڈنگ کارڈ لینے چیک ان کاؤنٹر کی طرف چل پڑے۔ کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے لڑکے نے ہم دونوں کو ایک ساتھ آتے دیکھا تو سمجھا کہ شاید ہم دونوں ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ ہم دونوں کو برابر برابر سیٹ دے دی اور کوئی موقع ہوتا تو اس ہم نشینی کو خوش قسمتی پر محمول کیا جا سکتا تھا مگر آج کا معاملہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ تو خیریت گزری کہ راستے بھر رفیقہ یا تو سوتی رہی یا کھانے پینے میں مصروف رہی۔ ان دونوں حالتوں میں زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ مجھے زیادہ دیر نیند نہیں آئی۔ میرا سارا دھیان آئل کی طرف تھا کہ کہیں خدانخواستہ آئل (Aisle) میں کوئی ربائی ٹہلتا ہوا نکل نہ آئے اور رفیقہ مجھے پکڑ کر زبردستی یہودی بنا دے۔ یہ خدشہ حقیقت نہ بنا۔ خیریت گزری۔

ہم لندن ائرپورٹ پر لینڈ کر چکے تھے لیکن میری آزمائش ابھی جاری تھی۔ رفیقہ کا اصرار تھا کہ پچھلے دس گھنٹوں میں ہم دونوں اس قدر قریب آ چکے تھے کہ لندن میں ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ وقت ایک ساتھ گزارنا اشد ضروری تھا۔ کوئی اور چارہ نہ تھا۔ میں نے ہامی بھر لی۔

رفیقہ کی پرواز میری پرواز سے ایک گھنٹے پہلے تھی۔ میں اسے گیٹ تک چھوڑنے گیا۔ گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے رفیقہ نے کاغذ پنسل نکال کر کاغذ پر کچھ لکھا پھر کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ ارشاد ہوا ”یہ میرا پتا ہے۔“ پتا دینے کے بعد وہ آگے بڑھی۔ پھر اسے جیسے کچھ یاد آ گیا۔ ”ارے ہاں میں تمہارا پتا لینا تو بھول ہی گئی۔“

میں نے دل ہی دل میں اس بھول کا شکر ادا کیا اور اس سے کہا۔ ”تم جلدی سے جاؤ جہاز کہیں اڑ نہ جائے۔ میں اپنا پتا خط میں لکھ دوں گا۔“

بعد میں اس دروغ گوئی پر توبہ کی۔ جب تک رفیقہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی میں نے اس پرچی کو عقیدت کے ساتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھا۔ اس کے غائب ہوتے ہی میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کچرے کی ٹوکری کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ جان بچی تو لاکھوں پائے۔ آج نہ صرف جان، بلکہ ایمان بھی بچ چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ آزادی بھی۔

رفیقہ سے رہائی حاصل کرنے کے گھنٹا بھر بعد میری جدہ کی پرواز تھی۔ وقت گزارنے کے لیے میں کتابوں کی دکان میں چلا گیا۔ جہاں کتابوں کے ساتھ ساتھ بہت سے گریٹنگ کارڈز بھی قطار در قطار سجے ہوئے تھے۔ ان میں ویلنٹائن ڈے کے کارڈ سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ویلنٹائن ڈے چند روز بعد تھا۔

(اب تو ہمارے شہروں میں بھی ویلن ٹائن ڈے منایا جانے لگا ہے۔ اور ویلن ٹائن ڈے کے کارڈز کے ساتھ ساتھ TV پر بھی پٹیاں چلتی ہیں۔ لوگ اپنی محبوب ہستی سے لگاوٹ کا اعلان کرتے ہیں بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ ویلن ٹائن ڈے ہے کیا بلا۔)

ویلن ٹائن ایک رومن سینٹ تھا جس کے متعلق لوگوں کو وثوق کے ساتھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ صرف یہ معلوم ہے کہ اس کا انتقال چودہ فروری کو روم کے شمال میں واقع کمیلیا میں پانچویں سے ساتویں صدی کے دوران میں ہوا تھا۔ مزے کی بات ہے کہ ایک ہی نام کے دو سینٹ تھے اس لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے یہ دن کس سینٹ کے لیے منایا جاتا ہے۔ اس ڈے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک طرح کا عرس ہے جو ہر سال ان کے مرنے کے دن منایا جاتا ہے۔ اس تہوار سے متعلق چونکہ کوئی بات پورے وثوق کے ساتھ نہیں معلوم ہے۔ پوپ پال VI نے 1969ء میں اس تہوار کو رومن کیلنڈر سے خارج کر دیا لیکن پاکستانیوں نے اسے اپنا لیا کہ اب مغربی دنیا میں یہ دن پیار جتانے کا دن مانا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جیفری شاسر کے زمانے میں شروع ہوا اور کسی ناتے کے بغیر کورٹ شپ کرنے والے جوڑوں نے اسے اپنے اظہار محبت کے لیے اپنا لیا۔

اتنی ساری تفصیل اس لیے کہ پاکستانی قوم مغرب سے اس قدر متاثر ہو چکی ہے کہ اپنی ہر خصوصیت اور پہچان کو پس پشت ڈال کر ہر وہ چیز اپنانا چاہتی ہے جو امریکا میں ہوتی ہے۔ پھر شور مچاتی ہے کہ امریکا ڈرون حملے کر رہا ہے۔ جب ہم خود امریکا کے جوتے صاف کر کے فخر محسوس کرتے ہیں تو امریکا ہم کو کیوں اپنے سر پر بٹھائے گا؟

لیکن میں چونکہ اس وقت پاکستان میں نہیں بلکہ لندن میں تھا اس لیے مجھے حق پہنچتا تھا کہ اس سرزمین پر جو بھی تہوار منایا جائے میں اس میں شامل ہو جاؤں۔ قطع نظر اس کے کہ یہ تہوار انتہائی بے تکا کیوں نہ ہو کہ ایک آدمی کی موت کے دن اس کے مزار پر چراغ جلانے کی بجائے محبت کے متوالے ایک دوسرے سے اپنی محبت کا اظہار کریں۔

ایک کارڈ اتنا خوبصورت تھا کہ میں اسے خریدے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری ویلن ٹائن ڈے کارڈ تھا۔

کارڈ خرید تو لیا۔ مگر اب اسے بھیجوں کس کو۔ لیکن وہ جا چکی تھی ورنہ اسی کو دے دیتا۔ بیچاری زبردستی میں خوش ہو جاتی۔ مگر یہ خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔

اس وقت میں لندن میں تھا جو برطانیہ کا حصہ تھا۔ برمنگھم بھی اسی سرزمین کا حصہ تھا۔ میں نے برمنگھم میں اپنی زندگی کا ایک سال گزارا تھا۔ میں وہاں کے کچھ لوگوں کو جانتا بھی تھا۔ مسئلہ حل ہوتا دکھائی دیا۔ میں یہ کارڈ روبن کو بھیج سکتا تھا۔ مگر اس میں دو قباحتیں تھیں۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ مجھے اس کا پتا نہیں معلوم تھا۔ دوسرے یہ گمان تھا کہ شاید اس کی شادی ہو چکی ہوگی۔ میں دو چار دفعہ اس کے بوائے فرینڈ "ٹونی" سے مل بھی چکا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔ ویلن ٹائن ڈے منانے کا مقصد اظہار محبت ہوتا ہے۔ کسی شادی شدہ لڑکی کے شوہر سے اظہار رقابت کا نہیں۔ میں نے ان دونوں مسائل کا حل ڈھونڈ لیا۔

میں یہ کارڈ روبن کے ڈپارٹمنٹ کے پتے پر برمنگھم یونیورسٹی بھیج سکتا تھا۔ اگر وہ اپنا پتا وہاں چھوڑ گئی ہے تو یونیورسٹی یہ کارڈ اس کے پتے پر فارورڈ کر دے گی۔ اگر نہ بھی کیا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کارڈ اس کو نہ ملتا۔

دوسرے مسئلہ کا حل یہ تھا کہ یہ کارڈ میں روبن کی بجائے ٹونی کو مخاطب کر کے لکھوں۔ میں نے لکھا "یہ کارڈ تمہاری بیوی کے لیے ہے صرف یہ جتانے کے لیے کہ تمہاری پسند کتنی اعلیٰ ہے۔ میرا روبن کو تم سے چھیننے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

اب ایک مسئلہ اور آ گیا۔ اسے پوسٹ کہاں سے کروں۔ میں اسی بک اسٹور میں واپس گیا۔ کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی سے پوچھا۔

"کیا اس کارڈ کو پوسٹ کرنے کا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔"

"جی بالکل ہو سکتا ہے۔ آپ ڈاک کا ٹکٹ میرے پاس سے خرید کر لفافے پر چپکا دیں۔ میں اسے پوسٹ کر دوں گی۔"

میں نے ڈاک ٹکٹ کے پیسے تھمائے اور اطمینان کا سانس لیا۔ یہ زبردستی کی مصیبت تھی جو میں نے اپنے گلے ڈالی تھی۔ میں اس کا الزام کسی اور کے سر نہیں ڈال سکتا تھا لیکن میں بھی آخر پاکستانی تھا۔ ویلن ٹائن ڈے پر کارڈ بھیجے

کا حق باقی ماندہ ہر پاکستانی کی طرح مجھے بھی حاصل تھا۔ اگر میرے اپنے ملک کے اور مذہب کے تہوار تریا رو باتیں تھے تو کیا ہوا؟ میں تو امریکا کا غلام ہوں۔

جدہ کی پرواز کا اعلان ہو چکا تھا۔ میں جہاز میں داخل ہو کر اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ یہ فروری کا مہینا تھا۔ ویلن ٹائن ڈے کا مہینا۔

فروری کا مہینہ کینیڈا میں سرد ترین مہینا ہوتا ہے۔ ٹھنڈ کے ساتھ ساتھ تیز ہوا بھی چلتی ہے۔ ہوا کی رفتار تقریباً ایک ڈگری بدتر بنا دیتا ہے۔ ہاتھ پیر بجتے محسوس ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ میں اس سردی میں گھر چکا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ اس دن اندھیرا ہو چلا تھا، حالانکہ ابھی صرف پانچ بجے تھے۔ میں گروسری کرنے کے بعد اپنی رہائش گاہ کی طرف واپس آ رہا تھا۔ ان دنوں میں اپنی پڑھائی کے لیے پیسے جمع کر رہا تھا۔ کینیڈا میں میری آمد میں شروع شروع کے دن تھے۔ میں نے ایک گھر میں ایک کمرا کرائے پر لے رکھا تھا۔ گاڑی بھی پرانی تھی۔ راستے میں ایک جگہ دائیں ہاتھ پر ایک شاپنگ پلازہ تھا جس میں کئی سو گاڑیوں کے پارک کرنے کے لیے بہت ہی بڑا پارکنگ لاٹ تھا اور بائیں طرف کھلا میدان تھا۔ ہوا خوب زوروں پر چل رہی تھی۔ صبح صبح جو برف پڑی تھی وہ ہوا کے ساتھ ساتھ پارکنگ لاٹ سے اڑ اڑ کر کھلے میدان کی طرف جا رہی تھی۔ میری پرانی گاڑی اتنی سخت سردی برداشت نہ کر سکی، وہیں دم توڑ دی۔ میں نے چاہا کہ اس کا بونٹ کھول کر قسمت آزمائی کروں کہ شاید اسٹارٹ ہو جائے۔ میں اس وقت تین پیس کا سوٹ پہنے ہوئے تھا جس کے اوپر اوور کوٹ بھی پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں خوب موٹے موٹے گرم دستانے تھے اور سر پر ایسی ٹوپی تھی جو کانوں کو بھی ڈھانپ لیتی تھی۔ لیکن اس تمام ساز و سامان کے باوجود میں نے جیسے ہی گاڑی سے قدم باہر نکالا سرد ہوا کے تند جھونکے نے میرا استقبال کیا۔ گاڑی کا بونٹ کھولنا تو بڑی بات ہے صرف چند قدم چل کر بونٹ تک پہنچنا محال ہو گیا۔ میں فوراً گاڑی میں واپس آ گیا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ پیچھے سے ایک بس آ رہی تھی۔ بس ڈرائیور نے بس سے ہلکا سا دھکا لگا کر میری گاڑی کو سڑک کے کنارے لگانے میں مدد دی۔ میں گاڑی سے اتر کر بس میں سوار ہو گیا۔ اگر یہ بس نہ آئی ہوتی تو شاید صبح تک گاڑی سے میری ٹھٹھری ہوئی لاش برآمد ہوتی۔ آج کے سفر کے لیے میں نے کینیڈا ایسے ہی موسم میں چھوڑا تھا۔ ہر طرف برف ہی برف، بدن میں سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی ٹھنڈی یخ ہوا۔ لیکن پچھلے چوبیس گھنٹوں میں دنیا بدل چکی تھی۔

جدہ میں سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ موسم میں خوشگوار گرمی تھی۔

کھال میں چبھتی ہوئی کینیڈا کی ٹھنڈک سے تو نجات مل چکی تھی مگر جدہ میں ایک انوکھی اور نرالی مصیبت نے میرا استقبال کیا۔ میرے بچپن اور جوانی والے فرینڈ بلٹ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ صلاح الدین صاحب اب ڈاکٹر صلاح الدین بن چکے تھے۔ میں نے بذریعہ تار ڈاکٹر صاحب کو اپنی آمد کی خوشخبری سے مطلع کر دیا تھا۔ گھر کے پتے پر تار یا خط نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ ان دنوں جدہ میں سڑکوں کے نام نہیں ہوا کرتے تھے...... سوائے چند ایک بڑی بڑی سڑکوں کے...... اور نہ ہی گھروں کے پتے۔ خط و کتابت کے لیے پی او بکس نمبر استعمال ہوتے تھے۔ تار پی او بکس پر نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ میں جدہ ائرپورٹ سے باہر آیا تو وہاں اپنے استقبال کے لیے کسی کو نہ پایا۔ ڈاکٹر صاحب کو دفتر کے پتے پر بھیجا ہوا تار ان کو نہیں ملا تھا۔ آج جمعہ کا دن تھا۔ ان کا دفتر تعطیل کی وجہ سے آج بند تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ گھر پر ٹیلیفون جو نہ تھا۔ ان دنوں جدہ میں ٹیلی فون کا شمار عیاشی میں ہوتا تھا۔ ٹیلی فون کی لائنیں بہت تھوڑی سی ہوا کرتی تھیں اور گھر پر ٹیلی فون صرف وہی لوگ لگوا سکتے تھے جن کے بہت زیادہ اثر و رسوخ ہوں۔ آج کے دن ڈاکٹر صاحب تک پہنچنے کے سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔

اس وقت کا جدہ کا ائرپورٹ بھی آثارِ قدیمہ میں رکھنے کے قابل تھا۔ اس کے مقابلے میں کراچی کا ائرپورٹ شاندار تھا۔ جدہ ائرپورٹ پر کسی قسم کی کوئی سہولت موجود نہ تھی۔ کسی قسم کی معلومات دینے کے لیے بھی کوئی موجود نہ تھا۔ ہوٹلوں کی تفصیل تک حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ میں عربی زبان سے کلی طور پر نابلد تھا۔ ائرپورٹ پر انگریزی بولنے والوں کی قلت تھی۔ پھر ستم بالائے ستم میرا سوٹ کیس بھی جہاز پر نہیں آیا تھا۔ قسمت مجھ سے اگلے پچھلے سارے بدلے نکالنے پر تلی ہوئی تھی۔ میں ائرپورٹ سے باہر نکل آیا۔ بدن پر سوٹ، ہاتھ میں کینیڈا کی پارکا...... گرم اوور کوٹ...... پسینے سے برا حال ہو رہا تھا۔ کوٹ کو بھی اتار کر ہاتھ میں پکڑا۔ دوسرے ہاتھ سے بریف کیس تھاما اور ہوٹل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

باہر ایک ٹیکسی والا ٹل گیا لفظ ''ہوٹل'' سن کر پوچھا۔ ''فندق۔ فندق؟'' مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ فندق کیا بلا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عربی زبان میں ''ہوٹل'' کو ''فندق'' کہتے ہیں۔ ٹیکسی والے کے سوال فندق۔ فندق، پر میں نے اپنے شانے اچکا دیے اور امریکا کا مشہور کلمہ ''واٹ ایوز'' دہرا دیا۔ اس کے جواب میں ٹیکسی ڈرائیور سینہ تان کر میرے سامنے آ گیا اور اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے انا بیٹھ دیا۔ ''انا؟'' میں سمجھا کہ شاید میرے ''واٹ ایوز'' نے اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اسی لیے وہ اپنا سینہ تان کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ یہ بھی میرے عربی زبان سے نابلد ہونے کا خمیازہ تھا۔ دراصل عربی زبان میں ''میں'' انا کو کہتے ہیں۔ ہماری اردو کی ''انا'' کی جڑیں شاید اسی عربی ''انا'' سے پھوٹی ہیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں وہ ٹیکسی ڈرائیور مجھ سے صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ''میں تم کو ہوٹل لے چلوں گا۔'' میں اس کی ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ اس نے جہاز کی رفتار سے ٹیکسی دوڑا دی۔

سب سے پہلے وہ مجھے ایک ہوٹل فندق الامین، لے گیا۔ یہ ہوٹل ائرپورٹ کے بہت نزدیک تھا مگر وہاں کوئی جگہ نہ تھی۔ ایک دو جگہیں اور دیکھیں سب جگہ مایوسی ہوئی۔ یہ وہ دور تھا کہ جب سعودی عرب میں بے پناہ ترقیاتی کام ہو رہا تھا۔ ہر طرف نئی نئی کئی منزلہ عمارتیں بن رہی تھیں۔ ہر قسم کی مشینری اور سامان درآمد ہو رہا تھا۔ ہر شخص بشمول میرے سعودی عرب کی اس تیل کی بہتی گنگا سے ہاتھ دھو کر پوتر ہونا چاہتا تھا۔ اس تیل کی دولت میں اپنا حصہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ سعودی عرب میں آ کر قیام کرنے والے بے تحاشا، ہوٹل بہت کم۔ تھک ہار کر ٹیکسی والا مجھے واپس ائرپورٹ لے آیا۔

جب میں نے ٹیکسی سے اترنے کے بعد اس کا کرایہ ادا کر دیا تو ٹیکسی والے نے سامنے اشارہ کر کے عربی زبان میں کچھ کہا جو میری کچھ میں نہیں آیا۔ مگر جب میں نے پلٹ کر اس سمت دیکھا جس سمت ٹیکسی والے نے اشارہ کیا تھا تو وہاں پر مجھے ریسٹورنٹ قسم کی ایک جگہ دکھائی دی جس کے آگے کئی اونچے اونچے پلنگ سے بچھے ہوئے تھے۔ ان پلنگوں جیسی چیز پر تین طرف لکڑی کے ڈھکے بنے ہوئے تھے۔ لوگ ان پلنگوں پر تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے بغیر دودھ کی چائے پی رہے تھے یا باتیں کرنے میں مشغول

تھے۔ دن کے وقت یہ جگہیں چائے پینے اور کھانا کھانے کے لیے استعمال ہوتی تھیں اور رات کو سونے کے وقت کرایہ پر چڑھا دی جاتی تھیں۔ کرایہ صرف چند ریال۔ میں نے ٹیکسی والے کو اشارہ سے منع کر دیا کہ میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ اس نے بدخلقی سے شانے اچکائے اور دوسری سواری کا انتظار کرنے لگا۔ میں واپس ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہو گیا۔

ائرپورٹ کی عمارت انتہائی معمولی، بوسیدہ اور چھوٹی سی تھی۔ وہاں بہ چار پانچ پرانی مگر بڑی اور آرام دہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک کرسی پر بستہ جمایا اور ٹانگیں پسار کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو بھوک لگ رہی تھی۔ باہر جا کر "شوورمہ" کھایا بغیر دودھ والی چائے پی۔ شوورمہ ایک نئی چیز تھی جو میں نے پہلے نہ دیکھی تھی اور نہ ہی کھائی تھی۔ برسوں بعد یہ پاکستان میں بھی چیزوں کا کھانا کھلا تھا۔ "شوورمہ" کو میں نے اسی کھاتے میں ڈال دیا۔

ائرپورٹ کی اس کرسی پر مجھے کسی نہ کسی طرح سے صبح کرنی تھی جو کسی نہ کسی طرح ہو گئی۔ جیسے ہی دفتر کے کھلنے کا وقت ہوا میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا "خدا کے واسطے میرے حال پر رحم کریں اور ائرپورٹ پہنچ کر مجھے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔" تھوڑی دیر بعد میں اپنی بہن سے مل رہا تھا۔

بہن نے چائے بنائی۔ میں اتنی دیر میں نہا کر آ چکا تھا۔ چائے پی کر پلنگ پر ایسا گرا کہ شام کی خبر لی۔ میں نے سب کو منع کر دیا تھا کہ مجھ میں کھانا کھانے کی بھی سکت نہیں ہے۔ جب تک میں خود نہ اٹھوں، مجھے کوئی نہ اٹھائے۔ میری اس التجا کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

اگلے روز ہم لوگ عمرہ کرنے چلے گئے۔

میرا سعودی عرب کا ویزا صرف چودہ دن کا تھا۔ اسی عرصے میں مجھے نوکری تلاش کرنی تھی وہ بھی ہوائی جہاز کی نوکری۔ میرا اسپارا زور سعودی عربین ائرلائن پر تھا جو وہاں سعودیہ کہلاتی تھی۔

سعودیہ کے شعبہ ملازمین میں حاضری دی۔ مدعا بیان کیا کہ ہینگر میں جہاز پر کام کرنے کا خواہشمند ہوں۔

جواب ملا "تم کو ہوائی جہاز پر کام کیے ہوئے سات آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ہینگر میں نہیں۔ ہم تم کو بعض دوسرے شعبوں میں بھیج سکتے ہیں۔"

میں دوسرے شعبوں میں گیا مگر کوئی بات نہ بن سکی۔

مجھے ہوائی جہاز ہوا میں تحلیل ہوتا دکھائی دیا۔ میں کینیڈا واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ دوسری جگہوں پر نوکری کی تلاش شروع کر دی۔

میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ صبح شہر نکل جاتا اور سڑک کے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک۔ سڑک کے دونوں طرف جو بھی دفتر آتا اس کے اندر جا کر ان لوگوں کو اپنی آمد کی خوشخبری سناتا۔ مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

ان دنوں جدہ شہر "بلد" میں ابھی اتنی عمارتیں نہیں تعمیر ہوئی تھیں جتنی اب ہیں۔ بلد میں بہت سے خالی علاقے بھی تھے جن کے اطراف ریت کے ڈھیر جمع رہتے تھے۔ تقریباً ہر روز دوپہر کے وقت آندھی جیسی تیز ہوا چلتی تھی جس کی وجہ سے بلد میں ریت کے طوفان کا سا سماں ہوا کرتا تھا۔ ہاتھ منہ، کپڑے سب ریت میں اٹ جاتے۔ گھر آ کر سب سے پہلے نہا کر کپڑے بدلنے پڑتے تب سکون ملتا۔ اسی طرح تین دن اور گزر گئے۔ اگلے روز جمعہ کا دن تھا۔ ہم لوگ پھر عمرہ کرنے چلے گئے۔

نو دن گزر چکے تھے۔ اب میرے ویزے میں صرف پانچ دن رہ گئے تھے۔ ہوائی جہاز بھی پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ میں نے ایک دفعہ اور سعودیہ میں قسمت آزمائی کرنے کی ٹھانی۔ شعبہ موظفین (ملازمین) میں داخل ہوا تو وہاں ایک نئے صاحب کو بیٹھے ہوئے پایا۔ نام "ہانی غریب" عجیب و غریب نام تھا۔ یہ بھی پہلی دفعہ سننے والی چیزوں کے کھاتے میں گیا۔ ہانی کو وہ ام کہانی سنائی۔

جواب ملا "یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم تو خود تجربہ کار انجینئرز کی تلاش میں ہیں جن کو بوئنگ B737 اور B707 کا تجربہ ہو۔"

میں نے B737 پر تو کام نہیں کیا تھا۔ مگر مجھے B707 کا کئی سال کا تجربہ تھا۔

ہانی نے اپنی بات ختم کی۔ "میں تم کو ہینگر میں امین الشوربی کے پاس بھیج رہا ہوں تم ان سے جا کر بات کرو۔" ہانی نے امین الشوربی کو فون کر دیا اور میں ہینگر روانہ ہو گیا۔

ہینگر پہنچا تو سب سے پہلے سیکورٹی والوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ان میں ایک نے بندوق میری طرف تانی۔ دوسرے نے عربی میں کچھ کہا جو میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ میں نے ہانی کی دی ہوئی پرچی اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے

پرچی کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوا ''امئن الشوری؟'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے امئن کے دفتر سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ اپنا مکالمہ ختم کرنے کے بعد مجھ سے عربی میں گویا ہوا ''فیین جوازات'' لفظ ''فیین'' کے معنی تو مجھے معلوم تھے کہ انگریزی زبان میں ''پیچھے'' کو فیین کہتے ہیں۔ مگر یہ ''جوازات'' کیا ہے۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ اس نے انتہائی کرخت آواز میں اپنا مطالبہ دہرایا۔ لیکن اس دفعہ انگریزی زبان میں ''پاسپورٹ۔ یو۔ پاسپورٹ۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنا پاسپورٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ پاسپورٹ کے بدلے اس نے مجھے پلاسٹک کا بنا ہوا ہینگر میں داخلے کا کارڈ دیا اور حکم دیا ''گو۔ یمین'' میں سمجھا کہ شاید مجھ سے کہنے کی کوشش کر رہا ہے کہ ''امئن کے پاس جاؤ'' مگر بعد میں پتا چلا کہ اس نے ''امئن'' نہیں بلکہ ''یمین'' کہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہینگر میں دائیں ہاتھ کی طرف مڑ جاؤ۔

ہینگر میں داخل ہوا تو لگا جیسے ایک عرصے بعد گھر لوٹ آیا ہوں۔ سامنے ایک بوئنگ B-707 پر کام ہو رہا تھا۔ مجھے PIA کا چھوڑا ہوا ہینگر یاد آ گیا۔ PIA کے اپنے باس سعید صاحب یاد آ گئے کہ مجھ سے اور اعجاز سے اپنی جان چھڑانے کی غرض سے ہم دونوں کو وہ جہاز کا معائنہ کرنے ہینگر بھیج دیا کرتے تھے۔ سامنے سے آنے والے مکینک سے امئن کے دفتر کا معلوم کر کے وہاں چلا گیا۔ امئن کا سیکریٹری میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے امئن کے کمرے میں پہنچا دیا۔

امئن کا قد چھوٹا، جسم بہت زیادہ دبلا پتلا۔ جلسی میں پھکو پن۔ وہ ایکٹنگ جنرل منیجر انجینئرنگ تھے۔ مجھ سے چند سوال کیے پھر مجھے منیجر انجینئرنگ کے پاس بھیج دیا۔ وہ بھی مستقل منیجر نہیں تھے ایکٹنگ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مملکت سعودی عرب کی طرح سعودیہ بھی ترقی پذیر تھی۔ اس کے اندر بھی بہت پھیلاؤ ہو رہا تھا۔ نئے نئے عہدے وجود میں آ رہے تھے لیکن ابھی ان عہدوں پر لوگوں کا انتخاب نہیں ہوا تھا۔

انجینئرنگ منیجر کا نام شرعبی تھا۔ سب ان کو ''شرابی'' پکارتے تھے کہ شرعبی کا تلفظ یہی بنتا تھا۔ ان کا قد امئن سے کافی اونچا، تن و توش وافر۔ بال آگے تو تھے لیکن سر کے پچھلے حصے پر قدرت بالوں کی مہربانی کرنا بھول گئی تھی۔ آنکھوں پر عینک۔ ہونٹ گول بنا کر بات کرتے تھے۔ خوش مزاج بھی تھے۔

شرعبی نے سب سے پہلے میری اسناد طلب کیں۔ مشرق کی دنیا میں اور مغرب کی دنیا میں سوچ کا ایک اور واضح فرق ہے۔ مغرب کی دنیا میں زور اسناد پر نہیں بلکہ کارکردگی پر ہوتا ہے۔ نوکری اسی وقت پکی ہوتی ہے کہ جب آپ عملی طور پر کام کر کے یہ ثابت کر دیں کہ آپ کے اندر کام کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ڈگری آپ کو صرف اس صلاحیت کے لیے تیار کرتی ہے۔

مشرقی دنیا کی سوچ الگ ہے۔ یہاں پر سارا زور ڈگری کے کاغذ پر ہے۔ چاہے وہ ڈگری جعلی ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے ایک انتہائی ذہین اور زیرک سیاست داں کا قول ہے کہ ''ڈگری، ڈگری ہوتی ہے۔ چاہے اصلی ہو یا جعلی۔'' یہ ڈگری تو یا ہمارے یہاں کے سیاسی اکھاڑے میں اب پوری طرح مستحکم ہو چکا ہے۔ اب ہمارے یہاں اگر کوئی سیاست داں رکن پارلیمنٹ بن کر عوام کی دولت لوٹنا چاہتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی اس صلاحیت کو ثابت کرنے کے لیے اپنے پاس ڈگری رکھتا ہو۔ غیر ڈگری یافتہ اشخاص کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ڈگری یافتہ لوگوں کی حق تلفی کر کے ان کی طرح عوام کی دولت لوٹنے کی کوشش کرے۔ کرپشن کے اعلیٰ ترین گر سیکھنے کے لیے کالج سے ٹریننگ حاصل کرنا ضروری ہے۔

شرعبی کو حسب الطلب اپنی ڈگری پیش کرنا میرا فرض تھا۔ میرا پشاور یونیورسٹی کا سرٹیفکیٹ دیکھ کر بولے۔ ''اس میں تو لکھا ہے کہ تم ایم۔ ایس۔ سی میں داخل ہوئے ہو۔ یہ ڈگری کیسے ہو گئی؟''

میں نے ان کو سمجھایا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے ایم ایس سی کی ڈگری کی پڑھائی مکمل کر لی ہے اور اب میں ان لوگوں میں داخل ہو گیا ہوں کہ جن کو MSC کی ڈگری پر نائز کیا گیا ہے۔''

زور کا قہقہہ لگا کر مجھ سے مخاطب ہوئے ''کل میں نے ایک اُمیدوار کو اسی بات پر نوکری دینے سے انکار کر دیا۔'' ایک دفعہ پھر ہنسے۔ ''اس بے وقوف کو بھی یہ بات سمجھانا چاہیے تھی۔ بے وقوف۔''

میں نے چونکہ شرعبی صاحب کو یہ بات سمجھا دی تھی۔ انہوں نے اس کے عوض مجھے نوکری کی خوشخبری سے نوازا۔

میں بالی کے پاس واپس آ گیا۔ اسے اپنے انٹرویو کا

حال سنایا۔ شکریہ ادا کیا۔ اس نے کہا ''اب تو دفتر کا وقت پورا ہونے والا ہے۔ کل میں تمہاری کاغذی کارروائی مکمل کردوں گا۔ تم کل صبح نو بجے تک آجانا۔''

آنے والے برسوں میں میری اور بانی کی گہری دوستی ہونے والی تھی۔

اگلے دن جب میں کاغذی کارروائی مکمل کرنے بانی کے دفتر پہنچا تو اس نے مجھے ایک ساتھی جارج کے حوالے کردیا۔ جارج برطانیہ کا شہری تھا۔ خوش شکل نوجوان، پچھلے تین سال سے سعودیہ میں کام کررہا تھا۔ میرے کاغذات دیکھ کر بولا۔ ''تم نے کینیڈا کی شہریت حاصل کرلی ہے؟''

''میں شہریت کی درخواست تو دے چکا ہوں۔ لیکن میرا انٹرویو اور رسمِ حلف برداری ابھی باقی ہے۔''

''میرا مشورہ ہے کہ تم یہاں پر نوکری شروع کرنے سے پہلے اپنی کینیڈا کی شہریت حاصل کرلو۔''

''لیکن کینیڈا کی شہریت کا اور میرے یہاں پر نوکری کرنے کا آپس میں کیا تعلق ہے۔'' میں نے معلوم کرنا چاہا۔

''بہت گہرا تعلق ہے۔ بحیثیت کینیڈین تم کو پاکستانیوں سے زیادہ مراعات ملیں گی۔ فرنیچر ملے گا۔ گھر ایئر کنڈیشنڈ ملے گا اور ہر مہینے کھانا پکانے کے لیے تین LPG گیس کے سلنڈر بالکل مفت۔''

یہ تو بہت گہرا تعلق نکل آیا۔ اتنا گہرا کہ مجھے اپنی شہریت کی کارروائی مکمل کرنے کے لیے ایک دفعہ پھر سے کینیڈا ''الاوپس'' جانا پڑے گا۔

دراصل سعودیہ میں چار مختلف قسم کے نوکری کے کنٹریکٹ تھے۔ سب سے اوّل درجہ پر TCN یعنی تیسری دنیا کے ممالک کے شہریوں کا کنٹریکٹ۔ اس سے اوپر یورپی ممالک وہ بھی صرف مغربی یورپ کے ممالک۔ پھر سعودی شہریوں کا کنٹریکٹ اور سب سے اعلیٰ اور ارفع شمالی امریکا کے ممالک کا کنٹریکٹ جس میں صرف امریکا اور کینیڈا شامل تھے۔ اس تفریق کی ایک عام وجہ بھی جو پورے سعودی عرب پر لاگو تھی۔ ماں باپ کے بعد سب سے بڑا وجہ امریکا بہادر کا تھا۔ ہر سعودی امریکا سے بے انتہا مرعوب تھا۔

اس زمانہ میں سعودیہ کو مینجمنٹ کا کنٹریکٹ اس وقت کی مشہور ایئرلائن TWA کے پاس تھا۔ TWA امریکا کی ایئرلائن تھی۔ سعودیوں کو ایئرلائن چلانے کا مطلوبہ تجربہ نہیں تھا۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ ایئرلائن چلانے کا ٹھیکا کسی مشہور تجربہ کار ایئرلائن کے سپرد کردیا جائے۔

ان دنوں پورا سعودی عرب صرف پیسے کے زور پر چل رہا تھا۔ سعودی باشندوں کے پاس نہ تو تعلیم تھی اور نہ ہی تجربہ۔ ان کے پاس صرف ایک چیز تھی اور وہ بھی بے تحاشہ..... پیٹرو ڈالرز تیل کے ذخیروں سے کمایا ہوا پیسا۔ سعودی عرب پیسے کے عوض ہر کام ٹھیکے پر کرواتا تھا۔ اس سے متعلق سعودی عرب کی دولت سے جلنے والوں نے بہت سے لطیفے بھی گھڑ لیے تھے۔ ایک بہت مشہور لطیفہ یہ تھا ''سعودی عرب نے اسرائیل کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا ہے۔ ٹھیکا کوریا کو ملا ہے۔''

TWA نے اپنے ٹھیکے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شمالی امریکی شہریوں کے لیے وہ مراعات حاصل کررکھی تھیں جو کسی اور ملک کے شہریوں کو میسر نہیں تھیں۔ حتیٰ کہ پاسپورٹ بنوانے کی فیس اور اس پر لگنے والی تصویروں کا خرچہ بھی سعودیہ کے ذمے تھا۔ مجھے ان سہولیات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن ان کو حاصل کرنے کے لیے کینیڈا کی شہریت کا حاصل کرنا ناگزیر تھا۔

جارج نے میرے کاغذات مکمل کرنے کے بعد لفافہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور ساتھ ہی ایک خط بھی دیا جس میں لکھا تھا کہ مجھے سعودیہ میں نوکری دے دی گئی ہے۔ مجھے کینیڈا کی شہریت حاصل کرنے کی مہلت دی جارہی ہے۔ یہ شہریت حاصل کرتے ہی میں جدہ واپس آسکتا ہوں۔

گھر آکر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور شام میں ایئرلائن کے آفس جاکر کراچی کے لیے سیٹ بک کروائی کیمبرانگٹ کراچی تک کا تھا۔

کراچی پہنچ کر میں نے ٹورونٹو میں اپنے کزن مجی کو ٹیلی فون کیا تاکہ معلوم کروں کہ میری کینیڈا کی شہریت کی کارروائی میں کچھ پیش رفت ہوئی بھی یا نہیں۔ مجی نے بتایا۔ ''آپ کی شہریت کے انٹرویو کے لیے دو دفعہ آپ کا بلاوا آچکا ہے۔ لیکن آپ چونکہ پاکستان میں تھے میں نے پھاڑ کر پھینک دیا۔''

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ میں کینیڈا میں انٹرویو کے بلاوے کے لیے دو برس سے زیادہ انتظار کرتا رہا مگر کوئی بلاوا نہیں آیا اور اب تین ہفتہ میں دو بار بلاوا آچکا تھا۔ انٹرویو کے لیے تین دفعہ بلاوا آیا کرتا تھا اگر درخواست گزار اس کے باوجود حاضر نہ ہو تو شہریت کی درخواست واپس دفتر کردی جاتی تھی۔

اب مجھے ایک آخری موقع اور ملے گا۔ اگر میں اس دفعہ بھی انٹرویو کے لیے نہیں گیا تو میری درخواست ختم ہو جائے گی۔ ساری کارروائی دوبارہ شروع کرنا پڑے گی۔ ہوائی جہاز کی نوکری ہوا ہو جائے گی۔ میں پہلی فلائٹ پرواز سے ''لاہور'' ٹورونٹو پہنچ گیا۔

ٹورونٹو ائرپورٹ پر نجمی مجھے لینے آئے تھے۔ میں نے ان کی خیریت بعد میں پوچھی۔ پہلے پوچھا۔ ''کیا انٹرویو کے لیے میرا بلاوا آ گیا؟''

نجمی نے جواب دیا ''جی ہاں۔''

''کہیں تاریخ نکل تو نہیں گئی؟'' میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''پیر کے دن انٹرویو ہے۔ آج جمعہ ہے آپ عین وقت پر آ گئے اچھا ہوا۔''

اس گفتگو کے بعد میں نے نجمی سے کہا ''السلام علیکم۔ کیسے ہو!''

نجمی نے صرف ایک مسکراہٹ سے نوازا۔

پیر کے دن انٹرویو ہو گیا۔ اب صرف رسم حلف برداری باقی رہ گئی تھی۔ حلف بھی اٹھا لیا۔ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مجھے صرف ملکہ الزبتھ، ملکہ برطانیہ سے وفاداری کا ثبوت دینا تھا کہ برطانیہ کے ساتھ ساتھ وہ نیوزی لینڈ اور کینیڈا کی بھی ملکہ ہیں۔

ملکہ برطانیہ سے وفاداری کے صلے میں مجھے ایک تحفہ اور بھی ملا۔ اب میں کینیڈا کا ہم پلہ ہو چکا تھا۔ رہی کینیڈا جو میرے ساتھ کینیڈا میں ورکوانڈسٹریز میں کام کرتے تھے اور برطانوی نژاد کینیڈین ہونے کے ناتے ٹورونٹو میں ملکہ برطانیہ کی نمائندگی کو اپنا منطقی حق سمجھتے تھے۔ اگر منطقی طور پر ٹورونٹو کی ملکہ برطانیہ کی نمائندگی پر کینیڈا کا حق تھا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ جدہ میں یہ منصب ابھی خالی تھا۔ میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں بھی جدہ جانے کے لیے تیار تھا۔ مگر وہاں جانے کے لیے اولین شرط یہ تھی کہ میرے پاس کینیڈا کا پاسپورٹ ہو۔ اب میرا اہم ترین ہدف کینیڈا کا پاسپورٹ حاصل کرنا تھا۔

☆☆☆

کینیڈا کی شہریت میرے ہاتھ میں تھی۔ اب مجھے صرف کینیڈا کا پاسپورٹ حاصل کرنا تھا جس کے بعد میں جدہ جا کر سعودیہ کی ملازمت شروع کر سکتا تھا۔ ایک دفعہ پھر ہوائی جہاز کو گلے لگا سکتا تھا۔ شب فراق کی جدائی ختم ہو سکتی تھی۔

سنا تھا کہ ایک دفعہ شیخ سعدی کسی دعوت میں گئے۔ کپڑے پھٹے پرانے پہنے ہوئے تھے۔ چوکیدار نے محفل میں جانے سے روک دیا۔ دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ شیخ صاحب ٹھنڈے ٹھنڈے واپس آ گئے۔ اگلی دفعہ پھر اسی جگہ دعوت تھی۔ چوکیدار بھی پہلے والا تھا۔ اس دفعہ شیخ سعدی نہایت نفیس اور قیمتی لباس زیب تن کر کے محفل میں پہنچے۔ اسی چوکیدار نے جھک کر شیخ صاحب کا استقبال کیا اور نہایت ادب اور توقیر کے ساتھ لے جا کر ایک نمایاں نشست پر بٹھایا۔ جب کھانا سامنے آیا تو شیخ سعدی نے خود کھانا کھانے کی بجائے کھانے کو آستینوں میں ڈالنا شروع کر دیا اور اپنے لباس کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ''کھاؤ۔ جی بھر کے کھاؤ۔'' جب شیخ صاحب سے لوگوں نے دریافت کیا ''شیخ صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ کھانا آخر اپنے لباس کو کیوں کھلانا چاہتے ہیں۔'' شیخ صاحب نے نہایت سادگی سے جواب دیا ''ٹھیک کھلا رہا ہوں کہ یہ کھانا اسی لباس کے لیے آیا ہے۔ میرے لیے نہیں۔ اس لیے کہ جب میں پھٹے پرانے کپڑے پہن کر آیا تھا تو اسی دربان نے مجھے دھکے دے کر محفل سے باہر نکال دیا تھا۔''

یہی حال پاکستانی اور کینیڈین پاسپورٹ کا ہے۔ ایک کے ساتھ ناقدری دوسرے کے ساتھ توقیر۔

سعودیہ میں ملازمت کے دوران میں مجھے اپنے کینیڈین پاسپورٹ کی کمائی کھانے کے اپنے پاکستانی بھائیوں سے ڈھکے چھپے بہت طعنے ملتے تھے۔ اس لیے کہ مجھے جو سہولتیں ملی تھیں وہ ان لوگوں کو نہیں ملی تھیں۔ کام سب کا ایک جیسا تھا۔ اس کے اوپر ستم یہ کہ میں پہلا ''کالا'' تھا کہ جس کو ''گوروں'' کی سہولیات دی گئی تھیں۔ کوک آنے والے برسوں میں دس بارہ اور ''کالوں'' کو ''گوروں'' کی سہولیات مل گئی تھیں کہ وہ بھی امریکن یا کینیڈین تھے۔ مجھے پاسپورٹ کا طعنہ دینے میں میرے ایک عزیز دوست پیش پیش رہتے تھے۔ چند سال بعد وہ کینیڈا چلے گئے۔ وہاں کی شہریت حاصل کرنے کے بعد واپس جدہ آ کر ''گوروں'' کی سہولیات حاصل کر لیں۔ میں اس وقت تک سعودیہ کو خیرباد کہہ چکا تھا۔

اگر پاکستانی دوستوں کا ردعمل ان کی نظر سے دیکھا جائے تو بالکل جائز تھا۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو مجھے بھی بالکل اسی طرح کا احساس ہوتا مگر اس میں دو باتیں قابلِ غور

ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ گو کہ اپنا ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک کو اپنانا چاہے عارضی طور پر یا مستقل طور پر۔ مختلف وجوہات کی بنا پر ہوتا ہے لیکن اسی فیصد سے زیادہ لوگ اپنا ملک معاشی بہتری کے لیے چھوڑتے ہیں۔ اگر اجرتی کنٹریکٹ پر بھی وہی تنخواہ دی جاتی جو پاکستانی کنٹریکٹ پر دی جاتی تھی تو یہ تنخواہ ان لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ وہ اپنے ملک میں اس سے زیادہ تنخواہ والی نوکریاں کر سکتے تھے ان کے لیے اپنا ملک اپنا ماحول چھوڑ کر سعودی عرب کے ریگستان میں آکر بسنے کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس پاکستانیوں کے لیے یہ تنخواہ قابل قبول تھی اس لیے کہ یہ تنخواہ ان کی اس تنخواہ سے زیادہ ہوتی تھی جو وہ پاکستان میں کما سکتے تھے اور مکہ مدینہ کی زیارت بونس میں۔

دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ جو تکنیکی مہارت مغرب کے ملکوں میں تھی۔ وہ پاکستان میں زیادہ تر کام کرنے والوں کے پاس نہیں تھی۔ یہ صورت حال آج بھی ہے۔ گو کہ اب اس میں کافی بہتری آچکی ہے کہ اگر ہمارے یہاں کوئی بڑا پروجیکٹ شروع کیا جائے تو اس کے لیے ہم کو غیر ملکی ماہرین کی ضرورت تقریباً ہر شعبہ میں پڑتی ہے ہم سو فیصد کوئی بھی پروجیکٹ صرف اپنے بل بوتے پر نہیں کر سکتے گو کہ ہمارے ملک میں بہترین اذہان موجود ہیں۔ لیکن ان اذہان کو جس جلا کی ضرورت ہوتی ہے اس کے مواقع میسر نہیں ہیں۔ پاکستان میں بننے والا ایٹم بم ایک جیتی جاگتی مثال ہے کہ ہماری قوم کے اذہان نے ہر رکاوٹ کو پار کر کے یہ ہدف حاصل کیا۔ یہ لمحہ فکر یہ ہے ان صاحب اقتدار لوگوں کے لیے کہ جن کے کرپشن نے اس ملک کو کس بلندی سے کس پستی کی طرف دھکیلا ہے۔ صرف پیسے کی ہوس میں۔ وہ پیسا جو صرف بینکوں کے کھاتوں میں بڑھتا رہے گا۔ وہ اور نہ ہی ان کی طرح سے ان کی اولادیں، اس کو کبھی استعمال میں لاسکیں گی۔ صرف بیرون ملک بینکوں میں جمع ہوتا رہے گا۔ آسودگی حاصل ہو یا نہ ہو۔ یہ انسانی ہوس کا وہ بدترین حال ہے کہ جس کا کوئی کنارا نہیں۔

ایک تیسری بات بھی ہے جو میں کچھ افسوس کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ عام طور سے نہیں پایا جاتا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ”کام“ کسی طرح سے ”کل“ پر ٹل جائے۔ ”آج“ نہ کرنا پڑے۔ اگر کسی کو میری اس بات سے اتفاق نہیں ہے تو ممکن ہے کہ یا تو وہ خود سرکاری دفتروں میں کام کرتے ہوں گے کہ ہر وقت کی نا اہلی میں گھرے رہنے کے بعد ان کی آنکھیں اس نا اہلی کی اس قدر عادی ہو گئی ہیں کہ اب یہ نا اہلی ان کو دکھائی ہی نہیں دیتی ہے۔ یا پھر ان کا واسطہ ہمارے سرکاری دفتروں، تھانوں، اسپتالوں اور عدالتوں سے نہیں پڑا ہوگا۔ میرے پاکستانی پاسپورٹ حاصل کرنے کی داستان ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اس وقت میں پی آئی اے میں کام کر رہا تھا۔

مجھے پی آئی اے میں کام کرتے ہوئے تین سال سے اوپر ہو چکے تھے۔ اب مجھے پی آئی اے کی طرف سے یہ سہولت حاصل تھی کہ میں تعلیمی چھٹی لے کر باہر جا کر مزید تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔ میں اس سہولت کو استعمال کر کے باہر جا کر انجینئرنگ میں MSC کی پڑھائی کرنا چاہتا تھا۔ باہر جانے کے لیے مجھے پاسپورٹ کی ضرورت تھی۔

میں نے پاسپورٹ آفس جا کر نیا پاسپورٹ بنوانے کا فارم حاصل کر لیا۔ اس فارم کو پُر کرنے کے بعد جب میں اس کو جمع کروانے کے لیے پاسپورٹ آفس گیا تو وہاں کھڑکی کے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی نے میرے ہاتھ میں ایک ٹوکن تھما دیا۔ ”آپ یہ ٹوکن لے کر سامنے قطار میں لگ جائیں۔ جب اس پر لکھے ہوئے نمبر کی آواز پڑے تو آپ اندر چلے جایئے گا۔“ میں ٹوکن لے کر لائن میں لگ گیا۔ تو دس بجے کا وقت ہوگا۔

گیارہ بجے کے قریب چپراسی نے آواز لگائی۔ فلاں ٹوکن نمبر تک کے لوگ کھڑے رہیں باقی واپس چلے جائیں۔ میرا ٹوکن نمبر بعد کا تھا۔ میں نے چپراسی سے پوچھا کہ میں کیا کروں تو اس نے کہا ”آپ کل صبح سات بجے آکر نیا نمبر لے لیں۔ صاحب صرف ایک بجے تک ملتے ہیں۔ اگر آپ دیر سے آئے تو کل بھی آپ کا نمبر نہیں آئے گا۔“ اس نے دھمکی دینے کے سے انداز میں جتایا۔

اگلے روز میں صبح سات بجے پاسپورٹ آفس پہنچ چکا تھا۔ کھڑکی سے ٹوکن لے کر اپنی باری آنے کا انتظار کرنے لگا۔

صاحب دس بجے تشریف لا چکے تھے۔ چپراسی نے خوشخبری سنائی۔ ہم لوگوں کی قسمت جاگ چکی تھی۔ میرا نمبر ساڑھے بارہ بجے کے قریب آیا۔ میں صاحب کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ صاحب کو بالکل ویسا ہی پایا جیسے صاحب

ہوتے ہیں، بے نیاز اور اکھڑ۔ صاحب نے عینک اتار کر میرا فارم لے کر پڑھا۔ "آپ پی آئی اے میں کام کرتے ہیں؟" صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں میں پی آئی اے میں کام کرتا ہوں۔"

"تو آپ کا پاسپورٹ وہیں سے بنے گا۔ نیکسٹ۔"

میں صاحب سے تفصیل معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن "نیکسٹ" کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ صاحب بگڑ گئے۔ "میرا وقت ضائع نہ کریں وہیں جاکر پوچھیں۔"

صاحب بھول چکے تھے کہ میرے سوالوں کے جواب دینے اور میرا پاسپورٹ بنانے کے لیے ہی ان کو تنخواہ دی جاتی تھی۔ میں گھر لوٹ آیا۔ اس وقت پی آئی اے جانا بے سود تھا۔

پاسپورٹ حاصل کرنے کی بھاگ دوڑ کا آج تیسرا دن تھا۔ پچھلے دو دن صاحب کا دیدار حاصل کرنے میں نکل گئے تھے۔ ہینگر میں حاضری لگانے کے بعد میں پی آئی اے کے پاسپورٹ سیکشن چلا گیا۔ وہاں کے متعلقہ افسر سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ انہوں نے پوچھا "آپ کہاں کام کرتے ہیں۔"

"جی میں ہینگر میں بحیثیت جونیئر انجینئر کام کرتا ہوں۔"

انہوں نے کہا "آپ کو اپنا پاسپورٹ خود بنوانا پڑے گا۔ یہاں پر صرف فضائی عملے کے اور ان لوگوں کے پاسپورٹ بنتے ہیں جن کو پی آئی اے کے کام سے باہر جانا ہو۔" انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ مطلب یہ کہ قصہ ختم۔ آپ جا سکتے ہیں۔ میں ہینگر واپس آ گیا۔

چوتھے دن پھر پاسپورٹ آفس کا رخ کیا کہ جاکر صاحب کو خوشخبری سنا دوں۔ وہی سات بجے ٹوکن لینے کا چکر تھا۔ قریب بارہ بجے میری باری آئی۔ صاحب نے میری بات سن کر ارشاد کیا "آپ نے کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ یہ تو مجھے پہلے سے ہی معلوم تھا۔ آپ پی آئی اے سے "ان رائٹنگ" لکھوا کر لے آئیے۔"

میں چاہتا تھا کہ صاحب کی توجہ اس طرف دلواؤں کہ "ان رائٹنگ" کے بعد لفظ "لکھوا کر" انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کی ٹانگ توڑتا ہے۔ پھر خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ صاحب طیش میں آکر میرے ممکنہ پاسپورٹ کی ٹانگ توڑ دیں۔ میں لنگڑے پاسپورٹ کے ساتھ کیسے سفر کروں گا!

ائرپورٹ لوٹنے کے بعد میں نے پاسپورٹ سیکشن سے مطلوبہ دستاویز "ان رائٹنگ" لکھوائی، اور اگلے روز ٹوکن حاصل کرنے کے بعد بارہ بجے اس کو صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ "بارہ بجے" کا خطرناک اثر شاید صاحب پر ہو چکا تھا۔ فرمانے لگے "خط تو ٹھیک ہے۔ مگر اس پر مہر نہیں لگی ہوئی ہے۔ مہر لگوا کر لائیے۔" میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مہر لگوا کر اگلے روز پھر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے میرے فارم پر دستخط کر دیے۔ چھ دن لگے ان سے دستخط لینے میں۔ ہر روز سات سے بارہ بجے کی ڈیوٹی۔ دو ہفتہ بعد پاسپورٹ لینے جانا تھا۔

یہ تو پاکستانی پاسپورٹ حاصل کرنے کی داستان تھی۔

کینیڈا میں پاسپورٹ حاصل کرنے کا طریقہ ذرا مختلف تھا۔ وہاں کے پاسپورٹ آفس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ وہاں پر "صاحب" کا کوئی وجود نہ تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی لڑکی نے پاسپورٹ کی درخواست کا فارم میرے ہاتھ میں رکھا اور گویا ہوئی "اس کے ساتھ اپنا شہریت کا کارڈ لگائیں۔ ان کو بھرنے کے بعد کسی ڈاکٹر یا وکیل یا نوٹری سے دستخط کروائیں جو آپ کو کم از کم دو سال سے جانتا ہو کہ اس فارم میں لکھے گئے تمام کوائف درست ہیں۔ پھر یا تو آپ خود آکر اس کو جمع کروا دیں یا ڈاک سے بھیج دیں۔"

میں نے فارم تصدیق کروانے کے بعد ڈاک سے بھیج دیے۔ چھ دن بعد میرا پاسپورٹ مجھے ڈاک کے ذریعہ ہی موصول ہو گیا۔ صاحب کے نہ ہونے کے باوجود اتنی جلدی میرا پاسپورٹ بن چکا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی اگر صاحب ہوتے تو شاید یہ پاسپورٹ ایک ہی دن میں بن چکا ہوتا۔

صاحب کی موجودگی کو یقینی نہ بنا کر کینیڈا کے پاسپورٹ آفس نے صاحب کی بے توقیری کی ہے۔ "صاحب" کی اس بے توقیری پر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کاش کہ زمین پھٹ جائے صاحب اس میں سما جائے۔ یہ بے توقیری تو نہ دیکھنے۔

پھر مجھے خیال آیا کہ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ صاحب تو بڑی چیز تھے۔ کینیڈا کی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے چھوٹے میاں یعنی "چپراسی" کو بھی پس پشت ڈال رکھا تھا۔ کسی نے

امریکا دریافت کرلیا تھا لیکن کینیڈا کی دو تہائی کرۂ آبادی ابھی تک چھوٹے سیاں کو نہیں دریافت کر پائی تھی۔ اگر حکومت کینیڈا اس بات کی خواہشمند ہے کہ اس کا دفتری نظام بھی اسی کامیابی کے ساتھ ہچکیاں لے لے کر چلے کہ جس طرح پاکستان کا دفتری نظام چلتا ہے تو اس کو بھی پاکستان سے سبق حاصل کرتے ہوئے "صاحب" اور "چپراسی" کو فوراً دریافت کرنا پڑے گا ورنہ ان کا یہ نظام اسی طرح حسن کارکردگی سے چلتا رہے گا جیسے آج چل رہا ہے۔ اس وقت کینیڈا کسی اور کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکے گا سوائے خود اپنے آپ کے لیکن تب تک وقت گزر چکا ہوگا۔ کف افسوس ملنے سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

اگر کینیڈا کی حکومت اپنے سیاسی نظام کو بھی اسی کامیابی کے ساتھ ہچکیاں اور ہچکولے دے دے کر چلانا چاہتی ہے تو اس کو پاکستان سے سیاسی رہنما درآمد کرنے پڑیں گے۔ انشاء اللہ کامیابی اس کے قدم چومے گی۔ یہ سیاسی رہنما کینیڈا کے سیاسی رہنماؤں کو عوام کا جیب لوٹنے کے جدید زریں اور سونے زریں گر سکھا سکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ عالمی درجہ کی کرپشن کی ٹریننگ بھی مفت فراہم کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس گرانقدر تربیت کے بعد کینیڈا کے سیاسی رہنما بھی اس لوٹ کھسوٹ کے نتیجہ میں دنیا کے دس امیر ترین لوگوں کی فہرست میں شامل ہو کر ساری دنیا میں کینیڈا کا نام روشن کر دیں۔

یہ بیش بہا مواقع صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ سگ کینیڈا بھی ہمارے سیاستدانوں کی اعلیٰ صلاحیتوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ کینیڈا کے سگوادوں کی زیادہ تر آبادی گھروں میں لاڈ و پیار و نعم میں پل کر جوان ہونے کے باعث سگ لیلیٰ کی طرح سے بھونکنا بھول کر اپنا وہ مقام کھو چکی ہے جو اس کے آباؤ اجداد کو اس کے حوالے سے حاصل تھا۔ یہ مقام اب ہمارے یہاں ان کے وقف TV کی ہر چینل پر کبھی نہ ختم ہونے والے حالات حاضرہ کے ٹاک شوز ہیں۔

سگ کینیڈا کو چاہیے کہ وہ ہمارے حالات حاضرہ کے پروگراموں میں شرکت کرکے ہمارے ٹی وی اینکر کی ہر "بحث" پر لڑ لڑ کر اور چیخ چیخ کر اپنا کھویا ہوا اعزاز دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے ٹی وی اینکر رقیبوں کو مد مقابل لا کر اس کے جوہر مخاصمت کو کندن بنانے میں اپنا ثانی آپ ہیں۔

سیاستدانوں کی جھوٹی سوٹی لڑائی کا منظر مرغوں کی لڑائی کے منظر سے بھی زیادہ چسکے والا ہوتا ہے۔ آپ مرغے کی طرح اپنا سیاستدان بھی چن سکتے ہیں۔ عوام کی نظریں ٹی وی سے نہیں ہٹتی ہیں۔ ٹی وی چینل کی ریٹنگ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ ریٹنگ آج کل کے ٹی وی مینجر کا واحد ہدف ہے۔ پروگرام چاہے اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی، معیار کا بھی اب کوئی معیار باقی نہیں رہا ہے۔ ریٹنگ بے نوٹی وش چینل ہے۔

جس طرح کتوں کی لڑائی میں نقصان کتے کا نہیں بلکہ صرف اس آدمی کا ہوتا ہے جس کو کتا کاٹ کھائے۔ اسی طرح حالات حاضرہ کے پروگرام میں بھی نقصان خدانخواستہ کسی سیاستدان یا اس کی پارٹی کو نہیں پہنچتا۔ صرف عوام کو پہنچتا ہے۔

پروگرام کے اختتام پر جب کیمرے بند کر دیے جاتے ہیں تو تمام مخالف پارٹیوں کے سیاستدان اور اینکر گلے ملتے ہیں۔ خواتین کے علاوہ اور وہ تمام سیاستدان جو ٹی وی پر ایک دوسرے کے جانی دشمن دکھائی دیتے ہیں عوام کو لوٹنے کے اور اپنی تین چار اولادوں کے لیے اربوں ناجائز ڈالر جمع کرنے کے باہمی دلچسپی رکھنے والے نئے منصوبوں پر غور و فکر اور تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو فراموش کر چکے ہوتے ہیں کہ قرآن نے اسی لیے اولاد کو انسان کے لیے فتنہ قرار دیا ہے۔

عوام کا معاملہ دوسرا ہے۔ عوام کے ایک ہاتھ میں پٹرول کا بم اور دوسرے ہاتھ میں سی این جی کا بم باندھ کر پہلے اس کو گیارہ ہزار وولٹ کا جھٹکا لگایا جاتا ہے۔ اگر وہ سخت جان پھر بھی ڈھٹائی سے سانس لے رہا ہو تو اس کو مہنگائی کے دریا میں پھینک دیا جاتا ہے۔ عوام کو دریا میں پھینکنے میں بھی ہمارے سیاستدانوں کا اپنے اٹھارہ کروڑ عوام سے محبت اور لگاوٹ کا بے لوث عنصر شامل ہوتا ہے۔ دریا میں پھینکنے میں سب احتیاط ملحوظ خاطر ہوتی ہے کہ عوام کو دریا کے پانی میں ڈوبنے کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا کہ اب ہمارے دریا تقریباً سوکھ چکے ہیں۔ جب ان میں پانی ہی نہیں ہے تو عوام ڈوبیں گے کیسے!

کالا باغ ڈیم نہ بنانے میں بھی شاید یہی دانشمندی حائل ہے۔ اگر پاکستان کے کسی بھی خطہ میں پانی جمع ہو گیا تو عوام اس میں پھینکے جانے کے بعد خدانخواستہ کہیں ڈوب نہ جائیں۔

میری پاکستانی یا سیوریٹ حاصل کرنے کی صبر جمیل سے

بھرپور داستان چالیس سال سے زیادہ پرانی ہے۔ چند ماہ قبل میں اپنا نیا پاکستانی پاسپورٹ بنوانے کی غرض سے ذوجے دل کے ساتھ پاسپورٹ آفس پہنچ گیا۔ پاسپورٹ آفس اب بھی اسی عمارت میں واقع ہے جہاں وہ شاید قیام پاکستان کے زمانہ سے ہے۔ جگہ کم ضرورت زیادہ۔ یہاں پہنچ کر مجھے اپنا دل اور زیادہ ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ لوگ "صاحب" کی رحلت کا سوگ منا رہے تھے۔ میری بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "صاحب" پاسپورٹ آفس سے رحلت کر کے دوسرے سرکاری محکموں کو "پیارے" ہو چکے تھے۔ "صاحب" کی یہ رحلت بہت خوش آئند ثابت ہوئی ہے کہ آج کا پاسپورٹ آفس نہایت عمدگی سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا کیونکہ پاسپورٹ ہی تو جدہ جانے کا پروانہ ہے۔

☆☆☆

کینیڈا کا پاسپورٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ اب جدہ واپس جانے کے لیے مجھے سعودی عرب میں کام کرنے کا ورک ویزا چاہیے تھا۔ ورک ویزا حاصل کرنے کے لیے جو کاغذات چاہیے تھے وہ مجھے یا تو سعودیہ کے ہیڈ آفس سے منگوانے پڑتے یا پھر سعودیہ کے مقامی دفتر سے حاصل کیے جا سکتے تھے لیکن کینیڈا میں سعودیہ کا کوئی دفتر نہیں تھا۔ اس تمام کارروائی کے لیے مجھے لندن جانا پڑے گا۔ میں نے ائر کینیڈا سے ٹورونٹو سے لندن جانے کا ٹکٹ خرید لیا۔ وان وے۔

لندن میں شام کے وقت پہنچا تھا۔ وکٹوریہ اسٹیشن کے پچھواڑے جا کر اپنے آزمودہ "بیڈ اینڈ بریکفاسٹ" ہوٹل جا کر حیدرآبادی ڈسکاؤنٹ حاصل کیا۔ پچھلے پانچ سال میں ہوٹل کا کرایہ خاصہ بڑھ چکا تھا۔ مگر حیدرآبادی ڈسکاؤنٹ بھی بڑھا کر ایک پاؤنڈ کی بجائے دو پاؤنڈ کر دیا گیا تھا۔ صبح صبح لندن کا صحت مند ناشتا کرنے کے بعد میں سعودیہ کے دفتر پہنچ گیا۔

سعودیہ کے دفتر پہنچ کر میں نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی کو وہ خط دکھایا جو مجھے سعودیہ کے شعبہ ملازمین نے جاری کیا تھا۔ اس خط میں میری نوکری کی تفصیل لکھی تھی کہ میری نوکری پکی۔ میں کینیڈا کی شہریت حاصل کرنے کے بعد اپنی نوکری شروع کر سکتا ہوں۔ اس لڑکی نے اپنا تمام ریکارڈ چھان مارا مگر اس کو میری نوکری کا کوئی حوالہ نہیں ملا۔ اس نے بے چارگی سے مجھے مخاطب کیا۔ "سوری میرے پاس آپ کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتی۔"

میں نے جواب دیا "کوئی بات نہیں" اور دفتر سے باہر جانے والے دروازہ کی طرف بڑھا۔ اس لڑکی نے مجھے حیران کن نظروں سے دیکھا۔ وہ حیران اس لیے تھی کہ جب میری نوکری کے بارے میں کوئی ریکارڈ نہیں ملا تو میں نے اپنی مایوسی کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ سکتا تھا۔ میں نے اس کو دلاسا دیا۔ "آپ فکر نہ کریں میرے پاس جدہ جانے کے لیے کاروباری (بزنس) ویزا ہے میں جدہ جا کر حالات سنبھال لوں گا۔" اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

سعودی عرب میں دفتری نااہلی کے واقعات عام تھے۔ میں کئی دفعہ لوگوں کی داستان غم سن چکا تھا کہ فلاں فلاں محکمہ کی نااہلی اور بے پروائی سے ان کو کیا کیا نقصانات اٹھانے پڑے۔ میں اس اندیشہ کے پیش نظر کہ میرے ساتھ بھی کوئی ایسی صورت حال پیش آ سکتی ہے۔ ٹورونٹو سے روانہ ہونے سے قبل ہی اپنے پاکستانی پاسپورٹ پر سعودی عرب کا کاروباری ویزا حاصل کر چکا تھا۔ میرے لیے جدہ جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

جدہ پہنچ کر میں بالی غرب کے دفتر چلا گیا۔ بالی کو میں نے ساری کارروائی سے آگاہ کیا۔ اس نے دوبارہ کاغذات مکمل کرنے کے بعد ان کاغذات کا پلندہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"سارے کاغذات میں نے دوبارہ مکمل کر دیے ہیں۔ اب تم کو ویزا حاصل کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں پیش آنا چاہیے۔ مگر ایک بات ہے سعودی حکومت کے قانون کے مطابق تم کو یہ ویزا سعودی عرب میں نہیں مل سکتا۔ تم کو کسی دوسرے ملک کے سعودی عرب کے سفارت خانہ سے حاصل کرنے پڑے گا۔" پھر مجھے مشورہ دیا۔ "ویسے تو تم یہ ویزا پاکستان سے بھی حاصل کر سکتے ہو۔ مگر میرا ذاتی مشورہ ہے کہ تم لندن چلے جاؤ۔"

"لندن چلے جاؤ۔" میں نے اپنے دل میں کہا۔ جیسے لندن نہ ہوا پڑوس کا آنگن ہو گیا۔ مگر میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ویسے بھی میں نے لندن سے جدہ آتے وقت لندن کا ریٹرن ٹکٹ لے رکھا تھا۔

لندن میں سعودیہ کے دفتر پہنچا تو اسی لڑکی سے ملاقات ہوئی جس سے میں پہلی دفعہ ملا تھا۔ اس نے کاغذ میرے ہاتھ سے لے کر میری طرف ستائش بھری نظروں سے دیکھا کہ میں نے کیا عقلمندی کا کام کیا تھا۔ میں نے خود

بھی اپنی جیب ٹھونکی۔ میں نے پھر اس لڑکی سے پوچھا۔ ”ویزا ملنے میں کتنے دن لگیں گے؟“

جواب ملا ”زیادہ نہیں۔ سعودی ایمبیسی کو سعودیہ کی ضرورت بات کا اور اک ہے۔ ہمارے ویزا کی درخواستوں میں کسی قسم کے جھمیلے کی کوئی بات نہیں ہوتی ہے۔ ہمارا کام جلد ہو جاتا ہے۔“

میں نے اس لڑکی کو مطلع کیا ”اگر ایک ہفتے سے زیادہ وقت لگا تو میں اپنا بیڈ اینڈ بریک فاسٹ چھوڑ کر تمہارے گھر منتقل ہو جاؤں گا اس لیے کہ میرے پاس جو جمع پونجی ہے وہ ایک ہفتے سے زیادہ کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اور میرے پاس واپسی کے ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں ہیں۔“

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک دن پہلے مجھے یاد دلا دینا تاکہ میں اپنے شوہر کو تمہارا سامان ہوٹل سے لانے کے لیے بھیج دوں۔“ مگر اس کے شوہر کو ہوٹل آنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایک ہفتے کی فراغت۔ لندن کا شہر۔ برمنگھم کی یادیں۔ سوچا کہ برمنگھم چلا جاؤں۔ جیب نے اجازت نہ دی۔ یادوں کے جزیرے کے علاوہ برمنگھم جانے کی خواہش کی ایک اور وجہ بھی تھی۔

میں نے جب اسی لندن شہر سے اپنا ویلنٹائن ڈے کا کارڈ روز لین کو بذریعہ ٹونی بھیجا تھا تو غلطی سے میں نے کراچی کی بجائے اپنا کینیڈا کا پتا لکھ دیا تھا حالانکہ میں کراچی جارہا تھا۔ کینیڈا واپسی کا اس وقت کوئی گمان تک نہ تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ شہریت کی کارروائی مکمل کرنے کے لیے مجھے کینیڈا واپس جانا پڑے گا۔

شہریت کی کارروائی کے ختم ہونے اور کینیڈا کا پاسپورٹ ملنے کے بعد لندن روانہ ہونے سے قبل مجھے ٹورونٹو میں بھی کے پتے پر ایک خط ملا۔ اس خط پر برطانیہ کے ڈاک کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ یہ خط ٹونی کی طرف سے میرے ویلنٹائن ڈے کے کارڈ کے جواب میں آیا تھا۔ لکھا تھا ”میری پسند کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اگر تم کو کارڈ ہی بھیجنا تھا تو شادی کی مبارک باد کا بھیجتے۔“ اس کے بعد دھمکی۔ ”اگر تم نے روز لین کو مجھ سے چھیننے کے بارے میں کبھی سوچا بھی تو تم کو میرا ڈوئل کا چیلنج قبول کرنا ہوگا۔ ہتھیار صرف میرے پاس ہوگا تاکہ تمہاری موت یقینی ہو سکے۔“ اس کے بعد برمنگھم آنے کی مشروط دعوت۔ اپنی طرف سے نہیں۔ بندوق روز لین کے کاندھے پر رکھ کر چلائی گئی تھی۔ ”روز لین کا اصرار ہے کہ تم جب بھی برطانیہ آؤ تو برمنگھم ضرور آنا۔ مگر ایک شرط پر۔ اور یہ شرط میری ہے۔ تم روز لین سے کم سے کم ایک میل کے فاصلے پر رہو گے۔“ شرط مجھے منظور تھی مگر جیب نادار۔

میں نے ٹونی اور روز لین کو ٹیلی فون کرنے پر اکتفا کیا۔ ان کو شادی کی مبارک باد دی۔ اپنے قلاش ہونے کا حال سنا کر برمنگھم نہ آسکنے کی معذرت کی اور وعدہ کیا ”برطانیہ کے اگلے چکر میں، میں تم دونوں سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔“ مگر اس کے بعد لاتعداد مرتبہ لندن جانے کے باوجود میں ٹونی اور روز لین سے ملنے نہیں جاسکا۔

حجاب آتا ہے ان سے نظر ملانے میں
عجیب لطف ہے وعدوں کے بھول جانے میں

چار دن کے بعد سعودیہ سے اس لڑکی نے میرے ہوٹل فون کیا۔ ”تم کو میرے گھر منتقل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا پاسپورٹ ویزا لگنے کے بعد آچکا ہے۔ میں نے تمہارا ٹکٹ بھی بنا دیا ہے۔ یہ اوپن ٹکٹ ہے۔“

”آپ کے فون کرنے کا شکریہ۔ ٹکٹ اوپن نہ رکھیں۔ کل صبح کی فلائٹ میں اگر جگہ ہے تو اس میں میری سیٹ کنفرم کر دیں۔ میں ایک گھنٹے بعد آپ کے دفتر آکر اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ لے لوں گا۔ ایک دفعہ پھر آپ کے فون کرنے کا شکریہ۔“

☆☆☆

میں ہیتھرو ائرپورٹ کی ٹرمنل نمبر 3 کی ڈپارچر لاؤنج میں اپنی جدہ جانے والی پرواز کا اعلان ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پرواز کا اعلان ہو چکا تھا۔ میں جہاز پر سوار ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ لاؤنج پر آخری نظر ڈالی۔ مگر لاؤنج سے صدا آرہی تھی۔

اس انجمن میں ڈوب کو آتا ہے بار بار
دیوار و در کو غور سے پہچان لیجیے

پھر میں واقعی اس انجمن میں اتنی بار لوٹ کر آیا کہ ان در و دیوار کا کونا کونا میرے ذہن میں نقش ہو چکا تھا۔ میں ٹرمنل 3 کی لاؤنج سے آنکھیں بند کر کے باہر آسکتا تھا۔

جدہ ائرپورٹ پر ڈاکٹر صلاح الدین میرے منتظر تھے۔ گھر پہنچے تو زین نے ایک دفعہ پھر گلے لگا یا۔ اس دفعہ میں نے یہ فرمائش نہیں کی کہ مجھے اس وقت تک سونے دیا جائے جب تک کہ میں خود سے نہ اٹھ جاؤں۔ ہم لوگ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اگلے روز صبح سویرے میں سلطان صلاح الدین ایوبی

کی سی فاتحانہ شان سے ہینگر میں داخل ہوا کہ میں اس کو فتح کر چکا تھا۔ فتح کی یہ سرشاری میری رگ رگ میں ناچتی تھی۔

افسوس یہ سرشاری زیادہ پائیدار نہ تھی۔ میرے لیے امیدوں پر اوس پڑنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ مجھے اب تک اس کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر نہیں۔ میں بڑے طمطراق سے امین الشوریٰ کے دفتر میں داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر امین کی جگہ احمد شرعی براجمان تھے۔ امین کا پتا کٹ چکا تھا۔ شرعی امین کے خلاف بغاوت کر کے اس کی کرسی جھپٹ چکے تھے۔ امین کا تبادلہ دوسرے محکمہ میں کر دیا گیا تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ اب تک تو سعودیہ کا سارا انتظام TWA از راہِ ایک ایجنٹ معاہدہ کے تحت چلا رہی تھی۔ تمام اعلیٰ عہدوں پر TWA کے ملازمین فائز تھے۔ اب یہ معاہدہ اپنے اختتام کو پہنچنے والا تھا۔ تمام اعلیٰ عہدوں پر سعودی فائز ہونے والے تھے۔

ٹیکنیکل ڈویژن میں تین انتہائی لائق سعودی انجینئر کام کر رہے تھے۔ عدنان دماغ، امین الشوریٰ اور احمد شرعی۔ ان تینوں کے درمیان رسہ کشی چل رہی تھی کہ کون بنے گا کروڑ پتی؟ ذاتی طور پر امین کے تبادلے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے کہ احمد شرعی نے ہی مجھے سعودیہ میں نوکری دی تھی مگر اس وقت وہ منیجر انجینئرنگ تھے۔ آج وہ جنرل منیجر کی کرسی پر براجمان تھے۔ "سارا جھگڑا کرسی کا"

شرعی نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور صالح شلبی کو اپنے دفتر میں بلا کر مجھے ان کے حوالے کر دیا۔ صالح شلبی انجینئرنگ کے شعبہ میں تمام دفتری امور کے کرتا دھرتا تھے۔ ان کا حلیہ شرعی سے خاصا ملتا جلتا تھا۔ سوائے اس کے کہ ان کا قد شرعی کے قد سے چھوٹا تھا اور شرعی کے سر پر سامنے کی طرف جو بالوں کی تھوڑی سی جھالر تھی اس سے صالح کئی سال پہلے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں پر عینک بھی نہیں تھی۔ جو شرعی کے چہرے کی زینت تھی۔

سعودیہ کے شعبہ ملازمین نے مجھے جو کاغذات دیے تھے وہ میں نے صالح کی طرف بڑھا دیے۔ پہلے انہوں نے وہ کاغذ دیکھے پھر اپنی دراز کھول کر ایک رجسٹر نکالا۔ اس کے صفحوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ پھر میرے دیے ہوئے کاغذ مجھے واپس کرتے ہوئے بولے۔ "یا اخی (اے میرے بھائی) اس وقت ہمارے پاس انجینئر کی کوئی آسامی خالی نہیں ہے۔"

میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پچھلے چند ماہ کی بھاگ دوڑ۔ جدہ۔ کراچی۔ لندن۔ ٹورونٹو کے سفر...... ان

تمام کارروائیوں کو صالح کے ان ایک جملے نے لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ میں غصہ اور مایوسی کی حالت میں ہانی غریب کے دفتر میں داخل ہوا۔

"کیا ہوا بھئی۔ یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟" ہانی نے میرا حلیہ دیکھ کر اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ حلیہ میں نے نہیں صالح شلبی نے بنایا ہے۔" میں نے ماجرا تفصیل کے ساتھ سنا ڈالا۔

"یہ پانی پیو" ہانی نے پانی کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے۔"

ہانی نے اپنا ریکارڈ نکال کر دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ دیکھو" اس نے ریکارڈ میری طرف بڑھایا۔ "یہ صاف صاف لکھا ہے کہ اس وقت ہینگر میں انجینئرز کی تین آسامیاں خالی ہیں۔ تم فکر مت کرو میں صالح سے ابھی بات کرتا ہوں۔"

ہانی نے صالح سے ٹیلی فون پر بات کرنے کے بعد مجھے واپس ہینگر بھیج دیا۔ میں دوبارہ صالح کے پاس پہنچ گیا۔ صالح نے معذرت کی۔ "یا اخی معاف کرنا۔ میں غلط رجسٹر میں دیکھ رہا تھا۔"

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔

چند مہینے بعد میری اور صالح کی گہری دوستی ہو چکی تھی۔ وہ ایک بہت اچھا انسان تھا۔ مگر اکھڑ اور بے پروا۔ اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد بولے۔ "اب سارا کام تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ جیسے ہی تم اپنا میڈیکل فٹنس کروا لو گے۔ تم اپنی نوکری شروع کر سکتے ہو۔ یہ اپنے میڈیکل کے کاغذ لو اور کلینک چلے جاؤ۔"

یا خدایا کیا ابھی اور بھی کوئی مرحلہ باقی تھا۔ ان لوگوں نے مجھے یہ ساری باتیں پہلے کیوں نہیں بتائی تھیں۔ اگر میڈیکل میں کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا تو پھر کیا ہوگا۔ پھر وہی لیبی پر جان ورو لیٹنی۔ میں میڈیکل کروانے سعودیہ کی کلینک چلا گیا۔ میڈیکل کے تمام مراحل خیر و خوبی گزر گئے سوائے ایک کے۔ میری آزمائش ابھی باقی تھی۔ سورۃ بلد میں ارشاد ہے۔ "انسان مشقت میں پیدا کیا گیا ہے۔" میں اس مشقت سے کیسے فرار پا سکتا تھا۔

آنکھوں کے ٹیسٹ کا پہلا مرحلہ ساتھ خیریت کے گزر چکا تھا۔ دوسرا مرحلہ کلر بلائنڈ ٹیسٹ کا تھا۔ اس ٹیسٹ

کے لیے مجھے چند کارڈ پڑھنے تھے۔ ان کارڈوں پر مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے دائرے تھے۔ ان دائروں کے رنگوں میں بعض رنگ دوسرے رنگوں کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں تھے۔ اس نمایاں رنگ کے دائروں سے اور چند دوسرے رنگوں سے مل کر کوئی ایک نمبر واضح طور پر دکھائی دیتا تھا۔ جیسے 9، 5 وغیرہ۔ پہلے چار نمبر مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے میں نے ان کو فرفر پڑھ لیا پانچویں پر آ کر اٹک گیا۔ نرس جو میرا ٹیسٹ لے رہی تھی فکر مند ہوگئی۔ وہ مجھے فیل ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی مگر مجھے یہ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ کارڈ پر کون سا نمبر لکھا ہوا ہے۔ اس نے ایک بیچ کا راستہ نکالا۔ بعض دائروں پر انگلی رکھ کر اس نے معصومیت سے مجھ سے پوچھا "تم نے اس کو نہیں دیکھا؟" میں نے فوراً دیکھ لیا۔ تین چار دائروں پر توجہ دلوانے کے بعد میں نے نمبر بتا دیا۔ جو صحیح تھا۔ نرس نے خوشی سے بچوں کی طرح تالی بجائی۔ میں میڈیکل میں پاس ہو چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے پر مہربان ہوتا ہے تو وہ اس بندے کے لیے ہر بند دروازے کھول دیتا ہے۔ یہ اس نرس کی مہربانی تھی کہ اس نے بغیر اپنا اصول توڑے ہوئے..... حتی الامکان میری مدد کی ورنہ میں یہ نوکری نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ اس آخری مرحلہ سے گزرنے کے بعد میرا اور ہوائی جہاز کا رشتہ ایک دفعہ پھر سے استوار ہو چکا تھا۔ اس دفعہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کے ساتھ استوار ہوا تھا۔ گو کہ میں نے تین دفعہ اس کو تڑانے کی کوشش کی۔

ملازمت شروع کرنے میں جتنی رکاوٹیں آ سکتی تھیں سب آ چکی تھیں۔ ان سب کا ازالہ بھی ہو چکا تھا۔ اب میں ہنگر جا کر کام شروع کر سکتا تھا۔ مجھے مینجر انجینئرنگ کے دفتر جا کر رپورٹ کرنا تھا۔ یہ وہی دفتر تھا جہاں پر مسٹر... نے چند ہفتہ قبل مجھے نوکری دی تھی۔ مینجر انجینئرنگ کے دفتر میں داخل ہوا تو وہاں پر ایک پاکستانی صاحب پارے کی طرح پہلو بدل بدل کر اور اچھل اچھل کر بات کر رہے تھے۔ ان کا نام عمر خان تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ ان کا پورا نام چوہدری محمد عمر خان تھا۔ وہ بہت ہی سنجیدگی سے "چوہدری" تھے چھوٹا قد۔ دبلے پتلے۔ مونچھیں غائب بغیر مونچھوں والا چوہدری میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اپنے مسئلے بھر لیے نام کو مختصر کر کے دستخط کرتے تھے CHMU KHAN جب ان سے میری دوستی ہو گئی تو میں نے ان کو مشورہ دیا کہ اپنی دستخط میں سے "h" نکال کر "Chmu" خان کی بجائے "Cmu" خان لکھیں تو بہتر رہے گا۔ ورنہ لوگ ان کے نام کے غلط معنی نکال لیں گے۔

ایسا ہی ایک مشورہ میرے مرحوم ماموں شاہد رزاقی صاحب نے حنیف رامے صاحب کو دیا تھا۔ حنیف رامے صاحب اپنا نام "ح۔ رامے" لکھا کرتے تھے۔ شاہد ماموں نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ اگر رامے صاحب اس کو چھوٹی "r" سے لکھیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔

عمر صاحب نے مجھے "پروجیکٹ مینجر ایوبانکس" کے پاس جانے کے لیے کہا جن کا نام "ایلن" تھا۔ کہ مجھے ایلن کے ساتھ ہی کام کرنا تھا۔ میرے دفتر چھوڑنے سے پہلے عمر صاحب نے کہا "پاکستانیوں کا نام روشن رکھے گا۔"

میں نے وعدہ کر لیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ وعدہ کرنے میں کیا جاتا تھا۔ عمر صاحب محب وطن پاکستانی تھے مگر امریکا جا کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ہمارے ہر محب وطن پاکستانی کی ایک ہی پہچان ہے۔ وہ مغرب کے کسی ملک میں جا کر مستقل سکونت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے بیٹھ کر اس ملک کو گالیاں دیتا ہے اور پاکستان سے اپنی لازوال محبت کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ ان گالیاں کھانے والے ملکوں میں امریکا کا نام سرفہرست ہے۔

ایلن نے کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" میں بھی خوش ہو گیا کہ اس دنیا میں کوئی تو ایسا بندہ ہے۔ جس کو میری ذات سے مل کر خوشی محسوس ہوئی لیکن میں ایک بار پھر خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ ایلن کی اس خوشی کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ "اچھا ہوا تم آ گئے۔ تین دن بعد ہوٹل براوو سیٹوں کی تعداد بڑھانے کے کام کے لیے ہانگ کانگ جا رہا ہے۔ تم کو اس کے لیے انجینئرنگ آرڈر (E.O) لکھنے ہیں۔ یہ جہاز کے ساتھ جائیں گے۔" ذات کی خوشی کی سنسنی ختم ہو چکی تھی۔

ہو سکتا ہے کہ "ہوٹل براوو" سن کر کسی کو یہ گمان ہو کہ شاید سعودی عرب میں کوئی ایسا عجوبہ "بہادر ہوٹل" تھا جس کا کاروبار سعودی عرب میں ٹھپ ہو چکا تھا اور وہ نقل مکانی کر کے..... جس طرح محب وطن پاکستانی نقل مکانی کر کے امریکا چلے جاتے ہیں ہانگ کانگ جا رہا تھا کہ اپنی سیٹوں کی تعداد بڑھا کر بننے کا ایک تلاش کر کے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

جس طرح لوگ اپنے بچوں کو پکارے جانے کے لیے ان کے نام رکھتے ہیں اسی طرح جہاز ران کمپنیاں اپنے

جہازوں کے نام رکھتی ہیں۔ جوان جہازوں کا رجسٹریشن نمبر کہلاتا ہے۔ اور جس طرح اکثر بچوں کے نام اس کے ماں باپ نہیں بلکہ دادا، دادی، نانا، نانی رکھتے ہیں اسی طرح جہازوں کا رجسٹریشن نمبر اس ملک کی سول ایوی ایشن اتھارٹی دیتی ہے۔ ہانگ کانگ جانے والے اس جہاز کا مکمل رجسٹریشن نمبر HZ-AHB تھا مگر پیار سے حرف "HB" کہلاتا تھا۔ H سے ہوٹل اور B سے براوو۔ ہوٹل براوو۔ اس جہاز میں سیٹوں کی تعداد بڑھائی جارہی تھی تاکہ اس میں زیادہ تعداد میں مسافر سفر کرسکیں۔ سعودیہ کے مسافروں میں ان دنوں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہورہی تھی۔ جہاز کم اور چھوٹے پڑنے لگے تھے۔ سیٹیں بڑھانے کا یہ کام ہانگ کانگ کی ایک کمپنی HAECO میں ہورہا تھا۔

تینوں EO میں نے دو بجے تک تیار کرلیے تھے۔

اب ان کو ٹائپ کروانا تھا۔ میں ٹائپسٹ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ ایک پاکستانی صاحب تھے مرشد حسین نام تھا۔ میں ان کے آرام میں مخل ہوا تھا۔ وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں اگر کینیڈا کی بجائے پاکستان سے سیدھا جدہ وارد ہوا ہوتا تو شاید مجھے یہ منظر دیکھ کر اتنی حیرانی نہیں ہوتی اس لیے کہ پاکستان کے دفتروں میں یہ منظر عام ہے لیکن کینیڈا میں کام کرکے میری عادتیں خراب ہوچکی تھیں۔ میں نے اعتراض کیا تو مرشد حسین صاحب نے آستینیں چڑھالیں۔ ”دو بج چکے ہیں۔ ڈھائی بجے دفتر کا ٹائم ختم ہوجائے گا۔ آپ کو پہلے آنا چاہیے تھا۔ اب یہ کل صبح ٹائپ ہوگا۔“

دوسرے دن صبح صبح پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ابھی تک اخبار پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ ”یہ آج کا تازہ اخبار ہے۔ اہم خبریں پڑھ لوں پھر ٹائپ کردوں گا۔“

پھر مجھے اخبار پڑھنے کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے بولے ”آپ بھی پڑھا کیجیے۔ اس سے دنیا کے تازہ ترین حالات معلوم ہوتے ہیں۔ انسان کے لیے اپنے ماحول کے اردگرد سے باخبر رہنے میں ہی اس کی بقا ہے۔“ مجھے ان سے اختلاف تھا۔ اس وقت میری بقا صرف اور صرف اس امر میں تھی کہ میرے لکھے ہوئے EO ٹائپ ہوکر جہاز کے ساتھ روانہ کردیے جائیں۔ مجھے رخصت کرنے سے پہلے مرشد صاحب نے میری ہمت بڑھائی۔ ”فکر بالکل نہ کریں دوپہر تک ہوجائے گا۔“ مجھے اُمید کی کرن نظر آئی جو مجھے پہلے بھی اکثر دھوکا دے چکی ہے۔

میری اُمید کی کرن کا خدشہ صحیح تھا۔ دوپہر کے وقت تک وہ ساری اہم خبروں کو ہضم کرچکے تھے۔ اب غیراہم خبروں کی باری تھی۔ معاملہ سہ پہر کے وعدہ پر ملتے ہوا۔ دو بجے ان کے پاس گیا تو بولے ”اشتہار باقی رہ گئے تھے۔ میں نے سوچا ایک نظر ان پر بھی ڈال لوں۔ اب تو ویسے بھی آدھے گھنٹے بعد چھٹی ہوجائے گی۔ ٹائپنگ شروع کی تو ادھوری رہ جائے گی۔ صبح ایک ہی جگہ میں کام تمام کردوں گا۔“ کل کا انتظار کرنا میرا مقدر بن چکا تھا۔

”کل“ آتو گیا۔ لیکن قسمت کا لکھا پورا ہوکر رہنا ہے۔ نو بجے کے قریب مرشد حسین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ آج کے تازہ اخبار کی زیادہ تر اہم خبروں کو پڑھ چکے تھے۔ صرف ”چند ایک“ باقی رہ گئی تھیں۔ ”جیسے ہی یہ ختم ہوئیں بس ٹکا ٹک ٹائپ کردوں گا۔ آپ کو آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

مجھ میں مزید حوصلہ نہ تھا۔ جہاز کو اگلے دن روانہ ہونا تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ میں نے غصہ میں آکر ہاتھ بڑھا کر ان کی ٹرے سے اپنے کاغذ جھپٹ لیے۔ وہ بھی غصے میں آگئے۔ اخبار ایک طرف پھینک کر کھڑے ہوگئے۔ ”عجیب بے صبرے آدمی ہیں۔ کہہ رہا ہوں کہ ہوجائے گا مگر یہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ کچھ سنتے ہی نہیں۔“ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے میں ان کا مزید ایک لفظ بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے کاغذ لیے۔ ان کو دوبارہ اپنے ہاتھ سے خوش خط کرکے لکھا۔ تمام ڈرائنگ وغیرہ کے ساتھ مکمل کیا اور اگلے دن جہاز کے ساتھ روانہ کردیا۔ مرشد صاحب ایسے لوگ پاکستان کے دفتروں میں کوئی عجوبہ نہیں ہیں۔ تقریباً ہر دفتر میں ایک دو مرشد حسین پائے جاتے ہیں لیکن یہ کافی پرانے لوگ ہوتے ہیں اور کام کرنے کرانے اس سے بے نیاز دکھتے ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے مرشد حسین صاحب بھی اسی قدر پرانے ہوں گے کہ ان کو کسی جواب دہی کی پروا نہیں تھی لیکن کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ ہمارے مرشد حسین صاحب نے سعودیہ میں مجھ سے صرف چھ ہفتے پہلے ہی ملازمت اختیار کی تھی۔ ان کے دل گردہ کو داد دینی پڑی۔ اس ذہنیت کے لوگوں نے پاکستان کا نام سعودی عرب میں اور خلیج کے دوسرے ممالک میں بہت زیادہ بدنام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

جاری ہے

سہیل احتشام

نشیلی دوائیں پوری نسل کو برباد کردیتی ہیں۔ اس سے گھناؤنا کاروبار کوئی اور نہیں اسی لیے ہر ملک کی پولیس ڈرگ اسمگلرز کے تعاقب میں رہتی ہے۔ دنیا بھر میں ڈرگ کی سب سے بڑی منڈی امریکا کو سمجھا جاتا ہے اور ان اسمگلرز کی سب سے بڑی دشمن بھی امریکن پولیس ہے۔ وہ ہر اس رخنے کی تلاش میں رہتی ہے جس کا فائدہ نشیلی دواؤں کے اسمگلرز اٹھا سکتے ہیں۔ امریکن پولیس نے کس طرح دنیا کے سب سے بڑے ڈرگ اسمگلرز کے گینگ کو توڑا یہ قصہ بھی کم دلچسپ نہیں۔

ایڈورڈ میڈونا اپنے باغیچے میں پھول کے پودوں کی صفائی میں مصروف تھا اور اس خیال سے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ آخرکار اسے پودوں پر توجہ دینے کا موقع مل ہی گیا۔ اتوار کا دن تھا اور جون 1985ء کی 23 تاریخ تھی۔ وہ پینتیس سال کا ایک جوان آفیسر تھا اور یو ایس ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن کے سیئٹل Seattle آفس سے وابستہ تھا۔

دوپہر ہو چلی تھی، دھوپ میں خاصی تمازت تھی لیکن

وہ اس کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔ پھر ایک بج کر چند منٹ پر اس کی بیلٹ سے منسلک پیجر اچانک "بیپ" کرنے لگا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے ڈرائنگ روم میں آیا اور اپنے دفتر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ایسے میں اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی اور میڈونا کو کسی سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ چند منٹ کے بعد میڈونا نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور اپنی بیوی کی طرف مڑا۔

"کون تھا؟" بیوی نے پوچھا۔

"ابھی ابھی کسٹمز نے ٹوکیو سے آنے والی ایک پرواز سے منشیات کے دو اسمگلروں کو گرفتار کیا ہے۔ چند اونس منشیات ہوگی پھر بھی۔۔۔ میری چھٹی غارت کردی۔" اس نے جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس کے ایک گھنٹے بعد وہ سیئٹل کے ٹیکوما ایئرپورٹ پر تھا اور اپنی نظروں کے سامنے یو ایس کسٹمز کے ایک انسپکٹر کو دھات کی ان ایک سو اڑتیس بالٹیوں کو ڈرل کرکے ان کے کھوکھلے پیندوں میں سے دو سو بارہ پونڈ خالص ہیروئن برآمد کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا جن کے بارے میں ان اسمگلروں کا دعویٰ تھا کہ یہ پروڈکٹ سیمپلز تھے۔ یہ ریاست ہائے متحدہ میں مشرقی ایشیا کی ہیروئن کی سب سے بڑی کھیپ تھی جو پکڑی گئی تھی۔ لیکن۔۔۔ میڈونا کے ایئرپورٹ پہنچنے سے پہلے ہی ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آچکا تھا۔ ان دو میں سے ایک اسمگلر نے حکام سے باتھ روم جانے کی اجازت مانگی تھی اور اسے اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ سیاہ مونچھوں والا ایک دبلا پتلا چینی تھا جس نے فن چی شینگ کی حیثیت سے اپنی شناخت کرائی تھی۔ اسے باتھ روم گئے ہوئے کئی منٹ ہو چکے تھے اور جب انتظار کے لمحات طویل ہونے چلے گئے تو انسپکٹر اسے چیک کرنے کے لیے خود وہ باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ وہاں فرش پر ایک نقلی مونچھ پڑی ہوئی تھی اور باتھ روم کی چھت کی کھڑکی پوری کھلی ہوئی تھی۔ وہ غائب ہو چکا تھا جبکہ اس کا ساتھی اسمگلر محافظوں کی سخت نگرانی میں تھا۔

"تم کون ہو؟" میڈونا نے اس کمرے میں پہنچ کر اس سے پوچھا۔

"میں ایک الیکٹریکل انجینئر ہوں اور کاروباری دورے پر یہاں آیا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں ہیروئن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ "میں برف کی بالٹیاں ایک دوست کو ڈلیور کرنے لایا تھا۔ مجھے ان بالٹیوں کو ٹکوما لے جانا ہے اور ایک فون کال کا انتظار کرنا ہے۔"

"آپ لوگ ذرا باہر جائیں اور ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔" میڈونا نے کسٹمز کے انسپکٹروں سے کہا۔

سارے انسپکٹر کمرے سے نکل گئے۔ میڈونا اس کے پاسپورٹ کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے پاسپورٹ پر چسپاں اس کی تصویر کو غور سے دیکھا اور میز کی دوسری طرف براجمان اس شخص پر نگاہ ڈالی۔ وہ چھبیس سال کا ایک نحیف سا چینی تھا۔

"تم چین زنگ جیک ہو؟" میڈونا نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں تائی چینی ہوں۔" وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا اور اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں بہت تیزی سے جگہ بناتی جارہی تھیں۔

میڈونا غور سے کئی منٹ تک اس چینی کو دیکھتا رہا۔ چینی واضح طور پر بے حد خائف نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں کمرے میں پوشیدہ چیزوں کو تلاش کررہی تھیں۔ وہ خائف تھا لیکن کس سے؟ اسے کس سے خطرہ تھا؟

"اطمینان رکھو تائی۔" میڈونا نرمی سے بولا۔ "کوئی بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن برف کی وہ بالٹیاں ہمارے لیے بہت بڑا مسئلہ بن گئی ہیں اور مجھے اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل نظر آتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آؤ ہم ایک معاہدہ کرلیتے ہیں۔" میڈونا نے پیشکش کی۔ "تم اپنا سفر جاری رکھو اور وہ بالٹیاں ٹکوما میں ڈلیور کردو۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ "اور اگر تم ہمیں کھیپ کے مالکان کی شناخت کرادو اور ان کے خلاف گواہی دو تو بیس سال تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑنے رہنے سے بچ جاؤ گے۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کسی بھی طرح ایسا نہیں کرسکتا۔"

میڈونا اسے شعلہ بار نظروں سے گھورنے لگا۔ "اس کے سوا تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "تم یہ کیوں نہیں سمجھ رہے کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔"

"بہتر ہے۔" تائی چین نے کافی پس و پیش کے بعد ہامی بھرلی۔ "میں ٹکوما جاؤں گا اور اس فون کال کا انتظار کروں گا جو متوقع ہے لیکن اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔ میں گواہی نہیں دے سکوں گا۔"

"لیکن کیوں؟" میڈونا نے پوچھا۔

"کیونکہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔" چن نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور...... اور میری فیملی کو بھی۔"

"کون تمہیں مار ڈالے گا؟" میڈونا نے پوچھا۔

چن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میڈونا بے بسی سے محض شانے اچکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

اس کے دو گھنٹے بعد وہ اس چینی کے ہمراہ ایک پرواز سے شکاگو جا رہا تھا۔ تائی چن نے کہا کہ اسے وہاں ہلٹن ہوٹل میں قیام کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ چنانچہ اسے اسی ہوٹل میں لے جایا گیا۔ ڈی۔ای۔اے کے تین ایجنٹوں کو ہوٹل کے ہال میں متعین کر دیا گیا جبکہ ایک محافظ کو چن کے کمرے میں اس کی نگرانی پر مامور کر دیا گیا۔ میڈونا اس سے ملحقہ کمرے میں قیام پذیر تھا۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے اچانک میڈونا کا فون گنگنا اٹھا۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے کوئی شخص چن کے محافظ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میڈونا نے دیوار کھٹکھٹا کر محافظ کو اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی سیکنڈ کے بعد وہ محافظ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ چن اپنے کمرے میں چند منٹ کے لیے تنہا رہ گیا۔ دفعتاً میڈونا کے کانوں سے ایک پُرشور آواز ٹکرائی۔

"دوڑو۔" وہ چیختا ہوا نگرانی پر مامور ٹیم کے ہمراہ بھاگ کر تائی چن کے کمرے میں داخل ہوا۔

کمرا خالی تھا۔ چن فرار ہو چکا تھا۔

اس اسمگلر نے ایک کھڑکی بزور بازو کھول لی تھی اور حیرت انگیز طور پر تین منزل نیچے ہوٹل کے کنکریٹ کے سائبان پر کود گیا تھا۔ پھر وہاں سے دو منزل نیچے سڑک پر چھلانگ لگا دی تھی اور رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا تھا۔ میڈونا کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے فوراً پولیس، اسپتالوں اور ٹرانسپورٹ سنٹرز کو بذریعہ ریڈیو چن کے حلیے سے آگاہ کر دیا۔ یہ کیسا خوف تھا جس نے اس اسمگلر کو اتنی بلندی سے چھلانگ لگانے پر مجبور کر دیا تھا؟

اس کے تقریباً نصف گھنٹے بعد ایک گشتی پولیس نے ایک زخمی اور پریشان حال اجنبی کو، جو نیو یارک کی بس میں سوار ہونے والا تھا۔ اس کی ایک کہنی ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے شدید اندرونی چوٹیں آئی تھیں۔ پھر بھی اس نے اپنی تکلیف پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ہوٹل کے پاس سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی رکوائی تھی اور اس میں سوار ہو کر فرار ہو گیا تھا اور اب جبکہ وہ نیو یارک کی بس میں سوار ہونے والا تھا تو گشتی پولیس مین نے بڑھ کر اسے حراست میں لے لیا۔ وہاں سے اسے سیدھے اسپتال پہنچا دیا۔

اگلی صبح میڈونا اسپتال میں اس کے بستر کے پاس کھڑا تھا۔

"بیس سال ایک طویل مدت ہے تائی۔" اس نے یاد دلایا۔

جواب میں تائی دیوار کو سپاٹ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی یہ خاموشی فیصلہ کن لگتی تھی۔ وہ زبان کھولنے پر جیل جانے کو ترجیح دیتا نظر آ رہا تھا۔ وہ دہشت زدہ تھا۔ میڈونا کو یہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اپنے دفتر پہنچ کر میڈونا نے تائی چن کے فرار ہونے کی حیرت انگیز کوشش اور عدم تعاون سے متعلق ایک رپورٹ لکھی لیکن یہ رپورٹ ظاہر ہے، ہر پہلو سے تشنہ تھی۔ اس کے اہم نکات یہ تھے...... برف کی ایک سو اڑتیس بالٹیاں، دو سو بارہ پونڈ ہیروئن اور ایک زخمی اسمگلر لیکن ان نکات سے کسی بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ میڈونا کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ آیا امریکا پہنچنے والی ہیروئن کی یہ کھیپ بھی بے شمار کھیپوں میں سے ایک تھی اور یہ کہ ہیروئن کس نے بھیجی تھی!؟ اس کھیپ کا اصل مالک کون تھا؟

☆☆☆

1985ء کی گرمیاں رخصت ہو رہی تھیں اور بار بار پوچھے جانے کے باوجود تائی کے رویے میں کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ بدستور خاموش تھا۔ اس دوران میں میڈونا اس کی ٹکٹوں اور کاغذات کی جانچ پڑتال میں مصروف رہا۔ چن کے پاس سے ایک نوٹ بک برآمد ہوئی تھی جس میں بے شمار ناموں اور فون نمبروں کی کھچڑی سی نظر آتی تھی۔ میڈونا نے اس نوٹ بک کی کاپیاں ڈی۔ای۔اے کے دنیا بھر کے تمام دفتروں کو ارسال کر دی تھیں لیکن گزرتا ہوا وقت یہ بتا رہا تھا کہ اس کیس میں نہیں تھا جس میں امید کی کوئی ہلکی سی کرن بھی داخل ہو سکتی۔ بے شمار ناموں اور فون نمبروں کی کھچڑی بھی میڈونا کی کوئی مدد نہ کر سکی۔ کسی نے بھی تائی چن یا نیگ چن شنگ کا نام نہیں سنا تھا۔ جو اب تک مفرور رہا لیکن میڈونا اتنی آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے قبضہ میں لیے جانے والے سفری دستاویزات کی روشنی میں ایک خاکہ تیار کیا۔ دو مرد، چینی،

دھات کے سامان کے ساتھ بینکاک یا ٹوکیو سے ایک ساتھ سفر کرتے تھے اور ہلٹن ہوٹلوں میں قیام کرتے تھے۔ یہ خاکہ تیار کرنے کے بعد اس نے یو ایس کسٹمز سروس ڈاٹا بینک سے رابطہ قائم کرلیا۔

یہ ڈاٹا بینک امریکا کا دورہ کرنے والے ہر غیر ملکی کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ رکھتا ہے۔ جب بھی کوئی غیر ملکی امریکا کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے، اسے کسٹمز اور امیگریشن کے فارم پُر کرنے پڑتے ہیں اور ان فارموں میں درج شدہ معلومات کمپیوٹر کو فیڈ کردی جاتی ہیں۔ یہ کمپیوٹرائزڈ ڈیٹا، نیشنل نارکوٹکس بورڈ انٹرڈکشن سسٹم پروگرام کے نام سے جانا جاتا ہے۔

میڈونا نے ڈاٹا بینک سے رابطہ تو کرلیا لیکن وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ پروگرام ان دو چینیوں کے بارے میں اسے معلومات فراہم کرسکے گا؟ وہ جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوجائے تو یہ ایک کارنامہ ہوگا۔ اسے لاکھوں امیگریشن کارڈز اور کسٹمز ڈیکلریشن فارم چیک کرنے پڑتے۔ ڈاٹا بینک کی انٹیلی جنس نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس پروگرام سے استفادہ کرسکتا ہے۔

☆☆☆

اگست کے اواخر تک اس پروگرام نے میڈونا پر یہ واضح کردیا کہ امریکا کا دورہ کرنے والوں میں کم سے کم انیس غیر ملکی ایسے تھے جو اس کے خاکے سے ملتے جلتے تھے لیکن یہ کوئی بہت حوصلہ افزا بات نہیں تھی۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ انیس غیر ملکیوں کی اس فہرست میں وہ دو چینی کون تھے، جو اسے مطلوب تھے۔ وہ سگنل کے دفتر میں اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا، اس کی اسکرین پر چمکتے ہوئے ناموں کو غور سے دیکھ رہا۔ یہ انیس افراد اتنی کثرت سے امریکا کا دورہ کرتے رہے تھے کہ جہاں سے وہ آتے تھے ان ممالک کے نام، ان کی آمد، روانگی، فلائٹ نمبر اور امریکا میں ان کے قیام اور پتے وغیرہ کے بارے میں جاننے میں اسے پورا ایک گھنٹا لگ گیا۔ تاہم اندھیرے میں چلایا جانے والا تیر اپنے نشانے پر بیٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے رگ و پے میں زبردست سنسنی سی دوڑ گئی تھی کہ ہر مشتبہ غیر ملکی میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ ان میں سے بیشتر نے 1983ء سے اب تک ایک درجن سے بھی زائد مرتبہ امریکا کے چکر لگائے تھے اور یہ سب کے سب اپنے ساتھ دھات کی بنی ہوئی برف کی بالٹیاں یا دھات کے گلدان لاتے رہے تھے جنہیں وہ "سیلز سیمپلز" کہتے تھے۔ مزید یہ کہ عموماً ان کی آخری منزل نیویارک ہوا کرتی تھی اور وہ ہلٹن ہوٹل میں ہی ٹھہرا کرتے تھے۔

فینگ چن شینگ نے ایسے چار چکر لگائے تھے۔ یہی چن، اپنی گرفتاری سے صرف ایک ماہ قبل اپنے ساتھ اٹھانوے بالٹیاں لے کر آیا تھا۔ ان دونوں نے دیگر مسافروں کے ساتھ سفر کیا تھا جن کا نام کمپیوٹر اسکرین پر نمودار ہورہا تھا۔ وہ مشرق بعید کے ہر گوشے سے آئے ہوئے لگتے تھے۔ میڈونا اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ دم بخود تھا۔ اس ڈیٹا بیس سے اس پر یہ واضح ہورہا تھا کہ اس نے منشیات کی بہت ہی وسیع پیمانے پر کی جانے والی اسمگلنگ اور اس کے انتہائی پیچیدہ طریقہ کار کا پتا چلالیا تھا۔ کئی ماہ کی ناکامی کے بعد یہ چیز دریافت ہوئی تھی۔

اس نے فوری کسٹمز اور امیگریشن کے افسران سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان مشتبہ افراد پر نگاہ رکھیں۔ مبادا وہ اس ملک میں دوبارہ داخل ہوں۔ پھر اس نے طویل فاصلے کے ٹیلی فون کالز کا ریکارڈ طلب کرلیا جو مشکوک افراد نے اپنے ہوٹل کے کمروں سے کیے تھے۔ ان کالز کی تعداد سیکڑوں میں تھی اور یہ ہانگ کانگ اور تائیوان جیسے دور دراز کے ممالک تک کی گئی تھیں۔ ان معلومات سے لیس ہونے کے بعد میڈونا نے ڈی، ای، اے کے ہیڈ کوارٹر واشنگٹن کو ایک رپورٹ بھیجی۔ اپنی اس رپورٹ میں اس نے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ ممکن ہے چینی سپلائرز امریکا میں ہیروئن کی پچیس فیصد مارکیٹ پر چھا جائیں گے۔ پھر اس نے ڈی ای اے کے دفتر واقع نیویارک سے رابطہ قائم کیا اور اس پر بہت جلد واضح ہوگیا کہ ایشیا کے اسمگلروں کے بارے میں تفتیش ڈی ای اے کی ترجیحات میں سے ایک نہیں ہے۔ ہاں، وہ اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک ایجنٹ کو مقرر کرسکتے ہیں اور وہ زیادہ مددگار بھی ثابت نہیں ہوگا۔ اس طرف سے مایوس ہوکر میڈونا نے خود اس کی تفتیش و تحقیق کا بیڑا اٹھایا۔

☆☆☆

مورخہ 30 اگست کو میڈونا کے دفتر میں رکھی ہوئی ٹیلیکس مشین نے اسے ایک مختصر سا لیکن اہم پیغام دیا۔ بینکاک میں متعین ڈی، ای، اے کے ایجنٹوں نے مفرور فینگ چن شینگ کا کھوج لگالیا تھا۔ اسے گولی ماردی گئی تھی اور ڈی ای اے کے ایجنٹوں کو یقین تھا کہ یہ ایک چینی

وارانہ قتل تھا۔ سبڈ وتا نے محسوس کیا کہ اس کیس کی بعض کڑیاں نیجر سالک تک بکھری ہوئی ہیں اور یہ کہ ان کڑیوں کو ڈھونڈنے کے لیے اسے وہاں جانا پڑے گا۔ چنانچہ اس نے تھائی لینڈ میں ڈی ای اے کی ٹیم سے ملنے کا اہتمام کیا اور چونکہ یہ شبہ تھا کہ منشیات کی اسمگلنگ کا ہانگ کانگ سے تعلق ہوسکتا تھا، لہٰذا اس نے رائل ہانگ کانگ پولیس سے درخواست کی کہ وہ کوئی سراغ رساں اس کے پاس بھیج دیں۔ سبڈ وتا نے کبھی شمالی امریکا سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ بینکاک پہنچا تو اسے گرمی کا احساس ہوا۔ وہ نومبر کی 12 تاریخ تھی جب وہ ڈی ای اے کے دفتر میں داخل ہوا اور وہاں موجود کئی ایجنٹوں اور تجزیہ کاروں سے اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''مجھے جان پرسیجارڈ کہتے ہیں۔'' ایک سراغ رساں نے کہا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ انگریز تھا۔ ''میرا تعلق ہانگ کانگ پولیس سے ہے۔''

جواب میں سبڈ وتا گرمجوشی سے مسکرایا اور یہیں سے ان کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔ وہ ایک میز پر جا بیٹھے اور جان اسے ہانگ کانگ میں سرگرم عمل چینی اسمگلروں کے گروپ اور ان کے ڈھانچے کے بارے میں بتانے لگا۔

''بدقسمتی سے۔'' وہ بولا۔ ''تم نے جتنی بھی اور جیسے کالز کی شناخت کرائی تھی، ان کا سراغ لگانا ممکن ہی نہیں کہ وہ جرائم کی کس تنظیم کی تھیں۔ ہمارا واسطہ جس سے پڑا ہے، وہ جو کوئی بھی ہے نہایت چالاک ہے۔''

فینگ کے قتل کے بعد آٹھ عدد پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات تھائی حکام کے ہاتھ لگے تھے۔ جان پرسیجارڈ اور سبڈ وتا، ان پاسپورٹ اور دستاویزات کا معائنہ کرنے لگے۔ ایک پاسپورٹ ہانگ کانگ سے، دوسرا سنگاپور سے، اور تیسرا لیبیا کے مقام لاپاز سے جاری ہوا تھا۔

''معلوم ہوتا ہے، اس شخص فینگ کے کئی روپ تھے۔'' جان نے تبصرہ کیا۔

''ایک منٹ'' اگلے ہی لمحہ وہ بول پڑا۔ ''یہ کیا ہے؟''

وہ ہانگ کانگ سے جاری کیے جانے والے پاسپورٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ ایک پرانا اور خستہ حال پاسپورٹ تھا۔ جان یہ دیکھ رہا تھا کہ اس پر چسپاں تصویر فینگ سے مشابہ نہیں تھی۔ ''میں اس شخص کو جانتا ہوں'' وہ سبڈ وتا سے بولا۔ ''یہ خود کو ٹومی عرف ناٹنجر کہتا ہے۔ ایک سابق ریڈ گارڈ۔ ہم اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔''

''مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' سبڈ وتا نے خواہش ظاہر کی۔

''آج سے ٹھیک ایک سال پہلے 26 نومبر 1984ء کو ہانگ کانگ کسٹمز یوٹ نے ماہی گیری کے ایک ٹرالر کو پکڑا تھا جس میں سے آٹو میٹک پستول اور سائلنسر سمیت دو سو بیالیس پونڈ تھائی ہیروئن برآمد ہوئی تھی۔ اس چھاپے کے دوران میں جہاز کے کپتان نے جو تعاون کرنے والا شخص تھا، نارکوٹکس کے افسران کو یہ بتایا کہ جہاز پر لدے ہوئے اس مال کے آرگنائزر ہانگ کانگ کے باشندے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان کی گرفتاری عمل میں آتی، وہ سب کے سب فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ ناٹنجر انہیں بھگوڑوں میں سے ایک تھا۔''

سبڈ وتا پُرخیال انداز میں اس پاسپورٹ کو اپنی انگلیوں سے کھٹکھٹانے لگا۔ آخرکار اسے ایک ایسا ثبوت مل گیا تھا جسے فینگ کے قتل سے جوڑا جاسکتا تھا۔

جان پرسیجارڈ کا تعلق بیڈفورڈ شائر سے تھا جہاں وہ پولیس آفیسر ہوا کرتا تھا۔ اس نے 1980ء میں رائل ہانگ کانگ پولیس جوائن کیا تھا اور صرف آٹھ ماہ قبل نارکوٹکس بیورو میں اس کا تبادلہ ہوا تھا۔ اب یہ اس کا کام تھا کہ وہ سبڈ وتا کے کیس اور مقامی اسمگلروں کے درمیان رابطے کا سراغ لگاتا۔ اس کی بہت سی خوبیوں میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ مقامی زبان بول سکتا تھا۔

☆☆☆

اس دن وہ دونوں یعنی سبڈ وتا اور جان پرسیجارڈ، بینکاک کے ائرپورٹ پر تھے۔ سبڈ وتا واپس امریکا پرواز کر رہا تھا۔ ائرپورٹ کے باہر بلا کی گرمی تھی۔

''ایک اندھا دوسرے اندھے کی رہنمائی کر رہا ہے۔'' سبڈ وتا نے ہنس کر کہا۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' جان نے اسے خبردار کیا۔ ''ہم کسی بھی لمحہ کسی بھی جگہ ان ظالموں کا شکار ہوسکتے ہیں۔''

''بالکل۔'' سبڈ وتا نے اپنا سفری بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارا مشورہ یاد رکھوں گا۔ خدا حافظ'' یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ ٹرمینل کی طرف بڑھ گیا۔

جب جان پرسیجارڈ واپس اپنے دفتر پہنچا تو اس کی میز پر ایک خفیہ سی رپورٹ رکھی ہوئی تھی، جو اس کی یونٹ نے انتھک کاوشوں کے بعد تیار کی تھی۔ اس کا تعلق پچھلے سال جون میں سینٹل ائرپورٹ پر پکڑی جانے والی برف کی

پالیسیوں اور ہانگ کانگ سے ان کے مشکوک رابطے سے تھا۔

جان کے پاس سادہ لباس والوں نے جو سب کے سب چینی تھے، اس ٹریول ایجنسی کا سراغ لگا لیا تھا جہاں سے ان اسمگلروں نے سیئٹل کے لیے ائرلائن کے ٹکٹ خریدے تھے لیکن وہ ٹکٹ کیش خریدے گئے تھے۔ جان پر ہچارڈ کو ہانگ کانگ اور تائیوان سے جانے والے ان فون کالز کی تفتیش جاری رکھنی تھی جو تائی چن کی نوٹ بک سے ٹریس کیے گئے تھے لیکن وہ اس کی تفتیش کو پس پشت ڈال کر ماہی گیری کے ٹرالر کے ریکارڈز اور اس کے متعلق تفتیشی رپورٹ کا مطالعہ کرنے لگا۔ ایک دم وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ یہ ایک ٹاپ سیکرٹ رپورٹ تھی جس میں ہانگ کانگ میں سرگرم عمل مجرموں کی ایک نئی تنظیم کی سرگرمیوں کی تفصیل تھی۔ اس کا نام ”بگ سرکل گینگ“ تھا۔ یہ گینگ فین مو مجرموں پر مشتمل تھا۔ ماضی میں ان کا مرکز چین کا ایک مقام ”گوانزو“ ہوا کرتا تھا۔ 1970ء کے اواخر میں اس گینگ نے اپنی مجرمانہ سرگرمیاں گوانزو سے ہانگ کانگ منتقل کر دی تھیں لیکن ایسے شواہد موجود تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ چین میں موجود اپنے گروپ کے ارکان سے ان کا اب بھی گہرا رابطہ تھا اور یہ لوگ ان کے ذریعے بینکاک اور برما سے ہیروئن منگواتے تھے۔ تائی چن ان کا ایک لیڈر تھا۔

جان پر ہچارڈ نے اپنی تحقیق جاری رکھی۔ اسے نومبر 1983ء کے ایک کینیڈین کیس کی فائل میں اس ”بگ سرکل“ کے جرائم کا حوالہ ملا۔ اس رپورٹ کے بموجب ٹورنٹو پولیس نے دو آدمیوں کو گرفتار کیا تھا جن کے قبضے سے آٹھ پونڈ ہیروئن برآمد ہوئی تھی۔ یہ ہیروئن سوٹ کیس کی تہ میں چھپی ہوئی تھی اور ان کی منزل نیویارک تھی۔ ریکارڈ سے پتا چلتا تھا کہ وہ دو اسمگلر کینیڈا پرواز کرنے سے پہلے سنگاپور میں رکے تھے۔ سنگاپور میں اپنے قیام کے دوران میں ان دو میں سے ایک نے ہانگ کانگ کے ایک فر (Fur) کے تاجر کو فون کیا تھا۔ اس کا نام لوان ژنگ تھا۔

”مسٹر کون، مجھے یقین ہے کہ تم فر کے علاوہ دیگر چیزوں کی بھی تجارت کرتے ہو۔“ جان پیر ہچارڈ نے خود کلامی کے سے انداز میں بہ آواز بلند کہا اور مزید انہماک سے فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس سراغ رساں کے مطابق جسے کون یولنگ سے پوچھ گچھ کے لیے بھیجا گیا تھا، کون عرف جانی کون نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ شخص ایک ایکسپورٹر تھا، شنگھائی میں پیدا ہوا تھا اور اب ”کولون“ میں ایک نہایت عالی شان اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ پولیس کو اس کے بیان پر یقین نہیں آیا تھا کہ سنگاپور سے فون کرنے والا کوئی ایسا شخص ہوگا جو اس کے گھر میں ٹھہرے ہوئے کسی مہمان سے گفتگو کرنا چاہتا ہوگا لیکن پولیس کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ وہ ٹورنٹو میں پکڑی جانے والی ہیروئن سے اس کا تعلق ثابت کر سکتی۔

جان نے تھکے تھکے سے انداز میں فائل ایک طرف رکھ دی اور سینڈوچ زہر مار کرنے لگا۔ کون یولنگ...... عرف جانی کون...... یہ نام اس کے دماغ میں لڑھک رہا تھا۔ اس نے یہ نام پہلے بھی کہیں سنا تھا۔ کب اور کہاں؟ یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ایک بار پھر فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔ جو ماہی گیری کے ٹرالر سے برآمد ہونے والی ہیروئن اور اسلحے کی رپورٹ پر مشتمل تھی اور تب اسے معلوم ہوا کہ اس ٹرالر کے کپتان نے اپنے بیان میں جان کا ذکر کیا تھا۔ وہ ٹرالر کے عملے کو اجرت دیا کرتا تھا۔ اب وہ مفرور تھا۔ قیاس غالب تھا کہ وہ تائیوان فرار ہو گیا تھا۔

جان نے وہ فائل ایک طرف رکھ کر دوسری فائل اٹھائی۔ اس میں موجود رپورٹ کے مطابق پولیس نے تلاشی کے لیے اپارٹمنٹ پر چھاپا مارا تھا اور ریکارڈز کے کئی بکس اٹھا لیے تھے جو ایسی مختلف کمپنیوں سے متعلق تھیں جنہیں جانی کون ہانگ کانگ میں کنٹرول کر رہا تھا۔ اس کے بینک کھاتوں کی چھان بین سے یہ بات سامنے آئی کہ اس کی آمدنی لاکھوں ڈالر تھی اور یہ فر کی تجارت سے ہونے والی آمدنی نہیں تھی۔ اس کے بے رول پر ساتھ ملازمین کے نام تھے جن میں سے بیشتر بگ سرکل گینگ کے ممبر تھے۔ تا جگر لی ان میں سے ایک تھا۔

یہ ساری کڑیاں ملی تھیں۔ جان اور سینڈرا نے امریکا میں ہیروئن کی وسیع پیمانے پر اسمگلنگ کے آپریشن کو بے نقاب کیا تھا اور اب وہ دنیا کے خطرناک ترین منشیات فروشوں کا تعاقب کر رہے تھے۔

☆☆☆

دسمبر 1985ء میں جان پر ہچارڈ تائی چن کے مقدمے کے لیے شہادتیں پیش کرنے کے لیے سیئٹل پہنچ گیا۔ اسے تائی چن کے خلاف یہ شہادت پیش کرنی تھی کہ تائی چن نے بینکاک کی ایک ائرلائن سے سیئٹل کی ٹکٹ خریدی اور فنگ چین شینگ کے ہمراہ امریکا جاتے ہوئے، وہ ہانگ کانگ میں رکا تھا۔ جب جان سیئٹل پہنچا تو سینڈرا اس کا

انتظار کررہا تھا۔

"جان، ہم جانی کون اور اس کے دیگر ساتھیوں کے قریب نہیں پہنچ پا رہے ہیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "برف کی ان بالٹیوں کے پکڑے جانے کے بعد سے اب تک یہ لوگ کم سے کم ایک ٹن ہیروئن یہاں پہنچا چکے ہوں گے اور ہمیں اس کا علم تک نہیں۔"

"ہم چیش وقت کررہے ہیں۔" جان نے جواب دیا۔ "ابھی ہم ٹامی کی نوٹ بک میں درج شدہ فون نمبروں سے فارغ نہیں ہوئے ہیں۔ ممکن ہے، انہی نمبروں میں ہمارا جواب پوشیدہ ہو۔" مقدمے کے دوران میں جان نے کمرۂ عدالت میں تقریباً چالیس سال کے ایک دبلے پتلے چینی کو دیکھا، جو تماشائیوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر نہایت بیش قیمت سوٹ تھا۔ وہ تنہا بیٹھا نوٹس لے رہا تھا۔ جان اسے غور سے دیکھنے لگا اور جب اس چینی نے ٹامی کی طرف دیکھا تو جان یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک تھی۔ جان دھیرے دھیرے اس کے قریب پہنچ گیا اور تب اس نے دیکھا۔ اس اجنبی کے پہلو میں ایک فولڈر رکھا ہوا تھا اور اس پر ایک نام چھپا ہوا تھا

"سوانیڈ کار بھاری، سالسٹیرس، کولون، ہانگ کانگ"

جان کو یاد آگیا، یہ ان ہی وکلاء میں سے ایک تھا جنہوں نے کینیڈا اور پھر ماتی گیر زالر کے مدعا علیہان کے مقدمے کی پیروی کی تھی اور اب یہ ٹامی چن کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ کیوں؟ کیا یہ محض اتفاق تھا؟

☆☆☆

23 دسمبر 1985ء کو عدالت نے ٹامی چن کو بیس سال کی سزا سنادی جو اسے وفاقی جیل میں کاٹنی تھی۔ 25 دسمبر کو جان واپس ہانگ کانگ پہنچ کر پولیس ہیڈکوارٹرز کے دفتر میں بیٹھا سراغ رسانوں کی رپورٹ کا مطالعہ کررہا تھا۔ وہ جیسے جیسے مطالعہ کررہا تھا، اس بات کا قائل ہوتا جارہا تھا کہ وہ لوگ صحیح راستے پر بڑھ رہے تھے۔ اس وقت جانی کون سے متعلق رپورٹ اس کے زیر مطالعہ تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق، جانی کون ایک غیر قانونی پناہ گزین تھا جس نے 1963ء میں خود کو پناہ گزین ثابت کرکے حکومت سے اپنے قیام کی اجازت لے لی تھی۔ اس کے پانچ سال بعد وہ ہانگ کانگ سے جنوبی ویت نام چلا گیا تھا اور سائیگون کو اس نے اپنے آپریشن کا مرکز بنا کر اسمگل کی ہوئی جیولری، فر اور گھڑیاں امریکی فوجیوں کو بیچنے لگا تھا۔ 1974ء سے

وہ تھائی لینڈ میں ہیروئن اسمگل کرنے لگا تھا۔ 1980ء تک ہانگ کانگ میں واقع اس کی کمپنیوں میں تین سو ملازمین کام کرنے لگے تھے۔ چین میں مزید ڈیڑھ سو ملازمین تھے۔ نیویارک میں بھی اس کی دو فرمیں تھیں۔ ایک فر کی تجارت کرتی تھی اور دوسری اسٹیٹ ایجنسی تھی جو چائنا ٹاؤن میں واقع تھی۔

اب وہ ہا لیس سالہ جانی کون ہمہ وقت بن ریشم کا بانکا کا سلا ہوا سوٹ پہنتا تھا اور انتہائی عالی شان ہوٹلوں میں کھانا کھاتا تھا۔ اس کی کلائی میں جڑی ہوئی ڈائمنڈ کی گھڑی کی قیمت تیس ہزار ڈالر تھی۔ اس کے ناخن نہایت نفاست سے تراشے ہوتے تھے لیکن جان پریچارڈ جانتا تھا کہ بظاہر انتہائی مہذب نظر آنے والا یہ شخص۔۔۔اور اس کے گرگے کتنے بے رحم اور سفاک تھے۔ اس کے ساتھی جو سابق ریڈ گارڈز تھے، نہ صرف ہیروئن اسمگل کرنے میں بلکہ مسلح ڈکیتی اور قتل کرنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ جان کو شبہ تھا کہ خود جانی کون نے فینگ کو ہلاک کرنے کا حکم دیا تھا۔

☆☆☆

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ جنوری کا مہینا شروع ہو چکا تھا۔ جان پریچارڈ رات بھر اپنے اسکواڈ روم میں تنہا بیٹھا لیمپ کی روشنی میں وہ دھندلے فون کالز چیک کرتا رہتا جو تانی چن کی نوٹ بک سے حاصل کیے گئے تھے۔ جلد یا بدیر اس تلاش کا اختتام ہونا تھا اور ہوا بھی یہی۔ جنوری کے اواخر میں، ایک رات اسے ایک سراغ مل ہی گیا۔

1983ء میں کون کے ایک ساتھی نے ہانگ کانگ سے تائیوان ایک کال بک کرائی تھی۔ وہی فون نمبر تانی چن کی نوٹ بک میں بھی موجود تھا۔ جان پریچارڈ نے فوراً میڈونا سے سینٹر کے ہیڈکوارٹرز میں رابطہ قائم کیا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ صبر سے کام لو۔“ اس نے مارتھ چیس میں کہا اور ساری تفصیل گوش گزار کر دی۔

اس کے بعد وہ سورج طلوع ہونے تک سرکاری رپورٹ ٹائپ کرتا رہا۔ شہادتوں کی کڑیاں بالکل واضح تھیں۔ جانی کون کی تنظیم لندن میں ہیروئن کی کھیپ بھیجنے کی ذمہ داری تھی اور یقیناً اسی تنظیم نے اس وقت سے اب تک ہیروئن کی نہ جانے کتنی کھیپ امریکا بھیجی ہوگی۔ جانی کون کی سینڈیکیٹ کو بے نقاب کرنا بذات خود ایک بہت بڑا کارنامہ تھا لیکن یہ محض آغاز تھا۔ ہانگ کانگ کی پولیس کے پاس صرف ایک گواہ تھا۔ ماں کیرن کے ڈرائیور کا بیان......اور جب تک دوسرے گواہ نہ مل جائیں گرفتاری، الزام اور سزا یہ سب ایک خواب تھا۔

☆☆☆

”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ تم لوگ میرے یہاں آنے سے پہلے کیا کرتے رہے تھے۔“ اسپیشل ایجنٹ رچرڈ لامبگلن تند لہجے میں بولا۔

اس وقت وہ نیویارک کی فیڈرل بلڈنگ کے دفتر میں کھڑا اپنے ایجنٹوں کو گھور رہا تھا۔ اسے جنوری کے اوائل میں اس گروپ کا چارج لینے کے احکامات دیے گئے تھے اور وہ اس گروپ کی کارگزاریاں دیکھ کر وحشت زدہ ہو گیا تھا۔ یہ گروپ ہیروئن کی اسمگلنگ اور اس میں کی جانے والی سازشوں کو بے نقاب کرنے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا لیکن اس گروپ نے اب تک اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی کارگزاری صفر تھی۔ گرفتاریاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دیگر تمام ایجنسیوں کے مقابلے میں یہ ایجنسی بدترین تھی۔ یہ لوگ فیلڈ میں نکل کر عملی اقدامات کرنے کی بجائے محض کاغذی کارروائیاں کرتے رہے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ اس گروپ کے پاس نگرانی کے لیے کوئی کار تک نہیں تھی۔ اس گروپ میں شامل پانچ ایجنٹوں میں سے تین ایجنٹ یہاں سے نکلنے کے چکر میں تھے۔ اسی عمارت میں موجود یو۔ایس اٹارنیز ان ایجنٹوں کو کسی کیس کے پیچھے لگانے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے ان سے ذاتی گارڈز کا کام لیتے تھے۔ چنانچہ یہ گروپ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا لیکن اب حکومت نے اس گروپ کو موثر بنانے کی ٹھان لی تھی اور ایک انتہائی قابل اور باعمل شخص کو اس کا چارج دے دیا تھا۔

لامبگلن واحد سرکاری افسر تھا جو نہ صرف اسپینی امور کا ماہر تھا بلکہ اسپینی کی کئی زبانیں بول سکتا تھا۔ اس نے اسپین میں ساڑھے چھ سال گزارے تھے۔ پہلے ہانگ کانگ میں اور پھر بینکاک میں۔ وہ ایک سخت گیر اور نہایت بااصول افسر تھا اور اپنے ماتحتوں سے بھی انہیں خوبیوں کی توقع رکھتا تھا۔

”جیسے ہی کوئی یو۔ایس اٹارنی تمہیں گارڈ کی ڈیوٹی دینے کے لیے طلب کرے، وہیں مجھے خبر کرو۔“ وہ چنگھاڑا۔ ”تم میرے ماتحت ہو، ان کے نہیں۔ میں دیکھوں گا وہ کس طرح تم لوگوں سے اپنا کام لیتے ہیں۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ”اب ہم گرفتاریاں کریں گے۔“

☆☆☆

اس نے بے شک گرفتاریاں کیں لیکن وہ اسی پر اکتفا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گروپ 41 کو ازسرِ نو منظم کرنے کے لیے بروکلین اور کوئنز کے ڈی۔ ای۔ اے ایجنٹوں کو اپنے گروپ میں شامل کرلیا اور انہیں بالکل الرٹ کردیا۔ انہیں میں سے کیون نامی ایک انتیس سالہ ایجنٹ تھا جسے اس نے جالی کون کے تفتیشی امور کا سربراہ مقرر کیا تھا۔
اس مہم کو کام شروع کیے ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ 19 جنوری 1986ء کو رات کے آٹھ بجے لاسگن کو نیویارک کے کینیڈی ائرپورٹ کے کسٹمز انسپکٹر کی ایک کال موصول ہوئی۔ اس کال کے مطابق کسٹمز نے ایک چینی عورت کو گرفتار کرلیا تھا اور اس کے قبضے سے چوالیس پونڈ ہیروئن برآمد کرلی تھی۔ یہ ہیروئن دھات کے بنے ہوئے تصویروں کے بڑے بڑے فریم میں پیک کی گئی تھی جنہیں مین ہیٹن کے ایک ہوٹل میں ڈلیور کیا جاتا تھا۔
لاسگن فوراً کینیڈی ائرپورٹ پہنچ گیا اور اس نے عورت سے پوچھ گچھ شروع کردی۔ اس عورت کے بیان کے مطابق، وہ ٹوکیو سے آئی تھی اور تصویروں کے فریم اپنے ایک دوست کے کہنے پر لائی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ان میں ہیروئن چھپی ہوئی تھی۔
”تمہیں یہ فریم کہاں پہنچانے تھے؟“ لاسگن نے اس سے اس کی زبان میں پوچھا۔
”مجھے یہ فریم ہوٹل لے جانے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پھر کوئی شخص مجھ سے رابطہ کرتا اور آکر یہ سارے فریم لے جاتا۔“
”ٹھیک ہے۔“ لاسگن نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ”ہم اس شخص کا انتظار کریں گے۔“
اس کی پاسپورٹ کے مطابق وہ باون سال کی تھی اور تائیوان کی رہنے والی تھی۔ بہت خوش پوش اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور بہت بے چین نظر آرہی تھی۔ گھنٹے دھیرے دھیرے گزرنے لگے۔ دو گھنٹے کے بعد اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ لاسگن نے اسے فون کا جواب دینے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ وہ نہایت پُرسکون انداز میں گفتگو کرے گویا کچھ ہوا ہی نہیں لیکن وہ عورت فون اٹھا کر پھٹ پڑی۔ وہ نہایت تیزی سے چینی زبان میں گفتگو کرنے لگی تھی۔ لاسگن حیرت سے پلکیں جھپکانے لگا۔ اتنی رواں چینی اس کے پلے نہیں پڑ رہی تھی تاہم وہ سمجھ گیا کہ عورت فون کرنے والے کو اپنی گرفتاری سے مطلع کررہی تھی اور یہ بھی جارہی تھی کہ اس کے اردگرد سارے افسران موجود تھے۔
لاسگن نے جھپٹ کر ریسور اس عورت سے لے لیا اور کر یڈل پر پٹخ دیا۔ ”بہت ہوچکا۔“ وہ دہاڑا۔ ”تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔“ پھر اس نے کیون کو مخاطب کیا۔ ”اسے لے چلو۔“
عورت ان کی رہنمائی میں چل پڑی۔ اس نے مزید ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن لاسگن اپنے احساسات کو جھٹکنے میں ناکام رہا۔ اس گرفتاری میں کوئی قدر مشترک تھی اور وہ اس سے مانوس تھا۔

☆☆☆

اگلے روز وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ڈی۔ ای۔ اے کی پچھلی رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ ایسے میں چند ماہ پہلے سیٹل میں برف کی بالٹیوں کی سمگلنگ کی رپورٹ اس کی نظروں سے گزری۔ یکایک وہ اپنی نشست پر سیدھا ہو بیٹھا۔ ان دونوں کیسوں میں حیرت انگیز مشابہت تھی۔ پچھلے اسمگلر بھی چینی تھے اور دھات کی بنی ہوئی بالٹیوں میں ہیروئن چھپا کر لائے تھے۔ اس مرتبہ بھی اسمگلر ایک چینی خاتون تھی اور وہ بھی دھات کے بنے ہوئے فریم میں ہیروئن چھپا کر لائی تھی۔ کیا ان دونوں کیسوں کا آپس میں کوئی تعلق تھا؟؟ اس نے فوراً سیٹل ہیڈ کوارٹرز میں میڈونا سے رابطہ کیا اور شروع سے آخر تک ساری بات اسے کہہ سنائی۔ میڈونا نے نہایت سکون سے یہ تفصیل سنی اور پھر گویا ہوا۔ ”اس کے سفر کا روٹ معلوم کرو۔ یہ بھی کہ وہ کہاں کہاں کا چکر لگا کر پہنچی ہے۔“
”ٹوکیو سے نان اسٹاپ۔“ لاسگن نے جواب دیا۔ ”لیکن اس کے ٹکٹ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بینکاک سے چلی تھی۔“
”یہ وہی روٹ ہے جو نامی چن اور فینگ چن شینگ نے اختیار کیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ وہ تھائی لینڈ میں کس ہوٹل میں ٹھہری تھی؟“
”ری مونٹین میں۔“ لاسگن نے جواب دیا۔
”یہ وہی ہوٹل ہے جہاں نامی چن اپنے بینکاک میں قیام کے دوران ٹھہرا تھا۔“ میڈونا نے آگاہ کیا۔ ”یہ جالی کون کی ایک اور کھیپ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے نامی چن کی گرفتاری اور رجان پرچپارڈ کی تفتیش سمیت اب تک کی پیش رفت سے اسے آگاہ کیا۔ ”لیکن“ وہ آخر میں بولا۔ ”جب تک ہمیں حکومت کی تائید اور حمایت حاصل نہ ہو، ہم اس معاملے میں پیش رفت

نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔" لامبگن نے جواب دیا۔ "میں ہیڈ کوارٹرز سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔"

اس کے تین دن بعد لامبگن مشرقی ڈویژن کے جسٹس ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ اسسٹنٹ یو، ایس اٹارنی مس کیتھرائن پام سے ملنے پہنچ گیا۔ کیتھرائن تقریباً تیس سال کی ایک خوش رو خاتون تھی اور اسے منشیات کی اسمگلنگ اور اس میں ہونے والی سازشوں کے مقدمات کا زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ اس نے حال ہی میں یہ محکمہ جوائن کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ وکلا کی ایک فرم سے منسلک تھی جہاں بوریت کے سوا کچھ نہ تھا۔ لامبگن اس کے دفتر کا جائزہ لیتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے چکرا گیا۔ دفتر کی دیواریں بیس بال کے کھلاڑیوں کے پوسٹرز سے مزین تھیں۔ کیتھرائن کی شخصیت میں اٹارنی جنرل والی طمطراق بھی نہ تھا۔ لامبگن آج تک کسی ایسے اٹارنی سے نہیں ملا تھا۔

"لگتا ہے، آپ بیس بال کی زبردست فین ہیں۔" اس نے تبصرہ کیا۔ اس کے لہجے میں بدستور حیرت تھی۔

"تمہارا خیال درست ہے۔" وہ مسکرائی۔ "میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

لامبگن اسے سینٹل اور کینیڈی ائرپورٹ پر ضبط کی جانے والی ہیروئن کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ "اب تم دیکھ سکتی ہو کہ اینٹین اسمگلرز کس طرح نیویارک کی ہیروئن کی مارکیٹ پر چھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وہ آخر میں بولا۔ "ہمیں اس آپریشن کو ناکام بنانے کے لیے بہت سوچ سمجھ کر لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ کامیابی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں مزید سپورٹ کی ضرورت ہے۔ گروپ 41 محض ایک ہی کلاس ٹیم ہے۔ ہمارے محکمے میں سہولتوں کا فقدان ہے کیونکہ اب تک اسے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ کیا ہم تم پر بھروسا کر سکتے ہیں؟"

"تمہیں کس بات کا انتظار ہے؟" کیتھرائن مسکرائی۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

لامبگن کو یوں محسوس ہوا گویا اس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ یو، ایس اٹارنی کے دفتر کے تعاون کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ وہ، نہ میڈونا۔ اسسٹنٹ یو، ایس اٹارنی ہی تفتیش کی راہیں متعین کرتا ہے اور تلاشی کے وارنٹ جاری کرتا ہے اور آخر میں فردِ جرم عائد کرنا اور مقدمہ لڑ کر جیتنا بھی اسی کا کام ہوتا ہے۔ اب یہ سب کچھ کیتھرائن کو کرنا تھا۔ کیتھرائن کی طرف سے تعاون کی یقین دہانی کے بعد لامبگن نے میڈونا سے رابطہ قائم کر لیا اور اسے نیویارک پہنچنے کی درخواست کی۔ میڈونا نے فوراً ہامی بھر لی۔

☆☆☆

دو ہفتے کے بعد میڈونا بذریعہ طیارہ نیویارک پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھ جانی کرن کے خلاف جان پریچارڈ کے نوٹس سمیت پتے اور فون نمبر لے کر آیا تھا جو ٹامی تھن کے قبضے سے برآمد ہوئے تھے۔ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ چینی اسمگلروں کا طریقہ کار ایک ہی تھا۔ چنانچہ وہ اور لامبگن ہیروئن کے کیس کی تفتیش میں جت گئے۔ آخرکار 18 جون کی شب محو خواب میڈونا کے سرہانے رکھے ہوئے فون کی گھنٹی گونج اٹھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دوسری طرف سے بانگ کانگ سے جان پریچارڈ بول رہا تھا۔

"ان لوگوں نے اسے مار ڈالا۔" میڈونا کو اس کی آواز سنائی دی۔

"کیا؟" میڈونا کی نیند غائب ہو گئی۔ "کون؟ کس نے کس کو مار ڈالا؟"

"گواہ کو۔" جان پریچارڈ نے جواب دیا۔

"تمہارا مطلب ہے......"

"ہاں۔" جان نے اس کا جملہ اچک لیا۔ "پیشہ ور قاتلوں کی ایک ٹیم نے ماہی گیری کے ٹرالر کے کپتان کو مار ڈالا۔ اسے اعشاریہ پانچ کے ریوالور سے گولی ماری گئی ہے۔ قاتل فرار ہو گئے ہیں۔ جانی کرن کے خلاف کیس کی پوری عمارت زمیں بوس ہو گئی ہے۔"

"یہ بہت برا ہوا۔" میڈونا نے تاسف سے کہا۔ "بہت ہی برا۔ ہم جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔"

نیویارک میں بھی لامبگن اور اس کے گروپ 41 کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ کیون روزانہ اپنے ایجنٹوں کے ہمراہ سڑکوں کی خاک چھانتا رہتا تھا۔ یہ لوگ اینٹین اسمگلرز کے رابطہ کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے ساتھ ہی نئے مخبروں اور ایجنٹوں کو بھرتی کر رہے تھے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود وہ جانی کون کے مقامی ڈسٹری بیوٹرز کا سراغ لگانے سے قاصر رہے۔

اسی دوران ایک دن سینٹل ائرپورٹ پر ایک امیگریشن آفیسر نے ایک تھائی مسافر کو روک لیا جس کا

ویزا جعلی تھا لیکن اگر ڈی ای اے اس میں دلچسپی نہ لیتی تو اس مسافر کو محض واپس بھیج دیا جاتا۔ چنانچہ اس امیگریشن انسپکٹر نے فی الفور میڈونا سے رابطہ کیا۔

”اس کا نام؟“ میڈونا نے اپنی فہرست کا اوپر سے نیچے جائزہ لیتے ہوئے فون پر پوچھا۔

”ینا چنگ لینگ“ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”عرف آہ لنگ۔“

”اسے روک لو۔“ میڈونا چیخ پڑی۔ ”میں پہنچ رہی ہوں..... سمجھو پہنچ گئی۔“

میڈونا کے کمپیوٹر میں اس کا پورا ریکارڈ موجود تھا۔ وہ ایک سادہ تھا امریکن تھا جسے چینی والدین نے گود لے لیا تھا۔ اس کے پاسپورٹ سے اس کی مختلف تاریخ پیدائش اور مختلف قومیت ظاہر ہوتی تھی۔ وہ جنوری 1984ء سے اب تک تقریباً بیس مرتبہ نیو یارک کے چکر لگا چکا تھا۔ دو مرتبہ دعات کے بیٹے ہوئے تک اپنے ساتھ لایا تھا۔ دو مرتبہ فینگ چین شنگ اور ایک مرتبہ ٹائیگر لی کے ہمراہ آیا تھا۔

میڈونا ان معلومات سے لیس آندھی کی طرح ایئر پورٹ پہنچی۔ اس نے دیکھا کہ آہ لنگ تقریباً چالیس کا ایک تنحنی سا شخص تھا۔ اس کے بال نہایت نفاست سے سنورے ہوئے تھے۔ انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ اس میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔

”تم لوگوں کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ بولا اور بار بار یہی الفاظ دہراتا رہا۔ ”میں ایک تاجر ہوں۔ چیزیں ایکسپورٹ کرتا ہوں۔ یہ رہا میرا کارڈ۔“

میڈونا نے اس کے کارڈ کے پتے پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر کارڈ میز پر پھینک دیا۔ ”تمہارا نام میری فہرست میں شامل ہے۔“ وہ سرد لہجے میں بولا۔ ”لہٰذا ہم برف کی ان ڈلیوں اور ان گلدانوں کی بات کرتے ہیں جو تم نے مسٹر جانی کون کے لیے ڈلیور کیے تھے۔“

اس کے بعد وہ اسے پڑھ کر سنانے لگی کہ وہ کس کس تاریخ کو نیو یارک اور شکاگو آیا تھا اور کس کس ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور کب وہاں سے روانہ ہوا تھا۔ ”ہم تمہارے بارے میں بھی سب کچھ جانتے ہیں۔“ آخر میں میڈونا تند لہجے میں بولی۔ ”تم خود دیکھ سکتے ہو۔ میرے پاس جو ثبوت ہے وہ تمہیں عمر بھر کے لیے جیل میں سڑا سکتا ہے۔“ اس نے فہرست اس کے منہ پر کھینچ ماری۔

آہ لنگ نے فہرست اٹھا کر ان تاریخوں کا جائزہ لیا اور اس کی رنگت اڑ گئی۔ وہ واضح طور پر کانپنے لگا تھا۔ یکا یک وہ اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور دیر تک لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ آخر کار وہ ایک گہری سانس لے کر گویا ہوا۔ ”یہ اچھا ہی ہوا کہ کھیل ختم ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر یہ ہوتا ہی تھا۔“

”تم جانی کون کے لیے کام کرتے ہو؟“ میڈونا نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کب سے؟“

”1983ء سے میں اس کے لیے کام کرتا آ رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ پھر خود ہی بتانے لگا کہ اس نے فینگ کو کس طرح جانی کون سے متعارف کرایا تھا۔ ”فینگ ایک ایسا شخص تھا جسے میں اپنا بھائی سمجھتا تھا۔“ اس نے مزید کہا۔ ”اس نے امریکا کے تین چکر لگائے تھے اور جب اس کا آخری چکر ناکام رہا تو ان لوگوں نے اسے ہلاک کروا ڈالا۔“

ایجنٹوں کو آہ لنگ کے بریف کیس سے ایک لفافہ ملا جس میں نصف درجن فوٹو تھے۔ میڈونا نے وہ سارے فوٹو میز پر سجا دیے۔

”یہ کون لوگ ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

آہ لنگ کے پاس تعاون کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دوسری صورت میں اسے بھی ٹائی چن کی طرح جیل میں سڑنا پڑتا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچایا اور پھر اس نے فیصلہ کن انداز میں اپنی انگلی ایک تصویر پر رکھ دی۔ ”یہ جانی کون ہے۔“

تصویر والے شخص کی شکل چھپی ہوئی تھی۔ سر پر نقلی وگ اور منہ پر نقلی مونچھیں تھیں۔ ”اور یہ ٹائیگر لی ہے۔“ اس نے دوسری تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

اس طرح وہ بقیہ لوگوں کی نشاندہی کرتا چلا گیا۔ یہ سارے کے سارے بگ سرکل گینگ کے رکن تھے۔

”جب سے انہوں نے شنگ چین کو شوٹ کیا ہے، میں اپنے بریف کیس میں ان لوگوں کی تصویریں لیے پھر رہا ہوں۔“ وہ مزید بولا۔ ”میں اس انتظار میں تھا کہ موقع ملے تو میں یہ تصویریں کسی کو دکھا دوں۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ”یہ تصویریں تو محض آغاز ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بگ سرکل گینگ کس طرح کام کرتا ہے، ان کا طریقہ کار کیا ہے، پچھلے چند برسوں میں اس نے کتنی ہیروئن اسمگل کی ہے اور

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کون یہ ہیروئن سپلائی کرتا ہے۔"

☆☆☆

24 اور 26 ستمبر کو سبتل کے نواح میں واقع ایک ہوٹل کے کمرے میں جہاں سخت پہرہ تھا آ ہ لنگ، میڈونا اور لاسیگلن کے درمیان خفیہ بات چیت ہوئی۔ "کیا تم ہم سے تعاون کرنے کو تیار ہو؟" میڈونا نے پوچھا۔

آ ہ لنگ خاموش رہا۔ پھر کافی دیر کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں۔"

دونوں ایجنٹ اس کی طرف جھک گئے۔ "ایک اور قدم بڑھانے کے بارے میں کیا خیال ہے، آہ لنگ؟" لاسیگلن نے پوچھا۔ "کیا تم ہمارے لیے کام کرو گے؟ تم حسبِ سابق اپنا کام کرتے رہو اور سب کی رپورٹ ہمیں دیتے رہو مال کب جہاز پر لادا گیا۔ سپلائرز کون کون ہیں، منظے روٹ کون کون سے ہیں اور سب سے بڑھ کر جانی کون کے بارے میں بتاتے رہو۔ اس کے بدلے ہم ہر طرح سے تمہاری مدد کریں گے لیکن ہم تمہیں دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتے۔ اگر تم نے ہم سے دھوکا کیا تو زندہ نہیں بچو گے۔"

آ ہ لنگ ایک بار پھر کافی دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں یہ کام کروں گا۔"

☆☆☆

آہ لنگ ہانگ کانگ لوٹ گیا اور وہاں جان برسچارڈ سے ملا۔ اس نے ایک بار پھر بگ سرکل گینگ کے ہر ممبر کی تصویر کی شناخت کرائی۔ چنانچہ جانی اور پولیس کے تجزیہ کار مل کر جانی کی تنظیم کا ایک چارٹ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس چارٹ میں وہ ساری معلومات تھیں جو انہیں درکار تھیں۔ یہ چارٹ مکمل ہوا تو یہ کسی دیوقامت مکڑے کے جال سے مشابہ تھا جو پوری دنیا پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ صورتِ حال دہشت ناک تھی۔ اس میں ہالینڈ اور جرمنی میں ہیروئن کی تقسیم کنندگان کے پتے اور ان کے خفیہ ٹھکانوں کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ منیلا اور پناما میں ہیروئن کے گودام تھے۔ پیراگوئے میں گھڑی سازی کا کارخانہ، تائیوان میں ایک کمپنی، ٹوکیو میں ایک بار اور ایک کلب اور چین میں فرانکپورٹ کرنے والی کمپنیاں تھیں اور بقول آہ لنگ ان میں سے ہر دھندے کی آڑ میں ہیروئن اور کوکین کا دھندا ہوتا تھا۔

1986ء کے پورے موسمِ خزاں کے دوران بھی آہ لنگ نہایت ایمانداری سے جان برسچارڈ اور میڈونا کو اپنی رپورٹ ارسال کرتا رہا۔ کبھی کبھی تو اس کی کال رات گئے آتی اور میڈونا کو نیند سے بیدار کر دیتی۔ دوسرے موقعوں پر آہ لنگ ہانگ کانگ میں تعینات ڈی ای اے کے ایجنٹوں سے ایک بے نام عمارت کی سنسان بغلی گزرگاہ میں خفیہ طور پر ملتا اور اپنی رپورٹ ان کے حوالے کر دیتا۔ یہ عمارت خاصی محفوظ تصور کی جاتی تھی لیکن لگتا تھا کہ جانی کون آہ لنگ کو اپنے سے بے حد قریب رکھتا تھا۔ آہ لنگ نے اس عرصے میں کوئی نیا بزنس نہیں دیا تھا۔ جانی کون اپنی آرگنائزیشن کے ممبران سے اکثر و بیشتر صلاح مشورے کرتا رہتا تھا اور آہ لنگ نے پچھلے کئی ماہ سے اسے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ ان باتوں نے میڈونا کو مضطرب کر رکھا تھا۔ کیا آہ لنگ کا پردہ فاش ہو گیا تھا؟ یہ ناممکن تھا لیکن میڈونا اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو آہ لنگ یقیناً مارا جائے گا۔

☆☆☆

کیتھرائن باہر نہایت پابندی سے ہر ہفتہ میڈونا سے رپورٹ طلب کرتی اور میڈونا اسے ہر دو اطلاع فراہم کرتا، جو اس کی میز سے ہو کر گزرتی تھی لیکن معلومات اتنی کم اور ناکافی ہوتیں کہ وہ کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ اس دوران میں دن رات کی محنت اور بھاگ دوڑ میڈونا کی صحت پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ جب وہ شیو کرنے کے لیے آئینے میں اپنا عکس دیکھتا تو اسے اپنے چہرے پر تھکن کے نمایاں اثرات نظر آنے۔ اس کے چہرے سے شادابی رخصت ہو گئی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے جو شب بیداری کی علامت تھے۔

11 جنوری 1987ء کو رات کے گیارہ بجے اچانک اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دوسری طرف سے سان ژوا امریکا کا ایک ڈی ای اے ایجنٹ بول رہا تھا۔ "ابھی ابھی ایک تار واشنگٹن پہنچا ہے۔" میڈونا کو اس کی آواز سنائی دی۔ "پیراگوئے میں متعین یو ایس کونسل نے رپورٹ دی ہے کہ پولیس نے ایک چینی کو کوکین اسمگل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑ لیا ہے اور جانی کون کیس پر کام کرنے والے سارے ایجنٹوں کو یہ ٹیلیکس بھیج دیا گیا ہے۔"

"اس کا نام؟" میڈونا نے پوچھا۔

"رکی چن" جواب ملا۔

رکی چن ہانگ کانگ کا رہنے والا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال تھی۔ جان برسچارڈ اور آہ لنگ نے اسے بگ

سرکل گینگ کے اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے شناخت کرلیا۔ پولیس کی پوچھ گچھ کے دوران جن نے اقرار کیا کہ وہ ہانگ کانگ سے نیویارک، پیراگوئے پہنچا تھا اور اس کے پاس پچیس ہزار ڈالر کیش تھے جو جانی کون نے منشیات کی خریداری کے لیے اسے دیے تھے۔ میڈونا کو فوراً یہ خیال آیا کہ اگر جن تعاون کرنے کو تیار ہوجائے تو یہ سرکل گینگ اور اس کے لیڈروں کے خلاف فردِ جرم عائد کرنے کے لیے ایک اہم گواہ مل جائے گا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا پیراگوئے کے حکام اسے اس کے حوالے کردیں گے؟ اب تک ریاست ہائے متحدہ امریکا اور جنوبی امریکا کے درمیان مجرموں کے تبادلے کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔

یو۔ایس اٹارنی کیتھرائن نے اس کا ایک حل ڈھونڈ نکالا۔ وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی مسافر خواہ مختصر سے وقفے کے لیے ہی سہی، امریکا کی سرزمین پر رکتا ہے اور دس ہزار ڈالر سے زیادہ کیش لے کر نکل جاتا ہے تو اسے امریکی کسٹمز کے حکام کو یہ بتانا پڑتا ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو امریکی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ ”میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اس نے کسٹمز کو نہیں بتایا ہوگا۔“ وہ بولی۔

”میں چیک کرتا ہوں۔“ میگلن نے جواب دیا اور اسی وقت کسٹمز سے رابطہ قائم کرلیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد کیتھرائن کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ ”جن نے نیویارک کسٹمز کو نہیں بتایا تھا کہ اس کے پاس پچیس ہزار ڈالر تھے۔“ لا میگلن نے کیتھرائن کو آگاہ کیا۔

”اب میں اس کے خلاف قانونی کارروائی کرسکتی ہوں۔“ کیتھرائن نے ٹھوس لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

اس نے ایک ہفتے کے اندر امریکی حکام سے گفت وشنید کرکے ایک معاہدہ تیار کرلیا جس کے تحت پیراگوئے کے حکام جن کو ان کے حوالے کردیتے اور وہ ڈی ای اے کے ایجنٹوں کی تحویل میں دے دیا جاتا۔ جن کو اس بات کا علم ہوچکا تھا اور وہ جنوبی امریکا کی جیل سے رہائی پانے کے تصور سے بہت خوش تھا کیونکہ وہاں مجرموں کی خاصی درگت بنائی جاتی تھی۔ وہ سب کچھ بتانے کو بھی تیار تھا۔

9 مارچ 1987ء کو اسے ڈی۔ای۔اے کے ایجنٹوں کے حوالے کردیا گیا جو اسے لے کر نیویارک پرواز کرگئے۔ اس کے اگلے روز کیتھرائن پامر کے دفتر میں بیٹھا رکی جن، جانی کون کی سلطنت اور ریاست ہائے متحدہ امریکا میں واقع اس کی جائدادوں کا پول کھول رہا تھا۔ اب کیتھرائن کو اس پر فردِ جرم عائد کرنے کے لیے صرف ایک قدم اٹھانا تھا۔

اپریل میں میڈونا اور لامیگلن کو اطلاع ملی کہ جانی کون نے آہ لنگ کو کئی ماہ کے بعد پہلی بار ملنے کے لیے سنگاپور طلب کیا تھا۔ ”اس سے کہو کہ وہ بے حد محتاط رہے۔“ میڈونا نے اطلاع بہم پہنچانے والے ایجنٹوں کو خبردار کیا۔

آہ لنگ 14 اپریل کو سنگاپور پرواز کرگیا اور ایک عالی شان ہوٹل میں ٹھہرا۔ جانی کون نے اپنے سوئٹ کے دروازے پر اس کا استقبال کیا اور پھر ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”چائے پیو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ آہ لنگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد چائے آگئی۔ آہ لنگ چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ جانی کون سگریٹ کے دھوئیں کے اس پار سے آہ لنگ کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ہمارے درمیان ایک غدار گھس آیا ہے۔“ اچانک وہ بول پڑا۔ ”کیا تم انداز لگا سکتے ہو کہ وہ کون ہے؟“

آہ لنگ کو یوں محسوس ہوا گویا برفیلی انگلیوں نے اس کے حلق کو جکڑ لیا ہو۔ ”میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔“ وہ منمنایا۔ ”ادھر کچھ عرصے سے قسمت ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، اسے ڈھونڈ نکالنا ہوگا۔“

جانی کون نے سلگتا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ”ہمارے آدمی پکڑے جارہے ہیں، سپلائرز کا مجھ پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ”اب میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ جن پیراگوئے میں پکڑا گیا ہے اور ہمارے آدمیوں کو شبہ ہے کہ وہ نیویارک کی ایک اٹارنی سے مل گیا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو وہ ہماری پہنچ سے دور نہیں ہے۔ ہمارے آدمی اس کا پتا چلالیں گے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ اسے بھی دوسروں کی طرح جہنم رسید کردیا جائے گا۔“

آہ لنگ سن ہوکر رہ گیا۔ جانی کون کو اور کیا کیا معلوم تھا؟ کیا وہ اس کے ساتھ کھیل کھیل رہا تھا؟ کیا وہ اس صورت سے زندہ سلامت نکل سکے گا؟ جانی کون اس کی طرف دیکھ کر دھیمے سے مسکرایا۔ ”میں نے ان دو وجوہات کی بنا پر تمہیں سنگاپور طلب نہیں کیا ہے۔“ وہ بولا۔ پھر رک کر ایک گہری سانس لی۔ ”جن کی گرفتاری نے ہمیں پورے بنانا

میں اپنا کاروبار بند کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا۔ ''اب ہمیں نئے طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔ نئے روٹ دریافت کرنے ہوں گے۔ اب تمہیں پہلے سے کہیں اہم اور فعال کردار ادا کرنا پڑے گا۔''

آؤ لنگ نے سکون کی ایک گہری سانس لی۔

''ہیروئن کی ترسیل اب بھی ہمارے منصوبے میں ہے۔'' جانی کون دوبارہ گویا ہوا۔ ''اس کی مقدار کم سے کم ایک ٹن ہوگی۔ اس کی خرید و فروخت اور انتظام میں وقت لگے گا۔ تم سمجھ رہے ہو؟''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' آؤ لنگ نے اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

''ہم یہ ہیروئن تھائی لینڈ سے کنٹینر میں بذریعہ شپ، پہلے فیلا اور پھر امریکا کے مغربی ساحل بھیجیں گے۔'' جانی کون دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔ ''تم لاس اینجلس میں گودام کی سہولت فراہم کرو گے۔ ہم تم پر انحصار کر رہے ہیں۔''

☆☆☆

پورے جولائی کے دوران میں آؤ لنگ جانی کون کے ایک ٹن ہیروئن کے انتظام اور ترسیل کے بارے میں پابندی سے امریکی حکام کو رپورٹ کرتا رہا۔ اسی مہینے اس نے دو مرتبہ نیویارک کے چکر بھی لگائے اور کیتھرائن، سیڈ وما اور لا سیگلن کو تفصیل سے آگاہ کیا۔ اسی دوران خود سیڈ وما نے بھی ہانگ کانگ کے دو چکر لگائے اور جان پر ہچارڈ سے مل کر مقدمے کی کاغذی کارروائی کی نوک پلک سنواری۔ اب مقدمے کو گرینڈ جیوری کے سامنے پیش کرنے میں صرف چند ہفتے رہ گئے تھے۔ آؤ لنگ نے انہیں بتایا کہ جانی کون اب بھی ہیروئن فیلا اور نیویارک ڈلیور کرنے کے انتظامات میں لگا ہوا تھا۔

29 اگست کو آؤ لنگ، ہانگ کانگ میں متعین خفیہ ایجنٹوں سے ملا اور اس نے انہیں رپورٹ دی کہ جانی کون نے اپنی تازہ ترین کھیپ کی ترسیل کے لیے تھائی لینڈ میں ہیروئن خریدی تھی اور اسٹور کرنی شروع کر دی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے اس کھیپ کی ڈلیوری کی تکمیل میں مدد کرنے کے عوض ایک ملین ڈالر ملیں گے۔ اس نے اس امر کی بھی تصدیق کی کہ اسی سے سو پونڈ تک ہیروئن مہینے میں ایک بار چین کے راستے امریکا اور یورپ پابندی سے بھیجی جا رہی تھی۔

اس دوران میں جانی کون نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تائی چن کو ہر صورت میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔ اس خطرے کے پیش نظر کیتھرائن اور لا سیگلن اپنے گواہ تائی چن کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کر رہے تھے اور اسے وفاق کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔

5 دسمبر کو نیویارک میں ایک گرینڈ جیوری اس کیس کا جائزہ لینے کے لیے بیٹھی اور اس نے جانی کون کو مختلف مواقع پر ہیروئن کی کثیر تعداد امریکا اسمگل کرنے کے الزام میں ملوث پایا۔ 12 دسمبر کو کیتھرائن پامر نے اپنا کیس گرینڈ جیوری کے سامنے پیش کیا۔ اس کے دو دن کے بعد گرینڈ جیوری نے جانی کون سمیت اس کے چھ دوسرے ساتھیوں پر فرد جرم عائد کر دی اور اس کو سر بہ مہر کر کے انتہائی صیغۂ راز میں رکھ دیا گیا تاکہ جانی کون اور اس کے ساتھیوں کو اپنی گرفتاری تک اس کا علم نہ ہو سکے۔ اس کے بعد نہایت سرگرمی سے جانی کون کی تلاش شروع کر دی گئی اور انٹرپول سمیت تقریباً ایک درجن ممالک کی ڈرگ انفورسمنٹ پولیس، شکاری کتوں کی طرح اس کی بو سونگھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن جانی کون کا کوئی پتا نہ چل سکا۔ وہ ہمیشہ حرکت میں رہتا تھا۔ صرف آؤ لنگ سے اس کا مواصلاتی رابطہ تھا۔ اپنے ایجنٹوں سے اس کی ملاقات کے اوقات بدلتے رہتے تھے۔ وہ ان سے 12 جنوری 1988ء کو ٹوکیو میں ملا، فروری کے اوائل میں تائی پی میں، پھر 25 فروری کو اس نے آؤ لنگ کو ٹوکیو میں ملنے کا حکم دیا۔ ہیروئن کی اگلی کھیپ تقریباً تو سو پونڈ تھی جو کہ فیلا بھیجی جانے والی تھی۔ لیکن جانی کون کے ساتھ ایک مسئلہ تھا جسے حل کرنے کے لیے آؤ لنگ کی ضرورت تھی۔ یہ کیش کا مسئلہ تھا۔ اتنی وافر مقدار میں ہیروئن کی خریداری نے جانی کون کو نچوڑ دیا تھا۔ اب اسے نیویارک اور سان فرانسسکو میں واقع اپنی جائیداد فروخت کرنے کی ضرورت آن پڑی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ جائیداد کی فروخت سے اسے بیس ملین ڈالر مل جائیں گے۔ اس کام کے لیے آؤ لنگ کو امریکا جانا اور گاہکوں کو تلاش کرنا تھا۔

☆☆☆

آؤ لنگ نے اپنا کردار بہت عمدگی سے نبھایا لیکن جانی کون مشکوک ہو گیا۔ ''کیا واقعی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' آؤ لنگ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں وکیلوں کو کس بات کی فیس دیتا ہوں؟" وہ برہمی سے بولا۔

آرلنگ نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ "ٹھیک ہے۔" کچھ دیر کے بعد جانی کون نے سر ہلایا۔ "میں نیویارک جاؤں گا۔"

اور پیسے نے کسی مقناطیس کی طرح اسے کھینچ لیا۔ اس ملاقات کے چند ہی یوم کے بعد اس نے آرلنگ کو فون پر حکم دیا کہ وہ اس سے 13 مارچ کو نیویارک کے ہلٹن ہوٹل کے بار میں ملے۔

"کس وقت؟" آرلنگ نے پوچھا۔ ان کی یہ گفتگو ٹیپ ہو رہی تھی۔

"رات کے ٹھیک آٹھ بجے۔" اس نے جواب دیا۔

"کس روٹ سے اور کس فلائٹ سے؟" آرلنگ نے پوچھا۔

"یہ باتیں صیغہ راز ہی میں رہنے دو۔" اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

وہ 13 مارچ، اتوار کی ایک سرد اور بے کیف شام تھی۔ نیویارک کے ہلٹن ہوٹل کے اندر اور باہر، نیم تاریک گوشوں میں گروپ 41 کے ایجنٹ چھپے ہوئے تھے۔ بار کی ایک میز پر میڈونا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی رسٹ گھڑی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ آٹھ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ اس کی میز کی دوسری طرف لامیگلن اور قریب ہی کیون بیٹھا کافی سے میز کی سطح کو کھٹکھٹا رہا تھا۔ وہ بظاہر بے پروا نظر آ رہا تھا لیکن اسے یہ بات یاد آ رہی تھی کہ جانی کون کی نگرانی کرنے والے جملہ مسلح ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کا وقت گزر گیا۔ لاؤنج بھر گیا تھا لیکن ایک گوشے میں تنہا بیٹھے ہوئے آرلنگ کے پاس کوئی نہیں پہنچا۔ میڈونا کے دماغ میں جیسے کوئی ریل سی چل رہی تھی۔ اس نے دنیا بھر میں منشیات کے اس سب سے بڑے اور منظم ترین آرگنائزیشن کو بے نقاب کرنے میں شب و روز ایک کر دیے تھے۔ اسے مشکل ہی سے یقین آ رہا تھا کہ اب یہ کھیل ختم ہونے والا تھا۔ سارے ایجنٹ اپنی اپنی جگہ بے چین اور مضطرب تھے۔ ان کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ گزرنے والا ہر لمحہ ان کے اضطراب میں اضافہ کر رہا تھا۔ سب کے سب اپنی جگہ بے حد چوکنا اور مستعد تھے۔ میڈونا کے خیالات منتشر ہو رہے تھے۔ یکایک اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک چینی اس کے قریب سے گزرا تھا۔ اس کی متلاشی نگاہیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ فربہ جسم کا مالک، نہایت خوش پوش تھا۔ اس کی رسٹ گھڑی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور بے حد چوکنی تھیں۔

میڈونا نے اپنی سانس روک لی۔ کیا وہ کوئی تاجر تھا یا...... یا......؟ اس نے محتاط نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے کوئی باڈی گارڈز نظر نہیں آیا۔ اس کے سینے میں گویا اضطراب کا ایک سمندر سمٹ آیا۔ جانی کون کبھی بھی باڈی گارڈز کے بغیر نہیں نکلتا تھا۔ اس نے کیون کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ کیون نے ایک آنکھ دبائی اور بدستور میز کھٹکھٹاتا رہا۔ وہ چینی لمحہ بھر بعد ان کی طرف لوٹا۔ یکایک اسے آرلنگ نظر آ گیا۔ اس نے آرلنگ کو متوجہ کیا اور ریسٹوران کی طرف اشارہ کیا۔ میڈونا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا لیکن اس نے اپنی کیفیت کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ آرلنگ خاموشی سے اٹھا اور بار سے نکل گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی میڈونا، لامیگلن اور کیون اس کے تعاقب میں اٹھ گئے۔ دوبارہ ریسٹوران میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے داخلی گزرگاہ کے قریب ہی ایک میز منتخب کر لی جہاں سے وہ دروازوں پر نگاہ رکھ سکتے تھے اور آرلنگ اور جانی کون سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ان کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتے تھے۔ میڈونا دزدیدہ نظروں سے ان دونوں کو آپس میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ایک گھنٹے کے طویل صلاح مشورے کے بعد جانی کون اٹھ گیا۔ اس نے اپنے جسم پر اوورکوٹ ڈالا اور سڑک کی طرف کھلنے والے دروازے سے نکل گیا۔

"اب چلو، اسے پکڑتے ہیں۔" لامیگلن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ تیزی سے باہر نکلے۔ جانی کون اتنی دیر میں ان سے ایک بلاک آگے نکل گیا تھا اور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا جنوب کی سمت چلا جا رہا تھا پھر وہ جونہی بادن ریں شاہراہ کے کنارے پہنچا، انہوں نے اسے گھیر لیا۔ کیون نے نہایت پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ "وفاقی ایجنٹس، مسٹر کون۔" لامیگلن پھنکارا۔ "تم زیر حراست ہو۔"

جانی کون آہستہ سے مڑا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے یکسر عاری تھا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ نہایت سکون اور اطمینان سے بولا۔ "میں وونگ ہوں۔"

اس کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ ڈی۔ای۔اے کی ایک کار زنّاٹے سے قریب آکر رک گئی۔ "اسے ہتھکڑیاں پہنا دو۔" لامبکن نے چیخ کر حکم دیا۔ "اور اب ہم یہاں سے نکل چلتے ہیں۔"

ایک ایجنٹ نے نہایت پھرتی سے جانی کون کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ وہ اب بھی سراپا احتجاج بنا ہوا تھا لیکن، ایجنٹوں نے اسے اٹھا کر کسی گٹھڑی کی طرح کار کی پچھلی نشست پر پھینک دیا اور کار نہایت تیزی سے روانہ ہوگئی۔ اس کا رخ ہیڈ کوارٹرز کی طرف تھا۔ اس دوران میں لامبکن اسے اس کے حقوق پڑھ کر سناتا رہا۔

☆☆☆

رات آدھی گزر چکی تھی جب صبڈوہ نے ہانگ کانگ فون کر کے جان ریچارڈز کو جانی کون کی گرفتاری کی اطلاع دی۔ اس کے دو گھنٹے کے اندر اندر جان ریچارڈز نے سبڈوہ کو فون پر اطلاع دی کہ ہانگ کانگ کی پولیس نے تقریباً تمام مقامی مجرموں کو جیل میں ٹھونس دیا ہے۔

اگلی صبح یو۔ایس اٹارنی کیتھرائن پامر نے جانی کون کے خلاف کاغذی کارروائی مکمل کر لی اور پھر ہانگ کانگ میں پکڑے جانے والے اس کے ساتھیوں کو امریکی حکام کے حوالے کرنے کے کاغذات مرتب کرنے میں مصروف ہوگئی اور جب فارغ ہوئی تو اس قدر تھک گئی تھی کہ وہیں اپنے دفتر میں ایک کاؤچ پر سوگئی۔

14 مارچ 1988ء کو صبح دس بجے جانی کون کو بروکلین میں واقع وفاقی عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہ بے حد پُراعتماد نظر آرہا تھا لیکن جب اس پر عائد الزامات کی فہرست سنائی گئی اور جب بتایا گیا کہ اس کے تمام ساتھی بھی گرفتار ہوچکے ہیں تو اس کی خود اعتمادی کافور ہوگئی۔ وہ اچانک بے حد تھکا تھکا سا نظر آنے لگا تھا۔ پھر جب کیوان اسے واپس جیل لے جانے لگا تو وہ رک کر اس کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی اور پتھر جیسی سختی تھی۔

"تم سب کے سب مارے جاؤ گے۔" وہ پھنکارا۔ "تم بھی۔"

کیوان بخشش شانے اچکا کر رہ گیا اور اسے آگے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ اسے گیدڑ بھبکی سمجھا تھا لیکن بعد ازاں ڈی۔ای۔اے کے ایجنٹس کو اس کی سازش کا علم ہوگیا جس کے تحت کیوان کو اغوا کر کے زہریلے انجکشن کے ذریعے ہلاک کرنا تھا۔ پھر ایک موقع پر کیتھرائن کے دفتر میں ایک براؤن کیس نظر آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے کھولتی، وہاں موجود ڈی۔ای۔اے کے ایجنٹوں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس بریف کیس میں ایک رائفل تھی جو بریف کیس میں موجود ایک میکنزم کے تحت اس کے کھلتے ہی چل جاتی۔ یوں کیتھرائن مرنے سے بال بال بچ گئی۔

☆☆☆

لیڈر کی گرفتاری کے بعد بگ سرکل گینگ تاش کے پتوں کی مانند بکھر گیا۔ 18 مارچ کو جان ریچارڈز نے اس گینگ کے ایک بہت ہی اہم رکن کو منیلا سے ہانگ کانگ پہنچنے پر گرفتار کر لیا۔ اسے 25 مارچ کو امریکا پہنچا دیا گیا جہاں اس نے اپنی کوٹھری میں گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ اسی دوران میں ڈی۔ای۔اے کے ایجنٹوں نے جانی کون کے ایک مقامی تقسیم کار کو نیویارک کے چائنا ٹاؤن سے گرفتار کر لیا اور ٹانی چن اور آر۔ لنگ کے لیے حفاظتی انتظامات مزید سخت کر دیے گئے۔ انہیں کسی ایک مقام پر رکھنے کی بجائے ان کے مقامات تبدیل کیے جاتے رہے۔ اس کے علاوہ ایجنٹوں نے جانی کون کے کئی خطوط پکڑے جو اس نے اپنی کوٹھری سے تحریر کیے تھے۔ ان خطوط میں ان افراد کو قتل کرنے کے عوض بھاری رقوم کی پیشکش کی گئی تھی جو اس کے خلاف گواہی دینے والے تھے لیکن اس کی وہ دہشت جو کبھی بگ سرکل گینگ پر چھائی ہوئی تھی اب زائل ہوچکی تھی۔ حتیٰ کہ ٹانی چن نے بھی رہائی کے عوض سلطانی گواہ بننا قبول کر لیا تھا۔

آخر کار ایک سال کے بعد عدالت نے 29 ستمبر 1989ء کو ملزم جانی کون کو مجرم مانتے ہوئے پچاسی سال کی سزا سنا دی جو اسے وفاقی جیل میں کاٹنی تھی۔ کیتھرائن پامر کو یو۔ایس جسٹس ڈیپارٹمنٹ اور ہانگ کانگ کے گورنر کی سفارش پر وہاں کی حکومت کی جانب سے پبلک سروس کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا گیا۔ امریکی حکومت نے بہت کم موقعوں پر یہ ایوارڈ کسی غیر امریکی کو دیا تھا۔

یوں میگنا اور کیتھرائن کی جدوجہد کا ثمر ہے کہ آج ریاست ہائے متحدہ میں ہیروئن کے تقریباً تمام بڑے بڑے اسمگلرز اور ان کے گروہ بے نقاب ہوچکے ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہیروئن کی کھیپ امریکا پہنچے اور ڈی۔ای۔اے کے ایجنٹوں کو اس کے ذرائع اور روٹ کا علم نہ ہو سکے اور وہ اس کے خلاف کارروائی نہ کریں۔

شکاریات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک انوکھا قصہ

انسانی گارا

خالد قریشی

شیر کا شکار کرنے کے لیے شکاری "گارا" کا استعمال کرتے ہیں۔ کسی گائے یا بکری کو شیر کی گزرگاہ پر باندھتے ہیں تاکہ انہیں تر نوالہ سمجھ کر شیر آئے اور شکاری اس کا شکار کرلیں مگر اس انگریز سپاہی نے انوکھا گارا منتخب کیا تھا۔ اس نے جانور کی بجائے دو زندہ انسانوں کو باندھ کر آدم خور کی گزرگاہ میں بطور گارا رکھا۔ ایسا اس نے کس وجہ سے کیا؟

شکاری زبان میں گارے سے مراد وہ جانور ہوتا ہے جسے مطلوبہ شکار کو ترغیب دینے کے لیے گزرگاہ پہ باندھا جاتا ہے۔ یہ گارا شکار کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوششیں کرتا ہے جہاں شکاری گھات لگائے بیٹھا ہو۔ گارا شکار کی مرغوب غذا کا اہم ترین حصہ ہونا ضروری ہے۔ جیسے شیر، بکری یا گائے کے گوشت کا شوقین ہوتا ہے۔ شکاری بکری یا پھر بھینس کو شیر کی گزرگاہ پر باندھ کر بندوق تھامے کسی قریبی درخت کے دو شاخے پر بیٹھ کر انتظار کر سکتا ہے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی بھی جانور کے شکار کے دوران میں گارا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسے ہی کچھ حالات سے واسطہ ہمارا تب پڑا جب شیر جنگل کے جانوروں کو شکار کرنے کی بجائے آدم خور بننے پر مجبور ہوا۔

آدم خور شیر کو اگر اپنی من پسند خوراک یعنی انسانی گوشت وافر مقدار میں میسر آرہی ہو تب پھر وہ گارے کی جانب متوجہ ہونے کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ وہ گارے کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے قریبی آبادی کا رخ کرتا ہے اور گھروں میں گھسنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اسی لیے میرے ہمراہ شیروں کے شکار پر متعین انگریز شکاری نے تمام انسانیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے گارے کے طور پر جانور باندھنے کے سلسلے کو منقطع کر کے دو زندہ اور صحت مند انسانوں کا انتخاب کیا۔ اگر اسے انسانی گارا کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔

بات کچھ عجیب سی ہے لیکن تحریر کے مکمل مطالعے کے بعد شاید آپ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ بعض اوقات کچھ ایسی مجبوریاں وہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر سکتی ہیں جن کے متعلق عام حالات میں انسان سوچ کر بھی کانپ جاتا ہے۔

بہرحال تحریر کے آغاز سے پہلے اپنا مختصر تعارف کروا دوں۔ میرا نام نصیر احمد ہے۔ لکڑیوں کا بیوپاری ہوں۔ اس لحاظ سے جنگلی زندگی کا مطالعہ کرتے رہنے کی وجہ سے شکاری کی کئی اچھی چند خصوصیات مجھ میں بھی پیدا ہو گئیں۔ جن میں سرفہرست میرا اچھا اور کھرا نشانہ ہے۔ دیہاتی زندگی جہاں شہری زندگی کی نسبت پُرسکون، محدود اور زندگی کی پریشانیوں سے دور ہوتی ہے وہاں خدا کے عذاب کے طور پر آدم خور جانوروں کے علاوہ کچھ شر پسند جانور بھی نقصان کا باعث بن سکتے ہیں مثلاً ہاتھی گنے کی فصل کا انتہائی دشمن ثابت ہوتا ہے۔ ہاتھیوں کا گروہ گنے کی کئی ایکڑ پر موجود فصل کا ایک رات میں صفایا کر دیتا ہے۔ وہ کھاتے کم ہیں اور اجاڑ زیادہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ریچھ چنے کی فصل کے علاوہ سبزیوں کے کھیت کا بھی دشمن ہوتا ہے۔ فصل کی کٹائی سے پہلے دیہاتی اپنی زیادہ تر راتیں کھیتوں کے قریب گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ موسم کے تیوروں کو مدنظر

رکھتے ہوئے ان کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ رات گاؤں سے باہر کھیتوں کے قریب بسر کرنا چاہیے۔ اسلحے کی عدم موجودگی کی بدولت وہ جانوروں کو فصل سے دور رکھنے کے لیے دیسی طریقوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ جن میں سرفہرست آگ کا الاؤ روشن کرنا ہے۔ جانور آگ کی روشنی اور حدت سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ ہاتھی کو فصلوں سے دور رکھنے کے لیے ڈھول پیٹنا یا پھر شور وغل کرنا ان کے شر پسند عزائم سے نجات کا باعث بنتا ہے۔

بات ہو رہی تھی شکاری کی زندگی کی..... تو صاحب بندوق کی موجودگی کے باعث دیہات کے زیادہ تر لوگ میری خدمات کو حاصل کرنا قابل فخر گردانتے تھے۔ ہاتھی یا پھر ریچھ فصلوں کو گارے جیسی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک رات پیٹ پوجا کرنے کے بعد وہ بار بار اسی جگہ کا رخ کرتے ہیں کیونکہ انہیں وہاں سے مزید خوراک کی دستیابی کا یقین ہو جاتا ہے۔ کٹائی کے دنوں میں گاؤں والوں کے اصرار کے بعد میں نے کھیتوں کے پاس رات گزارنا شروع کیا۔ جانوروں کے فصلوں پر حملہ کرنے سے پہلے ہی میں انہیں بندوق کے دھماکے سے بدحواس کر دیتا تھا۔ بعض اوقات جب وہ حد سے تجاوز کرتے ہوئے فرار ہونے سے انکاری ہوتے تھے تب میں ان میں سے چند کا شکار کرنا معیوب خیال نہیں کرتا تھا۔ یہ میری شکاری زندگی کا آغاز تھا بعد از آغاز میں نے اپنی بندوق سے ریچھ، ہرن، چکارا اور بھیڑیے کے علاوہ چند آدم خور شیروں اور چیتوں کا بھی شکار کیا۔

تحریر کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے یہ بھی بتاتا چلوں کہ آدم خور جانور جس خطے سے شکار کا آغاز کرتا ہے اس آدم خور کو اسی خطے کے نام سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ میری تحریر کے آدم خور دونوں شیروں نے اپنی آدم خور زندگی کا آغاز ضلع کسنوری کے قریب واقع گاؤں ”پانی پتا“ سے کیا۔ اس لحاظ سے انہیں پانی پتا کے آدم خوروں کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں جڑواں آدم خوروں کی ماں بھی میری بندوق کی گولیوں کی نذر ہوئی۔ دونوں شیر ماں کے رحم و کرم پر پل رہے تھے اس لیے وہ بچپن ہی سے انسانی گوشت کی لذت سے آشنا تھے۔ ماں کی ہلاکت کے بعد ان دونوں نے اپنی ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پانی پتا کے علاوہ اردگرد کی آبادی پر آسمانی آفت کی صورت میں نازل ہونا شروع کر دیا اور ایک سال کے دوران میں ان دونوں نے لگ بھگ دو سو کے قریب انسانوں کو لقمۂ اجل بنا ڈالا۔ میں ان دنوں لکڑیوں کی فروخت کے سلسلے میں پانی پتا سے باہر مصروف کاروبار تھا۔ مجھے وہاں وقتاً فوقتاً آدم خوروں کی سرگرمیوں کی اطلاعات بہم پہنچتی رہتی تھیں لیکن کام کی مصروفیات کے باعث عملی قدم اٹھانا میرے اختیار سے باہر تھا۔

مصروفیات سے فارغ ہونے کے فوراً بعد میں نے پانی پتا کا رخ کیا۔ یہاں میری بھی رہائش دو کمروں کے پکے مکان کی صورت میں موجود تھی۔ جس کی دیکھ بھال میری عدم موجودگی میں میرے نوکر اسلم کے ذمے تھی۔ مکان میں قدم رکھتے ہی میرے استفسار پر اسلم نے مجھے بتایا کہ گزشتہ روز جڑواں آدم خوروں نے پانی پتا کے ایک گھر میں گھس کر نوجوان میاں بیوی کو ہلاک کرنے کے بعد انہیں گاؤں سے قریب ہی موجود درختوں کے جھنڈ میں کھینچ کر لے گئے اور وہاں بیٹھ کر ضیافت کا اہتمام کیا۔

میں نے اسلم کے ہمراہ گاؤں سے باہر درختوں کے جھنڈ کا معائنہ کیا۔ جھنڈ میں بچی کھچی ہڈیوں اور شیروں کے قدموں کے نشانات کے علاوہ مزید کچھ باقی نہیں تھا۔ قدموں کے نشانات کا معائنہ کرنے پر بھی اس کے علاوہ معلومات میں مزید اضافہ نہ ہو سکا کہ وہ دونوں نر شیر تھے جو بچپنے کی حدود کو عبور کرنے کے بعد جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے۔ دونوں شیر رات کے اندھیرے میں پانی پتا گاؤں کا رخ کرنے اور نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ گاؤں کے کسی بھی مکان کا انتخاب کرنے کے بعد لکڑی کے دروازوں کو توڑ کر رہائشیوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔ وہ اپنا گاؤں کے اردگرد موجود جلتے ہوئے الاؤ کی موجودگی کے باوجود کرتے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ الاؤ نصف رات سے بھی کم عرصے تک روشن رہنے کے بعد ماند پڑ جاتے ہوں گے الاؤ کو تا دم آخر تک روشن رکھنا دیہاتیوں کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ تو سورج غروب ہونے سے بھی پہلے گھروں کے دروازے بند کر کے اپنے مزید بچاؤ کی تدبیروں میں مشغول ہو جاتے تھے۔ الاؤ کو روشن کرنے کے لیے گھروں سے باہر قدم رکھنے کی ہمت ان میں نہ تھی۔ آدم خور شیروں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریز سرکار نے انگریز شکاری کو ڈیڑھ ماہ قبل پانی پتا بھیجا تھا مگر وہ تا حال گاؤں والوں کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ سوائے ایک دو روز کے علاوہ جب اس نے شیروں کے شکار کے لیے انسانی گارے کے قریب مچان باندھ کر آدم خوروں کا انتظار کیا اور ان دونوں کے گارے کی جانب رخ کرنے پر فائرنگ کی لیکن رات اندھیری ہونے کے باعث

وہ دونوں صاف بچ کر نکل گئے۔ اس ملے کے بعد دونوں شیر مزید محتاط ہو گئے۔

جب شام کو میری ملاقات شکاری تھامس سے ہوئی۔ تب میں نے سپاٹ اور کرخت چہرے والے تھامس کو شکاری لحاظ سے ہر طرح سے موضوع پایا۔ وہ فطرت کے لحاظ سے نہایت اذیت پسند اور سنگ دل انسان دکھائی دیا۔ اس نے میری ساکھ اور رتبے کو مدنظر رکھتے ہوئے بحالت مجبوری ملاقات کرنے کے لیے ہامی بھر لی۔ مزید کچھ بھرم اس بات سے بھی قائم رہا کہ دونوں آدم خوروں کی ماں میرے ہاتھوں ہلاک ہوئی تھی۔ ملاقات کے دوران میں اس نے مجھ سے پہلا سوال یہی کیا کہ میں نے ماں کو مارنے کے بعد بچوں کو زندہ کیوں چھوڑ دیا۔ تب میں نے اسے بتایا کہ ماں کی خونی سرگرمیوں کے دوران میں مجھے یہ شبہ بھی نہیں ہو پایا کہ جوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہوئے وہ دو بچوں کی ماں بھی ہے۔ اس عمر تک ماں کے ساتھ منسلک رہنا قدرت کے قانون کے منافی ہو سکتا ہے لیکن بعض جانور غیر معمولی فطرت کے حامل ثابت ہوتے ہیں اور زیادہ عرصہ اپنی ماں پر انحصار کرتے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کی لنگڑی ماں انسانی خوراک کا زیادہ تر حصہ اپنے جوان بچوں کی نذر کرتی تھی اس لیے ماں کے ہلاک ہونے کے بعد بچوں نے ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آدم خوری کا آغاز کر دیا۔ شکاری تھامس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔

”یہی فرق ایک عام آدمی اور پیشہ ور شکاری کی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔ جانور کی ہلاکت کے بعد اس کے جسم کی تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے بچوں کی ماں ہے اور بچے اس کے ساتھ تعلق رکھتے ہوئے ہیں یا نہیں۔ تمہاری اس غلطی کا خمیازہ اردگرد موجود آبادی کو آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جناب عالی میں نے شیرنی کی ہلاکت کے فوراً بعد اس بات کو بھانپ لیا تھا کہ وہ تقریباً ایک ڈیڑھ سال قبل بچوں کی ماں بن چکی ہے لیکن میرے خیال میں اس بات کا اندازہ لگانا کہ بچے جوانی کی حدود میں قدم رکھنے کے باوجود بھی ماں پر انحصار کر رہے ہیں، کسی بھی انسان کے بس سے باہر ثابت ہو سکتا ہے۔ بعض جانور مافوق الفطرت ہوتے ہیں۔ جس کی جیتی جاگتی مثال آپ کے سامنے دونوں شیروں کی صورت میں موجود ہے۔ دونوں جوان ہونے کے باوجود بھی ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتے ہوئے ہیں۔ وہ خوراک کو مل بانٹ کر کھانے کے عادی بن چکے ہیں۔“

تھامس نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”شاید ان کی یہی فطرت ہماری کامیابی کے سلسلے میں بھی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔ وہ جب بھی کسی انسان کا شکار کرتے ہیں۔ تب مل بانٹ کر چند لمحوں کے دوران اسے چٹ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ہمیں گارے کے طور پر سوائے انسان کی ہڈیوں کے علاوہ اور کچھ بھی دستیاب نہیں ہو پاتا۔ علاوہ ازیں ہانکا ہونے کے فوراً بعد میں نے گائیں کے اردگرد یا پھر جنگل کے قریب متعدد جگہوں پر گائے اور بھینسیں باندھ کر آدم خور شیروں کو شکار کی ترغیب دی۔ لیکن انہوں نے جانوروں کے قریب سے گزرنے کے باوجود بھی انہیں نقصان نہیں پہنچایا۔ میں نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ یقیناً ایسا ہی کریں گے جبکہ انہیں انسانی گوشت کی سہولت با آسانی میسر آ رہی ہے۔ انسانی گوشت کے سامنے بھلا جانور کے گوشت کی کیا حیثیت...... وہ تو انہیں منہ لگانا بھی گوارا نہیں کریں گے۔“ تھامس بولا۔ ”انہی چند باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ حتمی فیصلہ کیا ہے کہ اگر دونوں جانوروں کی خونی سرگرمیوں کا خاتمہ یا تعمیر کرنا مقصود ہے تب ہمیں انتہائی اقدام اٹھانا ہی پڑے گا۔“

میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ انتہائی قدم کیا ہے؟“

اس نے نہایت سنگدلانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بتایا۔ ”وہ گارے کے طور پر انسانوں کے وجود کو استعمال کرنا ہے۔“

مجھے ہاتھوں کے توتے اڑتے محسوس ہوئے۔ یہ کسی بھی شکاری کی زندگی میں رونما پذیر ہونے والے واقعات میں سب سے منفرد اور ہولناک فیصلہ ثابت ہو سکتا تھا۔ جسے وہ نہایت معمولی بات کے طور پر پیش کر رہا تھا۔ میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی جیتا جاگتا انسان اپنے آپ کو گارے کے طور پر کیونکر پیش کرنے لگا۔ اگر آپ تنگدستی حالات میں پسے ہوئے کسی غریب کو رقم کا لالچ دے کر گارا بننے کے لیے قائل کرنے کی کوششیں کریں گے تب بھی میرے خیال میں آپ کو معاملے میں ناکامی کا سامنا ہی کرنا پڑے گا۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”رقم کا لالچ کیوں...... میں

زندگی کا لالچ دوں گا۔ کوئی بھی ہوش وحواس سے بھرپور انسان اپنی مرضی سے موت کو گلے لگانے کے لیے تیار نہیں ہوگا لیکن کسی موت سے بچنے کے لیے اس موت کا انتخاب کرنے کی ہامی ضرور بھر سکتا ہے جس میں بچنے کے چند فیصد چانسز بھی موجود ہوں۔ جیسے پھانسی پر چڑھنے والا مجرم جسے اس بات کا مکمل یقین ہو کہ اسے دوسرے دن یقیناً پھانسی پر چڑھ جانا ہے۔ وہ گارا بننے کے لیے بخوشی آمادہ ہوسکتا ہے۔ گارا بننے کی صورت میں موت سے بچنے اور زندگی کو پالینے کے ففٹی ففٹی چانسز ہوتے ہیں لیکن پھانسی پر چڑھنے کی صورت میں بچنا ممکن نہیں۔"

مجھے اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ جو کہہ رہا تھا سچ کہہ رہا تھا۔ ایسا ہوسکتا تھا مگر حکومت کی مرضی کے ساتھ۔ ہم دونوں کے سوچنے سے بات آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ یہی بات جب میں نے اس کے سامنے دہرائی تب اس نے مجھے بتایا کہ "کمشنر صاحب مدد کرنے کا وعدہ کرچکے ہیں۔ ایک یا دو دن بعد قیدی پانی پا پہنچنے والے ہیں۔"

بات ختم ہوگئی اور میں اٹھ کر اپنی رہائش گاہ کی جانب چلا آیا۔

اگلے دن انگریز اہلکاروں کی معیت میں دو مقامی قیدیوں کو پانی پا لایا گیا۔ قیدی شکل و صورت کے لحاظ سے سیدھے سادے اور جاہل گنوار دکھائی دیتے تھے جنہیں مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا مشکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں شاید یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ تھامس پانی پا گاؤں کے درمیان لگے خیموں میں رہائش پذیر تھا۔ دونوں قیدیوں کو تھامس کے خیمے کے ساتھ لگے دوسرے خیمے میں مقید کردیا گیا۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ تھامس سے مصافحہ کرنے کے بعد میں قیدیوں سے ملاقات کی نیت سے ان کے خیمے کی جانب چلا آیا۔ دونوں نے مجھے دیکھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھے رہنے کی تلقین کی اور خود خیمے کے دروازے کے پاس پڑی اکلوتی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے مجھے بتایا کہ چند عرصہ قبل ان دونوں کے ہاتھوں انگریز سرکار کے دو اہلکار ہلاک ہوگئے اور وہ بھاگ گئے عرصہ ان دونوں پر مقدمہ چلا پھر پھانسی کی سزا سنادی گئی۔ میرے مزید پوچھنے پر دونوں دیہاتیوں نے بتایا کہ انگریز اہلکار ان کی اکلوتی بہن کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ دونوں بھائیوں کے احتجاج کرنے پر بھی باز نہ آئے اور انہوں نے لڑکی کا دوپٹا چھین کر ہوا میں اچھال دیا تب طیش میں آکر دونوں نے انہیں موقع پر ہی ہلاک کردیا جبکہ مزید دو بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔ پھانسی کی سزا پانے والے دونوں دیہاتیوں کے نام گشو اور رنگی تھے۔ کچھ دیر کی پوچھ گچھ کے دوران میں دونوں قیدیوں نے مجھے وہ بات بتائی جسے سن کر میرے جسم میں موجود خون نفرت کی شدت سے کھولنے لگا۔ ان دونوں کا کہنا تھا کہ فرار ہونے والے دو انگریز اہلکاروں میں سے ایک تھامس تھا۔ جس نے چند روز قبل جیل میں آکر ان دونوں کو گارا بننے کی ترغیب دی اور بدلے میں سزا معاف کروانے کی پیشکش بھی کی۔ مجبور اور لاچار سیدھے سادے دیہاتیوں نے سزا معاف ہوجانے کا سنتے کے فوراً بعد ہاں کردی اور انگریز اہلکاروں کے ہمراہ پانی پا چلے آئے۔ وہ دونوں خاموش ہوگئے مگر میرے دماغ میں غم وغصے کا طوفان برپا تھا۔ مجھے انگریز سرکار سے ایسی ہی مفاد پرستی اور خودغرضی کی توقع تھی۔ وہ انگریزوں کے علاوہ اور کسی کو انسان تصور کرنا بھی گناہ خیال کرتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ گارے کی صورت میں بندھے ہوئے دونوں معصوم دیہاتیوں کی موجودگی کی خوشبو پر اگر آدم خور گاؤں کی جانب کھنچے چلے آئے تب تھامس اس بات سے قطع نظر کہ اس کی چلائی ہوئی گولیاں دونوں دیہاتیوں کی زندگی کا خاتمہ بھی کرسکتی ہیں۔ بلا دریغ گولیوں کی بوچھاڑ شیروں پر کرنے کا حکم صادر کردے گا۔ اس کی نگاہوں میں آدم خوروں کے جسموں کو تسخیر کرکے اپنے رعب و دبدبے میں اضافہ اس بات کی نسبت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ وہ حقیر انسانوں کو ضرور نہ پہنچانے کے لیے آدم خوروں کو بھاگنے کا موقع دیا جائے۔ میں نے نفرت کے ساتھ زمین پر تھوک دیا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر چکی تار نما آری باہر نکالی اور رنگو کے ہاتھوں میں تھمادی۔ حیرت کے عالم سے پروندان موجود تھے اور اس کی لمبائی دس انچ کے قریب تھی۔ بظاہر پتلی اور کمزور دکھائی دینے والی وہ تار نما آری نہایت آزمودہ ہتھیار ثابت ہوسکتی تھی۔ رنگی حیرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے ان دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے بھائیو! تم دونوں اپنی حماقت کے سبب جس مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہو میں نہیں چاہتا کہ اس مصیبت میں مبتلا ہوسکو۔ گارے والی رات کوشش کرنا کہ اپنے جسموں کی حرکت کو حتی الوسع پوشیدہ رکھتے ہوئے پاؤں

اور ہاتھوں کی زنجیروں کو اس تیز آری سے کاٹ کر جنگل کی جانب فرار ہونے کی کوشش کرنا۔ جنگل تمہارے وجود کو پناہ دے سکتا ہے لیکن آبادی میں موجود انگریز اہلکاروں کے جاسوس تمہیں پکڑ کر دوبارہ شکاری تھامس کے سامنے لا کھڑا کریں گے۔ اور ایک مزید بات اور وہ ہاتھوں کی زنجیر کو کاٹنے کے بعد اٹھنے کی کوشش نہیں کرنا بلکہ لیٹے لیٹے اپنے وجود کو مخالف صورت دینے کے بعد ایک دوسرے کے پاؤں کی زنجیروں کو کاٹنے کی کوشش کرنا اور اس بات کو اپنے دماغ میں نقش کر لینا کہ مچان پر بیٹھے ہوئے شکاری تھامس کی بندوق کا ہدف تم دونوں کا وجود ہی ہوگا۔ معمولی سی حرکت اسے مشتعل کر دینے کے لیے کافی ہوگی۔“

میں نے ہار کو گوگی کی شلوار کے نیفے میں چھپا دیا۔ دونوں نے ممنون نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور میں مطمئن قدموں کے ساتھ خیمے سے باہر نکل آیا۔

یہ دو دنوں کے بعد کی بات ہے۔ ان دو دنوں کے دوران میں پالی پتا کا کوئی بھی آدمی آدم خوروں کا نوالہ نہیں بنا تھا اور تھامس کے کہنے کے مطابق دونوں آدم خور انسانی گوشت کی دستیابی کے لیے بے تاب ہوں گے۔ اگر آج کی رات انہیں انسانی گوشت کی دستیابی کا یقین انسانی شکار کی صورت میں دلا دیا جائے تب وہ یقیناً گاؤں کی جانب رخ کریں گے۔ بات جنیا اکی ہی کی تھی۔ میرے اثبات میں سر ہلانے پر اس نے پالی پتا کی شروعات کے پاس واقع میدان کے سرے پر لگے شہتوت کے تناور درخت پر مضبوط چارپائی باندھ کر مچان کی صورت دی پھر میں اور تھامس چارپائی پر براجمان ہوگئے۔ ہمارے سامنے میدان کے مخالف جانب ننگی زمین پر گوگی اور ننگو زنجیروں کے ساتھ بندھے چاروں شانے چت لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے ہماری جانب تھے اور پشت کی جانب جنگل تھا۔ جہاں سے آدم خوروں کی آمد متوقع تھی۔ شبہ میں تھا کہ دونوں آدم خوروں کو اسی سمت سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ شاید ان کی رہائش گاہ اسی سمت رہی ہوگی ورنہ جنگل تو پالی پتا کے چاروں جانب موجود تھا۔ وہ کسی بھی سمت سے گاؤں میں داخل ہو سکتے تھے۔ میں مچان پر چڑھنے سے پہلے دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ حتی الامکان کوشش کروں گا کہ دونوں آدم خوروں کو مجبور و لاچار دیہاتیوں کے قریب بھی نہ پہنچنے دوں۔ اس کے لیے اگر مجھے مچان سے کود کر دونوں دیہاتیوں کو بھی بچانا پڑا تب بھی میں دریغ نہیں کروں گا۔

وقت نہایت سست رفتاری کے ساتھ گزرنے لگا۔ ہر جانب سکوت طاری تھا۔ گاؤں کے مکان اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ساکت تصویر کا منظر پیش کر رہے تھے۔ سردیوں کی رات تھی اس لیے ہم مچھروں کی شر پسندیوں سے محفوظ تھے۔ تاہم جھینگروں کی آواز یا قریب موجود جوہڑ میں مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز گونج رہی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے ہم دونوں کے جسموں پر کمبل موجود تھے لیکن دیہاتی معمولی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ وہ ٹھنڈی زمین پر سرد ہوا کے تھپیڑوں کی مکمل زد میں تھے اور میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے دل میں درد محسوس کرنے کے...... دور کہیں ٹگر کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ یہ جنگل کے بادشاہ کے باہر نکلنے کا اعلان تھا۔ ٹگر واحد ایسا جانور ہے جو شیر کے کچھار کے ارد گرد پایا جاتا ہے۔ وجہ تو جانے کیا رہی ہو لیکن وہ شیر کی موجودگی سے جنگل کے جانوروں کو باخبر کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ ٹگر کے علاوہ جنگلی لنگوروں کو بھی جنگل کے دربان کے عہدے پر منصب کیا جا سکتا ہے۔ شیر جب شکار کرنے کے لیے جنگل کا رخ کرتا ہے تب اس کی مکمل کوشش ہوتی ہے کہ وہ لنگوروں کے علاقے سے دور ہی رہے۔ لنگور اسے دیکھتے ہی شور و غل مچا کر جنگل کے جانوروں کو شیر کی موجودگی سے باخبر کرنے کا فریضہ بخوبی ادا کرتے ہیں لیکن چونکہ شکار میدانی علاقوں میں ہوتا ہے جہاں لنگوروں کی اکثریت نہیں پائی جاتی۔ لنگور بلند و بالا اور گھنے جنگلات کے شیدائی ہوتے ہیں۔ اس لیے دونوں کا آمنا سامنا کم ہی ہوتا ہے لیکن جب بھی ہوتا ہے خوب ہوتا ہے۔

لنگو اور گوگی کے جسموں میں خفیف حرکت نمایاں ہونے لگی تھی۔ میری نگاہیں ان دونوں کے جسموں پر تنقیدی پہلو کی تلاش میں مرکوز تھیں لیکن دونوں کمال ہوشیاری کے ساتھ جسموں کی حرکت پوشیدہ رکھے ہوئے تھے۔ کبھی کروٹ لینے کے بہانے اور کبھی جسم کو کھجانے کی خاطر وہ مکمل احتیاط کے ساتھ جگہ تبدیل کر رہے تھے۔ ٹگر چیخ چلا کر خاموش ہو گیا۔ شاید شیر اس کے علاقے سے باہر نکل آیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا میرے جسم میں بے چینی کی لہر کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ماحول پر دوبارہ سکوت طاری ہو گیا تھا اور پھر اچانک ہی اندرون جنگل کی جانب سے جنگلی کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ آوازوں کا شور بتدریج قریب آتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے جسم کے

رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ جنگلی کتے رات کے اندھیرے میں غول کی صورت میں باہر نکلتے ہیں۔ جنگل کے تمام جانور اس ناگہانی آفت کی صورت میں نازل ہونے والے خطرے سے خائف رہتے ہیں۔ میں نے اپنی محدود شکاری زندگی کے دوران میں آنکھوں کے سامنے پچیس سے زیادہ جنگلی کتوں کے غول کو مادہ گینڈے اور اس کے چند روز پہلے پیدا ہونے والے بچے کا شکار کرتے ہوئے دیکھا۔ میں ان کی دسترس سے دور پہاڑی ٹیلے پر موجود تھا۔ نیچے وادی میں یہ خونی ڈراما کھیلا جا رہا تھا۔ مادہ گینڈے کو شکار کرنا ناممکن تھا اور جنگلی کتوں کا ہدف مادہ گینڈا تھی بھی نہیں۔ وہ تو بچے پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے۔ مقصد کے حصول کے لیے جنگلی کتے دو گروہوں میں بٹ کر حملہ کر رہے تھے۔ ایک گروہ مادہ گینڈے کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا جبکہ دوسرا گروہ مادہ گینڈے کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بچے کو ماں کی پہنچ سے دور لے جانے کی سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد بچہ کھینچا تانی کے دوران میں لہولہان ہو گیا اور اس کے قدم لڑکھڑانے لگے لیکن ماں اب بھی محاذ پر ڈٹی ہوئی تھی۔ وہ میدان میں بھاگ دوڑ کر جنگلی کتوں کے گروہ کو تتر بتر کرنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ کتے بکھرنے کے فوراً بعد گھوم پھر کر دوبارہ یکجا ہونے کی کوششیں کرتے۔ پھر بچہ زمین پر گر گیا اور کتوں کے گروہ نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ مجبور و لاچار جنگلی مادہ ماں دور کھڑی چیر پھاڑ کرتے ہوئے کتوں کو بے چارگی کے عالم میں دیکھتی رہی پھر اپنی جان بچا کر فرار ہو گئی۔

کتوں کی آواز قریب سے قریب تر آتی چلی جا رہی تھی۔ ٹنگلو اور گوگی کے جسموں میں بھی واضح حرکت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے اور پھر میدان کے سرے پر موجود جھاڑیوں کے پاس سے پہلا کتا نمودار ہوا۔ اس نے ناک کو اونچا کر کے سونگھ کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ ہوا کا رخ ہماری مخالف جانب تھا اس لیے وہ جانچ نہیں پایا کہ میدان میں بندھے ہوئے دونوں دیہاتیوں کے علاوہ دو اور انسان بھی درختوں پر بندوقیں تانے براجمان ہیں۔ اگر انہیں ذرا سا بھی شک ہو جاتا تب وہ میدان میں داخل ہونے کی بجائے جنگل کے سرے پر بیٹھ کر بہتر موقع کا انتظار کرتے اور یہ انتظار صبح تک طویل ہو سکتا تھا۔ بہرحال حالات سازگار دیکھ کر تمام کتے نمودار ہونے لگے۔ ان کی تعداد کم و بیش چندرہ سے بیس تھی۔ اندھیرے کی بدولت تعداد میں کمی بیشی بھی ہو سکتی تھی لیکن پھر بھی تعداد دو انسانوں کے حوالے سے زیادہ ہی تھی۔ تمام جنگلی کتے جنگل سے نکلنے کے بعد دونوں دیہاتیوں کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

میں نے بے چین نگاہوں سے ساتھ بیٹھے تھامس کی جانب دیکھا۔ اس نے ناک پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے ان کی بے حسی پر شدید غصہ آیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے خاموش بیٹھے رہنے میں ہی بہتری جانی۔ ایک کتے نے آگے بڑھ کر گوگی کی قمیص کے دامن کو منہ میں تھاما اور اپنی جانب کھینچنے لگا۔ گوگی نے ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی لیکن زنجیروں میں بندھے ہونے کی بدولت مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ناکامی کے بعد اس نے گلا پھاڑ کر چیخنا شروع کر دیا۔ وہ میرا نام لے کر مدد کرنے کی التجا کر رہا تھا۔ میں نے مجبور و لاچار نگاہوں سے ایک دفعہ پھر تھامس کی جانب دیکھا۔ وہ مکمل محویت سے حالات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے بے بسی کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد گوگی کے علاوہ ٹنگلو کے چیخنے چلانے کی آواز بھی مجھے سنائی دینے لگی۔ جنگلی کتوں نے شاید حملہ کر دیا تھا۔ میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں پھر یکلخت ماحول پر سناٹا طاری ہو گیا۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں کتے اپنی دموں کو پچھلی ٹانگوں میں دبائے جنگل کے مخالف بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے جنگل کی جانب بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی یعنی وہ کسی جانور سے خوف زدہ ہونے کے بعد بھاگنے پر مجبور ہوئے تھے اور وہ جانور شیر کے علاوہ بھلا کون ہو سکتا تھا۔ میں نے پھرتی سے مچان پر پڑی ہوئی رائفل کو اٹھایا اور اس کی نال کا رخ جنگل کی جانب کر دیا۔ وہاں گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ تھامس کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔

”یہ کیا ہوا؟ جنگلی کتے کیوں بھاگ گئے؟ ایسا ہونا ناممکن ہے۔“

میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن ایسا ہو چکا ہے کتے فرار ہو گئے ہیں۔ مسٹر تھامس خدا ہر چیز پر قادر مطلق ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی مکھی بھی پر نہیں مار سکتی۔ ناممکن کو ممکن بنانا اسے خوب آتا ہے۔“

میرا لہجہ جذبات کی شدت سے تقریباً روندھنے لگا لیکن بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ زنجیروں کی کھنکدار آواز سے ماحول گونج اٹھا۔ تھامس نے ہڑبڑا کر ٹنگلو اور گوگی کی

جانب دیکھا۔ وہ زنجیروں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد زمین سے اٹھ کر جنگل کی جانب بھاگنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ خناس کی آنکھیں فرطِ حیرت کی شدت سے پھٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ حالات کو سمجھنے میں اسے کچھ وقت کا سامنا کرنا پڑا لیکن سمجھ میں آتے ہی اس نے پھرتی سے رائفل کی نال کا رخ جنگل کی جانب بھاگتے ہوئے دونوں دیہاتیوں کی جانب کیا اور فائر داغ دیا۔ مجھے اور تو کچھ سجھائی نہیں دیا میں نے لاشعوری طور پر اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی رائفل کی نال کا رخ آسمان کی جانب کر دیا۔ جنگل ہولناک دھماکے کی آواز سے گونج اٹھا۔ درختوں پر ساکت بیٹھے پرندے چیخنے چلانے لگے۔ خناس نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ میری جانب دیکھا پھر غصے کے ساتھ گالیاں بکتے ہوئے رائفل کا بٹ میرے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ میں اس ردعمل کے لیے پہلے سے ہی تیار بیٹھا تھا۔ سر کو دائیں جانب گھماتے ہوئے میں نے رائفل کے بٹ سے بچنے کے فوراً بعد مچان سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ زمین سے مچان کی اونچائی کم و بیش پندرہ سے بیس فٹ کے درمیان تو ضرور رہی ہوگی۔ زمین پر گرنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں گھٹنوں کے پاس سے ٹوٹ کر علیحدہ ہو کر رہ گئے ہوں۔ مگر فوراً ہی احساس ہو گیا کہ زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے۔ میں نے رائفل کو کاندھے کے ساتھ لٹکایا اور میدان کو عبور کرتا ہوا جنگل کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ ابھی جنگل میں داخل بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ مجھے اندرونِ جنگل سے ننکو اور گوگی کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ آدم خور نے شاید ان دونوں پر حملہ کر دیا تھا۔ میں نے سمت کا تعین کیا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ کچھ آگے جانے پر گوگی کا مسلا کچلا جسم زمین پر گرا ہوا دکھائی دیا لیکن ان دونوں کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ اندھیرے کی بدولت زمین پر درندوں کے نشانات تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں اندازے کے مطابق آگے بڑھنے لگا۔ جنگل میں جھاڑیوں اور درختوں کی بہتات تھی۔ آگے بڑھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ ایک درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے کسی آدمی کی ہچکیاں لے کر رونے کی آواز سنائی دی۔ میں جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رک گیا۔ آواز میرے دائیں جانب موجود شہتوت کے تناور درخت سے آتی محسوس ہوئی۔ میں نے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔

وحشی بن حرب

نام وحشی کنیت ابو دسمہ نسلاً حبشی حضرت جبیر بن مطعم کے غلام۔ جنگ احد میں جب ان کے آقا کے بھائی کو حضرت حمزہؓ نے قتل کیا تو اس کا بدلہ لینے کے لیے اس نے انہیں مامور کیا اور اس کام کے عوض آزادی کی پیش کش کی۔ چنانچہ اس نے چھپ کر وار کر کے آپؓ کو شہید کیا۔ فتح مکہ کے وقت طائف میں چلا گیا اور ثقیف کے وفد کے ساتھ اسلام لے آیا۔ اس لیے آپؐ نے اسے معاف تو کر دیا مگر اس سے کہا کہ نظروں کے سامنے نہ آئے۔ اس نے حضرت حمزہؓ کی شہادت کا بدلہ جنگ یمامہ کے وقت اسلام کے سب سے بڑے دشمن مسیلمہ کذاب کو قتل کر کے چکانے کی کوشش کی۔

مرسلہ: سلطان شیخ، سرائے عالمگیر

"اوپر کون ہے؟" میں نے چلاتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں میرے پیچھے موجود جھاڑیوں سے شیر کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ہڑبڑا کر رائفل کو کاندھے کے ساتھ لٹکایا اور پھرتی کے ساتھ درخت کے اوپر چڑھنے لگا۔ درخت کی درمیانی اور مضبوط شاخوں کے درمیان کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ گوگی تھا لیکن اس کے ہمراہ مجھے ننکو دکھائی نہیں دیا یقیناً وہ آدم خوروں کا شکار بن چکا تھا پھر مجھے جنگل میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے نیچے کی جانب دیکھا۔ شکاری خناس ہاتھوں میں رائفل تھامے درخت کی جانب بھاگتا چلا آ رہا تھا۔ اس کا رخ ان جھاڑیوں کی جانب تھا۔ جہاں دونوں آدم خور چھپے ہوئے ننکو کی لاش کو بھنبھوڑنے میں مصروف تھے۔ میں نے چلاتے ہوئے خناس کو خطرے سے آگاہ کیا اور اسے قریبی درخت پر چڑھنے کی ہدایت کی۔ خناس کے قدم جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے پھر اس نے بلا کی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قریبی درخت کا انتخاب کیا اور بندر کی سی رفتار کے ساتھ اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اب یہ علیحدہ بات تھی کہ اس نے جس درخت کا انتخاب کیا وہ جنگلی املی کا ٹھگنا درخت تھا۔ زمین سے اوپر تک اس کی اونچائی دس بارہ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ عام شیر کی لمبائی دم کی لمبائی کو منہا کرنے کے باوجود بھی پانچ فٹ کے درمیان ہوتی ہے۔ اس کے لیے دس بارہ فٹ لمبے درخت تک چھلانگ

لگانا بھلا کیا معنی رکھتا تھا۔ مجھے نخاس کی بدحواسی اور بزدلانہ فطرت پر گمبھیر حالات کے باوجود بھی ہنسی آنے لگی لیکن ہنسنے ہنسانے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے چلاتے ہوئے نخاس کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”کیا اسے املی کے درخت کے قریب موجود جھاڑیوں میں آدم خوروں کی جھلک دکھائی دے رہی ہے؟“

اس نے انکار میں سر ہلایا پھر چلاتے ہوئے جواب دیا۔

”میں درخت پر مزید اوپر چڑھ کر جھاڑیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں شاید مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے۔“ وہ اوپر چڑھنے لگا۔ میں اپنی رائفل کو کاندھے کے ساتھ لگائے جھاڑیوں کو بغور طور پر گھورنے لگا۔ رات چاندنی تھی لیکن درختوں کی بہتات کی وجہ سے جھاڑیوں کے درمیان کچھ بھی دکھائی دینا ممکن نہیں تھا۔ نخاس کا جسم بھی ہولے سے کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ درخت کی نچلی ٹہنیوں کے پاس پہنچنے کے بعد اس نے جھاڑیوں کا جائزہ لیا پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”دکھائی تو کچھ بھی نہیں دے رہا لیکن ہڈیاں بھنبھوڑنے اور ہلکے ہلکے غرانے کی آواز ضرور سنائی دے رہی ہے۔ اب اس کے علاوہ مزید کچھ نہیں کیا جا سکتا کہ ہم دونوں اپنی رائفلوں کا رخ جھاڑیوں کی جانب کر کے فائر داغ دیں۔ شیر ہڑبڑا کر باہر نکلنے کی کوشش کریں گے تب انہیں با آسانی نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔“ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اسے سمجھایا۔

”ہماری بندوقوں میں صرف دو کارتوس فائر کرنے کی اہلیت ہے یعنی میری رائفل اور تمہاری رائفل کی گولیوں کو ملا کر ہمارے پاس صرف چار کارتوس موجود ہیں۔ اگر چار کارتوس درندوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پائے تو جب تک ہم رائفل کو دوبارہ لوڈ کرنے کی کوشش کریں گے تب تک وہ آدھے سے زیادہ جنگل عبور کر چکے ہوں گے۔“

بات نخاس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”پھر بھلا کیا کریں؟“

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم اپنی رائفل سے پہلا فائر کر کے انہیں باہر نکالنے کی کوشش کرو۔ ان کے باہر نکلنے پر ہمارے پاس مزید تین کارتوس باقی بچیں گے۔ اگر ہم نے احتیاط کے ساتھ کام لیا تب انہیں با آسانی زیر کر سکتے ہیں۔“ نخاس نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا اور مجھے چوکنا رہنے کی ہدایت دینے کے بعد رائفل کی نال کا رخ جھاڑیوں کی جانب کر دیا۔ میں نے بھی انگلی رائفل کی لبلبی پر رکھ کر نال کا رخ ہدف کی جانب کر دیا۔ گولی نے رونا بند کر دیا تھا اور اب خالی خالی نگاہوں سے ہماری نقل و حرکت کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ نخاس نے اچانک ہی فائر کر دیا۔ گولی کے دھماکے کی آواز سے جنگل کا ماحول گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں شیر دھاڑتے ہوئے جھاڑیوں کے درمیان سے باہر نکل کر سامنے آ گئے۔ میری نگاہیں جھاڑیوں سے باہر نکلنے والے ان کے متوقع وجودوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں۔ میں نے نشانہ لینے کے ذرا بعد بندوق کی لبلبی کو دبا دیا۔ جنگل کا ماحول دوسرے دھماکے کی آواز سے گونجا۔ پہلا شیر دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ میرے اندازے کے مطابق گولی اس کے سر کی ہڈی کو توڑ کر بھیجے کے آر پار ہو گئی تھی۔ تیسرا فائر نخاس کی جانب سے کیا گیا۔ بدقسمتی سے یہ گولی زمین پر گرے ہوئے تڑپتے ہوئے آدم خور کو لگی۔ دوسرے آدم خور نے فوراً داغی جانے والی گولی کی سمت کا تعین کیا اور املی کے درخت پر چڑھ کر اس نے نخاس کو پاؤں کے پاس سے تھاما اور درخت سے نیچے کھینچ لیا۔ ماحول نخاس کی دردبھری چیخوں سے گونجا۔ زمین پر گرتے ہی آدم خور نے نخاس کے جسم کا محاصرہ کرنے کی کوشش کی۔ سب کچھ سیکنڈ کے ہزارویں حصے سے پہلے رونما پذیر ہوا۔ مجھے کچھ بھی سوچنے کا موقع میسر نہیں آ سکا۔ حواس بحال ہوتے ہی میں نے رائفل کی نال کا رخ شیر کے غصے سے تھرکتے وجود کی جانب کیا اور اس احتیاط کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کہ میری چلائی ہوئی گولی شیر کے نیچے دبے ہوئے شکاری نخاس کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ فائر کر دیا میری رائفل کی آخری گولی تھی اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ضائع نہیں ہونے پائے۔ گولی شیر کی کمر اور سر کے درمیان گلے کے جوڑ پر لگی۔ درندہ ڈھیر ہوتا چلا گیا۔ نخاس کا جسم آدم خور کے تنومند جسم کے نیچے مدفون ہو گیا۔ اس نے مزاحمت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید شدت خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

چند لمحے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے کے بعد میں نے پھرتی سے کمر کے ساتھ بندھی ہوئی پٹی میں سے کارتوس باہر نکالے اور دوبارہ رائفل کو لوڈ کرنے لگا۔ یہ جانتے بوجھتے کہ دونوں آدم خور یقینی طور پر فنا ہو چکے ہیں اس کے باوجود بھی احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ شکاری کی رائفل کسی بھی متوقع خطرے سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہر وقت تیار

رہے۔ دونوں ببر درختوں کے درمیان بے سدھ پڑے تھے۔ میں نے لوڈ رائفل کو مکمل احتیاط کے ساتھ کمر کے ساتھ لٹکایا اور درخت سے نیچے اترنے لگا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی میں نے رائفل کو ہاتھوں میں تھاما اور اس کا رخ دونوں ببروں کے بے سدھ پڑے وجودوں کی جانب کردیا۔ شیشم کے درخت پر سے گوگی کی آواز سنائی دی۔ وہ درخت سے نیچے اترنے کی اجازت طلب کررہا تھا۔ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اسے اپنی جگہ پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی پھر زمین پر پڑے ہوئے پتھر اٹھا کر ببروں کی جانب پھینکے۔ انہوں نے حرکت نہیں کی۔ تب میں نے آگے بڑھ کر ان کے مردہ وجودوں کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ دونوں نر ببر تھے اور چند عرصہ قبل جوانی کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد آدم خوری کی عادت میں مبتلا ہوئے تھے۔ نہایت صحت مند اور قابل رشک کھال کے مالک تھے۔ میں نے کھینچ تان کر ببر کے جسم کے نیچے بے ہوش پڑے خاکسی کے جسم کو باہر نکالا اور ایک جانب ڈھیر کردیا۔ میری توقع کے عین مطابق میری پہلی گولی نے پہلے ببر کی کھوپڑی کو پاش پاش کرکے رکھ دیا تھا جبکہ دوسری گولی نے دوسرے ببر کی گردن کی ہڈی کو چکنا چور کردیا تھا۔ ان باتوں کے باوجود بھی احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ مرے ہوئے ببر کے قریب بھی جانے سے پہلے مکمل اطمینان کرلینا چاہیے کہ اس میں دلی برابر سانس بھی باقی ہے یا نہیں۔ بصورت دیگر حالات توقع کے برخلاف بھی ثابت ہوسکتے تھے۔ ایسا غیر متوقع حادثہ میری شکاری زندگی کے دوران میں پیش آچکا ہے۔ ماحول کچھ ایسا ہی تھا جیسا اس وقت تھا۔ میں رائفل تھامے مچان پر براجمان تھا۔ میرے ہمراہ مچان پر ایک ایسا دیہاتی بھی موجود تھا جس کی ماں کو آدم خور شیر نے ہلاک کیا تھا اور گوشت سے پیٹ بھر جانے کے بعد بقایاجات کو خشک پتوں اور گھاس کے درمیان چھپانے کے بعد قریبی واقع رہائش گاہ میں آرام کرنے کی نیت سے چلا گیا۔ میں نے لاش کے بقایاجات کے قریب درخت پر مچان باندھی اور دیہاتی کی ضد کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے بھی مچان پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ تمام رات انتظار کرتے رہنے کے بعد صبح فجر کے وقت سے کچھ پہلے شیر نے گارے کی جانب رخ کیا۔ تب میں نے اس کی دائیں ٹانگ کے جوڑ سے کچھ پیچھے فائر کرکے اس کا خاتمہ کردیا گولی ٹھیک شیر کے دل میں لگی۔ وہ قلابازی کھا کر گارے کے پاس زمین پر چاروں شانے چت گر گیا۔

کچھ دیر تڑپتے رہنے کے بعد خاموش ہوگیا۔ میں ابھی مچان سے نیچے اترنے کے متعلق سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ میرے ہمراہ مچان پر بیٹھے ہوئے دیہاتی نے اچانک ہی مچان سے نیچے چھلانگ لگادی۔ چشم زدن میں وہ مجھے شیر کی لاش کے قریب دکھائی دیا۔ اس نے نفرت کے عالم میں پہلے شیر کے جسم پر تھوکا پھر اسے ٹھوکر مارنے کی کوشش کی۔ شیر جنگل کا بادشاہ گردانا جاتا ہے وہ اس تذلیل کو برداشت نہیں کرپایا۔ اس میں کچھ جان ابھی باقی تھی۔ دیہاتی کی ٹھوکر لگنے سے پہلے اس نے اپنے آدھے جسم کو اوپر اٹھالیا اور سیدھے ہاتھ کا تھپڑ دیہاتی کے چہرے پر رسید کردیا۔ جنگل کا ماحول ترخ کی آواز سے گونج اٹھا۔ دیہاتی کا جسم کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین پر اپنی ماں کے وجود کی بقایاجات کے قریب گرا اور ساکت ہوگیا۔ شیر کے جسم سے بھی جان نکل گئی۔ میں نے تاسف بھری نگاہوں کے ساتھ ماں، بیٹا اور آدم خور شیر کی لاشوں کی جانب دیکھا تھا۔ شیر جیسے قوی اور طاقت ور جسم کے مالک جانور سے یہ توقع کرلینا کہ ایک یا دو گولیاں اسے زمین سے اٹھنے سے روک سکتی ہیں سراسر بے وقوفی ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ بعض اوقات دو تین گولیاں لگنے کے باوجود بھی اٹھ کر جنگل کی جانب بھاگ سکتا ہے۔ بہرحال پانی پا کے دونوں آدم خور ببر میرے ہاتھوں واقعی فنا ہوچکے تھے۔ شکاری خاکسی کی لاش میں نے اپنی گاڑی میں ڈال کر کمشنر صاحب کے دفتر پہنچائی۔ اسے صرف ایک ہی گولی لگی تھی لیکن اس ایک گولی نے اس کی شہ رگ کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ تمام حالات تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد میں نے کمشنر صاحب کو آخری حالات کے متعلق آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ جب میں نے پانی پا کے ان دونوں ببروں پر بے دریغ فائر کیے تب خاکسی دونوں ببروں میں سے ایک ببر کے نیچے دفن تھا۔ میرا نشانہ اتنا سچا نہیں تھا اس لیے ایک گولی غلطی کے ساتھ خاکسی کو جالگی۔ جس کی بدولت موقع پر ہی اس کی موت واقع ہوگئی میری اس بات کی ضمانت درخت پر موجود گوگی نے بھی دی۔ یوں کمشنر صاحب نے خاکسی کی موت کو اتفاقیہ قرار دیتے ہوئے گوگی کی پھانسی کی سزا کو معاف کردیا۔ میں تحریر کے آغاز میں بتا چکا ہوں کہ میرا نشانہ نہایت سچا ہے۔ اس دن نشانہ کیوں چوکا آپ اس بات کی تہہ تک بخوبی رسائی حاصل کرسکتے ہیں صرف دماغ پر زور دینے کی ضرورت ہے۔

٭٭

در کوئے جاناں

انور فرحان

الفاظ کو دریا کی روانی عطا کرکے اس میں فکروفن گھولتے ہوئے دل میں طوفان اٹھادینے والی شاعری کا خالق خود میں کس قدر بے پروا تھا۔

ایک باکمال شاعر [illegible] بے سروا [illegible] کا تذکرہ

آپ نے اخباروں میں یہ تو اکثر پڑھا ہوگا کہ فلاں سیاستداں کے جلسے کو کامیاب بنانے کے لیے سیکڑوں کی تعداد میں ''کرائے کے لوگ'' گاڑیوں میں لاد کر لائے گئے۔ مگر یہ کبھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی مشاعرے کے لیے پکڑ دھکڑ کر سامعین لائے گئے ہوں۔ اس جہان رنگ و بو میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ پولیس کی مدد سے راہ گیروں کو پکڑ کر مشاعرہ گاہ تک لانے والے انہیں دھمکی دیتے جاتے تھے کہ اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے پکڑ کر تھانے پہنچادیا جائے گا۔ اور یہ پکڑنے اور مشاعرہ گاہ تک لانے والے کوئی اور نہیں۔ دو شاعر تھے۔ ایک منیر نیازی اور ایک محمود اختر کیانی۔ یہ منیر نیازی کی شاعری کا ابتدائی دور تھا اور یہ مشاعرہ 1948ء میں منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں منعقد ہوا تھا۔ محمود اختر کیانی منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر راجہ حسن اختر کے صاحبزادے تھے جو شاعر بھی تھے۔

یہ قیام پاکستان کا ابتدائی زمانہ تھا اور منٹگمری میں ان دنوں انعقاد پذیر ہونے والا ایک بڑا اور اہم مشاعرہ تھا۔ جس میں لاہور کے مہمان شاعر ساحر لدھیانوی، قتیل شفائی، احمد راہی اور عبدالحمید عارف کے علاوہ بھارت سے آئے ہوئے علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی بھی موجود تھے۔ مگر انہیں سننے والے سامعین کا یہ عالم تھا کہ تک تک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ تعداد تو ان کی خاصی تھی مگر وہاں موجود لوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ شاعروں کے شعروں پر داد بیداد کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اور آپ سوچ سکتے ہیں کہ ''واہ واہ.....'' اور ''مکرر ارشاد'' یا برجستہ جملے بازی کے بغیر مشاعروں کا مزہ بھلا کیسے دوبالا ہوسکتا ہے۔ مشاعرے کے منتظمین کے لیے یہ صورت حال بہت تشویشناک تھی۔ اس مشاعرے کو سننے کے لیے حقیقتاً چند درجن افراد ہی پہنچے تھے۔ منٹگمری میں ان دنوں فرید کوٹ کے بلوچ خاندان فیروز پور اور دوسرے کے لٹے پٹے مہاجرین اکثریت میں تھے مگر یہ لوگ اپنی پریشانیوں اور روزی روٹی کے چکر میں تھے۔ شعروشاعری کے بارے میں سوچنے کی کس کو فرصت تھی۔ مقامی مسلمان آبادی برائے نام تھی اس لیے مشاعرہ سننے کے لیے زیادہ لوگ نہیں آئے تھے۔ منیر نیازی اور محمود اختر کیانی نے جن کو مشاعرے کی ذمہ داری سونپی تھی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہی ترکیب نکالی کہ پولیس کی مدد سے راہ گیروں کو پکڑ کر زبردستی مشاعرہ گاہ تک لاکر سامعین کی تعداد بڑھائی جائے۔ وہ آئے تو آگئے مگر مشاعرے کے اصل سامعین کا کردار ادا نہیں کرسکے۔

اس مشاعرے کے انعقاد کی وجہ یہ تھی کہ اپریل 1948ء میں اخبار میں یہ خبر چھپی تھی کہ یوم اقبال کے مشاعرے کے لیے علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی بھارت سے لاہور آرہے ہیں۔ لہٰذا منٹگمری میں مقیم حمید اختر، مجید امجد، منیر نیازی، محمود اختر کیانی ایک ذمہ دار

شاعر حاجی اکرم فخر اور دیگر ادبی شخصیتوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس موقع پر شکرگڑھ میں بھی ایک مشاعرہ کرایا جائے۔ اس مقصد کے لیے حمید اختر کو لاہور روانہ کیا گیا کہ وہ لاہوری شعراء کے علاوہ بھارتی شاعروں کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں۔ مہمان شعرا بھی آگئے، مشاعرہ بھی ہو گیا مگر منتظمین کو اس بات کا تلخ تجربہ بھی ہو گیا کہ کسی کامیاب مشاعرے کے لیے بڑے اور اچھے شاعروں کی موجودگی ہی ضروری نہیں ہوتی، باشعور اور ادب نواز سامعین کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بعد میں جب مقامی شاعروں کی چنڈال چوکڑی بنی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ سامعین کی تعداد بڑھانے کے لیے پولیس کے ذریعہ گرفتار کر کے لانے کا آئیڈیا کس کا تھا تو معلوم ہوا منیر نیازی کا۔

منیر نیازی ایسا ہی انسان تھا، چونکا دینے والے شعر ہی نہیں کہتا تھا، چونکا دینے والی حرکتیں بھی کرتا تھا۔ ایک بار وہ ادیب وصحافی حمید اختر کو لاہور کے ایک انتہائی مہنگے ویسٹو وان لوونگ، میں چائے پلانے لے گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عام ہوٹلوں میں چائے کی پیالی دو آنے کی ملتی تھی جبکہ لوونگ، میں چائے کے بارہ آنے لیے جاتے تھے۔ وہاں چائے پینے اور پیسٹری کھانے کے بعد سوا تین روپے کا بل بنا۔ بیرا بل لے کر آیا تو منیر نیازی نے پانچ روپے کا نوٹ دیا۔ بیرا پونے دو روپے واپس لایا۔ منیر نیازی نے ایک ادا کے ساتھ سر کے اشارے سے یہ ساری رقم بطور ٹپ لے جانے کا اشارہ کیا جبکہ اس دور میں دو چار آنے ٹپ دیے جاتے تھے۔ حمید اختر کو اس کی اس سخاوت پر تعجب ہوا اور وہ اس کی وجہ پوچھنے ہی والے تھے کہ واپس جاتے ہوئے بیرے کو اس نے آواز دے کر بلایا اور وہ قریب آیا تو اس کی پلیٹ سے ساری ریزگاری اٹھالی۔ اور بولا۔ ”جاؤ۔“

حیران پریشان بیرا چلا گیا تو حمید اختر نے کہا۔ ”تم نے یہ کیا حرکت کی؟“

”ایسے آدمی کے لیے ایسی ہی حرکت کرنی چاہیے تھی۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں نے اس کو اتنی بڑی بخشش دی اس کے باوجود اس نے مجھے سلام نہیں کیا۔ اس کے بعد کیا وہ اس ٹپ کا مستحق ہو سکتا ہے؟“

ایک دن آج کے مقبول کالم نگار اور ماہ مقبول جان کی

اچھرہ کے پاس منیر نیازی سے ملاقات ہوگئی۔ یہ 1976ء کا زمانہ تھا اور اس وقت وہ ایک طالب علم تھے جبکہ منیر نیازی شاعری میں اپنی شناخت پیدا کر چکا تھا۔

''چلو میرے ساتھ'' علیک سلیک کے بعد منیر نے اوربا سے کہا۔ اور دونوں پیدل چلتے ہوئے انارکلی تک گئے۔ راستے میں ایک جگہ اوربا نے کہا۔

''فیض صاحب نے گزشتہ دنوں آپ کی شاعری کی بہت تعریف کی ہے۔''

منیر نیازی ایک دم رک گیا اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اوربا کو دیکھ کر بولا۔ ''یہ فیض جیسے لوگ میرا ذکر کر کے اپنا قد بلند کرتے ہیں مگر میں کیا کروں میں تو اتنا کوتاہ قامت ہوں کہ مجھے بڑے لوگوں کے ذکر کے سہارے کی بہت ضرورت ہے۔''

منیر نیازی محض اچھا شاعر ہی نہیں تھا۔ ایک اچھا انسان بھی تھا۔ قدرت نے اسے ایک قبول صورت ہی نہیں دی تھی، اسے ایک خوش گفتار اور خوشگوار طبیعت کا مالک بھی بنایا تھا۔ مگر اس کی حرکتیں کبھی کبھی بڑی غیر متوقع ہوتی تھیں جس پر اس کے سنگی ساتھی ان سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

ایک بار منیر نیازی نے اپنے چند دوستوں کو اپنے فیروز پور روڈ والے گھر میں مدعو کیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب لاہور میں نئی نئی امرتسر ٹی وی کی نشریات آنی شروع ہوئی تھیں اور لوگ بڑے بڑے انٹینا لگا کر یہ بلیک اینڈ وائٹ نشریات دیکھا کرتے تھے۔ منیر نیازی نے اپنے دوستوں کی خاطر مدارات کے لیے خود اپنے ہاتھ سے ٹن میں چھڑکاؤ کیا اور میز پر ٹی وی سجایا جبکہ سارے دوست اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ منیر نے خود اپنے ہاتھ سے مشروب بنا کر سب کو دیے۔ دوستوں نے اس خاطر مدارات کی وجہ دریافت کی تو منیر نیازی اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔ ''وہ بات دراصل یہ ہے یارو۔'' وہ بولا۔ ''آج امرتسر ٹی وی پر امرتا پریتم ایک پروگرام پیش کرے گی۔'' اتنا کہہ کر وہ رکا۔ پھر بڑے مخمور انداز میں گویا ہوا۔ ''کتنی خوبصورت عورت ہے یہ امرتا پریتم بھی۔''

ذرا دیر بعد پروگرام شروع ہوگیا۔ یہ پروگرام پاکستان کے پنجابی شاعروں پر تھا۔ منیر نیازی نے بڑے انہماک سے ٹی وی دیکھنا شروع کر دیا۔ منیر کو خیال تھا کہ اس کے ذکر سے بات شروع ہوگی مگر امرتا پریتم نے کسی نا غیر معروف شاعر سے بات شروع کی، اس پر منیر بولے۔ ''غالباً یہاں بھی مشاعرے والا پروٹوکول چلتا ہے۔ میرا ذکر شاید آخر میں ہوگا۔''

آدھا گھنٹا پروگرام چلتا رہا مگر منیر نیازی کا ذکر نہ آیا۔ اس کی نگاہیں حیرت اور بے یقینی کے عالم میں اسکرین پر گڑی رہیں۔ آخر میں جب امرتا پریتم اس کا ذکر کیے بغیر رب راکھا کہہ کر رخصت ہو گئیں تو منیر نیازی نے ٹی وی سے نگاہیں ہٹا کر بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''کتنی بدصورت عورت ہے یہ امرتا پریتم بھی۔''

جس طرح وہ اپنی شاعری میں انفرادیت قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا اسی طرح اپنی شخصیت میں بھی خود پسندی اور خود نمائی کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ خود بھی بہت خوبرو اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا اور اسے ہمیشہ مزید قابل توجہ بنانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی خوش پوشی قابل ذکر ہے۔ بے کاری اور بے روزگاری کے دنوں میں بھی وہ صاف ستھرے کپڑے زیب تن کرتا تھا اور اچھی خوشبو استعمال کرتا تھا۔ آخری برسوں میں اس نے سفید کپڑے پہننا شروع کر دیے تھے۔ اس طرح بھی اس کی شخصیت میں بڑا کریس پیدا ہو گیا تھا۔

اپنی شاعری کی دلکشی کی طرح اپنی گفتگو میں بھی وہ اچھے اور خوبصورت جملے بول کر لوگوں سے واہ کا طلب گار ہوتا تھا۔ شاہ امرتسری اور اے حمید اس سے کہتے تھے۔

''تم گھر سے فقرے سوچ کر آتے ہو اور دوستوں میں استعمال کرتے ہو۔''

اس کے ایسے جملوں میں کچھ بہت مقبول بھی ہوئے۔ جیسے ''بعض سر صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ ان پر ٹوپی پہنی جائے اور ایسا ہی سر احسان دانش کا بھی ہے۔''

بذلہ سنجی اور برجستہ گوئی میں بھی اس کو ایک کمال حاصل تھا۔ ایک بار کوئٹہ ایئرپورٹ کے لاؤنج میں قتیل شفائی کے ساتھ ہمکلام تھا کہ باتوں کی دوران ہی اچانک پوچھ بیٹھا۔ ''یار قتیل! یہ جا بجا تم نے بھی تمہارے گانے پکچرائز کروائے ہیں؟''

قتیل شفائی کے چہرے پر ایک رنگ آ گیا اور انہوں نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔ ''ہاں...... اس پر تو سارے گانے ہی میرے پکچرائز ہوتے ہیں۔''

منیر نیازی پہلے مسکرایا، پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''اچھا تو یہ وجہ ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کے منہ پر

دانے کیوں نکل رہے ہیں۔"

منیر نیازی مدتوں بہت خوش مزاج رہا۔ فقرے بازی سے بھرپور اچھی گفتگو کرتا رہا بالکل اپنی شاعری کی طرح مگر پچھلی تقریباً دو دہائیوں سے وہ آرام پسند، بیزار اور کم آمیز ہو گیا تھا۔ ناپسندیدہ شخصیت سے مل کر اس کی تیوری چڑھ جاتی تھی۔

منیر نیازی کا خاندان خاصا خوش حال تھا۔ اس کے اکثر عزیز ٹرانسپورٹ کی تجارت سے وابستہ تھے۔ خود اس کے نام منٹگمری میں آٹا پیسنے کی ایک چھوٹی سی چکی الاٹ ہوئی تھی۔ جو اس کے دوستوں کا اڈہ بن گئی تھی۔ وہاں کام کم ہوتا تھا ادب اور سیاست پر گفتگو زیادہ ہوتی تھی۔ اس نے "سات رنگ" کے نام سے ایک ادبی پرچہ بھی نکالا تھا جو اچھے خاصے پیسوں کی بربادی کے بعد بند ہو گیا۔ منٹگمری سے لاہور آنے کے بعد اس نے فری لانسنگ بھی شروع کر دی تھی۔ اور وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات وجرائد کے لیے کالم نگاری کی۔ اس سلسلے میں روزنامہ اخباروں میں زمیندار، آزاد، ہفت روزہ اور ماہناموں میں اظہر جاوید کا ہفت روزہ ضرب مجاہد، ماہناموں میں سرور سکھیرا کا "دھنک" اور شباب کیرانوی کا "ڈائریکٹر" قابل ذکر ہیں۔ شباب کیرانوی منیر نیازی کو ایک مضمون کا معاوضہ تیس روپے دیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد اسے معلوم ہوا کہ شباب صاحب عبدالقادر حسن کو ایک مضمون کا معاوضہ پچیس روپے دیتے ہیں۔ ایک دن اس نے عبدالقادر حسن کو پکڑ لیا اور اس بات پر الجھ گیا کہ شباب صاحب تمہیں کیوں پچیس روپے دیتے ہیں جبکہ مجھے تیس دیتے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب عبدالقادر حسن آج جیسے نامور کالم نگار نہیں تھے۔ ان کا بھی یہ ابتدائی دور تھا۔ انہوں نے منیر نیازی کو سمجھایا۔ "بھائی! یقین جانیں اس میں میرا کوئی قصور نہیں، اس بات پر آپ کو شباب صاحب سے احتجاج کرنا چاہیے۔"

یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے بڑی خوش دلی سے عبدالقادر حسن سے ہاتھ ملا کر دوستی کر لی۔ عبدالقادر نے اپنی اس دوستی کو پکی کرنے کے لیے اپنے اوپر کے پانچ روپے سے فی الفور منیر نیازی کو چائے پلا دی۔ بعد میں کچھ دنوں کے لیے شباب کیرانوی نے منیر نیازی کو "ڈائریکٹر" کی ادارت کی ذمے داری بھی سونپ دی تھی۔

"ڈائریکٹر" کی ایڈیٹری کے دوران میں اس نے بڑی محنت اور لگن سے کام کر کے اسے ایک اچھا اور خوبصورت پرچہ بنا دیا۔

"زمیندار" اخبار کے لیے کالم لکھنے کے زمانے میں وہ اپنے شاعر ساتھی منظور قریشی کے ہمراہ "زمیندار" کے دفتر سے نکل کر میکلوڈ روڈ پر آنے کی بجائے گلیوں سے واپس آتا۔ منظور قریشی کو اس کی یہ تک سمجھ میں نہیں آئی تو چند دنوں بعد اس سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی۔

"دیکھو قریشی!" منیر نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں کہا۔ "جب ہم گلیوں سے گزرتے ہیں تو جھروکوں، بالکونیوں سے خوبصورت چہرے ہمیں بالوں کو دیکھتے ہیں تو کتنا اچھا لگتا ہے۔"

قریشی کو اس کی یہ بات شاید اچھی نہیں لگی اور اس نے چند دنوں کے بعد گلیوں کی طرف سے جانے سے انکار کر دیا تو منیر نیازی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یار قریشی، بات دراصل یہ ہے کہ میں سڑک کی طرف سے اس لیے نہیں جاتا کہ میں نے اس طرف سگریٹ اور پان کے کھوکھے والے کا ادھار دینا ہے۔"

اس میں ریاکاری یا بدنیتی کا عنصر نہیں تھا وہ ایسی باتیں بڑی معصومیت کے ساتھ کہہ جاتا تھا۔ مثلاً ایک بار اس نے داتا دربار میں جا کر دعا مانگی۔ "یا اللہ! تو اپنے فضل سے میرے اور سید علی ہجویری کے گناہ معاف فرما دے۔"

19 اپریل 1928 کو ضلع ہوشیار پور پنجاب، کے ایک گاؤں میں پیدا ہونے والے منیر نیازی نے میٹرک ضلع منٹگمری سے کیا جس کے بعد دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد جنگ عظیم کے دوران کی ہندوستانی بحریہ میں بھرتی ہو گیا۔ لیکن جلد ہی ملازمت چھوڑ دی۔

بچپن کے دنوں میں وہ اپنے گھرانے کا ایک بگڑا ہوا بچہ تھا جس کی شکایتیں لے لے کر لوگ دروازے آتے تھے۔ گھر کے کچھ افراد بڑی سنجیدگی سے سوچتے تھے۔ اگر منیر نہ رہے تو کئی مصیبتوں سے ایک ہی بار نجات مل جائے۔

تقسیم کے بعد جب منیر نیازی نے منٹگمری سے ایک ہفت روزہ "سات رنگ" نکالا تو سب نے سر پیٹ لیا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ منیر پرچہ نکال رہا ہے اور دونوں ہاتھوں سے بزرگوں کے خون پسینے سے کمایا ہوا روپیہ برباد کر رہا ہے۔ گھر والوں نے خاموشی کا حربہ اختیار کر کے

اس سے قطع تعلق کر لیا۔ لوگ بہت تھے اور وہ اکیلا۔ اس سے یہ بازی جیتی نہ جا سکی اس نے ایک چپ، ایک مستقل خاموشی اور الگ تھلگ پڑے رہنے کے بعد یہ بازی گرد ہی رکھ دی۔

ایک دن خبر ملی کہ منیر شاعر بن گیا ہے۔ شاعروں اور ادبی مجلسوں کی دھواں دھار فضا کے درمیان ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ کسی کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ منیر اور شاعری۔!! مگر اس نے شاعری کی اور ایسی کی کہ اس کے مخالفین بھی اسے تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس کی شاعری ہی نہیں، اس کی شخصیت بھی طلسمی سی اور پُراسرار تھی۔ زکیبیت میں جتنا لوگ پُرکشش نہیں رہتے لیکن منیر نیازی کی زکیبیت بھی اس کی طرح منفرد تھی جس نے اس کی کشش میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ شاعری کے ابتدائی دور ہی سے اس کی مضطرب اور بے قرار روح کچھ کرنے کے لیے بے چین رہتی تھی۔ اس بے چینی اور اضطراب کا وہ عمر بھر شکار رہا اور اسی کیفیت نے اس کے فن کو جلا بخشی۔ اس کی یہی بے قراری اسے فلم انڈسٹری تک لے گئی۔

اگرچہ یہ وقت اس کی شاعری کے عروج کا وقت تھا۔ اس کی پہلی فلم ''نئی لڑکی'' تھی۔ یہ فلم زیادہ چل نہ سکی۔ فلموں کی ایک پرانی ریت ہے کہ اگر کسی کی پہلی فلم فلاپ ہو گئی تو وہ بھی فلاپ ہو جاتا ہے پھر اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ مگر ریاض شاہد نے اپنی فلم ''سسرال'' بنائی تو اس نے اس سے گیت لکھوائے، مصلح الدین اس فلم کے موسیقار تھے۔ اس فلم کا ایک گانا

جس نے میرے دل کو درد دیا۔
اس شکل کو میں نے بھلایا نہیں۔

یہ گانا بہت مقبول ہوا۔ اگرچہ اس گانے کی کمپوزیشن کے وقت کچھ لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ ''شکل میوزک کا لفظ نہیں۔''

مگر مصلح الدین نے کہا۔ ''دیکھنا اس کی پوری شکل ابھرے گی۔'' اور ایسا ہی ہوا۔

ریاض شاہد اور خلیل قیصر نے فلم ''شہید'' بنائی تو اس میں منیر نیازی کی غزل۔

''اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو۔''

شامل کی۔ جو اس فلم کی ہائی لائٹ ثابت ہوئی اور آج تک اس کا شمار مقبول گیتوں میں ہوتا ہے۔ یہ فلم جب منٹگمری (جو اس وقت تک ساہیوال بن چکا تھا) کے سینما گھروں میں ریلیز ہوئی تو اس کے بورڈوں پر لکھا ہوا تھا۔ ''منٹگمری والے منیر نیازی کی شاعری سے مزین فلم شہید۔''

جمشید نقوی کی ایک فلم میں بھی منیر نیازی کی یہ غزل بہت مشہور ہوئی۔

''زندہ رہیں تو کیا جو مر جائیں ہم تو کیا۔''

جن دنوں منیر نیازی نگار خانوں میں جانے آنے لگا تھا۔ انہی دنوں کی بات ہے، یوسف خان نئے نئے فلموں میں آنا شروع ہوئے تھے۔ فلمسازوں اور ہدایت کاروں نے منیر نیازی کو دیکھا تو اس کی خوبصورتی اور پُرکشش شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور چاہا کہ اسے بھی یوسف خان کی طرح ہیرو کے طور پر فلموں میں پیش کرنا چاہیے۔ اور پھر کئی فلم والوں نے اس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا مگر اداکاری کا شعبہ اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ فلمی حلقوں میں اس کی زیادہ دوستی ریاض شاہد، آغا طالش، منور نقوی اور اظہر برکی سے تھی۔ کچھ فلم والوں نے ان کے ذریعے بھی اسے اداکاری پر اکسایا مگر اس نے اپنی ناں کو ہاں میں نہیں بدلا۔ کچھ ایسا ہی رویہ اس نے بعد کے دنوں میں کالم نگاری کے ساتھ بھی کیا۔ اس کے دوستوں کے اصرار کے باوجود اس نے اخباروں میں کالم نگاری جاری نہیں رکھی۔

منیر نیازی کی طلوں مزاجی اس کو کسی ایک جگہ، ایک حال میں نہیں رہنے دیتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد چار پانچ برس تک وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہا، اس کا سرگرم کارکن رہا مگر بعد میں اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے لاتعلق ہو گیا۔ اس کی شاعری میں اکثر اس کی شخصیت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں، اس کی ایک خوبصورت نظم کا عنوان ہے مگر وہ واقعی لیٹ لطیف تھا۔ اکثر دیر سے کام کرنے کا عادی تھا۔ مگر اس نے دوسری شادی کرنے میں بہت جلدی کی۔ ہاں اس نے دو شادیاں کی تھیں مگر اولاد کسی سے نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود اس نے بیویوں کو اس کا طعنہ کبھی نہیں دیا۔

وہ مشاعروں کا شاعر نہیں تھا۔ مجمع دیکھ کر گھبرا جاتا تھا۔ اور گھبراہٹ میں سنانے والی نظم یا غزل بھول جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میری شاعری سننے کی نہیں پڑھنے کی چیز ہے۔ اور وہ اپنے پیچھے پڑھنے والوں کے لیے بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ گیا ہے۔

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

علی سفیان آفاقی

قسط نمبر: 232

ایسے نادرِ روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرمِ عمل ہوں اور اپنے روزِ اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہنِ رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابلِ ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع ملا۔ دید و شنید اور مسلسل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابلِ رشک ہے۔ آیئے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان، داستاں سرگزشت

مولانا ظفر علی خان شعلہ بیاں مقرر، کہنہ مشق صحافی، زود گو شاعر اور پُرجوش انقلابی تھے۔ تحریر ہو یا تقریر انہیں زبان و کلام پر عبور حاصل تھا۔ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو ساری رات گزر جاتی اور سامعین میں سے کوئی ایک بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتا۔ اس زمانے میں جلسے موچی دروازے میں ہوا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ موچی دروازے کے جلسے میں تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو یہ الفاظ ضرور کہا کرتے تھے۔

"ہندوستان عالم اسلام کا دل ہے۔ پنجاب ہندوستان کا دل ہے۔ لاہور پنجاب کا دل ہے۔ موچی دروازہ لاہور کا دل ہے۔ آج میں عالم اسلام کے دل میں کھڑا ہو کر تقریر کر رہا ہوں۔"

موچی دروازے کو اس لحاظ سے لاہور کا دل کہا جا سکتا ہے کہ لاہور کی تہذیبی روایات، رواداری، وضع داری، موچی دروازے میں عروج پر نظر آتی تھیں۔ یہاں کی پیچ دار گلیاں ایک معمے کی طرح پیچیلی نظر آتی تھیں۔ انجان لوگ اگر کسی پتلی نیم تاریک گلی میں داخل ہو جاتے تو گھنٹوں بھٹکتے رہتے لیکن اس بھول بھلیاں سے باہر نکلنے کا راستہ نہ ملتا۔

موچی دروازے کا جادو آج بھی اسی طرح سر چڑھ کر بولتا ہے۔ حالانکہ حکومت نے اس مذہبی اور قیمتی تاریخی ورثے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ مکان گرنے لگے ہیں۔ گلیاں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔ صفائی کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ خدا جانے ہمارے قومی ورثے اور محکمۂ اوقاف کے لوگ کس بات کی تنخواہیں لیتے ہیں اور اتنا بڑا بجٹ کہاں خرچ کرتے ہیں۔ لاہور کے پرانے لوگ جب موچی دروازے کی گلیوں سے گزرتے ہیں تو ہزاروں رنگین اور دلکش یادیں ذہن و دل میں تازہ ہو جاتی ہیں۔ یہاں ایسے دولت مند خاندان بھی ہیں جو گلبرگ یا ڈیفنس میں شاندار محل بنا سکتے ہیں لیکن موچی دروازے کی یادیں ان سے چمٹی ہوئی ہیں کیوں کہ یہاں کا ماحول ہی اور ہے جو انہیں کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتا۔

گلیوں میں حویلیوں کے گھروں میں گل فروشوں کی مہکتی ہوئی دکانوں سے ساری گلی معطر رہتی تھی۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ ہر روز وہ تازہ مہکتے ہوئے پھول ہی لا کر فروخت کرتے۔ موسم کا ہر پھول، ہار اور گجرا ان کی دکانوں پر دستیاب تھا۔ انہی میں ایک دکان ماجے پہلوان کی تھی ان بزرگ کی اپنی شخصیت بہت بارعب اور انوکھی تھی۔ دبلا پتلا جسم، بوسکی کی قمیص، لٹھے کی شلوار، بے داغ پگڑی۔ جسم تو دبلا پتلا تھا مگر چہرے پر رعب کا ما پہلوان جیسا تھا۔ چہرہ بڑھاپے میں بھی سرخ و سفید، موٹی موٹی بارعب مونچھیں۔ وہ اپنے ہاتھ سے بڑی نفاست اور نزاکت سے مختلف پھولوں کو علیحدہ کر کے گلدستہ بنا کر اسے دھاگے میں لپیٹ کر دیا کرتے تھے۔ یہ کام وہ ایسے کرتے تھے جیسے بڑے پیار سے کوئی دلہن کو سجاتا ہے۔ پھر وہ ہر پھول کی خصوصیت اور خوبی بھی بیان کر دیا کرتے تھے۔ زندگی بھر وہ اپنی یہ وضع نبھاتے رہے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے نے گدی سنبھالی تو وہ بھی من و عن باپ

مولانا ظفر علی خان

ہی کے انداز میں کام کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کی دکان پر پھول خریدنے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں اپنے باپ کی روایت کو نبھا رہا ہوں جو کہ میرا فرض ہے۔

ان کی دکان کے ساتھ ایک نان بائی کی دکان تھی جس کا نام عمر تھا۔ دکان میں انہوں نے اپنی اور اپنے گھوڑے کی تصویر لگا رکھی تھی۔ ان کے نان سارے لاہور میں مشہور تھے۔ انتہائی خستہ، نرم اور خوش مزہ۔ ان کی دکان سے ایک درجن نان ہوا کر کپڑے یا کاغذ میں لپیٹ کر لے جائیں۔ گھر جا کر نکالیں تو بالکل تر و تازہ جیسے ابھی تندور سے نکالے گئے ہیں۔ یہ فن ان کے سوا کسی اور نان بائی کے پاس نہ تھا۔

نوجوان نسل پرانے شہر سے نئی آبادیوں میں منتقل ہو رہی ہے لیکن پرانے وضع دار لوگ کسی قیمت پر بھی پرانا شہر چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ اگر مجبوراً اولاد کے اصرار پر نئی آبادیوں میں جاتے بھی ہیں تو پرانا لاہور، روایات اور وضع داریوں کی یادیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ جسمانی طور پر وہ کہیں بھی رہیں ذہنی طور پر وہ پرانے گلی کوچوں میں بسے رہتے ہیں کیونکہ نئے علاقوں میں نہ وہاں کوئی پرانا ملاقاتی، نہ ہم مذاق اور ہم عمر۔ پتھر کی طرح پڑے رہتے ہیں اور بہت جلد دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ انہیں وہ پرانے شہر کی بیٹھکیں اور محفلیں یاد آتی رہتی ہیں جن سے کوشش کے باوجود وہ باہر نہیں نکل سکتے۔ خوش حال اولاد کے والدین کبھی کبھی کاروں میں بیٹھ کر موچی دروازے جاتے ہیں تو پرانے شناساؤں

سے مل کر تازہ دم اور نوجوان ہو جاتے ہیں۔ پرانے لاہور کے علاقے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ موچی گیٹ، لوہاری گیٹ، دلی دروازہ، شاہ عالمی، کوچا فقیر خانہ، گھنٹوں پرانے دوستوں کے ساتھ مل کر پرانی داستانیں دہراتے ہیں۔ اس روز ان کی عید ہو جاتی ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو اولاد کے ساتھ ڈیفنس منتقل ہو گئے مگر صبح سویرے ناشتے کے بعد بس میں بیٹھ کر پرانے شہر کے چکر ضرور لگاتے ہیں۔ ایک بزرگ کا دستور تھا کہ صبح سویرے بس میں سوار ہو کر پرانے شہر کے محلے، نہاری اور سری پائے خرید کر لے آتے ہیں یا پھر وہیں بیٹھ کر دوستوں کے ساتھ دعوت شیراز اڑاتے ہیں۔

کئی معذور بزرگ جب پرانے محلے چھوڑ کر گئے تو وہیل چیئر پر بیٹھ کر آئے اور پرانے دوستوں سے مل کر بہت روئے۔

ہائے رے انسان کی مجبوریاں

حلوا پوری بھی پرانے شہر کی سوغات ہے۔

سعادت حسن منٹو

ایک بزرگ نے جب جوہر ٹاؤن میں بسیرا کیا تو ان کا یہ دستور تھا کہ صبح سویرے برآمدے میں بیٹھ جاتے اور روٹی کے ٹکڑے پرندوں میں تقسیم کرتے۔ سارا دن ان کی یہی مصروفیت تھی۔ چڑیاں بھی ان سے اتنی ہی مانوس تھیں کہ ان کے کندھوں، گھٹنوں پر آ کر بیٹھ جاتی تھیں اور صبح ہوتے ہی ان کا انتظار کرتی تھیں۔ ایک بار وہ پرانے محلے میں گئے تو سب سے پہلے پوچھا کہ کیا چڑیاں اب بھی ہر روز یہاں آ جاتی ہیں۔ مالک نے کہا کہ جناب والا جب کوئی دانا ڈالنے والا ہی نہ ہو گا تو چڑیاں کیوں آئیں گی۔ اب انہوں نے یہاں آنا چھوڑ دیا۔ یہ سن کر وہ بزرگ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ اس کے بعد نئے مالک کی اجازت سے انہوں نے روٹی کے ٹکڑے بنا کر صحن میں ڈالنے شروع کر دیے۔ پہلے ایک چڑیا آئی اور چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہاں چڑیوں کا ہجوم ہو گیا۔ شاید وہ سمجھ گئی تھیں کہ ان کے پرانے حاجی صاحب واپس لوٹ آئے ہیں۔ اس دن کے بعد ان کا یہ معمول ہو گیا کہ ہر صبح بس میں بیٹھ کر جوہر ٹاؤن سے پرانے شہر جاتے جہاں سینکڑوں چڑیاں ان کی منتظر ہوتی تھیں۔ اب وہاں صحن میں چڑیاں سارے دن چوں چوں کرتی ہوئی ان کے اردگرد جمع ہو جاتی ہیں۔ اس گھر میں پھر سے رونق ہو گئی ہے۔ نئے مالک مکان بھی ان کے اس معمول سے بہت خوش ہیں اور چڑیوں کی خوشی کا تو کچھ ٹھکانا ہے۔

☆☆☆

عام لوگ پوچھتے ہیں کہ اردو میں ہر صنف نے ترقی کی اور مقبولیت بھی حاصل کی لیکن اردو میں ناول اتنا پیچھے کیوں رہا؟ دراصل ناول، افسانہ اور کہانی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ روسی، انگریزی، فرنچ مصنفین اتنے موٹے موٹے ناول لکھتے تھے اور ان میں تفصیل اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ اردو پڑھا لکھا شخص ان کو دیکھ کر ہی احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا۔ ناول پڑھتے ہوئے کئی صفحات کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے تو تفصیل میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

پاکستانی فلموں کے حوالے سے ہر طرف مارتی ہے۔ پھر بھی رہ رہ کر چنگاریاں ابھرتی ہیں۔ 2006ء میں ایک پنجابی فلم ''مجاجن'' نے عوام کے ہر حلقے میں پسندیدگی کی سند حاصل کی تھی جب کہ اپنی سپر ہٹ کامیابی کی وجہ سے فلم ساز کے لیے بڑے منافع کا سبب بھی بنی تھی۔ اس سال کے اختتامی ایام میں ایک دوسری اردو فلم ''واپسی'' کی نمائش ہوئی تھی جس نے کامیابی کے لحاظ سے کوئی ریکارڈ تو قائم نہیں کیا تھا کیوں کہ اس کی حیثیت ایک آرٹ فلم کی تھی اور یہ اپنی متعدد خوبیوں کی وجہ سے پڑھے لکھے طبقے کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی واسے نہ صرف یہ نار مولا ٹریٹمنٹ سے ہٹ کر ایک آرٹ فلم کی حیثیت سے بنایا گیا تھا بلکہ سنجیدہ مزاج کے شائقین فلم کے لیے ایک معیاری اور خوب صورت فلم بنانے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ اس فلم کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ عالمی ادب کے ایک شہرہ آفاق ناول پر مبنی کہانی پر بنائی گئی تھی۔ یہ کہانی فرانس کے الیگزینڈر ڈوماس کا معروف ناول ''کاؤنٹ آف مونٹی کرسٹو'' سے ماخوذ تھی۔ فرانسیسی زبان کے اس ناول کی عالمگیریت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کر کے اسے انگریزی ادب کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ فرانس میں یہ ناول 1846ء میں چھپا تھا۔ اس پر پہلی خاموش فلم 1908ء میں بنی۔ دوسری خاموش فلم 1913ء میں بنی جب کہ اس ناول پر اولین بولتی فلم 1934ء میں تیار ہوئی۔ پچھلی ایک صدی کے دوران صرف انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں اس ناول پر 30 سے زیادہ فلمیں بن چکی ہیں۔ جب کہ مصر اور بھارت میں بھی اس پر فلمیں بنائی گئی ہیں۔ پاکستان میں ندیم نے بھی اس کہانی کے مرکزی خیال پر ایک فلم بنائی تھی۔ پاکستانی فلمی صنعت میں جہاں آج کل غنڈوں، بدمعاشوں اور برادری ازم پر گھسی پٹی فارمولا فلمیں بنائی جاری ہیں۔ وہاں کسی ایسے شہرہ آفاق ناول کو مرکزی خیال بنا کر فلم بنانا کیا حیرت انگیز بات نہیں؟ اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس فلم کا تخلیق کار ایک غیر پاکستانی ہے۔ جس کی مادری زبان بھی اردو نہیں۔ پانچ کروڑ کی لاگت سے ''واپسی'' کے نام سے قومی زبان کی فلم بنانے والے مجید احمد عبدالرزاق دبئی کے ایک کاروباری شخص ہیں جو اس فلم کے فلمساز بھی ہیں۔ کہانی نویس بھی اور ہیرو بھی ہیں اور انہیں پاکستان میں فلمسازی کے شعبے میں سرمایہ کاری کرنے والے غیر ملکی سرمایہ کار بننے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ مجید احمد عبدالرزاق نے دبئی میں فرنیچر کے وسیع کاروبار سے وابستہ ہیں انہیں اس ناول پر فلم بنانے کا کیوں اور کیسے خیال آیا اور اس فلم کو اردو زبان میں اور پاکستان میں بنانے کا کیا سبب ہے؟ دلچسپ اور قابل ذکر بات ہے۔ موصوف کامرس اور بزنس میں ڈپلومہ ہولڈر ہیں۔ عرب امارات میں ان کے فرنیچر کے کوئی سات آٹھ شوروم ہیں۔ پھر ایسے کسی شخص کو اس ناول پر فلم بنانے کا خیال کیوں آیا اور پھر انہوں نے اسے پاکستانی فلم بنانے کو کیوں اعزاز بخشا؟ بات دراصل یہ تھی کہ زمانہ طالب علمی سے مجید احمد عبدالرزاق کو تیماداری کے ساتھ ساتھ ناول پڑھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اسی شوق کی تکمیل کے دوران یہ ناول ان کے ہاتھ لگا جس کے کردار، پلاٹ، مکالمے اور خاص طور پر ناول کے ہیرو EDMOND

دوسری اہم چیز مقبولیت اور شہرت تھی۔ اردو کے کتنے ناول دوسری زبانوں میں ترجمہ کیے گئے اور انہوں نے شہرت بھی پائی کیونکہ لوگوں کو پڑھنے کا شوق تھا۔ اس لیے کتابوں کی خریداری بھی بہت بڑی تعداد میں ہوتی تھی۔ ہمارے اردو ناشر کتاب کا معاوضہ شرمناک حد تک کم دیا کرتے تھے اور کہیں فریاد یا شنوائی نہیں تھی۔ اس وجہ سے اردو لکھنے والوں کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ مہینوں کی سخت محنت کے بعد کوئی شاہکار پیدا کریں تو جواب میں گھر آ کر بیگم کے طعنے تشنوں کے علاوہ کچھ نہ ملے۔ اردو غزل نے بے شک قابل رشک ترقی کی کیونکہ اس زمانے میں شرفا اور رئیس خود بھی شاعری میں دلچسپی رکھتے تھے۔ بڑے بڑے نامور شاعروں کی منت سماجت کر کے بلاتے اور انہیں غم روزگار سے بے نیاز کر دیتے۔ اس زمانے میں شعرا کا پیشہ صرف شاعری تھا۔ حکمراں اور امرا کے علاوہ عام لوگ بھی شاعری کے دلدادہ تھے۔

اردو کا آغاز قصے کہانیوں سے ہوا تھا مگر بڑی بوڑھیاں چراغ جلتے ہی اپنے بڑے خاندانوں کے بچوں کو کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ دراصل قصے کہانی کا استعارہ تھی جوں جوں قصہ پھیلتا رہا کہانیوں اور افسانوں میں بھی رنگ پیدا ہو گئے۔ افسانہ ہو یا کہانی لکھنے میں وقت کم خرچ ہوتا تھا اور بہت جلد نتیجہ نکل آتا تھا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ سعادت حسن منٹو نے ناول کیوں لکھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ منٹو ایک بے چین روح تھی۔ وہ زیادہ دیر تک ایک جگہ ٹک کر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ کہانی اور کردار سوچے اور لکھنا شروع

DANTE المعروف کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو کے کردار سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ یہ ناول انہوں نے بار بار پڑھا اور اس کا مرکزی کردار ایڈمنڈ ڈینٹے ان کے حواس پر طاری ہو گیا۔ اس ناول سے ان کی وابستگی اس قدر بڑھی کہ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس ناول کے مرکزی خیال پر فلم بنائیں گے۔ جس کہانی پر بے شمار فلمیں بن چکی ہوں۔ اس پر کوئی فلم بنانے کا کیا جواز تھا؟ مجید نے اس ناول پر اس لیے فلم بنانا ضروری تصور کیا کہ اب تک جو فلمیں اس ناول پر بنی ہیں ان کے فلم سازوں نے فلم میں ڈرامائی موڑ پیدا کرنے کے لیے ہیرو کے کردار کو اس طرح بدلا ہے کہ بقول مجید، ہیرو کے کردار کو مسخ کر کے رائٹر کو گالی دی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس تحریف کے ضمن میں بڑی فاش اور بنیادی غلطی کا ارتکاب کیا گیا ہے جو یہ ہے کہ کہانی کے ہیرو ہیروئن کے ایام محبت کے دوران ان کے ناجائز تعلقات کے حوالے سے یہ بتایا گیا کہ اگر چہ وہ حقیقی طور پر ہیروئن کا بیٹا ہوتا ہے اس کے باوجود وہ اس کے ساتھ منہ کالا کرتا ہے۔ جب کہ مجید نے ناول کی اصل کہانی کے ساتھ کوئی بددیانتی نہیں کی ہے۔ ہالی وڈ اور بالی وڈ سمیت جہاں جہاں بھی اس ناول کی کہانی کو بنیاد بنا کر فلم بنائی ہے ان میں کہانی سے کسی حد تک قریب ترین فلم مصری ہے مگر مصر سمیت ہر ملک کے کہانی کار نے متذکرہ تحریف کر کے کہانی کی روح کو مجروح کیا ہے۔ اس فلم کے بنانے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے قبل جتنی بھی فلمیں بنائی گئیں ان کا ماحول ناول کی تحریر کے زمانے کا ہے۔ پرانی حویلیاں، تلوار زنی، سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے، پرانے نوابوں کا بود و باش۔ اس قدر قدیم انداز کی فلم دیکھتے ہوئے آج کا فلم بین طبقہ ماحول سے اجنبیت محسوس کرتا ہے اور فلم سے اس کی ذہنی انوالمنٹ نہیں ہو پاتی جب کہ مجید نے اپنی فلم ''واپسی'' کی کہانی کے مرکزی خیال اور روح کو برقرار رکھتے ہوئے آج کے دور اور معاشی شناسا ماحول کے تقاضوں کو مد نظر رکھا ہے تاکہ فلم بین اسے اپنے ہی دور کی کہانی محسوس کرے۔ مجید احمد عبدالرزاق نے اس فلم کو ٹریلی ورژن یعنی عربی، اردو اور فارسی میں بنانے کی منصوبہ بندی کی تھی مگر اس طرح فلم کی تکمیل میں بہت دیر ہوتی اس لیے ''واپسی'' کے نام سے اردو زبان میں یہ فلم بنا کر ریلیز کر دی جب کہ اس موضوع پر سب سے پہلے عربی زبان میں عقاب (Punishment) کے نام سے کویت، دوبئی، یو اے ای، بحرین اور عمان کے سنیماؤں میں ریلیز ہوئی اور DVD پر اس کی کم و بیش چار ہزار کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں ایران کے لیے فارسی زبان میں بنائی جانے والی فلم بھی تکمیل کے مراحل میں ہے۔ واضح رہے کہ جس طرح اردو فلم ''واپسی'' پاکستانی فنکاروں کو لے کر بنائی گئی ہے اسی طرح عربی اور فارسی فلموں کے لیے عرب امارات اور ایران کے فنکاروں کا تعاون حاصل کیا گیا ہے۔ فرانسیسی ناول میں اس کا سارا ایکشن فرانس اور اٹلی کے ساحلی لوکیشن میں دکھایا گیا ہے جب کہ ''واپسی'' میں یہ لوکیشن دبئی اور کراچی کے ساحلوں کو بنایا گیا ہے۔ پاکستان میں اس پروڈکشن کا تمام انتظام و انصرام آغا شہزاد بنگش نے سنبھال رکھا تھا۔

مرسلہ: انور فرہاد

کرنا۔ قلم کے ایسے ماہر تھے کہ جہاں چاہتے کہانی ختم کر دیتے۔ پڑھنے والے گمان بھی نہیں کر پاتے تھے کہ مصنف نے طوالت سے بیزار ہو کر کہانی کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اس کو موپاساں کا انداز کہتے تھے مگر اصل سے وہ واقف نہ تھے۔

افسانے یا کہانی کو طویل یا مختصر کرنے کے لیے انہوں نے ایک ترکیب ''سب ٹلا'' ایجاد کی تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ منٹو انتہائی صاف ستھرے اور سلیقے کے آدمی تھے وہ لکھنے کی میز پر چند پنسلیں بہت باریک تراش کر کے سجائے تھے جس پنسل کی نوک موٹی ہوتی وہ اس کو ایک طرف رکھ کر دوسری پنسل اٹھا لیتے تھے یہاں تک کہ باریک نوک دار پنسلوں کا حصہ ختم ہو جاتا اور وہ اسی جگہ کہانی کا انجام کرتے

تھے۔ لوگوں کے خیال میں یہ ایک قابلِ تعریف ہنر مندی تھی لیکن درحقیقت یہ ان کی سستی اور کاہلی تھی جس کو انہوں نے افسانے کا حسن بنادیا تھا۔

منٹو صاحب چھوٹے چھوٹے خوب صورت الفاظ لکھتے تھے اور لکھے ہوئے کو کاٹتے نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر خوش خط اور خوش کن لگتی تھی۔ یہی خوبی ہم نے شوکت تھانوی مرحوم میں دیکھی۔ وہ اگر غلطی سے کوئی فقرہ لکھ دیتے تو اس کو کاٹ کر جدا کرنے کی بجائے فقرے ہی کو ایک موڑ دے دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے فقرہ خوب صورت ہو جاتا تھا مگر یہ خوبیاں صرف ایسے لکھنے والوں میں تھیں جنہیں زبان و بیان پر عبور حاصل ہوتا تھا۔

اردو میں ناول کا آغاز تو ''امراؤ جان ادا'' سے ہوا تھا لیکن بعد میں ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، سجاد یلدرم اور ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر کے ناول بہت مشہور ہوئے۔ غلام عباس نے بھی کئی معروف ناول لکھے خدا کی بستی بھی مشہور ناول ہے۔ اس کو ٹی وی ڈراما بھی بنا تھا۔ عزیز احمد بھی ایک ناول نگار تھے لیکن ان کے ناول خاص پس منظر میں لکھے جاتے تھے جن میں ایک زمانے میں عبدالحلیم شرر کے ناولوں کی مقبولیت تھی۔ یہ ناول اسلامی پس منظر میں لکھے گئے۔ اسی طرح صادق حسین صدیقی سردھنوی کے اسلامی ناول بھی نصف صدی قبل بہت پسند کیے جاتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ابن صفی نے اردو میں ناول کو ایک نیا انداز متعارف کرایا، جو بچے، بڑے اور خواتین سب بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے بہت مقبول ناول لکھے۔ رئیس احمد صدیقی کے ناول بھی پسند کیے جاتے تھے۔ قرۃ العین حیدر کے دو ناول ''آگ کا دریا'' اور ''کارِ جہاں دراز'' کلاسیکی ناولوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن مغربی ناولوں جیسا دیرپا تاثر پیدا کرنے میں ہمارے اردو ناول کامیاب نہ ہو سکے۔ کرشن چندر نے بھی غالباً دو ناول لکھے لیکن وہ ان کے افسانوں کی طرح شہرت نہ پا سکے۔ آج کل بھی ناول لکھے جارہے ہیں۔ ان میں کئی موثر اور معیاری بھی ہوتے ہیں لیکن ایسے نہیں ہوتے جن کی دھوم مچ جائے۔

ذیل میں اردو ناولوں کی تفصیل ملاحظہ کیجیے:

مرزا رسوا...... امراؤ جان ادا۔

علامہ راشد الخیری۔۔۔۔۔۔فسانۂ غم۔
ڈپٹی نذیر احمد۔۔۔۔۔۔بنات النعش، مراۃ العروس۔
شوکت صدیقی۔۔۔۔۔۔خدا کی بستی۔ جانگلوس۔
عبدالحلیم شرر۔۔۔۔۔۔فردوس بریں۔
نسیم حجازی۔۔۔۔۔۔غرناطہ اور تلوار ٹوٹ گئی۔
انتظار حسین۔۔۔۔۔۔بستی اور دیگر ناول۔
جگن ناتھ آزاد۔۔۔۔۔۔(ناول کا نام یاد نہیں آرہا)۔
عبداللہ حسین۔۔۔۔۔۔اداس نسلیں۔
ممتاز مفتی۔۔۔۔۔۔علی پور کا ایلی، الکھ نگری۔
قدرت اللہ شہاب۔۔۔۔۔۔شہاب نامہ، ماں۔
بانو قدسیہ۔۔۔۔۔۔راجہ گدھ۔
راجندر سنگھ بیدی، اک چادر میلی سی
ان کے علاوہ دوسرے معروف ناول نگار یہ ہیں۔
مرزا ادیب، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رضیہ بٹ، گوپی چند نارنگ، بشریٰ رحمٰن، فاطمہ ثریا وغیرہ۔

ان میں کئی ناولوں کو فلمایا بھی گیا۔ رضیہ بٹ کے کئی ناول پاکستان میں فلمائے گئے اور مقبول ہوئے۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناول "اک چادر میلی سی" یہ ناول ہندوستان میں فلمایا گیا۔ پاکستان میں سنگیتا نے یہ فلم بہت علیحدہ اور معیاری بنائی تھی۔ بشریٰ رحمٰن کے ناول بھی فلمائے گئے۔ ان ناول نگاروں نے بہت اچھے ناول بھی لکھے جن کو آج تک یاد کیا جاتا ہے۔

ناولوں کا تذکرہ اس لیے پیش کیا گیا کیونکہ ہمارے قارئین بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ انہیں یہ مختصر جائزہ یقیناً پسند آئے گا۔

☆☆☆

جو لوگ کہتے اور سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں کبھی اچھی معیاری فلم بنی ہی نہیں ان میں اکثریت ایسے انگریزی بابوؤں کی ہے جنہوں نے آج تک کوئی پاکستانی فلم نہیں دیکھی وہ لوگ احساس کمتری و احساس برتری کا شکار ہیں جو پاکستان کی ہر اچھی چیز کو بھی بھارتی اشیا پر فوقیت دیتے ہیں۔

آج آپ کو ایک پاکستانی فلم "بہن بھائی" کی کہانی سناتے ہیں۔ دراصل اس فلم کا خیال ایک مدراسی فلم "بیٹی بیٹے" سے اخذ کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں بہن بھائیوں، ماں باپ کے بچھڑنے کی فلمیں بہت بنائی جاتی تھیں آخر میں بچپن میں کسی گائے ہوئے گیت یا کسی جسمانی شناخت کی وجہ سے راز کھلتا تھا اور سب ہنسی خوشی رہنے لگتے تھے۔

"بیٹی بیٹے" اس موضوع پر انڈیا میں بنائی جانے والی فلم تھی اور اچھے منے ابھرتے پن کی وجہ سے بہت پسند کی گئی۔ اس فلم کا مرکزی خیال فلم ساز و ہدایت کار بی آر چوپڑا کو بہت پسند آیا کیونکہ اس میں ایک نیا زاویہ پیش کیا گیا تھا۔ چوپڑا اس زمانے میں انڈیا کے ممتاز ترین ہدایت کار سمجھے جاتے تھے۔ بی آر چوپڑا نے وقت کے نام موضوع تھمایا اور یہ حسن طارق کو اتنا پسند آیا کہ انہوں نے ایک معیاری فلم بنا ڈالی۔ کہانی میں تبدیلیاں بھی کی گئی تھیں اور کرداروں کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ یہ موضوع فلم سازوں کو ایسا بھایا کہ منور رشید نے "بہن بھائی" اور "کون کسی کا" کے نام سے دو فلمیں بنا ڈالیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سب نہیں کامیاب ہوئیں۔

قیام پاکستان کے وقت کی یہ کہانی "کون کسی کا" منور رشید نے بنائی تھی۔ تقسیم ملک کے زمانے میں جو نقل مکانی ہوئی تھی اس کی وجہ سے کئی خاندان بچھڑ گئے ان میں سے ایک خاندان طلعت صدیقی کا بھی تھا جو اپنے چار بیٹوں

اور ایک بچی کے ہمراہ اس ہنگامے میں بچھڑ گئے تھے۔ اتفاقات پر ہماری فلمیں قائم ہیں۔ طلعت صدیقی کے سر پر ایک بھاری درخت گر پڑا جس کی وجہ سے ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور وہ کسی کو پہچانتی نہ تھیں۔ اتفاق سے بہن بھائی ایک گاؤں میں اکٹھے ہو گئے۔ صابرہ دیبا اور عبدل (کمال) جوان ہوئے تو سارے گاؤں میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ تیسرا بھائی نذیم خراب صحبت میں رہنے کی وجہ سے ایک جیب کترا بن گیا۔ اعجاز بازار حسن کا دلال بن گیا جب کہ اسلم پرویز نے ایک ڈاکٹر کا کردار بہت خوبی سے کیا تھا۔ رتیجہ کی کھولی میں رہنے والی لڑکی رانی ان کی محبت میں گرفتار ہو گئی جہاں ڈاکٹر ایک اور لڑکی حسنہ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس فلم کو کئی ہدایت کاروں نے بنایا تھا لیکن بہترین ڈائریکٹر کے طور پر حسن طارق کو نگار ایوارڈ ملا۔

اس فلم کے تمام نغمات بہت اچھے تھے اداکاری کے اعتبار سے بھی ہر اداکار نے اپنا کردار بہت خوب صورت اور فطری انداز پیش کیا تھا۔

یہ کہانی سنانے کے لیے تو بہت لمبی ہے اس میں اتنے بہت سے مختلف قسم کے کردار ہیں کہ ہر کردار کو بخوبی سمجھنا مشکل سا ہے۔ اسی قسم کا واقعہ ایک بار شوکت حسن رضوی صاحب کے ساتھ پیش آیا۔ انہوں نے کہانی جو شروع کی تو کہانی میں اتنے قریبی رشتے دار تھے کہ ہم نے دو بار یہ کہانی ان کی زبان سے سنی۔ پھر جب انہوں نے ہماری رائے دریافت کی تو ہم نے کہا کہ شوکت صاحب معاف کیجیے گا ہم رشتوں کے معاملے میں بہت کمزور ہیں۔ بہت ہی قریبی رشتے داروں کے علاوہ ہمیں خود اپنے رشتے یاد نہیں رہتے کہ کون سا کس کا ہے، کس کی سوتیلی ماں ہے، کس کے آپس میں اچھے تعلقات ہیں اور کون ایک دوسرے کی کاٹ میں لگا رہتا ہے۔

شوکت صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا "کیا واقعی تم رشتے یاد نہیں رکھتے؟" ہم نے اصرار کیا تو بولے "ارے میاں تم تو کما مز نکلے۔ میرا خیال تھا کہ تو جوان ہو، تمہارا دماغ تیز ہوگا۔"

ہم نے کہا "معافی چاہتے ہیں۔ یہ تو دماغ بنانے والے کی مرضی ہے۔"

کہنے لگے۔ "میاں تم تو یہ کہانی لکھا کرو اس سے آگے تم نہیں سوچ سکتے۔"

ہمارا دل رکھنے کے لیے انہوں نے انتہائی قیمتی چائے کے برتنوں میں چائے پلائی اور بولے "اگر کوئی کہانی دماغ میں آ جائے تو سب سے پہلے مجھے سنانا۔"

حالانکہ اس کے بعد دوبارہ کوئی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ خیر بات ہو رہی تھی "کون کسی کا" کی اس فلم کا ہر گانا سپرہٹ تھا۔ اداکاری کا معیار بہت اچھا تھا مگر جب تک دیکھتے رہو لطف اندوز ہوتے رہو لیکن جب فلم ختم ہو جائے تو سوچیں کہ آخر یہ کہانی اور کہانی تھی کیا؟ مگر یہ اپنے زمانے کی سپرہٹ فلم تھی جس کے سکّے لگتے ہیں ہمارا بھی حصہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ 56ء کے بعد 75-76ء تک پاکستان میں درجنوں بلکہ سینکڑوں یادگار فلمیں بنیں جن کی موسیقی بھی لاجواب تھی۔ پاکستانی تو ہندوستانی فلموں اور گانوں کے رسیا تھے مگر پاکستانی فلموں کے معیار کا اس طرح اندازہ لگائیے کہ انڈیا میں بے شمار پاکستانی فلموں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا اور 75 فیصد پاکستانی فلموں کی ہو بہو تھوڑی تبدیلیوں کے ساتھ نقل کی گئی مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہم احساس کمتری کے مارے ہوئے ہیں۔ ہمیں دوسروں کی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے یہ کہاوت ہے کہ دوسروں کی بیوی ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔

اب کچھ انڈین فلمی اداکاروں کا ذکر ہو جائے۔

شبانا تو آپ کو یاد ہوں گی۔ پچھلے دنوں ایک انٹرویو فرحانہ فاروقی کا نظر سے گزرا جو انہوں نے 2010ء میں لیا تھا۔ "جب فرحانہ نے ان کے گھر فون کیا تو ٹیلی فون خود شبانا نے اٹھایا۔ ان کی آواز میں کمزوری اور ترنگی نمایاں تھی۔ میں اس فن کارہ سے ملنے کی مشتاق تھی جس نے گرودت کی فلم "ڈر پار" میں کام کیا تھا اور ان پر فلمایا ہوا ایک نغمہ

"سن سن ظالما"

آج تک لوگوں کو یاد ہے۔

میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے مجھے انٹرویو کے لیے اپنے گھر مدعو کر لیا۔ جب میں ان کے فلیٹ پر پہنچی جو چیمبر کی روڈ پر بہت خوب صورت مقام پر واقع ہے۔ اندر گئی تو شبانا سامنے کھڑی تھیں۔ انہوں نے گلابی رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ان کے ترشے ہوئے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میری موجودگی ہی میں ان کی بیٹی شبیری اپنی ماں سے ملنے آ گئی اور محفل میں مزید دلچسپی پیدا ہو گئی۔ شبانا کی عمر اس وقت (2010ء میں) 74 سال تھی۔ دونوں ماں بیٹیاں بڑے پیار سے گلے ملیں۔ دو چار باتیں کیں۔ مجھ سے بھی ہیلو ہائے کیا اور شبیری رخصت ہو گئی۔

میں نے دیکھا کہ وہ واکر کے سہارے چل رہی تھیں۔

میرے پوچھنے پر بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے میرے دونوں پیروں میں فریکچر ہو گیا تھا۔ اس لیے میں زیادہ تر گھر ہی میں رہتی ہوں۔ کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔ انہوں نے ایک البم دکھایا جس میں ان کی تمام فلموں کے نام اور تصاویر تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ کام ان کے بیٹے ذریسر نے کیا ہے۔ انہوں نے مجھے ایک ڈائری بھی دکھائی جس میں ان کی تمام فلموں اور ہدایت کاروں کے نام درج تھے۔ انہوں نے گورودت، نرگس، مینا کماری اور راج کپور کے ساتھ ان کی فریم میں سجی ہوئی تصاویر دیواروں پر لگائی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ان تصاویر کو دیکھ کر پرانی تلخ و شیریں یادیں زندہ کرتی ہوں۔

''آپ فلموں میں کیسے آئیں؟'' میں نے پوچھا۔

میرا اصلی نام خورشید اختر ہے۔ میں نے نو سال کی عمر میں فلموں میں کورس گانوں میں حصہ لیا۔ سید شوکت حسین رضوی کی سپرہٹ فلم ''زینت'' کی قوالی میں بھی شامل تھی۔ یہ فلم 1945ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ میں چند رشتے داروں کے ساتھ پہلی مرتبہ ''زینت'' کی شوٹنگ دیکھنے کے لیے گئی تھی۔ اس فلم کی ہیروئن نور جہاں تھیں قوالی کے بول تھے کہ

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے
کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے
ہاتھوں سے جگر کو تھام لیا

جب میں نے شوکت صاحب کے یہ پوچھنے پر کہ کون اداکاری کرے گا تو میں نے فوراً ہاتھ اٹھا کر ''ہاں میں کروں گی'' کہا تو میں نے گھر والوں سے اجازت نہیں لی تھی۔

میرے والدین غریب تھے لیکن ابا نہیں چاہتے تھے کہ میں فلموں میں کام کروں۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ''ابا اس میں کیا برائی ہے؟'' وہ چپ ہو گئے۔

مجھے اداکاری کرنے کا بھی شوق تھا۔ میں اسکول میں اپنی چیز پر کھڑی ہو کر ڈانس کرتی کبھی ایکٹرز کی نقلیں کرتی۔ ساری لڑکیاں بہت خوش ہوتی تھیں، میں ہر فلم دیکھتی تھی۔

میں نے اداکاری شروع کی تو ہیروئن، سائیڈ ہیروئن اور ویمپ کی حیثیت سے 147 فلموں میں کام کیا ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے بہت اچھے کردار ملے۔ فلم ''شاردا'' کے لیے مجھے بہترین معاون اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا۔ ذاتی طور پر میں معاشرتی اور گھریلو قسم کی فلموں میں کام کرنا پسند کرتی تھی جیسے ''دو بہنیں''، ''چھوٹی بہن''، ''بھائی بھائی'' اور ''دو بھائی''، ''دو بہنیں''۔ دو بہنوں کی کہانی تھی۔ جن میں ایک بہت اچھی اور دوسری خراب تھی۔ راجندر کمار اس فلم کے ہیرو تھے جو زیادہ مشہور نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے ابتدا میں یہ فلم ٹھیک نہیں گئی۔ اس فلم میں دونوں بہنوں کا کردار میں نے ہی ادا کیا تھا۔ جب یہ فلم کچھ عرصے بعد دوبارہ ریلیز ہوئی تو اس نے دھوم مچادی

اور بہت کامیاب ہوئی۔

انہوں نے ترانہ، برسات کی رات اور فلم آر پار میں کام کیا جو بہت مقبول ہوئیں۔ یہ فلمیں 1950ء میں بنائی گئی تھیں۔ سب کہتے تھے کہ میرا چہرہ بہت فوٹو جینک ہے۔ کیمرے کو پسند ہے۔ کسی بھی زاویے سے شوٹ کیا جائے میرا چہرہ بہت اچھا فوٹو گراف دیتا ہے۔ میں اپنی فگر کا بہت خیال رکھتی تھی۔ کھانے میں بھی بہت احتیاط کرتی تھی۔

1951ء میں فلم ''سزا'' کی شوٹنگ کے دوران مشہور کیمرا مین فالی مستری کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے مگر مجھے اس سے بات کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ جب بات چھڑی تو انہوں نے کہا کہ شادی کے بعد تم فلموں میں کام نہیں کرو گی۔ میں نے کہا کہ میں بہت محنت سے اس درجے پر اس مقام پر پہنچی ہوں۔ وہ رضامند ہو گئے اور ہماری شادی ہو گئی۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی شیریں جس سے آپ ابھی ملی تھیں۔

یہ بات قارئین کے علم میں بھی ہوگی کہ اچھی فلم اچھی کہانی کی بنیاد پر بنتی ہے۔ ہالی وڈ سے لے کر لالی وڈ تک جن فلموں نے کامیابی حاصل کی ان کی کہانی ہی ان کی کامیابی کی اصل وجہ تھی۔ بھارت ہو یا پاکستان فلموں کی کہانی کا شعبہ اس لحاظ سے کمزور رہا ہے کہ یہاں تخلیقی کہانی نویسوں کی بہت کمی رہی ہے۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر رہی ہے۔ جو بڑے اور طرم خان قسم کے رائٹرز ہیں وہ بھی دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلانے کے بعد ہی ''شکاری'' بنے ہیں۔ اس کے لیے وہ دنیا بھر کی غیر ملکی کامیاب فلموں کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کو اپنے انداز میں لکھ کر فلمساز و ہدایت کار کو تھما دیتے ہیں۔ یہ کام آج سے نہیں گزشتہ چالیس پچاس برس سال سے بڑے دھڑلے کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

اللہ بخشے ہدایت کار محبوب خان کو انہوں نے اپنے ابتدائی دور میں ایک فلم بنائی تھی۔ ''الہلال'' جو انگریزی فلم "Judgment of Allah" کی کہانی پر بنائی گئی تھی۔ بس ان کے کہانی کار نے اسکرپٹ لکھتے وقت اسے اپنے ماحول میں ڈھال لیا تھا۔ یہ چسکا صرف محبوب خان تک محدود نہیں تھی اس دور کے دوسرے فلم ساز و ہدایت کار اے آر کاردار اور آئی ایس جوہر کے علاوہ بھی دوسرے لوگ دکھانے تھے۔ اے آر کاردار نے اس سلسلے کی کامیاب فلمیں بنائیں جن میں جادو، داستان اور دل ربا اور دلربا قابل ذکر ہیں۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ یہاں پاکستان میں کئی فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے چور کے گھر میں ڈکیتی کرنے کا بڑی بے دلیری سے مظاہرہ کیا۔ انگریزی فلموں کی چرائی ہوئی کہانیوں پر بنی بھارتی فلموں پر فلمیں بنا کر اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا دی۔ جب کہ بعض بھارتی فلم میکرز نے کامیاب پاکستانی فلم پر ہاتھ صاف کرنے میں ذرا دریغ نہیں کیا۔ 1981ء میں یہاں پاکستان میں نامور ہدایت کار پرویز ملک نے ایک فلم بنائی تھی ''قربانی'' جس نے اس وقت ڈائمنڈ جوبلی فلم ہونے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس فلم کی کہانی انگریزی فلم ''کریمر ورسز کریمر'' سے ماخوذ تھی۔ اس فلم کی عظیم الشان کامیابی سے متاثر ہو کر بھارت میں یہی کہانی ''اوبیکار'' کے نام سے فلمائی گئی مگر ناقص ٹریٹمنٹ کی وجہ سے ''قربانی'' جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی نہ ہی راجیش کھنہ ندیم جیسی کامیاب اداکاری کر سکے۔ انگریزی ناول پر بنی فلم ''پرزنر آف زینڈا'' کی کہانی پر آج سے بہت پہلے بھارت میں ایک فلم ''شبستان'' بنائی گئی تھی۔ اس کی ہیروئن پری چہرہ نسیم اور ہیرو شیام تھے۔ یہ فلم زیادہ کامیاب تو نہیں ہوئی مگر اس فلم کی شوٹنگ کے دوران شیام کا گھوڑے سے گر کر وفات ہو گیا تھا اس لیے اسے ایک یادگار حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کہانی پر ہدایت کار لقمان نے 20 سال بعد پاکستان میں ''محل'' کے نام سے ایک فلم بنائی۔ نسیم اور شیام کے کردار زیبا اور محمد علی نے ادا کیے تھے۔ محل، شبستان کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ثابت ہوئی تھی اور اپنے وقت کی گولڈن جوبلی فلم تھی۔ اسی طرح نامور بھارتی فلم ساز و ہدایت کار سہراب مودی نے انگریزی ناول پر بنی فلم La Miserable کی کہانی پر کندن کے نام سے فلم بنائی۔ اس فلم کی نمائش کے کوئی 35 سال بعد (1977ء میں) اس کہانی کو مشرف بہ اسلام کر کے پاکستانی ہدایت کار حسن عسکری نے ''سلاخیں'' بنائی جو آج تک ان کی پہچان بنی ہوئی ہے۔ ''کندن'' میں جو کردار سہراب مودی اور نمی نے ادا کیے تھے ''سلاخیں'' میں انہی کرداروں کو محمد علی اور بابرا شریف نے ادا کیے۔ ''گاڈ فادر'' ہالی وڈ کی شہرۂ آفاق فلم تھی جس کی کہانی پر پاکستان میں ہدایت کار اقبال یوسف نے طبع آزمائی کی۔ فلم کا نام تھا ''ان داتا'' سدھیر بارعب اور دبدبے والا کردار اس معیار کا کر سکے نہ ہی ''ان داتا'' ''گاڈ فادر'' جیسی شہرت پا سکی اس کے باوجود یہ فلم اور سدھیر دونوں کو

میں اپنی ازدواجی اور گھریلو زندگی سے بہت خوش اور مطمئن تھی۔ فانی کو مجھ پر مکمل اعتماد تھا۔ اگر کسی دن دیر سے شوٹنگ سے آتی تو ان سے کہتی ''میں بہت لیٹ ہو گئی ہوں مگر کھانا ہم دونوں ایک ساتھ کھائیں گے۔'' میں مسلمان تھی اور وہ پارسی لیکن ہم دونوں میں بہت انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ انہوں نے بتایا کہ کئی اداکار مجھ سے شادی کے خواہش مند تھے۔ میں ان کے نام بتانا نہیں چاہتی کیوں کہ ان میں سے کچھ زندہ نہیں ہیں اور باقی کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ مجھ سے اب بھی بات چیت ہو جاتی ہے اور ہم ایک دوسرے سے ''کیا حال ہے'' کہہ کر خیریت پوچھ لیتے ہیں۔

فانی مستری 1979ء میں فوت ہو گئے تھے لیکن ان کی آخری فلم نیچے وت کے ساتھ ہتھیار تھی۔ آج کل میں صرف آرام کرتی ہوں۔ اب سوتی ہوں اور اپنی پرانی فلمیں دیکھتی ہوں جب سے اپنے بچوں کو بھی وی ڈی وی ڈی لے کر دیے ہیں۔ میں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ہے۔ وحیدہ رحمن، نندہ اور شکیلہ سے میری اچھی دوستی رہی ہے۔ ثریا

پاکستانی تماشائیوں نے پسندیدگی کی سند عطا کی۔ انگریزی ناول کی کہانی پر مبنی انگریزی فلم ''زورنگ ہائٹ'' پر بھارت میں دو اور پاکستان میں ایک فلم بنائی گئیں۔ بھارت میں بننے والی فلمیں ''انچل'' اور ''دل دیا درد لیا'' تھیں جب کہ پاکستانی فلم ''دلبنر'' تھی۔ ''انچل'' اپنی کے اوجھا کی ڈائریکشن میں بنی تھی جب کہ ''دل دیا درد لیا'' اے آر کاردار کی فلم تھی۔ فنی خوبیوں کے لحاظ سے جاوید فاضل کی فلم ''دلبنر'' دونوں بھارتی فلموں سے سبقت لے گئی تھی مگر اس کا کریڈٹ مصنف سید نور کو جاتا ہے جن کی مہارت نے اس فلم کو منفرد بنا دیا تھا۔ اسی طرح دو بھارتی فلمیں ''جنم'' اور ''معصوم'' کے علاوہ ایک پاکستانی فلم ''کبھی الوداع نہ کہنا'' انگریزی ناول کی کہانی پر مبنی فلم ''زورین اینڈ چائلڈ'' سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھیں۔ ''جنم'' کے ہدایت کار مہیش بھٹ اور ''معصوم'' کے شیکھر کپور تھے۔ ''جنم'' بھی ٹیلی فلم تھی جب کہ ''معصوم'' نصیر الدین شاہ اور شبانہ اعظمی کی زبردست پرفارمنس کی وجہ سے مقبول ہوئی تھی۔ ''کبھی الوداع نہ کہنا'' کو ڈائریکٹر سنگیتا کی فنی مہارت نے ایک سپرہٹ فلم بنا دیا تھا۔ یہ جاوید شیخ کی پہلی کامیاب ترین فلم تھی۔ ''زولی ان ری سن'' انگریزی ناول کی کہانی پر بنائی گئی تھی۔ بھارت میں پروڈیوسر ڈائریکٹر ایم صادق مرحوم نے اس فلم کو ''سہاگ'' کے روپ میں ڈھالا تھا مگر نرگس اور مدھوبالا کی جوڑی بھی اس فلم کو فلاپ ہونے سے بچا نہیں سکی تھی جب کہ بہت بعد میں اسی کہانی پر ہدایت کار جاوید فاضل نے سپرہٹ فلم ''لازوال'' بنائی۔ اس فلم کی کامیابی کی حقیقی وجہ شبنم، ندیم، غلام محی الدین، جاوید شیخ اور آغا طالش نہیں تھے بلکہ اس کی اصل وجہ سید نور کا اسکرپٹ تھا جو کہانی کو بڑی خوبی سے بدلنے اور نئے انداز میں پیش کرنے کے ماسٹر ہیں۔ اس پر جاوید فاضل کی ہدایت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ کچھ اسی طرح کی بات ان دونوں کی جوڑی کی وجہ سے بننے والی فلم ''ضد'' کی ہے جو بھارتی فلم ''صاحب'' کی کہانی پر بنائی گئی تھی جب کہ یہ بھارتی فلم انگریزی فلم ''رونج'' کا چربہ تھی۔ حسن عسکری نے بھی اسی کہانی پر ''دل کسی کا دوست نہیں'' بنائی۔ یہ فلم بھی ''صاحب'' کے مقابلے میں نہ صرف بہت بہتر تھی بلکہ ''ضد'' کو بھی اس نے فنی لحاظ سے پیچھے چھوڑ دیا تھا مگر یہ فلم ''ضد'' کے مقابلے میں کاروباری طور پر پیچھے رہ گئی تھی۔ ضد کی کامیابی کے پیچھے بھی سید نور کا ہاتھ تھا۔ اصل کہانی کو وہ اس خوبی کے ساتھ نیا سوز دیتے ہیں کہ اصل مصنف بھی دیکھے تو دنگ رہ جائے۔ بھارت میں ایک فلم ''بازی گاروز'' کے نام سے بنائی گئی تھی جو انگریزی فلم ''بازی گاروز'' ہی کا چربہ تھی۔ بھارتی ''بازی گاروز'' بھارت میں کامیاب نہیں ہوئی مگر پھر بھی سید نور نے اس کی کہانی پر اس خیال سے ہاتھ صاف کیا کہ اپنے لکھے ہوئے اسکرپٹ کو جب وہ خود ڈائریکٹ کریں گے تو سُنی کر سونا بنا دیں گے مگر افسوس کہ ان کی سخت محنت اور ندیم اور شاہد کی خوب صورت پرفارمنس بھی ''محافظ'' کو کامیاب فلم نہ بنا سکی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا اور اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتی کہ کچھ کہانیاں ہمارے ماحول اور ہمارے تماشائیوں کے موڈ مزاج کی نہیں ہوتیں۔ ''کھوئے ہو تم کہاں'' جسے بنا کر اداکار عجب گل کامیاب فلم میکرز کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس کی کہانی بھی انہوں نے انگریزی فلم ''ری پرفیکٹ مرڈر'' سے مستعار لی تھی۔

آج بھی اچھی کہانیوں کی بالی وڈ اور لالی وڈ میں بے حد کمی ہے جس کی تلاش میں وہ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ شاید اسی محرومی کی وجہ ہے کہ اب بھارتی فلم ساز کہانیوں سے زیادہ گلیمر اور دیگر ذرائع سے اچھی فلموں کو کامیاب کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مرسلہ: انور فرہاد

رانے اور نادرہ سے بھی بہت اچھی دوستی تھی مگر اب وہ دنیا میں نہیں ہیں۔ نرودا رانے سے میری گہری دوستی تھی لیکن ان کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس زمانے میں ہم اپنے اپنے راز ایک دوسرے سے چھپانے تھے مگر آج کل سب کھلے عام اپنے بارے میں راز فاش کرتے ہیں۔

یہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کافی تھک گئی ہیں اور سونا چاہتی ہیں اس لیے میں نے انٹرویو ختم کر دیا۔

میں نے آخر میں پوچھا۔ ''آپ کو کسی بات پر افسوس بھی ہے؟''

''میں اپنی فیملی کو مس کرتی ہوں۔ میرے بیٹے دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں۔ ہم تو بہن بھائی تھے مگر اب ایک بھی نہیں رہا۔ لوگ آتے اور جایا کرتے ہیں مگر اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ میری کبھی کسی سے لڑائی نہیں ہوئی۔ میری خواہش ہے کہ مجھے دادا بھائی پھالکے ایوارڈ ملے۔ نہ جانے یہ خواہش پوری ہوگی یا نہیں۔'' میں نے ان سے اجازت لی

اور پرانی یادوں میں کھوئی ہوئی واپس آ گئی۔

☆☆☆

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہر پودا اور درخت ہر زمین میں پھل پھول نہیں سکتا۔ مثلاً شمالی پاکستان اور مری سے ہم بہت سے خوب صورت پودوں اور پھلوں کو لے کر آئے لیکن لاہور میں وہ مرجھا گئے۔ پھلنا پھولنا تو دور کی بات ہے لیکن یہ خوبی ہمارے پاکستانی فن کاروں میں بھی دیکھی کہ وہ بوٹے تو پاکستان میں جاتے ہیں، شہرت عزت اور مقامی حد تک انہیں دولت بھی مل جاتی ہے لیکن انڈیا کی بڑی مارکیٹ اور زیادہ شہرت اور دولت کے شوق میں جو فن کار پاکستان سے ہندوستان جاتے ہیں وہ خوب پھلتے پھولتے ہیں اگرچہ مشکلات بدنامی اور اسکینڈلز کا بھی نشانہ بنتے ہیں لیکن شہرت اور دولت کے بڑی لگتی ہے۔ عزت تو ایک محسوس کرنے والا ضمیر کا حصہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی عزت کا جامہ اور بدنامی کا تصور اتار پھینکے تو پھر اس کے لیے بدنامی اور غیرت کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

زیبا بختیار اور عدنان سمیع

ہمارے ہاں سے نصرت فتح علی خان، غلام علی، علی ظفر نے بھارت کا رخ کیا۔ بہت عزت اور شہرت پائی۔ وہ پاکستانی کے پاکستانی اور پاکستان ہی کو اپنی شناخت کہتے رہے۔

وینا ملک، میرا، ثنا نے بھی بھارت یاترا کی اور خوب دولت کمائی۔ بدنامی اس سے زیادہ ہوئی مگر اس کے نتیجے میں دونوں کو دولت مند شوہر مل گئے۔

پاکستان سے انڈیا جانے والوں میں ایک نمایاں نام عدنان سمیع خان کا بھی ہے۔ عدنان سمیع ایک پاکستانی بیورو کریٹ کے خوش حال بیٹے تھے۔ تعلیم بھی حاصل کی انگلستان میں لیکن موسیقی کے رسیا تھے۔ انہوں نے موسیقی کی باقاعدہ تربیت حاصل کی۔ یہ آواز بھی اچھی تھی۔

سید نور نے فلم ''سرگم'' بنائی تو حسب معمول نیا تجربہ کیا۔ اس فلم میں انہوں نے عدنان سمیع کو ہیرو اور موسیقار منتخب کیا۔ زیبا بختیار ہیروئن منتخب کی گئیں۔ یہ ایک اچھی جوڑی تھی۔ عدنان سمیع خوش شکل آدمی ہیں لیکن اس زمانے میں بھی موٹے تھے لیکن اپنی اداکاری اور موسیقی کے حوالے سے پسند کیے گئے۔ انہوں نے چند گانے بھی اس فلم میں گائے جو اتنے مشہور ہوئے کہ شادی بیاہ کی تقریبات میں ان کو پیش کرنا لازمی ہو گیا۔

اس فلم کے دوران میں عدنان سمیع اور زیبا بختیار محبت میں گرفتار ہو گئے اور پھر شادی بھی کر لی جو زیادہ عرصے نہ چل سکی۔ اس کی وجوہات کے بارے میں دونوں میں سے کسی نے کچھ نہ بتایا۔

زیبا بختیار تو آج بھی پاکستان کے ٹی وی ڈراموں میں نمودار ہوتی ہیں لیکن عدنان سمیع نے بمبئی پہنچ کر خوب دھومیں مچائیں، شہرت حاصل کی اور دولت بھی اس کے ساتھ آئی۔ بمبئی میں نئے موسیقاروں کے لیے مقابلہ بہت سخت تھا لیکن عدنان سمیع نے اپنی الگ پہچان پیدا کر لی۔ بمبئی کی آب و ہوا اور ماحول انہیں ایسا راس آیا کہ پھر انڈیا ہی کے ہو رہے۔ چند بار پاکستان آئے۔ یہاں میاں نواز شریف جو موسیقی کے دلدادہ اور عدنان سمیع کے فین ہیں انہوں نے گھر بلا کر سمیع کی بہت آؤ بھگت کی۔ عدنان سمیع کا

زیبا بختیار اور ان کا بیٹا اذان

کہنا ہے کہ نواز شریف اور شہباز شریف کو خود بھی گانے کا شوق ہے۔

کچھ دن پاکستان میں رہنے کے بعد وہ گڈ بائی کہہ کر بمبئی چلے گئے۔ البتہ یہ احسان کر گئے کہ اگر پاکستان میں

کوئی اچھی فلم بنائے گا اور انہیں مدعو کرے گا تو وہ ضرور پاکستانی فلم میں کام کریں گے۔ غیریت اور اجنبیت کی بھی حد ہوتی ہے۔ کیا اپنے وطن کی مٹی کی کوئی محبت، وفاداری اور احسان نہیں ہے۔ عدنان سمیع کو ایک پاکستانی ہدایت کار نے متعارف کرایا تھا مگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایک کونے میں کھڑے نظر آتے اور انڈیا والے تو کبھی انہیں گھاس بھی نہ ڈالتے۔

بہرحال قدرت کے کھیل ہیں۔ وفاداری اور خلوص ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا۔ عدنان سمیع موسیقار ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین پیانو بجاتے ہیں۔ اس حوالے سے دنیا بھر میں ان کی شہرت ہے۔ انہیں طبلہ، گٹار، سیکسوفون بجانے پر بھی عبور حاصل ہے۔ اسی لیے وہ سازوں اور آوازوں کی آمیزش کے معاملے میں انڈیا کے بڑے بڑے موسیقاروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے ہنرمند فن کار کی آؤ بھگت کیوں نہ ہوگی اور دولت اس پر نچھاور کیوں نہ کی جائے گی؟ پاکستان کے لیے یہ بات باعث فخر ہے کہ ایک پاکستانی فن کار نے بمبئی میں اپنا سکہ جمالیا ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ جب کسی غریب آدمی کا بیٹا بڑا آدمی بن جائے اور والدین کی خبر بھی نہ لے مگر والدین اس کی ترقی پر خوش ہوتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں اور اس کو دعائیں دیتے رہتے ہیں۔

عدنان سمیع خان کے کئی البم بھی ریلیز ہوئے اور بہت پسند کیے گئے جن سے انہیں کافی دولت ملی۔ ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ فن کار کو اس کا معاوضہ درمیان والے کھا جاتے ہیں اور اس کے پاس صرف نام ہی نام رہ جاتا ہے۔ انہوں نے معروف مغربی موسیقاروں اور گلوکاروں کے ساتھ مل کر بھی گانے گائے جو بے حد مقبول ہوئے۔ اتنی شہرت اور عزت حاصل کرنے کے باوجود ان میں غرور نہیں ہے۔ وہ صحافیوں اور دوسروں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتے ہیں اور زور زور سے قہقہے بھی لگاتے رہتے ہیں۔

زیبا بختیار اور ان کا بیٹا اذان اب لڑکپن کی حد میں ہے۔ خوش شکل مگر باپ کی طرح موٹا، حالانکہ عدنان سمیع نے اپنے آپ کو ڈائٹنگ اور دوسرے ذرائع کی مدد سے حیران کن حد تک دبلا کرلیا جس کی وجہ سے وہ مزید کم عمر لگنے ہیں۔ عدنان خان کہتے ہیں کہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے اذان جیسے بیٹے سے نوازا ہے۔

انہوں نے کہا میرے فن کی وجہ سے مجھے عزت اور دولت بھی اللہ نے دی ہے۔ میں اپنے بیٹے اذان سے دس سال تک نہیں مل سکا۔ کیوں کہ وہ پاکستان میں اپنی ماں کے پاس تھا۔ اب وہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ میں اس کا باپ بھی ہوں اور دوست بھی۔ اس میں فن کار بننے کی خوبیاں ہیں۔ مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے۔

عدنان سمیع ہمیشہ بے حد مصروف رہتا ہے۔ دوسرے ملکوں سے دور جب وہ بمبئی آتا ہے تو وہاں بھی فلموں اور البم کی تیاری میں مصروف رہتا ہے۔ اس لیے اس کے پاس انٹرویو دینے کا وقت بھی نہیں ہوتا۔

عدنان سمیع نے کہا کہ میری بیوی رویا میری بہترین

عدنان سمیع اور رویا فاریابی

ساتھی اور دوست ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری فیملی کو میری مصروفیات سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ موسیقی یا البم کمپوز کرتے ہوئے بہت زیادہ کافی پیتے ہیں۔ دوسرے کولڈ ڈرنک بھی پی لیتے ہیں مگر وہ اب ڈرنکس۔ بالی ووڈ میں ان کی شہرت ان کے البم کی ریلیز کے بعد ہوئی جس کا گانا
بھیگی بھیگی نظر بلا ڈ سو ہیو......
سے ہوئی تھی۔ وہ فلموں کے لیے پس منظر موسیقی بنانے میں ماہر ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے موسیقار یہاں تک کہ اے آر رحمن بھی ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ عدنان سمیع کے البم مغربی ملکوں میں بھی مقبول ہیں اور بڑے پیمانے پر فروخت ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے البم میں کئی نامور بالی وڈ کے فن کاروں کو لیا ہے جو ایک اعزاز ہے۔ انہوں نے لندن کے بڑے بڑے کنسرٹ ہالوں میں بھی موسیقی کا مظاہرہ کیا۔ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت سے اسکینڈلز مشہور ہوئے مگر وہ ان سے متاثر نہیں ہوئے۔ انہیں شکایت ہے کہ لوگ ان کے اسکینڈلز تو بناتے ہیں مگر میرے فن کے بارے میں بات نہیں کرتے مگر مجھے پروا نہیں ہے۔ میں اپنے کام میں مگن رہتا ہوں۔ میں اپنے کام سے بہت مخلص ہوں۔ شاید یہی میری کامیابی کا راز ہے۔ عدنان نے کبھی اپنے گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے اپنے فن پر آنچ نہیں آنے دی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک پاکستانی ہونے کی وجہ سے مجھ پر کبھی نکتہ چینی نہیں کی گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ دوسرے موسیقاروں سے زیادہ لطف میں اپنے البم بنا کر لیتا ہوں۔ پچھلے دنوں انہوں نے بالی وڈ کی فلموں ڈانس پروڈانس، بیسبٹی، سلسلہ، بادبان اور جمال کے لیے پس منظر موسیقی بنائی ہے۔

پاکستان میں عدنان پر بہت نکتہ چینی کی جاتی ہے کیونکہ بھارت اور پاکستان کے مابین ہمیشہ کشیدگی رہی ہے۔ جب آشا بھوسلے نے کہا کہ عدنان پاکستانی ہے مگر اس کی روح ہندوستانی ہے تو عدنان نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ میری روح پاکستانی ہے۔ وہاں فلمی صنعت نہ ہونے کے برابر ہو گئی ہے اس لیے میں یہاں کام کر رہا ہوں۔

عدنان سمیع پاکستانی فن کاروں نصرت فتح علی خان، عاطف اسلم، شفقت امانت علی خان اور علی ظفر کے کام کی بہت تعریف کرتے ہیں اور ان کی اس خوبی کو بھی سراہتے ہیں۔ وہ بھارت میں نام اور پیسا کمانے آتے ہیں اور واپس اپنے ملک چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ موسیقی سرحدوں کی پابند نہیں ہوتی۔ لوگ وہ ویڈیو خریدتے ہیں جو انہیں اچھا لگتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس ملک کے فن کار کا ہے۔

میں نے فلم ''تیرے بن لادن'' دیکھی ہے جس میں بہت اچھا کام کیا گیا ہے اور میں اس فلم کو دیکھ کر بہت ہنسا۔ یہ ایک کامیڈی ہے جس میں علی ظفر کی اداکاری غضب کی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ علی ظفر کی یہ فلم پاکستان میں ممنوع قرار دی گئی حالانکہ سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض ایک اچھی کامیڈی ہے۔

ان کے گائے ہوئے گانے اجا بچھڑا بچپن، گوونداوراتی کھر رتی، وہ ہیٹ شدن، ماہیا چودھری اور دوسرے فن کاروں پر فلمائے گئے ہیں۔

عدنان دوبارہ ایک فلم میں کام کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں وہ اب جسمانی طور پر بھی فٹ ہیں اور ان کے البم بھی رومانی فلموں میں ڈھالے جا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عدنان سمیع خان بے حد باصلاحیت بلکہ جینئس فن کار ہیں۔ ایسے جینئس بہت کم ہوتے ہیں۔

عدنان سمیع خان کی گھریلو زندگی ہمیشہ تلخ رہی ہے۔ دو شادیوں کی ناکامی کے بعد بھی انہوں نے تیسرا تجربہ کرنا مناسب سمجھا۔ ان کی تیسری شادی ایک افغان دوشیزہ کے ساتھ ہوئی۔ ان کی دوسری بیوی نے تیسری بیوی پر مقدمہ کر دیا کہ ہم رونوں کی نہیں بنتی اس لیے زویا کو میرا گھر خالی کرنے کی اجازت دی جائے۔

زویا قاربالی نسلاً افغان ہیں لیکن عدنان سے ان کی ملاقات جرمنی میں ہوئی جہاں زویا ایک بین الاقوامی کمپنی میں کام کرتی تھیں۔ ملاقات ہوئی محبت ہو گئی اور پھر شادی۔ وہ ایک ریٹائرڈ جنرل کی بیٹی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ شادی سادگی سے ہوئی جس میں سمیع کا چودہ سالہ بیٹا اذان بھی موجود تھا۔ عدنان نے منگنی میں ایک ہیرے کی انگوٹھی زویا کو دی تھی۔ زویا سے شادی کے بعد ان کی دوسری بیوی صبا گلدار نے عدالت میں مقدمہ کر دیا کہ میرا شوہر مجھ پر تشدد کرتا ہے۔ اس کا اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑا ہوا ہے اور عدنان نے سلگتی ہوئی سگریٹ سے اس کا جسم داغ دیا۔ عدنان نے اس کی تردید کر دی۔ عدالت نے ایک فلیٹ صبا کو دینے کا حکم دیا مگر عدنان کو پروا نہیں ہے۔ اس کے پاس بہت دولت ہے وہ اپنی تیسری بیوی زویا کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہا ہے۔

طارق عزیز خان

برف پوش میدانوں کو پاپیادہ طے کرنے کی چاہ میں وہ قطبین پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے گرم پانیوں کا رخ نہ کر کے برفیلے میدانوں سے نئے راستے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ایک نئے عزم سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

ایک مہم جو کے عزم کی داستان، دلچسپ بیان

دنیا کے بیشتر علاقوں کی دریافت کا سہرا یورپین مہم جوؤں کے سر جاتا ہے جنہوں نے لاکھوں مربع کلومیٹر پر پھیلے گرم سمندروں کی خاک چھانی اور نئے نئے علاقے دریافت کیے۔ مگر بیشتر یورپین مہم جوؤں کی دریافت کی بنیاد دور دراز علاقوں میں سونے چاندی کی تلاش تھی۔ تاہم بہت کم بار ایسے تھے کہ جنہیں وسائل سے مالا مال مشرق و مغرب کے معتدل علاقوں سے زیادہ شمال و جنوب کے برفیلے ویرانوں سے دلچسپی تھی۔ انہیں سونے چاندی سے زیادہ سفید چمکتی ہوئی برف بھلی لگتی تھی۔ انہیں قطبین سے عشق تھا اور دنیا کی چھت ان کی مہم کا محور مرکز تھی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ قطبین پر جمی ہوئی برف کا سلسلہ کتنا دراز تھا۔ ناروے سے تعلق رکھنے والا فرٹ جوف نین سن ایک ایسا ہی مہم جو تھا۔ اس نے 1888ء میں شمالی بحر اوقیانوس میں واقع دنیا کے سب سے بڑے جزیرے گرین لینڈ کو مشرق سے مغرب کی طرف پیدل مہم کے دوران پار کیا۔ اس نے 1893ء میں اپنے ڈیزائن کردہ بحری جہاز میں شمال مشرقی بحری راستے پر سفر کیا اور بحر منجمد شمالی میں 86.13 ڈگری شمال کی انتہائی حد تک رسائی
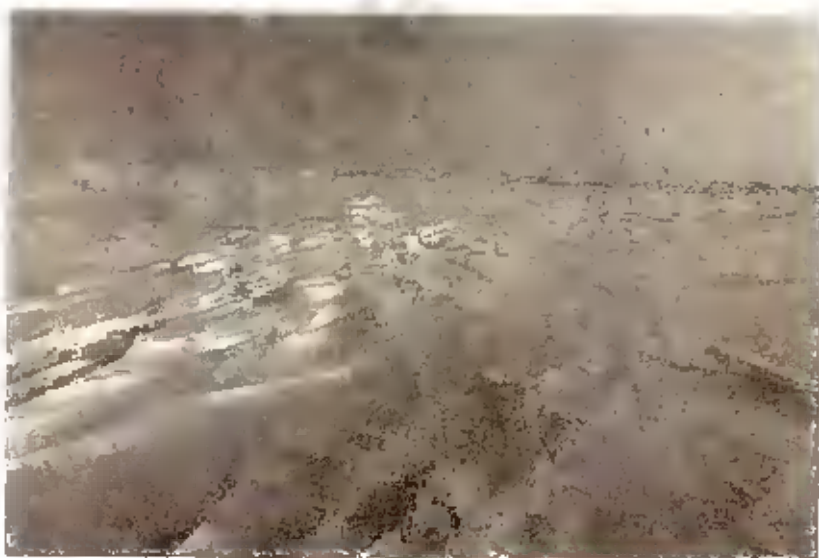
حاصل کی۔ یہ اس وقت تک قطب شمالی کے قریب تر پہنچ جانے کی سب سے بہترین انسانی کوشش تھی۔

فریٹ جوف نین سن 10 اکتوبر 1861ء کو ناروے کے دارالحکومت اوسلو کے چند کلومیٹر شمال میں واقع قصبے اسٹور فروئن میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بالڈور نین سن قانون دان تھا۔ نین سن اس کے تین بیٹوں میں دوسرے نمبر پر تھا۔ بڑے بیٹے کے بچپن میں انتقال کے بعد بالڈور نے نین سن اور اس سے چھوٹے بیٹے کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ نین سن کا بچپن اسٹور فروئن کے دیہاتی ماحول میں گزرا، جہاں مختصر سی گرمیوں میں تیراکی اور مچھلی پکڑنا سب سے بڑی تفریح تھی۔ تاہم نین سن کو شکار سے زیادہ برفیلے موسم سے عشق تھا۔ اسے کہرے میں لپٹے ہوئے برفیلے سمندر پر آوارہ گردی میں لطف آتا تھا۔ برف پر پھسلنا اس کا جنون تھا۔ اسکول میں موسم سرما کی تعطیلات کے آغاز پر جب اس کے دوست رشتے دار پولینڈ اور جرمنی کے نسبتاً معتدل علاقوں میں سیر کے پروگرام ترتیب دیتے تب نین سن کو تین ماہ تک برفیلے موسم میں رہنے کا خیال خوشی سے نہال کر دیتا۔ وہ ناروے کے طویل موسم سرما کے دوران اپنے محبوب مشغلے اسکائی جمپ اور اسکائنگ سے لطف اندوز ہوتا۔ اس نے والدین کے منع کرنے کے باوجود دس سال کی عمر میں اسکائی جمپ کے مقامی مقابلے میں حصہ لیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔

1877ء میں باپ کی وفات کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ اوسلو منتقل ہو گیا۔ نین سن نے 1879ء کی سردیوں میں ناروے میں ہونے والے اسکیٹنگ مقابلے میں حصہ لیا اور 1.6 کلومیٹر ریس میں نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ اس نے اگلے سال اسکیٹنگ میں ناروے کا قومی مقابلہ جیتا جس میں گیارہ ممالک کے کھلاڑی شریک تھے۔ 1881ء میں اس نے یونیورسٹی آف اوسلو میں حیوانات پڑھنے کے لیے داخلہ لیا۔ 1882ء میں اس کے استاد پروفیسر رابرٹ کولیٹ (Robert Collett) نے نین سن کو یونیورسٹی کی طرف سے بحر منجمد شمالی کی مطالعاتی دورے پر جانے کا مشورہ دیا۔

نین سن طالب علموں کے ایک گروپ کے ساتھ بحری جہاز سیلز وائی کنگ پر سوار ہوا جس کا کپتان ایکسل کریف ٹنگ تھا۔ یہ مہم 11 مارچ 1882ء کو اوسلو سے روانہ ہوئی۔ نین سن نے اگلے تین ماہ بحیرہ ناروے میں واقع جزائر سپٹس برگن میں گزارے۔ وہ جولائی کی شروعات میں سپٹس برگن کے مغرب میں واقع دنیا کے سب سے بڑے جزیرے گرین لینڈ پہنچا۔

اسے گرین لینڈ کے ویران ساحلوں میں عجیب سی کشش محسوس ہوئی۔ نین سن نے طے کیا کہ اگر اسے موقع ملا تو وہ گرین لینڈ کے اندرونی حصوں کو دریافت کرے گا۔ اگست میں سیلز وائی کنگ، اوسلو کی بندرگاہ واپس پہنچا۔ نین سن نے اسی سال اوسلو یونیورسٹی سے حیوانات میں ڈگری لی اور اوسلو کے برگن میوزیم میں حیوانات کے شعبے کا سربراہ مقرر ہو گیا۔ میوزیم کی ملازمت کے دوران نین سن کو انسانی دماغ کے کام کرنے کے طریقوں پر تحقیق کا موقع ملا۔ کہاں تو برف پر پھسلنے کا شوق اور کہاں انسانی دماغ کی پیچیدگیاں۔ تاہم نین سن نے یہاں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اس نے میوزیم کی چھ سالہ ملازمت کے دوران دماغ کے نروس سسٹم سے متعلق تحقیقی کام کیا اور اٹلی اور جرمنی کے مطالعاتی دورے کیے۔ وہ 1887ء میں ناروے واپس پہنچا جہاں اس نے یونیورسٹی آف اوسلو میں نروس سسٹم سے متعلق اپنا تحقیقی مقالہ جمع کروایا۔ لگ بھگ یہی وہ وقت تھا جب اس پر ایک بار پھر گرین لینڈ کی سیاحت کا جنون سوار ہوا۔ نین سن نے طے کیا کہ وہ گرین لینڈ کو مشرق سے مغرب کی طرف پیدل مہم کے دوران پار کرے گا۔

بحر اوقیانوس کے شمال میں واقع گرین لینڈ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ جس کا کل زمینی رقبہ 21 لاکھ 75 ہزار دو سو مربع کلومیٹر، شمالاً جنوباً لمبائی 2700 کلومیٹر، درمیان سے چوڑائی 1500 کلومیٹر، ساحلوں کی لمبائی 44 ہزار کلومیٹر اور موجودہ آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ گرین لینڈ کے شمال میں بحر منجمد شمالی، جنوب میں شمالی بحر اوقیانوس، مشرق میں بحیرہ گرین لینڈ اور آبنائے ڈنمارک، مغرب میں خلیج بفن اور آبنائے ڈیوس اور جنوب مغرب میں بحیرہ لیبرے ڈور واقع ہیں۔ گرین لینڈ کے طول و عرض کو برف کی اوسطاً 500 فٹ موٹی تہ نے گھیر رکھا ہے۔ اس تہ کی جزیرے کے وسط میں موٹائی کا اندازہ 11 ہزار فٹ ہے۔ گرین لینڈ کی مشرقی، مغربی اور جنوبی ساحلی پٹی اونچے نیچے سرسبز ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ سفید برف کے مقابلے میں یہ سرسبز علاقہ جزیرے کا صرف 10 فیصد کے قریب ہے۔ 981ء میں گرین لینڈ کا نظارہ کرنے والا اولین یورپین ناروے سے تعلق رکھنے والا بحری قزاق اریک دی ریڈ تھا۔ 1585ء میں برطانوی مہم جو جون ڈیوس نے گرین لینڈ کو مہذب دنیا کے لیے باقاعدہ دریافت کیا۔ 1721ء ڈنمارک نے اسے اپنی نو آبادی بنانے کا اعلان کیا۔ جس کے بعد سے اب تک گرین لینڈ کی حیثیت ڈنمارک کے زیر انتظام علاقے کی ہے۔ گرین لینڈ کی مغربی ساحلی پٹی پر واقع اس کا انتظامی

دارالحکومت نک ہے جس کا پرانا نام گوڈ تھاب تھا۔ نک شہر کی موجودہ آبادی تیس ہزار کے قریب ہے۔ گرین لینڈ کی سرزمین معدنیات خاص کر سیسہ، زنک اور قدرتی گیس کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہاں پائی جانے والی جنگلی حیات میں بارہ سنگھے ریچھ، بھیڑیے، سیلز، ساحلی پرندے اور سیلز نمایاں ہیں۔

فرٹ جوف نین سن نے اپنی مہم سے متعلق سویڈش مہم جو ایڈولف ایرک نورڈنسکی اولڈ سے مشاورت کی۔ نورڈنسکی اولڈ وہ شخص تھا جس نے 79-1878ء میں نہ صرف روس کے شمالی ساحلوں پر واقع شمال مشرقی بحری راستہ دریافت کیا تھا بلکہ 1883ء میں گرین لینڈ کی مغربی ساحلی پٹی کی چھان بین بھی کی تھی۔ نورڈنسکی نوجوان نین سن کے خیالات جان کر خوش ہوا۔ اس نے اسے مشورہ دیا کہ وہ گرین لینڈ کی مہم کے لیے شمالی ناروے سے تعلق رکھنے والے سامی شکاریوں کو ضرور ساتھ رکھے، جنہیں برفیلے علاقوں میں مہمات کا خاص تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ نین سن نے مہم میں حصہ لینے کے لیے پانچ افراد کا انتخاب کیا جن میں جہازراں اٹو سیورڈروپ، ملاح کرسٹین کرسٹینسن، سابقہ فوجی اولف کرسٹین ڈیٹرچ سن اور دو سامی شکاری شامل تھے۔ اس مہم میں سیورڈروپ اور کرسٹینسن کو ساتھ ساتھ کام کرنے کا تجربہ بھی تھا۔ مارچ 1888ء میں نین سن نے اوسلو یونیورسٹی سے حیوانیات میں Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اپریل میں اپنے گروپ کے ساتھ ایک تجارتی بحری جہاز کے ذریعے شمالی بحر اوقیانوس اور بحر منجمد شمالی کی سرحد پر واقع جزیرے آئس لینڈ پہنچا جو اس زمانے میں ڈنمارک کا علاقہ تھا۔ آئس لینڈ میں دو ماہ قیام کے دوران نین سن نے گرین لینڈ کی مہم سے متعلق معاملات کو آخری شکل دی۔ اس نے ریچھ کی کھال کے موٹے لباس، دو خیمے، نارویجی کشتی بنانے کا سامان، خشک گوشت، دوائیں، سرکہ اور خالی کین خریدے۔

3 جون 1888ء کے دن نین سن کا گروپ شمالی آئس لینڈ کی بندرگاہ Isaforance سے ماہی گیروں کے بحری جہاز جیسن پر سوار ہوا۔ اس بحری جہاز نے آئس لینڈ اور گرین لینڈ کے درمیان واقع آبنائے ڈنمارک میں مغرب کی طرف سفر شروع کیا۔ ایک ہفتے کے سفر کے بعد انہیں برف سے ڈھکے گرین لینڈ کے ساحل دکھائی دینے لگے۔ اس دوران ان کا جہاز سمندر میں تیرتے برف کے تودوں کے درمیان پھنس گیا اور ایک ماہ بعد سفر کے قابل ہو سکا۔ 17 جولائی کے دن وہ لوگ گرین لینڈ کے ساحلوں سے 20 کلومیٹر دور تھے کہ نین سن نے باقی کا سفر ایک چھوٹی کشتی میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ

فرٹ جوف نین سن کے بحری جہاز فرام نے بحر منجمد شمالی کی تین سالہ مہم کے دوران مجموعی طور پر 18 ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔ جبکہ نین سن نے اپنی پیدل مہم کے دوران جاتے ہوئے بحر منجمد پر کل 2500 کلومیٹر کا سفر کیا۔ وہ قطب شمالی تک تو نہ پہنچ سکا تاہم اس نے اس وقت تک 86.14 ڈگری شمال کی انتہائی حد تک رسائی کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ نین سن کی مہم کے 13 سال بعد 17 اپریل 1909ء کے دن امریکی مہم جو رابرٹ ایڈون پیری نے قطب شمالی کو دریافت کیا۔ نین سن کی طرح اس کے بحری جہاز فرام کو بھی شہرت حاصل ہوئی جس نے سائبیریا سے سپٹس برگ کے جزائر تک برف کے سمندر کو پار کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ نارویجین مہم جو رولڈ ایمنڈسن نے فرام کے ذریعے 14 دسمبر 1911ء کو قطب جنوبی تک پہلی کامیاب رسائی حاصل کی۔ نین سن کی بحر منجمد شمالی میں سفر کے حالات پر مبنی کتاب Farthest North جنوری 1897ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی یورپ میں ریکارڈ فروخت نے اسے دنیا کے عظیم مہم جوؤں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ 1900ء سے 1906ء کے درمیان نین سن کی کتاب The Norwegian North Polar Expedition کی چھ جلدیں شائع ہوئیں۔ 5-1904ء میں نین سن نے ناروے اور سویڈن کی دو آزاد ملکوں کے طور پر پرامن علیحدگی کے حق میں تحریک چلائی۔ اس تحریک کے نتیجے میں 26 اکتوبر 1905ء کو ناروے اور سویڈن کی کنفیڈریشن ختم ہوئی۔ اس نے 08-1906ء میں برطانیہ کے لیے پہلے نارویجین سفیر کی خدمات سرانجام دیں۔ نین سن نے 1910ء سے 1914ء کے دوران شمالی بحر اوقیانوس، بحر منجمد شمالی اور سائبیریا میں مہمات سرانجام دیں۔ 1914ء میں اس کی کتاب Through Siberia,the Land of the Future شائع ہوئی۔ اسے 1917ء میں امریکا اور 1918ء میں اقوام عالم (League of Nations) کے لیے ناروے کا سفیر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس نے 23-1920ء کے دوران عالمی فلاحی تنظیم ریڈ کراس کے لیے خدمات سرانجام دیں۔ 1922ء میں نین سن کو اس کی خدمات کے اعتراف میں امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ اسی سال نین سن کی کتاب Spitzenbergan منظر عام پر آئی۔ اس نے 1927ء میں اقوام عالم "تخفیف اسلحہ" کمیٹی میں ناروے کی نمائندگی کی۔ 1928ء میں نین سن کی آخری کتاب Armenia and the Near East شائع ہوئی۔ اس نے ناروے کے متعدد سول ایوارڈز حاصل کیے اور ملک کے کئی اہم شعبوں کا سربراہ رہا۔ 13 مئی 1930 حرکت قلب بند ہو جانے سے فرٹ جوف نین سن کا ناروے میں انتقال ہو گیا۔ اقوام عالم نے اس کی وفات کے بعد 1931ء میں Nansen International Office for Refugees کا ادارہ قائم کیا۔ جس نے 1938ء میں امن کا نوبل انعام حاصل کیا۔

سے تین گھنٹوں کے سفر کے بعد اس کی کشتی خط استوا سے 65.30 ڈگری شمال کے خط پر مشرقی گرین لینڈ میں واقع ایک چھوٹی سی خلیج Sermilik Fjord کے کنارے لنگر انداز ہوئی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ آسمان پر گہرے سرمئی بادل چھائے ہوئے تھے اور درجہ حرارت نقطہ انجماد کے قریب تھا۔ نین سن نے پایا کہ یہ کٹے پھٹے ساحلوں پر مشتمل ایک ویران علاقہ تھا جس کے قرب و جوار میں واقع اونچی پتھریلی چٹانوں پر سمندری پرندے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ رہے تھے۔ جبکہ جزیرے کے اندرونی حصے میں تاحد نگاہ برف کی سفید چادر ہی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ نین سن کا گروپ بحری جہاز سے نئی امید اور جوش کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ تاہم موسم اور علاقے کی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ مقام پیدل مہم شروع کرنے کے لیے موزوں نہیں تھا۔

نین سن نے فیصلہ کیا کہ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ کچھ جنوب میں جا کر جزیرے پر قابل رسائی مقام تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ انہوں نے جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے 380 کلومیٹر کا سفر طے کیا اور 29 جولائی کے دن گرین لینڈ کی مشرقی ساحلی پٹی پر خط استوا سے 62 ڈگری جنوب کے خط پر پہنچے۔ تاہم نین سن کے اتفاق نہ کرنے پر انہوں نے دوبارہ شمال کی طرف سفر شروع کیا۔ یکم اگست کے دن ان کی اسکیمو شکاریوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ مقامیوں نے یورپین کو اپنا دشمن خیال کیا اور ان پر تیر برسائے۔ تاہم یورپین کی جوابی فائرنگ کے آگے نہ ٹھہر سکے اور ایک ساتھی کی ہلاکت کے بعد فرار ہوگئے۔

نین سن کی کشتی 11 اگست کے دن گرین لینڈ کی مشرقی ساحلی پر خط استوا سے 64.30 ڈگری شمال اور 40.30 ڈگری ... مغرب کے خط پر واقع ساحلی مقام Umivik کے قریب پہنچی۔ گو کہ یہ جگہ بھی ریتلی چٹانوں اور کٹے پھٹے ساحلوں سے اٹی ہوئی تھی، تاہم یہاں ساحل سے جزیرے کی اندرونی برفیلی سرزمین تک رسائی ممکن دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے گروپ نے کشتی کو ایک چٹان کے ساتھ باندھا، سامان اتارا اور کنارے پر مناسب جگہ دیکھ کر اپنا کیمپ قائم کیا۔

نین سن کے گروپ نے 15 اگست 1888ء کی شام گرین لینڈ کی برفیلی سرزمین پر مغرب کی طرف پیدل سفر کی شروعات کیں۔ ان کی منزل جزیرے کی مغربی ساحلی پٹی واقع بندرگاہ گوڈ تھاب تھی۔ اس زمانے میں گوڈ تھاب اسکیموز اور آئس لینڈ کے ماہی گیروں پر مشتمل پانچ سے سات ہزار کی آبادی پر مشتمل ایک گاؤں تھا۔ نین سن نے آئس لینڈ میں معلومات حاصل کرلی تھیں کہ گوڈ تھاب سے آخری بحری جہاز ستمبر کے وسط یورپ روانہ ہوتا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اگلے ایک ماہ میں وہاں پہنچ کر بحری جہاز پکڑ لیں گے۔ اگلے ایک ہفتے تک کوئی مشکل پیش نہیں آئی اور وہ برف سے ڈھکی اونچی نیچی ڈھلانوں پر مغرب کی طرف گامزن رہے۔ اگست کے تیسرے عشرے کی شروعات میں بارش کے ایک سلسلے نے ان کے بڑھتے قدم روک لیے۔ موسلا دھار بارش اور سرد برفیلی ہواؤں میں سفر جاری رکھنا ممکن نہ رہا۔ انہوں نے برف کے بلاکس سے ایک ہٹ تعمیر کیا اور اس میں دبک گئے۔

بارش اور برف کا طوفان اگلے کئی روز جاری رہا۔

26 اگست کے دن نین سن اس نتیجے پر پہنچا کہ ستمبر کے وسط میں ان کے لیے گوڈ تھاب تک رسائی ناممکن تھی۔ ستمبر کی شروعات میں موسم بہتر ہوا۔ نین سن نے اپنے روٹ میں کچھ تبدیلی کی اور تھوڑا جنوب میں جا کر 64 ڈگری کے خط پر مغرب کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ سفر کے اس مرحلے کے دوران نین سن کے گروپ نے برف سے ڈھکے بلند پہاڑی ٹیلے عبور کیے۔ 11 ستمبر کے دن انہوں نے سطح سمندر سے 8922 فٹ بلند مقام پر اپنا کیمپ لگایا۔ نین سن کے گروپ کو اب تک کے سفر میں کوئی اسکیمو یا کسی پرندے کی آواز تک سنائی نہ دی تھی۔ ان کے چاروں طرف بلند ٹیلوں پر کئی میٹر موٹی برف کی سفید چادر بچھی تھی۔ وہ اسی برف کو پگھلا کر حلق تر کرتے۔ اپنے ساتھ لایا خشک گوشت کھاتے، دوائیں پی کر گزرے دنوں کی اچھی یادیں تازہ کرتے اور اندھیرا ہونے پر برف کھود کر اس میں دبک جاتے۔ ستمبر کے وسط میں صورت حال کچھ بہتر ہوئی جب انہوں نے بلند علاقے سے نیچے کی طرف سفر شروع کیا۔

آنے والے دنوں میں موسم بہتر رہا۔ یہاں تک 29 ستمبر کے دن انہیں پہلی بار برف کی اوٹ سے چمکتا پانی دکھائی دیا۔

یورپین میں جیسے بجلیاں سی بھر گئیں۔ وہ خوشی سے نعرے لگاتے بھاگتے ہوئے آگے بڑھے۔ یہ 64 ڈگری شمال اور 49.30 ڈگری مغرب کے خط پر ایک کٹی پھٹی سمندری خلیج تھی جس میں جابجا برف کے تودے تیر رہے تھے۔ نین سن کے ساتھی جہازراں اوٹو سویرڈرپ نے اپنے پاس موجود سامان کی مدد سے ایک گزارے لائق چھوٹی سی کشتی تیار کی۔ سب لوگ اس میں بیٹھے اور انہوں نے خلیج میں مغرب کی طرف مہم کے آخری مرحلے کا آغاز کیا۔ اگلے چار دن خیریت سے گزر گئے یہاں تک کہ انہیں 13 اکتوبر 1888ء کے دن گوڈ تھاب کی آبادی دکھائی دے گئی۔

نین سن نے 49 دن کے پیدل سفر کے دوران کُل 600 کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔ وہ بالآخر گرین لینڈ کی برفیلی سرزمین کو شکست دینے میں کامیاب رہا۔ حسب توقع گوڈ تھاب سے آخری بحری جہاز یورپ روانہ ہو چکا تھا۔ اب نین سن کے گروپ کے پاس سردیاں اس چھوٹی سی بندرگاہ میں گزارنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ تاہم وہ خوش تھے کہ انہوں نے ایک ناقابل یقین کارنامہ سرانجام دے دیا تھا۔ انہوں نے اگلی سردیاں گوڈ تھاب میں مقامی اسکیموز کے ساتھ گزاریں۔ وہ مقامیوں میں گھل مل گئے۔ انہوں نے ان کے رسم و رواج اور رہن سہن کے طریقوں کو قریب سے دیکھا۔ 15 اپریل 1889ء کو بندرگاہ میں ڈنمارک سے تعلق رکھنے والا پہلا بحری جہاز Hvidbjornen داخل ہوا۔ نین سن اور اس کا گروپ اس بحری جہاز کے ذریعے 21 مئی 1889ء کو ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن پہنچا۔ نین سن نے کوپن ہیگن میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے اپنی کامیابی کا اعلان کیا۔ وہ جون میں اوسلو پہنچا جہاں اس کا ایک ہیرو کے طور پر استقبال کیا گیا۔ برگن میوزیم کی انتظامیہ نے نین سن کو خوش آمدید کہا اور اسے اس کی سابقہ پوزیشن پر بحال کر دیا۔

6 ستمبر 1889ء کو نین سن نے ایوا سارز نامی خاتون سے شادی کی، جو اس کی طرح اسکیٹنگ میں ماہر تھی۔ ایو سے نین سن کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ 1890ء میں فرٹ جوف نین سن کی کتاب The First Crossing of Greenland اور 1891ء میں Eskimo Life منظر عام پر آئی۔ ان دونوں کتابوں کی عوام میں پذیرائی کے بعد نین سن نے قطب شمالی تک رسائی کی مہم جوئی ترتیب دی، جو اس وقت تک غیر دریافت شدہ مقام تھا۔ اس نے جہاز سازی میں ماہر کولن آرچر کی خدمات حاصل کیں اور اگلے ڈیڑھ سال کے دوران، فرام نامی قطبی پولر شپ تیار کروایا۔ بحر منجمد شمالی کے برفیلے پانیوں کے لیے خصوصی طور پر تیار کیے گئے اس بحری جہاز کی لمبائی 128 فٹ، درمیان سے چوڑائی 36 فٹ اور سامنے کا حصہ گول تھا۔ 26 اکتوبر 1892ء کے دن نین سن کی بیوی ایوا نے بحیرہ شمالی کی لاروِک بندرگاہ لیک میں بحری جہاز کا افتتاح کیا۔ اس وقت تک نین سن کی شہرت ایک مہم جو کے طور پر پھیل چکی تھی۔ ناروے سے تعلق رکھنے والے ہزاروں نوجوان اس کے ساتھ بحر منجمد کی مہم پر جانے کے خواہش مند تھے۔ تاہم اس نے خوب چھان پھٹک کر 12 ممبران افراد کی ٹیم تیار کی۔ اس نے گرین لینڈ کی مہم میں شریک اپنے پرانے ساتھی اوٹو سیورڈروپ کو فرام کا کپتان اور اپنا نائب مقرر کیا۔ اس کی ٹیم میں شامل ایک اور رکن سابقہ آرمی لیفٹیننٹ اور برف پر چلنے والی گاڑی (Dog Sledge) میں جوتے جانے والے کتوں کو کنٹرول کرنے کا ماہر جانثار جوہانسن نمایاں تھا۔

فرٹ جوف نین سن کے دیگر اعزازات

ماؤنٹ نین سن، کینیڈا میں یوکان علاقے میں واقع ایک پہاڑ کا نام

ماؤنٹ فرٹ جوف نین سن، انٹارکٹکا میں واقع ایک پہاڑ کا نام

نین سن آئی لینڈ، انٹارکٹیکا میں واقع ایک جزیرے کا نام

فرٹ جوف نین سن انسٹی ٹیوٹ، ناروے میں واقع درس گاہ

ہسٹری آف فرٹ جوف نین سن، 1968ء میں نین سن پر بننے والی فلم کا نام

Nansen Class anti-submarine warfare frigates، ناروے کی شاہی بحریہ کی ایک آبدوز کا نام

نین سن کے پاس موجود پاسپورٹ "نین سن پاسپورٹ" کہلاتا تھا۔ جس کے ذریعے وہ بلا روک ٹوک دنیا کے پچاس ممالک میں آ جا سکتا تھا۔

فرٹ جوف نین سن کی قیادت میں فرام 24 جون 1893ء کو اوسلو کی بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ وہ جون کے آخر میں شمالی ناروے میں واقع بحیرہ بیرنٹس کی بندرگاہ وارڈو پہنچا۔ جہاں قیام کے دوران نین سن نے قطب شمالی تک رسائی کے اپنے راستے کا تعین کیا۔ اس مقام پر اس کے سامنے قطب شمالی کے لیے دو راستے تھے۔ وہ شمال میں اسپٹس برگ کے جزائر میں رکتا ہوا براہ راست قطب شمالی کی طرف بڑھ سکتا تھا۔ جبکہ دوسرا آپشن شمال مشرقی بحری راستے کا تھا۔ وہ اس راستے پر سفر کرتے ہوئے پہلے سائبیریا سے ہوتا ہوا قطب شمالی کی طرف جا سکتا تھا۔ نین سن کو اپنے عملے اور بحری جہاز فرام پر بھرپور اعتماد تھا۔ اس نے قطب شمالی تک رسائی کے سب سے طویل یعنی سائبیریا کے راستے کا انتخاب کیا۔ بعض ذرائع کے مطابق اس راستے کے انتخاب کی وجہ نین سن کا مہم جویانہ مزاج تھا۔ وہ سوئیڈش مہم جو، اڈولف ایرک نورڈنسکی کے دریافت کردہ اس راستے پر سفر کا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔

نین سن کا بحری جہاز 21 جولائی 1893ء کو وارڈو سے

روانہ ہوا۔ اس نے اگلے دو ماہ کے دوران روس کے شمال میں واقع بحیرۂ بیرنٹس اور بحیرۂ کارا کو کامیابی سے پار کیا۔ گو کہ یہ شمالی نصف کرے میں گرمیوں کا موسم تھا، تاہم درجۂ حرارت نقطۂ انجماد کو چھو رہا تھا اور سمندر میں تیرنے برف کے تودے جہاز کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ جہاز کا کپتان اوٹو سیور ڈرپ اپنے پورے تجربے کو بروئے کار لا کر محتاط روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ ستمبر کے دوران بحیرۂ لیپ تو و میں خط استوا سے 78.49 ڈگری شمال اور 132.53 ڈگری مشرق کے خط پر پہنچا۔ جہاں سے قریب ترین سرزمین 278 کلومیٹر جنوب میں واقع روسی جزائر نوسائبیرین تھے۔ اس مقام پر نین سن نے جہاز کا رخ شمال مغرب میں قطب شمالی کی طرف موڑنے کا حکم دیا۔ یہ بحر منجمد شمالی میں موسم سرما کی شروعات تھیں اور جہاز کے اردگرد سمندر میں برف کے ٹکڑوں کا سیلاب دکھائی دے رہا تھا۔ نین سن جانتا تھا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان ٹکڑوں کا رقبہ بڑھتا جائے گا، یہاں تک کہ موسم سرما کے عروج پر برف کی موٹی چادر سمندر کو گھیر لے گی۔ اکتوبر شروع ہوتے ہوتے موسم کے تیور خطرناک دکھائی دینے لگے اور فرام کے لیے مزید ایک انچ بھی آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ وہ اگلے چھ ماہ تک برف میں پھنسا رہا۔ مارچ 1894ء میں جمے ہوئے سمندر میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہوئی۔ اپریل میں اوٹو سیور ڈرپ کی کوشش کے نتیجے میں فرام دھیرے دھیرے برف کو کاٹتا ہوا آگے بڑھا لیکن وہ 1.5 کلومیٹر فی دن کی مایوس کن رفتار سے زیادہ رفتار حاصل نہیں کر پایا۔ نین سن نے اندازہ لگایا کہ اگر یہی حالات رہے تو وہ اگلے پانچ سال میں بھی قطب شمالی تک نہیں پہنچ پائے گا۔ اب نین سن کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اگر وہ ناروے سے براہ راست شمال کی طرف بڑھتا تو شاید اب تک قدرت ان پر مہربان ہو چکی ہوتی۔

انہوں نے موسم گرما کے دوران صورت حال بہتر ہونے کا انتظار کیا لیکن فرام بہت کوشش کر کے بھی 83 ڈگری شمال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ نومبر 1894ء میں نین سن نے اعلان کیا کہ وہ اگلی گرمیوں کے آغاز پر جوہانسن کے ساتھ مل کر کتا گاڑی کے ذریعے قطب شمالی تک رسائی کی کوشش کرے گا۔

14 مارچ 1895ء کے دن نین سن اور جوہانسن نے اپنا سامان ایک کتا گاڑی پر لادا۔ اس وقت تک ان کا بحری جہاز گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہوا خط استوا سے 84 ڈگری شمال اور 95 ڈگری مشرق کے خط پر پہنچ چکا تھا۔ نین سن نے اوٹو سیور ڈرپ کو حکم دیا کہ وہ مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے اسپٹس برگ کے جزائر تک رسائی کی کوشش جاری رکھے جہاں سے انہیں مدد مل سکتی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو الوداع کہا۔ جہاز پر آخری نظر ڈالی اور اپنے ساتھی کے ساتھ کتوں کو ہنکاتا ہوا شمال مغرب کی طرف بڑھ گیا۔

نین سن نے اندازہ لگایا کہ انہیں قطب شمالی تک رسائی کے لیے کم از کم 600 کلومیٹر کے قریب سفر درپیش تھا جبکہ اس کے پاس موسم گرما کے دو ماہ تھے۔ اس نے طے کیا کہ وہ لوگ دن کے وقت کم از کم 13 کلومیٹر کا فاصلہ طے کریں گے۔

سفر کے پہلے ہفتے کی شروعات اچھی رہی لیکن پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ خراب موسم اور خوراک کی کمی کی وجہ سے ان کی رفتار بتدریج کم ہوتی گئی۔ اپریل کے آغاز پر ان کے کتے سست پڑ چکے تھے اور آگے بڑھنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے وفادار جانوروں نے مزید چند دن تک کوشش کی لیکن پھر وہ ہمت ہار گئے۔

7 اپریل 1895ء کے دن فرٹ جوف نین سن اور اس کا ساتھی خط استوا سے 86.14 ڈگری شمال کے خط پر تھے۔ یہ اس وقت تک کسی بھی مہم جو کی طرف سے شمال تک رسائی کا انتہائی ریکارڈ تھا۔ اس مقام پر نین سن نے اپنے پاس موجود خوراک کا جائزہ لیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس خوراک کے سہارے وہ لوگ قطب شمالی تک جا سکتے تھے لیکن پھر واپسی کے سفر کے لیے ان کے پاس کچھ باقی نہ بچتا۔ نین سن نے اپنے وفادار جانوروں کی چند سہولتوں اور مزید سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے بچی کھچی خوراک کے سہارے جنوب کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا۔ ان کی پہلی منزل بحیرۂ بیرنٹس کے شمال میں واقع روسی جزائر فرینز جوزف لینڈ تھے، جہاں سے انہیں مدد ملنے کی امید تھی۔ نین سن کی توقع کے برخلاف واپسی کا سفر کہیں زیادہ طویل اور مشکل ثابت ہوا۔ 24 اپریل کے دن نین سن نے چھ میں سے پہلے کتے کو گولی ماری تاکہ اس کا گوشت باقی کے جانوروں کو کھلایا جا سکے۔ اپریل کے آخر میں انہیں ایک برفانی لومڑی کا خاندان دکھائی دیا۔ سفید بالوں سے بھری خوبصورت لومڑی اور اس کے بچے کئی کلومیٹر تک نین سن کے ساتھ ساتھ رہے۔ مئی کے دوران نین سن نے دو کتے اور ہلاک کیے۔ اس بار بہت مجبور ہو کر اس نے اور جوہانسن نے بھی ان کا گوشت چکھا۔ 31 مئی کو نین سن نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنی منزل سے 93 کلومیٹر دور تھا۔ یہ ایک حوصلہ شکن اندازہ تھا۔ نین سن اور اس کے ساتھی نے اپنی مایوسی دور کرنے کے لیے وائن کے پیگ لیے اور کچھ دیر تک

اچھی یادوں سے دل بہلاتے رہے۔ 10 اگست کو انہوں نے اپنے آخری کتے کو گولی ماری اور اس کا گوشت اپنے لیے محفوظ کرلیا۔ خوش قسمتی سے اگست کے آخر میں دونوں ساتھی فرینز جوزف لینڈ کے شمالی حصے میں پہنچ گئے۔

بحیرہ بیرنٹس کے شمال میں واقع فرینز جوزف لینڈ کے جزائر کا کل زمینی رقبہ 20700 مربع کلومیٹر اور موجودہ آبادی پانچ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں واقع جزائر کی کل تعداد 187 ہے جو 400 کلومیٹر طویل اور 250 کلومیٹر عریض علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جزائر کے درمیان حصے میں واقع سمندر سال کے بیشتر حصے میں جما رہتا ہے۔ یورپین کی آمد کے وقت یہاں اسکیموز کے چند خاندان آباد تھے۔

نین سن اور جوہانسن کو تلاش کے باوجود قرب وجوار کے چھوٹے جزائر میں کوئی مقامی اسکیمو دکھائی نہ دیا۔ شاید وہ آنے والے بے رحم موسم سے بچنے کے لیے جنوب کے گرم علاقوں کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔ نین سن اور اس کے ساتھی کے لیے ان جزائر میں واحد حوصلہ افزا بات سیلز اور سمندری پرندوں کی سرگرمیاں تھیں۔ وہ سیلز کی چربی اور پرندوں کے گوشت کے سہارے سردیاں گزار سکتے تھے۔ نین سن نے اپنے ساتھی کی مدد سے پتھروں کے ساتھ گزارے لائق ہٹ تعمیر کیا۔ سر چھپانے کی جگہ میسر آجانے کے بعد انہوں نے گھات لگا کر چند ایک سیلز اور پرندے شکار کیے اور ان کا گوشت محفوظ کرلیا۔ موسم سرما کے دوران فرینز جوزف لینڈ کے علاقے میں طویل سرمئی شام کے سائے پھیل گئے۔ درجہ حرارت منفی 30 ڈگری سے نیچے گر گیا اور برفانی جھکڑ چلنا معمول بن گیا۔ نین سن اور جوہانسن کے پاس موسم سرما کی واحد مصروفیت ہٹ کے دروازے پر جمی برف ہٹانا تھا۔ وہ فارغ وقت میں پڑے سوتے رہتے یا پھر اپنے خاندان کی باتوں سے دل بہلاتے۔ اپریل 1896ء میں موسم کی صورت حال میں بہتر ہوتے ہی نین سن اور اس کے ساتھی نے سفر کے لیے اپنی تیاریاں شروع کیں۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ فرینز جوزف لینڈ کے درمیان جمے ہوئے سمندر پر سفر کرتے ہوئے جنوبی حصے میں واقع جزائر تک جائیں گے۔ جہاں مقامی اسکیموز یا پھر شمال مغربی یورپ سے آنے کسی بحری جہاز کی نظر ان پر پڑ سکتی تھی۔

دونوں ساتھیوں نے سامان کمر پر لادا اور 19 مئی 1896ء کو ایک نئے عزم سے سفر کا آغاز کیا۔ خوش قسمتی سے اگلے ایک مہینے کے دوران سب کچھ معمول کے مطابق رہا اور وہ جزائر کے جنوب میں پہنچ گئے۔ تاہم انہیں وہاں اسکیموز دکھائی نہیں دیے۔ یہ 17 جون کا دن تھا۔ نین سن اور اس کا ساتھی ایک جگہ رک کر آرام کر رہے تھے کہ انہیں کتوں کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ وہ آواز سن کر چونک پڑے۔ انہیں لگا یہ بھوکی ویلروس (وہ سیلز جن کے باہر نمایاں دانت ہوتے ہیں) ہیں جو ان پر حملہ کرنا چاہتی ہیں۔ دونوں ساتھی ہڑبڑا کر اٹھے لیکن یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں کہ وہ ویلروس نہیں بلکہ سدھائے ہوئے کتوں کا ایک گروپ تھا۔ یہ گروپ برطانوی مہم جو فریڈرک جیکسن کی قیادت میں فرینز جوزف لینڈ کی چھان بین کر رہا تھا۔ فریڈرک لپک کر اجنبیوں کے قریب آیا۔

"کیا تم...... نین سن ہو؟" فریڈرک نے نین سن کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"ہاں......" نین سن مسکرایا۔ "میں وہی ہوں۔"

نین سن کی زبانی اس کے قطب شمالی کے سفر کی داستان سن کر فریڈرک حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی انسان بحر منجمد کے بے رحم موسم میں تین سال تک قدرت سے لڑ سکتا ہے۔ فریڈرک نے اپنے ساتھیوں کو ان کا خیال رکھنے کی خصوصی ہدایت کی۔ وہ انہیں کتا گاڑیوں کے ذریعے کھلے سمندر تک لے گئے۔ 7 اگست 1896ء کے دن نین سن اور جوہانسن برطانوی بحری جہاز ونڈورڈ کے ذریعے یورپ روانہ ہوئے۔ وہ 13 اگست کو ناروے کے بندرگاہ وارڈو پہنچے، جہاں سے تین سال پہلے انہوں نے فرام کے ساتھ اپنی مہم کا آغاز کیا تھا۔ وارڈو سے ٹیلی گرام کے ذریعے اوسلو میں ناروے کی وزارت داخلہ کو نین سن کے بازیاب ہونے کی اطلاع دی گئی۔ جلد ہی یہ خبر پورے یورپ کے نمایاں اخبارات میں شہ سرخیوں سے شائع ہوئی۔ 18 اگست کو نین سن اور اس کا ساتھی قریب ہی واقع بڑی بندرگاہ Hammerfest پہنچے۔ جہاں انہیں خوشخبری ملی کہ ان کا بحری جہاز فرام ٹنس برگ سے شمال مغربی ناروے کی بندرگاہ ٹروسو پہنچ گیا ہے۔ نین سن اور جوہانسن وقت ضائع کیے بغیر ایک تجارتی بحری جہاز سے وابستہ ہو کر 250 کلومیٹر جنوب میں واقع ٹروسو پہنچے۔ وہ ایک طویل عرصے بعد اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے دوبارہ ملے۔ نین سن نے ایک بار پھر اپنی مہم کی قیادت سنبھالی اور فرام کے ساتھ 9 ستمبر 1896ء کو ناروے کی بندرگاہ اوسلو پہنچا۔ جہاں شہری انتظامیہ اور عوام کے جم غفیر نے اپنے ہیروز کا پرجوش استقبال کیا۔ ناروے کے بادشاہ اوسکر دوم (King Oscar II) نے نین سن اور اس کے عملے سے ملاقات کی اور ان کی مہم کو سراہا۔

خطائے ہواباز

ایف۔ کبیر

اس طیارے نے پورے یونان میں ہلچل مچا دی تھی۔ ہوائی فوج مستعد ہو گئی تھی لیکن انہیں خبر نہ تھی کہ اس طیارے کے ہواباز سے ایک بڑی خطا سرزد ہو چکی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی سو افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے

ایتھنز پر سورج طلوع ہو چکا تھا۔ 14 اگست کی صبح مطلع صاف تھا۔ ائرپورٹ پر معمول کی گہما گہمی تھی۔ اچانک ایوی ایشن انتظامیہ کو قبرص کے ہوائی اڈے سے ایک ایسی اطلاع ملی، جس نے ان میں سنسنی پھیلا دی۔

ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ایک آفت یونان کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔ فوراً اعلیٰ حکام سے رابطہ کیا گیا۔ جس نے خبر سنی، اچنبھا رہ گیا۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ممبر نے ائرفورس چیف سے بات کی، جس نے معاملے

کی نزاکت کے پیش نظر فوراً ایف 16 طیاروں کو الرٹ کر دیا۔

آفت انجنز کی فضاؤں میں تیر رہی تھی۔

یہ قبرص کے نمبرے بڑے شہر لارناکا سے اڑان بھرنے والا ہیلوس ایئرویز کا بوئنگ 737 تھا، جو انجنز حکام کے لیے دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ وہ موت کے فرشتے کی مانند تھا۔

اس جہاز نے نو بج کر سات منٹ پر قبرص کا رن وے چھوڑا تھا۔ کچھ دیر بعد کنٹرول روم میں بیٹھے انجینئرز کو کپتان کی جانب سے عجیب و غریب پیغامات ملنے لگے۔ وہ ایک ایسے الارم کی بات کر رہا تھا، جس کا دوران پرواز بج اٹھنا ناممکن تھا۔ کچھ دیر بعد جہاز کا کنٹرول روم سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ ریڈار کے مطابق جہاز مسلسل انجنز کی سمت بڑھ رہا تھا۔ قبرص حکام نے فوراً معاملے کی خبر یونان پہنچائی۔

9/11 کے سانحے کو چند ہی برس گزرے تھے۔ ابھی ساری دنیا اس کے حصار میں ہی تھی۔ ہوائی جہاز دہشت کی علامت بن گئے تھے۔ ایسے میں جب یونانی حکام کو پتا چلا کہ ایک آوارہ جہاز ان کی فضا میں منڈلا رہا ہے، ان کے ہوش اڑ گئے۔ پہلا دھیان دہشت گردی کے امکان ہی کی طرف گیا۔ اور یہ قابل فہم تھا۔ انجنز کی آبادی تیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ جہاز کو بہ طور ہتھیار استعمال کر کے ہزاروں افراد کی جان لی جا سکتی تھی۔

ایئرپورٹ پر تعینات عملے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ تمام نظریں آسمان پر ٹکی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ پراسرار جہاز ایئرپورٹ کے اوپر سے گزر گیا۔ اس کا رخ شمالی پہاڑوں کی سمت تھا۔

ایئرفورس چیف نے اشارہ کیا۔ فائٹر جیٹ ہوا میں بلند ہوئے۔ وہ شاہین سے تیز تھے۔ جلد ہی وہ مشکوک جہاز کے نزدیک پہنچ گئے۔

قبرص سے آنے والی اطلاعات کے مطابق جہاز میں 115 مسافر سوار تھے۔ حکام کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ فائٹر جیٹ کے پائلٹ کو احتیاط برتنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

اس پریشان کن دوپہر ایک فائٹر جیٹ بوئنگ 737 کے عین پیچھے تھا تاکہ کسی بھی ممکنہ خطرے کے وقت بھرپور کارروائی کر سکے۔ دوسرا جیٹ طیارے کے دائیں جانب پرواز کر رہا تھا۔

جیٹ کے پائلٹ نے جہاز پر نظر ڈالی اور جو منظر اس نے دیکھا وہ حیرت انگیز تھا۔

وہاں کوئی دہشت گرد ہاتھ میں بندوق لیے نہیں گھوم رہا تھا۔ مسافروں کے چہروں پر رنج والم نہیں تھا بلکہ ایک ایسی کیفیت تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ وہ عمل تنویم کے زیر اثر لگتے تھے۔

اس عجیب و غریب منظر نے پائلٹ کے تجسس کو مہمیز کیا۔ وہ اپنے طیارے کو جہاز کے خطرناک حد تک نزدیک لے گیا۔ اب وہ کاک پٹ میں براہ راست جھانک سکتا تھا۔

وہاں بھی تحیر چھایا تھا۔ کپتان کی کرسی خالی تھی۔ معاون پائلٹ آگے کو جھکا ہوا تھا۔

”وہاں کوئی حرکت نہیں ہے۔“ اس نے کنٹرول روم کو آگاہ کیا۔ ”جہاز کسی آسیب کے زیر اثر معلوم ہوتا ہے۔“

پائلٹ کے پیغام نے حالات کو مزید گمبھیر بنا دیا۔ آوارہ جہاز بے قابو تھا۔ وہ کہیں بھی گر سکتا تھا۔

”رکو رکو۔ کاک پٹ میں کچھ حرکت نظر آئی ہے۔“ پائلٹ کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ ”یہ ایک آدمی ہے۔ اس نے عملے کا لباس زیب تن کر رکھا۔ اس نے کپتان کی کرسی سنبھال لی ہے۔ خدایا، کیا وہ دہشت گرد ہے؟“

کنٹرول روم نے فوراً بوئنگ 737 سے رابطہ کیا، اس امید پر کہ کاک پٹ میں موجود شخص انہیں سن سکے گا مگر ان کے ہاتھ فقط ناکامی آئی۔

فائٹر جیٹ کے پائلٹ نے کاک پٹ میں بیٹھے شخص کو ہاتھ ہلا کر اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس نے اسے آگے بڑھتے رہنے کا اشارہ کیا۔ جواب میں اس پراسرار شخص نے عجیب حرکت کی۔ اس نے تین بار زمین کی سمت اشارہ کیا۔

اگلے ہی لمحے جہاز دائیں جانب گرنے لگا۔ وہ تیر کی طرح زمین کی طرف جا رہا تھا۔ فائٹر جیٹ کے دونوں سوار اسے بے بسی سے گرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

اگلے ہی لمحے زوردار دھماکا ہوا۔ ہوائی تاریخ کا پُراسرار ترین واقعہ رونما ہو چکا تھا۔

☆☆☆

شمالی پہاڑی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایمبولنس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں جائے وقوعہ کی سمت دوڑ پڑیں۔ امدادی عملہ فوراً متحرک ہو گیا۔

خبر فقط قبرص اور یونان تک محدود نہیں رہی۔ دنیا بھر کے چینلز نے جہاز کی تباہی کی خبر نشر کی۔ ساتھ ہی انہوں نے

ان عجیب و غریب واقعات کا بھی تذکرہ کیا جو فیرس سے روانہ ہونے ہی رونما ہونے لگے تھے۔

انفرادی لمحات میں جو کچھ ہوا، اس نے سب کو مخمصے میں ڈال رکھا تھا۔

لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، بوئنگ 737 کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا یہ دہشت گردی کی کارروائی ہے؟ وہ پُراسرار شخص کون تھا؟

یہ نکتہ بھی زیرِ بحث تھا کہ دہشت گرد تنظیموں نے کیوں چپ سادھ رکھی ہے؟ وہ واقعے کی ذمے داری کیوں نہیں قبول کر رہیں؟

کچھ لوگوں نے افواہ اڑا دی کہ جہاز گر کر تباہ نہیں ہوا بلکہ یونانی فضائیہ نے خطرے کے پیشِ نظر اسے مار گرایا تھا۔ یونانی حکام کی جانب سے اس پر سخت ردِعمل آیا۔ انہوں نے اس نوع کی رپورٹنگ کو انتہائی غیر ذمے دارانہ اور شرمناک قرار دیا۔

مرنے والوں کی فہرست جلد ہی سامنے آ گئی۔ جہاز میں کُل 121 افراد سوار تھے، 115 مسافر اور چھ افراد پر مشتمل عملہ۔ یونانی حکام 118 افراد کی لاشیں حاصل کر سکے۔ تین لاشیں کبھی نہیں ملیں۔ انتظامیہ کا کہنا تھا کہ وہ بدقسمت چیتھڑوں میں تبدیل ہو گئے، البتہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں غائب کر دیا گیا۔

مرنے والے 103 افراد کا تعلق قبرص سے تھا، جن کے اہلِ خانہ شدید صدمے کے زیرِ اثر تھے۔ وہ گریبان چاک کیے سڑکوں پر نکل آئے۔ سینہ پیٹنے لگے۔ قبرص نے تین روزہ سوگ کا اعلان کر دیا۔

مرنے والوں کے اہلِ خانہ نے شفاف تحقیقات کا مطالبہ کر دیا۔ عالمی دنیا بھی اس معاملے میں خصوصی دلچسپی لے رہی تھی، خصوصاً امریکا کی نظریں اس خطے پر ٹکی تھیں۔

اس ضمن میں ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کو پُراسراریت کی دھند چیرتے ہوئے حقائق سامنے لانے تھے۔

اور یہ کسی طور سہل نہیں تھا۔

☆☆☆

اس کا ذہن واقعے کو دہشت گردوں کی کارروائی قرار دے رہا تھا مگر دل متذبذب تھا۔

ایوی ایشن کے وسیع تجربے کے حامل افسر اکیر یاز سولاکی کو تحقیقاتی کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ وہ ایک سخت جان آدمی تھا۔ ذمے داریاں ملتے ہی وہ فوراً یونان روانہ ہو گیا۔ سب سے اہم مسئلہ فلائٹ ڈیٹا ریکارڈر اور کاک پٹ ریکارڈر کا حصول تھا۔ یونانی حکام کی کوششوں سے جہاز کے ملبے کا بڑا حصہ پہاڑی سے اکٹھا کر لیا گیا تھا۔ فلائٹ ڈیٹا ریکارڈر بھی انہیں مل گیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ خاصی خستہ حالت میں تھا۔

یہ سوچ کر کہیں ذرا سی بے احتیاطی ریکارڈنگ ضائع نہ کر دے، سولاکی نے اسے پیرس روانہ کر دیا، جہاں اسے پرکھنے کے لیے جدید ترین سہولیات دستیاب تھیں۔

اس نے فائٹر جیٹ کے دونوں پائلٹوں کے تفصیلی انٹرویو کیے۔ وہ جوان جس نے کاک پٹ پر آخری لمحات میں نظر ڈالی تھی، اس نے ان الفاظ میں اپنے خیالات قلم بند کروائے: ”وہ منظر اتنا عجیب تھا کہ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ جہاز کسی منحوس ذات کے زیرِ اثر تھا۔ اور پھر وہ اجنبی۔ کس طرح اس نے زمین کی سمت اشارہ کیا اور کچھ ہی لمحوں بعد جہاز زمین پر گر کر تباہ ہو گیا۔ میں کبھی اس واقعے کو نہیں بھول پاؤں گا۔“

ایتھنز ائرپورٹ کے کنٹرول روم کی ریکارڈنگ بھی حاصل کی گئی۔ سولاکی نے اس اسپتال کا بھی رخ کیا جہاں تباہ شدہ جہاز سے ملنے والی لاشیں لے جائی گئی تھیں۔

وہاں کے افسرِ اعلیٰ نے ایک اہم انکشاف کیا۔

”حادثے کے وقت وہ سب زندہ تھے۔“

”کیا مطلب؟“ افسر چونکا۔

”ہاں۔“ اس نے تاسف سے گردن ہلائی۔ ”ان سب کی موت جہاز کریش ہونے سے ہوئی۔ ممکن ہے کہ وہ بے ہوش ہوں، مگر ان میں سے کوئی ایک شخص بھی ہلاک نہیں ہوا تھا۔ جہاز کے زمین سے ٹکرانے تک وہ سب... زندہ تھے۔“

”ہوں۔“ اس نے ٹھوڑی کھجائی۔ ”مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ درکار ہو گی۔“

وہ مسافروں کی فہرست کھنگال چکا تھا۔ عام طور پر اس فہرست سے تفتیش کاروں کو کوئی سراغ نہیں ملتا مگر سولاکی کو دو ایسے افراد کے نام مل گئے تھے جنہیں شاید اس فلائٹ پر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پہلی تھی بتیس سالہ لیوسا ویتری۔ لیوسا جہاز کے عملے میں شامل تھی۔ اس نے اپنی ایک بیمار ساتھی کی جگہ لی تھی۔ اس پر شک کا کوئی جواز نہیں تھا۔

دوسرا تھا، پچیس سالہ اینڈریوس

پروڈز ریویں۔ ایئر ریوس بھی عملے ہی کا حصہ تھا۔ اس روز اس کی ڈیوٹی نہیں تھی مگر اس نے یہ کہہ کر اجازت حاصل کر لی کہ وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا ہے۔

"کیا وہ وحشت گردوں کا آلۂ کار تھا؟" سولا کی کے ذہن میں یہ سوال گردش کر رہا تھا۔

ملبے اور دیگر ضروری دستاویزات لے کر لوٹنے کے بعد سولا کی فوراً کام پر لگ گیا۔

پُراسراریت اتنی گہری تھی کہ کوئی کسی انکشاف کی توقع نہیں کر رہا تھا، مگر خلافِ توقع انہیں جلد ایک کامیابی ملی۔ تفتیش کار جان گئے تھے کہ جہاز پرواز کرتے کرتے کیوں زمین پر جا گرا۔

اب تک یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ کاک پٹ میں نظر آنے والے پُراسرار شخص نے جہاز کا رخ زمین کی سمت موڑ دیا، مگر اب انہیں پتا چلا کہ اس کے گرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس میں ایندھن ختم ہو گیا تھا۔ پہلے دایاں انجن بند ہوا اور بدقسمت جہاز نے اپنا توازن کھو دیا۔ چند لمحوں بعد ہی دوسرا انجن بھی خاموش ہو گیا۔

سولا کی نے ہیلوس ائرویز کے خلاف سرچ وارنٹ حاصل کر لیے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ جاننا ازحد ضروری تھا کہ اس روز آخر ہوا کیا تھا۔ اور یہ معلومات ہیلوس ائرویز کے دفتر ہی سے مل سکتی تھی۔

سولا کی کو ماضی بازیافت کرنا تھا... جس میں ایک راز چھپا ہوا تھا۔

☆☆☆

رات چھٹنے کا وقت تھا، جب جہاز لندن سے قبرص پہنچا۔ اب اسے ایتھنز کے لیے اڑان بھرنی تھی۔

کچھ دیر بعد مسافر اس میں سوار ہونے لگے۔ ایتھنز تک بھگ سوا گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ اور اس مختصر عرصے میں کسی گڑبڑ کا دور دور تک امکان نہیں تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ آسمان میں سورج چمک رہا تھا۔

58 سالہ ہینس مارٹن جہاز کا کپتان تھا۔ وہ ایک جرمن تھا۔ موسم گرما میں مصروفیات بڑھ جاتی ہیں۔ ان ہی دنوں کے لیے ہیلوس ائرویز نے اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ جہاز اڑانے کا 35 سالہ تجربہ رکھتا تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس کا معاون پیمپس نامی ایک شخص تھا۔ وہ مقامی تھا، عمر 51 برس۔ اسے بھی پرواز کا ٹھیک ٹھاک تجربہ تھا۔

ہیلوس ایک سستی ائرلائن تھی۔ ایک چھوٹی سی کمپنی، کل ایک درجن ہوائی جہاز۔ مختصر پرواز کے دوران وہ مسافروں کو کھانا وغیرہ بھی پیش نہیں کرتے، تاہم مسافرین نے کبھی شکایت نہیں کی۔ کم نرخوں کی وجہ سے وہ اُسے پسند کرتے تھے۔ جانے والے روز بھی جہاز پوری طرح بھرا ہوا تھا۔

کاک پٹ میں معمول کی کارروائی جاری تھی۔ ہینس مارٹن نے جرمن لہجے میں اپنے ساتھی پیمپس سے پوچھا۔ "تمام آلات چیک کر لیے؟"

"لگ بھگ۔" اس نے ایک پینل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"تو چلو سفر شروع کرتے ہیں۔" کپتان نے کہا۔

جہاز کا انجن جاگ اٹھا۔ کنٹرول روم سے اشارہ ملتے ہی اس کے پہیے حرکت میں آ گئے۔ وہ رن وے پر دوڑنے لگا۔ اگلے ہی لمحے وہ فضا میں تھا۔ نو بج کر آٹھ منٹ پر وہ نیلے آسمان میں داخل ہو گیا۔

سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ موسم خوشگوار، مطلع صاف۔ کاک پٹ میں اطمینان میں تھا۔

"ہم ساڑھے تین ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں۔" مارٹن نے مائیک میں کہا۔

"او کے۔" کنٹرول روم سے جواب آیا۔

اچانک ایک نامعلوم ساعت کر لمحہ کاک پٹ میں داخل ہوا۔ معاون پائلٹ پیمپس کو اپنے کاندھے میں چبھن محسوس ہوئی، پھر اس کے کانوں میں جھنجھناہٹ ہوئی۔ ٹھیک اسی پل ایک الارم بج اٹھا۔ پیلے رنگ کی بتی جلنے بجھنے لگی۔

"یہ کیا مصیبت ہے؟" مارٹن نے جرمنوں کے سے انداز میں ہاتھ جھٹکے۔

"یہ..." پیمپس متذبذب تھا۔ "یہ تو ٹیک آف کنفیگریشن وارننگ معلوم ہوتی ہے۔"

ٹیک آف کنفیگریشن وارننگ سے مراد یہ ہے کہ جہاز فی الحال پرواز کے لیے تیار نہیں۔

"اوہ ہاں۔ آواز تو ٹھیک ویسی ہی ہے..." کپتان نے آنکھوں سے ماتھا رگڑا۔ "مگر یہ تو فقط رن وے کے لیے مخصوص ہے۔ دورانِ پرواز اس کا کیا کام؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" پیمپس سوئچ بورڈ کا جائزہ لے رہا تھا۔

کپتان نے کنٹرول روم میں بیٹھے انجینئر سے رابطہ کیا۔

جرمن لہجے میں بولی جانے والی انگریزی، انجینئرز بمشکل سمجھ سکے۔ اور جب انہیں پتا چلا کہ کاک پٹ میں ٹیک آف کنفیگریشن الارم بج رہا ہے تو وہ ٹھٹکے۔

"ہمارے لحاظ سے تو سب کچھ ٹھیک ہے۔" انجینئر بالسن نے جواب دیا۔ "آپ حالات کا پھر جائزہ لیں۔"

معاون پائلٹ نے ایک سوئچ دبایا۔ الارم بند ہو گیا۔ اسے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ہم مزید بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔" کپتان نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ وہاں پسینے کے قطرے تھے۔

ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ پینل پر مختلف بتیاں جلنے بجھنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے خطرے کی نشان دہی کرنے والا مرکزی الارم چیخا۔

"خدایا یہ کیا ہو رہا ہے؟" جیمس کے منہ سے نکلا۔

"یہ تو جہاز کے گرم ہونے کا اشارہ ہے۔"

کپتان نے فوراً کنٹرول روم کو آگاہ کیا۔ انجینئرز سر کھجانے لگے۔ ٹھیک ان ہی لمحات میں کیبن میں کچھ ہوا۔ مسافروں کی سیٹ کے اوپری حصے میں لگے آکسیجن ماسک کی بتیاں جل اٹھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتے، آکسیجن ماسک ایک جھٹکے سے باہر آ گئے۔ وہ کسی عفریت کے مانند ان کے سامنے لہرا رہے تھے۔

عملے کی ہدایت پر مسافروں نے ماسک پہن لیا۔ عملہ بھی احتیاطی ہدایات کے مطابق اپنی سیٹوں پر جا بیٹھا۔

معاون پائلٹ جیمس کو شدید گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ خطرے کا الارم اس کے کانوں میں چیخ رہا تھا۔ اس نے عجلت میں ایک بٹن دبا کر اسے خاموش کر دیا۔

"آلات گرم ہو گئے تھے۔ اندر حبس ہو رہا تھا۔" کپتان مسلسل بولے جا رہا تھا۔ حواس بکھر رہے تھے۔ کپتان کو قطعی یہ اندازہ نہیں تھا کہ پیچھے کیبن میں سراسیمگی پھیل گئی ہے۔ سب مسافر منہ پر ماسک چڑھائے زندگی کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔

انجینئر پولسن اپنا تمام تر تجربہ بروئے کار لاتے ہوئے معاملے پر غور کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے سوال کیا۔ "یہ فرمائیں پریشرائزیشن سوئچ اس وقت آٹو پر ہے یا مینول پر؟"

یہ سسٹم دوران پرواز جہاز میں داخل ہونے والی ہوا کو کنٹرول کرتا ہے۔

کپتان کے سامنے اور دس ہزار مسئلے تھے۔ اس نے انجینئر کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ، آلات کو ٹھنڈا رکھنے والا مرکزی سرکٹ کہاں ہے؟ جرمن جہازوں میں تو سیٹ کے پیچھے ہوتا ہے؟"

"کیا پریشرائزیشن پینل اس وقت آٹو پر ہے؟" انجینئر نے سوال دہرایا۔ مگر کپتان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سیٹ چھوڑ چکا تھا۔ کاک پٹ وائس ریکارڈر نے پھر کبھی اس جرمن کی آواز نہیں سنی۔

معاون پائلٹ جیمس نے اسے بے بسی سے لڑکھڑا کر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اوہ خدا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔" اس نے اپنا سر تھام لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ خود بھی آگے کی طرف جھک گیا۔ یوں جیسے بھیانک غنودگی اس پر آن پڑی ہو۔

کاک پٹ میں خاموشی تھی۔ انجینئرز کو اپنے پیغامات کا کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔

وہ بار بار سوال دہرا رہے تھے۔ ریڈار پر جہاز کو دیکھ سکتے تھے۔ وہ انجینئرز کی سمت بڑھ رہا تھا۔ کنٹرول روم میں نصب آلات جہاز سے متعلق معلومات فراہم کر رہے تھے مگر کاک پٹ سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ شاید وہاں کوئی پراسرار مرض پھیل گیا تھا۔

اڑان کے ٹھیک تیس منٹ بعد کنٹرول روم کا جہاز سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ تین گھنٹے بعد یہ جہاز یونان کی پہاڑیوں میں گر کر تباہ ہو گیا۔

☆☆☆

معاملہ پیچیدہ تھا اور کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ سولا کی سر پکڑے بیٹھا تھا۔ صورت حال گمبھیر تھی۔ یہ دہشت گردی کی کارروائی نہیں لگتی تھی۔ گھوم پھر کر یہی خیال دماغ میں آتا کہ شاید جہاز پر بدروحوں نے حملہ کر دیا ہو۔

ان ہی دنوں ایک مقامی اخبار میں بدقسمت جہاز سے متعلق ایک سنسنی خیز اسٹوری شائع ہوئی۔

ہلاک ہونے والے ایک مسافر کے رشتے دار کی جانب سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ جہاز کریش ہونے سے چند منٹ قبل اسے عجیب ٹیکسٹ میسج موصول ہوا تھا۔ پیغام کچھ یوں تھا "جہاز کا عملہ بگڑ گیا ہے۔"

رپورٹ میں ایک اور ٹیکسٹ میسج کا تذکرہ تھا۔ پیغام بھیجنے والے نے لکھا تھا "پائلٹ مر چکا ہے، اور ٹھنڈ سے ہم جم رہے ہیں!"

اخبار کے مطابق بدقسمت جہاز کو کسی زہریلی گیس کے

ذریعے نشانہ بنایا گیا جس نے مسافر اور عملے کو بے ہوش کر دیا۔ جہاز میں سوار دہشت گرد نے کسی ذریعے سے خود کو اس سے محفوظ رکھا اور ایتھنز میں داخل ہونے کے بعد اُسے زمین پر گرا دیا۔

موسم برسات کی ایک شام تفتیشی کمیٹی کے ایک رکن نے جب سولاکی سے اس بابت رائے پوچھی تو اس نے کہا۔

"معاملہ بہت الجھا ہوا ہے درست۔ یہ سچ ہے کہ جہاز میں سوار ہر شخص بے ہوش ہو گیا تھا مگر ایک ایسا آدمی بھی تھا جس کے حواس سلامت تھے۔ وہ کاک پٹ تک آیا۔ اس نے کپتان کی کرسی سنبھالی...."

"اور پھر جہاز کو زمین پر گرا دیا۔" اس کا ساتھی پٹ سے بولا۔

"نہیں۔" سولاکی نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ہم جانتے ہیں کہ جہاز فیول ختم ہونے کی وجہ سے گرا۔ اس میں بالکل بھی ابہام نہیں تھا۔"

"آپ کے خیال میں اس واقعے میں کون سی دہشت گرد تنظیم ملوث ہو سکتی ہے؟" ایک خاتون نے پوچھا۔

"دہشت گرد تنظیم...." وہ بڑبڑایا۔ نظریں کھڑکی پر لگی تھیں، جہاں بارش کا پانی دستک دے رہا تھا۔ "دیکھیے، مجھے غلط مت سمجھیں۔ مجھے اس واقعے کا بہت دکھ ہے، مگر مجھے یہ دہشت گردی کا واقعہ نہیں لگتا۔"

"کیا بات کر رہے ہیں جناب۔" اسی نوجوان نے کہا، جس نے رپورٹ کا تذکرہ چھیڑا تھا۔ "یہ بالکل 9/11 جیسا واقعہ ہے۔ میری چند امریکیوں سے بات ہوئی ہے۔ وہ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔"

"امریکی جائیں بھاڑ میں۔" سولاکی نے رجبرے سے کہا۔ "مجھے ان کی پروا نہیں۔ کچھ حلقوں کے مطابق خود 9/11 کا واقعہ انتہائی مشکوک ہے۔ خیر، ہمیں اپنے مسئلے پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ وائس ریکارڈر جلد پیرس سے آجائے گا۔ ڈی این اے ٹیسٹنگ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اُمید ہے جلد ہی ہم کوئی سرا پکڑ لیں گے۔"

"مجھے آپ کی بات سے مایوسی ہوئی جناب۔" نوجوان نے تاسف سے سر ہلایا۔ "ذرا سوچیے تو سہی۔ جہاز کے 120 مسافر بے ہوش۔ ایسے میں ایک شخص کاک پٹ میں آتا ہے اور دس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے جہاز کو زمین پر گرا دیتا ہے۔ یہ کس قدر واضح ہے۔ یہ دہشت گردوں کی کارروائی ہے مگر آپ ماننے کو تیار نہیں۔"

"ہمیں تھوڑا انتظار کرنا چاہیے۔" سولاکی نے دھیرے سے کہا۔ باہر بادل زور سے گرجے۔

☆☆☆

"اینڈریوس کس دہشت گرد تنظیم کے لیے کام کرتا تھا؟" سولاکی کا لہجہ کرخت تھا۔

کرسی پر بیٹھے آدمی نے پہلو بدلا۔ اس کی عمر لگ بھگ تیس برس ہوگی۔ نام لیزاروز تھمز تھا۔ وہ ہیلیوس ایئرویز میں سینئر ٹریز تھا اور حادثے میں ہلاک ہونے والے فلائٹ اٹینڈنٹ اینڈریوس کا قریبی دوست تھا۔

"میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"زیادہ بنو مت لڑکے۔" تفتیشی کمیٹی کے ایک رکن نے کہا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ "ڈی این اے ٹیسٹ کے مطابق کاک پٹ سے ملنے والی لاش اینڈریوس کی ہے۔"

"اچھا؟" لیزاروز متذبذب تھا۔ "اوہ یاد آیا... وہ گزشتہ کچھ ماہ سے جہاز اڑانے کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ آخری بار ملا تھا تو بتا رہا تھا کہ وہ 260 گھنٹوں کی تربیت مکمل کر چکا ہے۔ بہت خوش تھا اس روز۔ شاید... شاید وہ جہاز کو تباہی سے بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔"

"اوہ واقعی؟" ایک افسر ہنسا۔ "تو ذرا یہ تو بتاؤ کہ وہ جہاز کے دیگر مسافروں کے مانند بے ہوش کیوں نہیں ہوا؟ ہمیں شک ہے کہ پہلے اس نے زہریلی گیس سے لوگوں کو بے ہوش کیا اور پھر...."

"نہیں یہ ناممکن ہے۔" لیزاروز چلایا۔ "وہ ایک اچھا انسان تھا۔ وہ پائلٹ بننا چاہتا تھا۔ ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا جو اسی سانحے میں اپنی جان سے گئی۔ اس کا ایک خاندان ہے۔ وہ ایسا کیوں کرے گا؟"

اس کی آواز رندھ گئی۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ "اس معمے کو سلجھانے میں ایک ذمے دار شہری کی حیثیت سے میں آپ سے ہر ممکن تعاون کروں گا جناب۔ لیکن اگر آپ اینڈریوس کو قصوروار ٹھہرانا چاہتے ہیں تو اجازت دیں۔ وہ ہمارا مخلص ساتھی تھا۔"

وہ اٹھا اور دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔

"مسٹر لیزاروز۔" افسر سولاکی کی آواز سنائی دی۔ "ممکن ہے ہم آپ کو پھر زحمت دیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے سے باہر چلا

کہا۔

☆☆☆

مون سون شروع ہو گیا۔ لوگ چھتری لے کر گھر سے نکلنے لگے۔ فیرس بھیگ رہا تھا۔

عجیب و غریب انکشافات ہونے لگے۔ وائس ریکارڈر کا ڈیٹا فیرس تک پہنچ چکا تھا۔ اس میں ابتدائی تین سے تیس ریکارڈنگ بھی جس کے بعد اگلے ڈھائی گھنٹے تک پُراسرار خاموشی کا قبضہ رہا۔ البتہ آخری حصے میں... خاموشی ٹوٹ گئی۔

انتہائی نحیف آواز میں پانچ بار لفظ ”مدد“ دہرایا گیا تھا۔ لہجے سے ظاہر تھا کہ مدد مانگنے والا شخص شدید اذیت میں ہے۔

آفیسر سولاکی اس ریکارڈنگ پر کام کر رہا تھا کہ ایک اور چونکا دینے والی خبر ملی۔

کو پائلٹ جیمسن کی لاش اس حالت میں ملی تھی کہ اس کا مردہ جسم سیٹ بیلٹ سے مضبوطی سے بندھا تھا۔ ابتدائی شواہد اور فائٹر جیٹ کے پائلٹ کے بیان کی روشنی میں یہ طے تھا کہ کریش کے وقت اُن کے چہرے پر آکسیجن ماسک نہیں تھا۔ مگر جانچ سے پتا چلا کہ جیمسن کی نشست کے اوپر نصب آکسیجن ماسک ایک بار استعمال کیا گیا تھا۔ اس میں معاون پائلٹ کے ڈی این اے سیمپل ملے تھے۔

سولاکی نے کھوپڑی کھجائی۔ بھلا یہ کس طرح ممکن تھا۔ اگر اس نے آکسیجن ماسک استعمال کیا تھا تو آخری لمحات میں اُسے کس نے ہٹایا؟ اور کیوں؟ معاون پائلٹ تو بے ہوش تھا۔

وہ پھر ریکارڈنگ کی جانب متوجہ ہوا۔

”مدد... مدد... مدد...“ اینڈریوس کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔

”اس نے پانچ بار مدد کے لیے پکارا مگر وہاں اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔“ سولاکی بڑبڑایا۔ ”ریڈیو یقینی طور پر فیرس کی فریکوئنسی پر سیٹ ہوگا۔ انجینئر کے آلات تک اینڈریوس کی آواز پہنچ ہی نہیں رہی ہوگی۔“

اگلے کئی گھنٹے وہ اس لڑکے کے متعلق سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے اینڈریوس کے باپ کانسٹنٹن سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

شام ڈھلے وہ لوبارنا کے مضافات میں واقع ایک کشادہ مکان کے لان میں بیٹھا تھا۔

”وہ بہت بہادر لڑکا تھا۔“ اس کے باپ نے دھیرے سے کہا۔ وہ خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ بارش رک چکی تھی۔

”بلاشبہ۔“ سولاکی نے گردن ہلائی۔

”وہ لائسنس یافتہ پائلٹ تھا۔ جہازوں کی بابت جانتا تھا مگر اس کا تجربہ کام نہیں آیا۔“ آدمی کی آنکھوں میں نمی تھی۔

”میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ جب مجھے خبر ملی کہ آخری لمحات میں ایک نوجوان کاک پٹ میں دیکھا گیا تھا، تب ہی میں سمجھ گیا تھا... وہ ضرور اینڈریوس ہوگا۔ میرا اینڈریاس۔ پورے فیرس کو اس پر فخر کرنا چاہیے۔“

”آپ نے درست فرمایا جناب۔“ سولاکی کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے اجازت دیجیے۔“

وہ رات گئے تک اپنے دفتر میں بیٹھا رہا۔ یہ کیس اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اینڈریوس کے الفاظ اس کے کانوں میں گردش کرنے لگے۔ ”مدد... مدد... مدد...“

☆☆☆

آسمان گھنے بادلوں سے بھر گیا۔ تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ کچھ ہی دیر بعد بارش شروع ہو گئی۔

لیزاروز اپنے گھر کی بالکونی میں بیٹھا تھا۔ وہ مضمحل معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھ میں بیئر کا کین تھا۔ جس روز سے وہ تفتیشی ٹیم سے الگ ہوا تھا، طبیعت پر بوجھ سا تھا۔ وہ پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی جدائی پر غمگین تھا اور پرسے یہ کہ اس کے عزیز دوست پر الزامات دھرے جا رہے ہیں۔

بارش تیز ہو گئی۔ سڑکیں خالی ہونے لگیں۔ لیزاروز نے اپنا سر کرسی پر ٹکا لیا۔ کچھ لمحوں بعد وہ غنودگی میں چلا گیا۔

وہ خواب کی پُراسرار دنیا تھی۔ لیزاروز ہوائی جہاز میں تھا۔ اچانک ایمرجنسی کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ عجیب و غریب کھٹ پٹ ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے دھاتیں ٹکرا رہی ہوں۔ سب نے سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔ اس کی نشست دروازے کے پاس ہی تھی اور وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ دروازہ بری طرح ہل رہا ہے۔ اس کی ربڑ کی سیل غائب تھی۔ ایک درز سی بن گئی تھی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے اس میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ کلائی تک اندر چلا گیا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اسے اپنی گردن پر چبھن محسوس ہوئی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ گھٹن نے اسے آ لیا۔ اگلے ہی لمحے آکسیجن ماسک گرے۔

لیزاروز کی حالت اتنی بگڑ گئی تھی کہ وہ بمشکل ذات سنبھال سکا۔ کچھ دیر میں صورت حال میں سدھار آنے لگا۔ جہاز نیچا نیچے آگیا۔ دروازے کے کھٹ پٹ رک گئی۔ مسافروں نے

آکسیجن ماسک اتار رہا ہے۔

وہ اپنی نشست سے کھڑا ہوا ہی تھا کہ اچانک ایک زور دار دھماکہ ہوا...

لیزا روز ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آسمان پر بادل بری طرح گرج رہے تھے۔ وہ شدید غصے میں تھے۔ کچھ دیر بعد وہ سولا کی کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

"میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" اس نے ریسیور سے کہا۔

"بولو نوجوان میں سن رہا ہوں۔" سولا کی نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔

"میں نہیں جانتا کہ اس سے آپ کو کتنی مدد ملے گی۔ دراصل..." اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ "گزشتہ برس اسی جہاز میں مرمت کا مسئلہ سامنے آیا تھا۔ اتفاق سے میں اس فلائٹ میں موجود تھا۔"

وہ سولا کی کو تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ جب آکسیجن ماسک کا ذکر آیا تو آرنی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"جہاز کو ایمرجنسی لینڈنگ کرنی پڑی تھی۔ بعد میں، میں نے اپنے سینئرز کو اس مسئلے سے آگاہ کیا۔ انجینئرز کا خیال تھا کہ ہمیں دوران پرواز "ریپڈ ڈی کمپریشن" کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا کا دباؤ بگڑ گیا، جس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوئی۔ بس اتنا ہی۔" اس نے گہرا سانس لیا۔ "میں نے سوچا شاید یہ معلومات آپ کے لیے معاون ثابت ہوں۔"

"میں تمہارا ممنون ہوں نوجوان۔" سولا کی نے کہا۔ "ہم خود بھی اسی جہت میں کام کر رہے ہیں۔ تمہاری معلومات ہمارے بہت کام آئیں گی۔"

"میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں سر۔" اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ "اینڈریوس دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک نیک انسان تھا۔"

"تم بھی ایک نیک انسان ہو لڑکے۔ شکریہ۔" سولا کی نے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

حکومت پر دباؤ بڑھنے لگے۔ عوام سڑکوں پر آ گئے تھے۔ مرنے والوں کے لواحقین مرکزی شاہراہ پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ سول سوسائٹی متحرک ہو گئی۔

میڈیا میں بھی طرح طرح کی خبریں آ رہی تھیں۔ بدقسمت جہاز کے مسافروں کی جانب سے اپنے رشتے داروں کو بھیجے جانے والے ٹیکسٹ پیغامات کا تذکرہ اب زور و شور سے ہو رہا تھا۔

ایک پیغام میں جہاز میں موجود ایک مشکوک آدمی کا تذکرہ تھا جس کے ہاتھ میں بندوق دیکھی گئی تھی۔ اسی طرح ایک اخباری رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ جہاز کی تباہی کا ذمے دار یونان ہے، جس نے دہشت گردی کے خطرے کے ڈر سے جہاز کو گرا دیا۔ کچھ لوگ ان تین مسافروں کا بھی تذکرہ کر رہے تھے جن کی لاشیں نہیں مل سکی تھیں۔

دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ آفیسر سولا کی کو ایک پریس کانفرنس کرنی پڑی۔ وہاں اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ ابتدا میں تو اس نے چند سوالات کی تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی مگر جذبات کے ریلے کے سامنے بھلا کون ٹھہر سکتا ہے۔ مرنے والوں کے اہل خانہ شدید غم و غصے میں تھے۔ آفیسر چپ ہو گیا۔ آخر میں اس نے فقط اتنا کہا۔

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ذمے داران تک ضرور پہنچوں گا۔ میں چین سے نہیں بیٹھنے والا۔"

اور وہ واقعی چین سے نہیں بیٹھا۔ سولا کی نے دن رات ایک کر دیے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گیا۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں رہا۔ شدید تناؤ میں رہنے لگا۔ عوامی توقعات نے اس کے کاندھوں کا بوجھ بڑھا رہا تھا۔

ایک بار تو اس نے سنجیدگی سے ان تین مسافروں کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا جن کی لاشیں نہیں مل پائی تھیں مگر جلد ہی یونان سے رپورٹ آ گئی کہ اس پہاڑی سلسلے سے، جہاں جہاز تباہ ہوا تھا، چند اعضا ملے ہیں، جن کا ڈی این اے ان تین مسافروں سے میچ کرتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے گردن ہلائی۔ "یہ باب بند ہو گیا۔ اب ان ٹیکسٹ پیغامات کے بارے میں غور کرتے ہیں۔"

یہ معاملہ بے حد مشکوک تھا۔ موبائل فون کمپنیوں سے حاصل ہونے والے ڈیٹا سے پتا چلا کہ مسافروں کی جانب سے آخری لمحات میں کسی بھی قسم کے پیغامات نہیں بھیجے گئے تھے۔

"تو یہ جو خبریں آ رہی ہیں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"سب افواہیں ہیں۔ من گھڑت کہانیاں ہیں سر۔" اس کے اسسٹنٹ نے کہا۔ "میری اطلاع کے مطابق ڈائریکٹر پولیس نے اپنے چند افسروں کو افواہ پھیلانے والے بدمعاشوں کے پیچھے لگا رکھا ہے۔"

"ہوں۔" اس نے تھوڑی کھجائی۔ "کوئی اور خبر؟"

"فی الحال تو نہیں سر۔ ہم پچھلی ایمرجنسیز کے ریکارڈ پر کام کر رہے ہیں۔" اسسٹنٹ نے کہا۔ "اور گزشتہ برس ہونے والے جس رابطے کا آپ نے تذکرہ کیا، ایئرلائن کے ریکارڈ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ان کی دستاویزات کے مطابق اس مسئلے کو فوری ہی حل کر لیا گیا تھا۔"

"کوشش جاری رکھو ممبر۔ عوام ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

وقت گزرتا رہا۔ پریس کانفرنس کو دو ہفتے بیت گئے تھے اور کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا تھا مگر سولاکی نے ہار نہیں مانی تھی۔ اس نے اپنا تن من دھن اس کام میں لگا رکھا تھا۔

اور پھر ایک حبس زدہ دوپہر... اس کا اسسٹنٹ دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "سر ایک معاملہ ہم سے نظر انداز ہو گیا۔ حیرت ہے، پہلے ہماری نظر اس پر کیوں نہیں پڑی۔"

"کیا ہوا، کچھ بولو بھی۔" وہ ذرا ناراض معلوم ہوتا تھا۔

"سر بوئنگ 737 صبح نو کے لندن سے لارناکا پہنچا تھا۔ اور لندن سے آتے ہوئے اسے ایک چھوٹے سے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔"

"اب تجسس مت بڑھاؤ لڑکے۔" وہ جھلایا۔

"دراصل عملے نے رپورٹ کی تھی کہ انہوں نے پچھلے دروازے کے کھڑکھڑانے کی آواز سنی تھی۔ اور پھر..." اس نے عادت کے مطابق ایک اور وقفہ لیا۔ "اس پر برف جم گئی۔"

"برف۔" وہ چونکا۔ "ہیلیوس کی انتظامیہ نے اس رپورٹ پر کوئی کارروائی کی؟"

"جی ہاں۔ انہوں نے دو انجینئرز کو روانہ کیا، جنہوں نے جہاز کا جائزہ لیا اور آخر میں رپورٹ میں لکھ دیا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ لیکن کیا واقعی سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔" اس نے پھر ذرا سا وقفہ لیا۔ "اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔"

"ذرا فلمیں کم دیکھا کرو۔" اس نے چہرے پر سنجیدگی طاری کیے رکھی، گو دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اسے داد دے رہا تھا۔ "لندن سے آمد اور انجینئرز کی جانب اڑان کے دوران میں وقفہ نہایت کم تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ اتنے کم وقت میں انجینئرز صحیح سے جانچ کر سکے ہوں گے؟"

ممبر کچھ دیر خاموش رہا۔ چہرے پر شوخی نہیں تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ "چودہ اگست کی دوپہر پیش آنے والا سانحہ قبرص کی تاریخ کا بدترین فضائی حادثہ تھا اور یہ اتنا پُراسرار تھا کہ پوری دنیا کی نظریں ہم پر مرکوز ہیں۔ ہم کوئی چانس نہیں لے سکتے۔ ہمیں ہر معاملے کا باریک بینی سے جائزہ لینا ہوگا۔"

"تو پھر بلاؤ ان انجینئرز کو۔" کہا۔ "ہم ان کے ساتھ چائے پینا چاہتے ہیں۔"

سولاکی نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لیا۔

☆☆☆

"ہاں، لندن سے لوٹنے کے بعد عملے نے دروازے پر برف جمنے کی اطلاع دی تھی۔" یہ انجینئر پولسن تھا۔ وہی شخص جس نے آخری بار جہاز کے عملے سے بات کی تھی۔ سولاکی خاموشی سے منتظر رہا۔

"میں اپنے ساتھی انجینئر کے ہمراہ جہاز پر گیا۔ ہم نے دروازے کی جانچ کی۔ اس پر مختلف آلات آزمائے مگر ہمیں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ اس کی سیل سلامت تھی۔"

"عملے نے جو رپورٹ جمع کروائی تھی اس میں دروازے کے کھڑکھڑانے کا بھی ذکر ہے۔" آفیسر نے سامنے پڑے کاغذ پر نظر ڈالی۔

"آپ نے درست فرمایا جناب۔" پولسن نے گردن ہلائی۔ "ہر طرح کی جانچ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جہاز کے اندرونی حصے میں ہوا کے گھٹتے دباؤ کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ تو ہم نے ایک ٹیسٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔"

میز پر ایک ریکارڈر دھرا تھا۔ یہ گفتگو ریکارڈ ہو رہی تھی۔

"ہمارا خیال تھا کہ ہوا کے دباؤ کے اخراج میں کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ جہاز سو فیصد ایئر ٹائٹ نہیں ہوتے۔ انجن اور پنکھوں کے راستے ہوا اندر داخل ہوتی ہے، جسے ایک نظام کے تحت مختلف حصوں سے گھماتے ہوئے پچھلے حصے سے خارج کر دیا جاتا ہے۔"

"تو آپ صاحبان نے پریشرائزیشن لیک ٹیسٹ کرنے کا فیصلہ کیا مگر آپ کے پاس جہاز کو اڑانے کا وقت نہیں تھا۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔" پولسن نے فوراً کہا۔ "ہم نے انجن چالو نہیں کیے، مصنوعی طریقے سے جہاز میں دباؤ پیدا کیا۔ یہ ایک آزمودہ اور رائج طریقہ ہے۔ ہم نے پوری طرح جانچ کی۔ اپنی رپورٹ مرکزی دفتر بھیج دی۔ وہاں سے اجازت ملنے کے بعد ہی جہاز نے اڑان بھری۔"

"مسٹر پولسن تم ایک قابل اور تجربہ کار آدمی ہو۔"

سولاکی نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ "تمہارے خیال میں اس روز کیا ہوا ہوگا؟"

"بتانا مشکل ہے جناب۔" اس نے گردن ہلائی۔

"میں خود متذبذب ہوں۔ کپتان کا کہنا تھا کہ ٹیک آف کنفیگریشن الارم بج اٹھا ہے... بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ دوران پرواز یہ الارم بجنے لگے؟ پھر جہاز کا گرم ہونا اور سب سے حیرت انگیز ہے تمام مسافروں کا یوں بے ہوش ہو جانا، یہ سب ناقابل فہم ہے۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر سولاکی نے کہا۔

"بہت شکریہ مسٹر پولسن۔ آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔"

اب وہ کمرے میں تنہا رہ گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اب تک کی تحقیقات سے ایک بات واضح ہوگئی تھی کہ کاک پٹ میں بیٹھے افراد کو اس بات کا قطعی علم نہیں تھا کہ جہاز کے خودکار نظام نے کیبن میں آکسیجن کم ہونے کا اشارہ روشن کردیا ہے اور تمام مسافروں نے منہ پر ماسک چڑھا لیے ہیں۔

واضح رہے کہ کیبن کے برعکس کاک پٹ میں یہ ماسک ازخود نہیں گرتے۔ پائلٹ کو انہیں خود ہی اوپری حصے سے نکال کر پہننا ہوتا ہے۔ اب تک ملنے والے اشاروں سے پتا چلتا تھا کہ دونوں پائلٹس کو یہ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ موت ان کے نزدیک آگئی ہے۔

کچھ دیر بعد اس کا اسسٹنٹ میسر کافی کا مگ لیے کمرے میں داخل ہوا۔ "کیا سوچ رہے ہیں سر؟"

"سوچ رہا ہوں کہ شاید پائلٹ حضرات کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ کیبن میں کیا بیت رہی ہے۔" اس نے عادتاً تھوڑی کھجائی۔

"سر مجھے تو لگتا ہے کہ کیبن اسٹاف بھی کاک پٹ سے لاعلم تھا۔ آکسیجن ماسک پہنتے مسافروں اور عملے کو قطعی علم نہیں ہوگا کہ جہاز آٹو پائلٹ پر منتقل ہوگیا ہے۔ اب اسے کوئی نہیں سنبھال رہا۔ ہوائی جہاز کے پائلٹ نے کہا تھا کہ وہ سب اپنی نشستوں پر اگرچہ بے ہوش مگر پرسکون حالت میں بیٹھے تھے۔"

"سوال یہ ہے میسر کہ جہاز کا ٹیک آف کنفیگریشن الارم کیوں بجا؟"

"ہم جلد یہ جان جائیں گے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔" میسر کی آواز میں عزم تھا۔

☆☆☆

وہ اسے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ مسلسل وہ ایک چھوٹا سا کنٹرول پینل تھا۔ بہ ظاہر اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ جہاز کے ملبے کے ڈھیر میں پڑا تھا۔

اسسٹنٹ میسر کی جب جب اس پر نظر پڑتی، اسے الجھن محسوس ہوتی مگر وہ اس کی وجہ سمجھ نہیں پاتا۔ البتہ انجینئر پولسن سے ملاقات کے بعد جب اگلی صبح اس پینل پر نظر پڑی، تو وہ چونک اٹھا۔ وہ اس کے قریب گیا۔ اسے اٹھایا۔

اچانک اسے کرنٹ لگا۔ یہ جہاز میں ہوا کے آکسیجن کی مقدار پرکھنے والے سسٹم کا پی فائیو پینل تھا۔ وہ باریک بینی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ کوئی گڑبڑ نظر نہیں آرہی تھی مگر کوئی انجانی بات ضرور تھی جو اسے بے چین کررہی تھی۔

دو گھنٹے بعد اس نے اپنی بے چینی کا سراغ پالیا۔ اس نے سولاکی کا نمبر ڈائل کیا۔

"کہاں ہیں سر آپ؟" اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"وہ میں... میں اینڈریوس کے باپ سے ملنے آیا تھا۔"

"اگر ملاقات ہوگئی تو سیدھے یہاں چلے آئیں۔ کچھ دکھانا ہے آپ کو۔"

چالیس منٹ بعد وہ پینل سولاکی کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پینل کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر میسر پر سوالیہ نظر ڈالی جس نے اپنے چہرے پر کسی سراغ رساں کی سی سنجیدگی طاری کر رکھی تھی۔

"اس طرح اداکاری کرنے کی بجائے صاف صاف بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔" وہ جھلایا۔

"اس پینل پر بائیں جانب، نیچے کی طرف ایک سوئچ ہے۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہے۔ پھر... تو کیا۔" جوں ہی اس کی نظر اس سوئچ پر پڑی، اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ سوئچ آٹو کی بجائے مینول پر تھا۔ یعنی جہاز خودکار طریقے سے آکسیجن کی کمی جانچ کا جائزہ نہیں لے رہا تھا۔ یہ کام پائلٹ نے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا... مگر کیوں؟

"مجھے یقین ہے کہ اس سوئچ کے ساتھ کسی نے چھیڑ خانی نہیں کی۔ کسی نے اسے آٹو سے مینول پر نہیں کیا۔"

میسر نے منہ بنایا۔ "جب سے یہ میری تحویل میں آیا ہے ایسے ہی ہے۔ ہاں البتہ... اسے یونان سے لانے ہوئے

کوئی چھیڑ خانی کی گئی ہو تو اور بات ہے۔ ارے یاد آیا...'' آواز میں شوخی در آئی۔ ''یوٹن سے سارا ملبا تو آپ ہی لائے تھے۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ دہاڑا۔ ''یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔''

مبسر یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ ''اسے کسی نے نہیں چھیڑا۔ یہ جوں کا توں ہے۔ جہاز کا خودکار نظام کاک پٹ والوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ جب یہ نظام معطل پر ہو تو آپ ایک ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اُسے متوازن رکھتے ہیں۔ مگر بوئنگ 737 کے معاملے میں ریموٹ کنٹرول بھی استعمال ہی نہیں ہوا۔''

''عجیب۔ بے حد عجیب۔'' آفیسر نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''جب ریموٹ کنٹرول استعمال ہی نہیں کیا گیا تو پھر... انہوں نے اسے آٹو سے مینول پر کیوں کیا؟''

''سر آپ کی عینک کہاں ہے؟'' مبسر نے ایک غیر متعلقہ سوال کیا۔

''عینک کیا مطلب؟'' سولا کی کا ہاتھ ماتھے تک گیا۔ پھر اس نے اپنی کرتے کی جیبوں کا جائزہ لیا۔ میز کے نیچے دیکھا۔ وہ کہیں نہیں تھی۔

''آپ اسے کینٹین میں بھول گئے تھے سر۔'' مبسر نے اسے جیب سے نکال کر عینک دی۔

''اوہ شکریہ۔ ہاں میں اسے بھول گیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''انسان کبھی کبھار کچھ چیزیں بھول جاتا ہے۔ اور یہ بھول خطرناک ہوتی ہے۔''

سولا کی سناٹا میں آ گیا۔ مبسر کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ ماتھے پر لکیریں پڑی تھیں۔

کمرے میں پُراسرار خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر آفیسر کی بارعب آواز سنائی دی۔ ''مسٹر پولسن کو کل صبح دفتر بلواؤ۔''

''میں فون کر چکا ہوں۔'' مبسر نے بے چہرے سے کہا۔ ''کل صبح دس بجے... ہمارے سامنے ہوں گے۔''

☆☆☆

پولسن اس ادارے کی نظتی توقع نہیں کر رہا تھا۔

''مگر کیوں؟'' اس نے مبسر سے سوال کیا۔

''مسٹر سولا کی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کل صبح چلے آئیں۔''

اگلے روز جب پولسن گھر سے نکلا، سڑک پر بارش کے بعد کا کیچڑ کھڑا تھا۔ وہ مقررہ وقت پر سولا کی کے دفتر پہنچ گیا۔ اُسے بلیک کافی پیش کی گئی۔

''ہم تمہاری رپورٹ پڑھ چکے ہیں لڑکے۔'' سولا کی نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ''اور تم اپنا بیان بھی ریکارڈ کرا چکے ہو کہ انجینئر روانگی سے قبل تم لڑکوں نے پریشر ائزیشن لیک ٹیسٹ کیا تھا۔''

''بالکل درست جناب!'' اس نے گردن ہلائی۔

''اسی ٹیسٹ کے دوران...'' سولا کی آگے کو جھکا۔ ''تم نے سوئچ کو آٹو سے مینول پر کر دیا تھا؟''

''یہ بھی صحیح ہے۔''

''تو کیا تم نے....'' ایک پریشان کن وقفہ۔ ''دوبارہ اُسے آٹو پر کیا تھا؟''

''آٹو پر؟ ہاں میں نے...'' انجینئر پولسن متذبذب نظر آ رہا تھا۔ سولا کی کی تجربہ کار نگاہیں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔

''میں نے... نہیں۔ شاید نہیں۔ میں نے اسے مینول ہی پر چھوڑ دیا تھا۔'' پولسن نے گہرا سانس لیا۔

اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

کمرے میں اداس خاموشی چھا گئی۔

مبسر جو ایک نرم دل آدمی تھا اس کے پاس گیا اور اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ ''ٹھیک ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں۔''

''مگر کیا فقط ایک سوئچ؟ کیا اس وجہ سے لوگوں کی جانیں گئیں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''سنانے رہو لڑکے۔'' سولا کی نے بھاری آواز میں کہا۔ ''خود کو قصوروار مت ٹھہراؤ۔ میں ممنون ہوں کہ تم آئے۔ شکریہ۔''

انجینئر کے جانے کے بعد سولا کی نے تیز کافی منگوائی۔ اسسٹنٹ فوراً حکم بجا لایا۔

''تو جب جہاز اڑان کے لیے تیار تھا، وہ سوئچ مینول ہی پر تھا۔'' اس نے یوں کہا جیسے بڑبڑا رہا ہو۔

''ہوا کے دباؤ کو مقررہ مقدار میں رکھنے والا خودکار نظام بند تھا۔'' اسسٹنٹ نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ ''اور کاک پٹ میں بیٹھے دونوں پائلٹ اس سے بےخبر لاعلم تھے۔ جب جہاز بلندی پر گیا، قدرتی طور پر ماحول میں آکسیجن کم ہونے لگی۔ کیبن میں آکسیجن ماسک گر گئے مگر کپتان اور اس کے معاون بے ہوش ہونے تک اس معاملے کا ادراک نہیں کر سکے۔''

''مگر کیوں؟'' اس نے تھوڑی کھجائی۔ ''پرواز سے پہلے تمام آلات کا تین بار جائزہ لیا جاتا ہے۔ وہ چوک کس

طرح سکتے تھے؟ اور پھر وہ ٹیک آف کنفیگریشن الارم کیوں بجنے لگا۔ اگر جہاز نے کوئی اشارہ کیا تھا تو تجربے کار پائلٹ اسے سمجھ کیوں نہیں سکے؟ پھر ایک معاملہ اور ہے......"

سولاکی کے چہرے پر گہرا تفکر تھا۔ اسسٹنٹ کی نظریں اس پر جمی تھیں۔

"آکسیجن ماسک انتہائی ہنگامی حالات میں نیچے گرتے ہیں۔ اگر ایسی نوبت آجائے تو پائلٹ کے پاس دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ پہلا، یا تو جہاز کو اتنا نیچے لے آئے، جہاں بیرونی فضا میں آکسیجن وافر مقدار میں موجود ہو اور دوسرا ہنگامی لینڈنگ۔"

"درست کہا۔" اسسٹنٹ نے گردن ہلائی۔ "اور اس کا سبب واضح ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بوئنگ 737 میں ہر نشست کے اوپری حصے میں نصب سلنڈر میں فقط بارہ منٹ کی آکسیجن ہوتی ہے۔ اگر احتیاط سے استعمال کی جائے تو شاید پندرہ منٹ چل جائے۔ اسی وجہ سے ہنگامی لینڈنگ کو ترجیح دی جاتی ہے۔"

"یہی نکتہ میرے ذہن میں ہے یار۔ ایک بات تو بتاؤ، آکسیجن ماسک فرش چھوڑنے کے کتنی دیر بعد مسافروں کے سروں کے اوپر لہرائے ہوں گے؟"

"رپورٹس اور اندازوں کے مطابق اڑان کے لگ بھگ پچیس منٹ بعد۔"

"اور اس کے بعد جہاز کب تک فضا میں رہا؟"

اسسٹنٹ نے شدید بے چینی محسوس کی۔ "لگ بھگ ڈھائی گھنٹے۔"

"ذرا سوچو تو۔ ہر مسافر کو انفرادی حیثیت میں فراہم کردہ آکسیجن تو پندرہ منٹ میں ختم ہوگئی ہوگی۔ پھر ہمارا پیارا اینڈریوس... اگلے سوا دو گھنٹے بھلا کیسے زندہ رہا؟"

اسسٹنٹ سکتے میں آگیا۔ وہ بڑبڑایا۔ "آکسیجن کے بغیر کوئی کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟ یہ تو حیران کن بات ہے۔"

"نہیں۔ حیران کن نہیں۔" سولاکی زہر خند سے مسکرایا۔ "سچ کہوں تو یہ ایک معما ہے، جس نے مجھے پاگل کر رکھا ہے۔"

☆☆☆

جب اعلیٰ حکام نے سولاکی کی درخواست سنی، وہ ٹھٹکا گئے۔

"لیکن... کیا یہ ازحد ضروری ہے؟" ایک افسر نے سوال کیا۔

حبیب بصری

نامور ولی اللہ، مقتدائے دین و تاج خواجہ الرعشی کے مرید و خلیفہ۔ سترہ برس کی عمر میں قرآن عظیم حفظ کرنے کے بعد عبادت و ریاضت میں مشغول ہوئے، بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ پیر و مرشد سے ایک سال بعد خلافت ملی۔ اللہ تعالیٰ کے کرم کے باعث جو بھی آپ کے پاس آتا، متاثر ہو کر بیعت کرتا اور فیض حاصل کرکے جاتا۔ آپ خاموش طبع اور قناعت پسند انسان تھے۔ ہمیشہ حجرہ کے اندر رہتے، قناعت کرتے، روزہ رکھتے اور رزق حلال کھاتے۔ ہمیشہ باوضو رہتے۔ اکثر راتوں کو جاگتے اور عبادت باری تعالیٰ میں مصروف رہتے۔ آپ کے مرید بھی آپ کی طرح ہر وقت باوضو رہتے۔ یہ لوگ ان مجلسوں میں اللہ کے سوا کسی کا ذکر نہ کرتے۔ روزہ رکھتے سبزیوں یا جنگلی میوے سے افطار کرتے۔ انہیں آپ کی نسبت حبیب بان کہا جاتا ہے۔ آپ کا ابتدائی ذریعہ معاش کتابت تھا۔ شوال 287ھ میں بصرہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

مرسلہ: خالد ساقی، سرگودھا

"بالکل۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "دنیا بھر میں ہوائی حادثوں کی تحقیقات میں یہ طریقہ اپنایا جاتا ہے۔"

"اور آپ چاہتے ہیں کہ ہم یونانی حکام کا تعاون بھی حاصل کریں؟"

"اس کے بغیر یہ طریقہ ادھورا ہے۔ ان کی شمولیت ہی اسے مکمل کرے گی۔"

"مجھے تو یہ سب بہت ہی احمقانہ لگ رہا ہے۔" میٹنگ میں موجود ایک بیورو کریٹ نے کہا۔

"کیونکہ آپ فضائی حادثوں پر تحقیق کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے۔" سولاکی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"مسٹر سولاکی، میں چاہوں گا کہ آپ تہذیب کا دامن تھامے رکھیں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"اور میں چاہوں گا کہ..." وہ آگے کو جھکا۔ "آپ ان خاندانوں کے بارے میں سوچیں، جو اپنوں سے محروم ہوگئے۔ اس تجربے کی کامیابی اس چیستان کے حل میں

معاون ہوسکتی ہے۔ صاحبان کیا آپ اسے حل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں؟"

افسران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔" بالآخر سینئر آفیسر نے کہا۔ "ہمیں منظور ہے۔"

☆☆☆

قبرص کے شہر لارنا کا پر ایک روشن صبح اتری۔ رن وے پر بوئنگ 737 کھڑا تھا۔ مطلع صاف تھا اور ایئرپورٹ پر معمول کی گہما گہمی تھی۔

یہ دن... 14 اگست کو نازل ہونے والے اس بدبخت دن سے انتہائی حد تک مشابہ تھا جس نے قبرص اور یونان میں سنسنی پھیلا دی تھی۔

ٹھیک نو بج کر سات منٹ پر ہیلیوس ایئرویز کے بدقسمت جہاز کے مانند... یہ طیارہ حرکت میں آیا۔ انجن گڑگڑایا۔ کنٹرول روم سے گرین سگنل مل گیا۔ اور ٹھیک تب... کاک پٹ میں بیٹھا ایک شخص پریشرائزیشن پینل پر جھکا۔ اس نے سوئچ آٹو سے مینول پر کر دیا۔

یہ سولا کی تھا جس نے یہ کیس حل کرنے کے لیے ایک انوکھے تجربے کا اہتمام کیا تھا۔ دراصل یہ ماضی میں جینے کی خواہش تھی۔ وہ ہر اس لمحے سے گزرنا چاہتا تھا، جس سے بدقسمت جہاز گزرا تھا، تاکہ وہ جان سکے کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔

سولا کی کو اس تجربے کا خیال مارک اینگل سے ملاقات کے بعد سوجھا۔ امریکا میں مقیم مارک اس کا پرانا دوست تھا۔ وہ جہازوں کی تیاری کا ماہر تھا۔ سولا کی نے اس سے تکنیکی معاونت کی درخواست کی تھی۔ اسے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ جہاز نے مسئلے کی صحیح نشان دہی کیوں نہیں کی۔ کیونکہ ملبے کی جانچ کے بعد یہ واضح ہو گیا تھا کہ تمام آلات بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔

"ممکن ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو۔" تجربے کار مارک نے کہا۔ "ہو سکتا ہے جہاز نے نشان دہی کی ہو۔ بالکل درست نشان دہی۔ مگر پائلٹ اسے سمجھ ہی نہ سکے ہوں۔"

"مگر ٹیک آف کنفیگریشن الارم کا بج اٹھنا میرے دوست..." اس نے دھیرے سے کہا۔ "بھلا کس نوع کی نشان دہی ہے؟"

"نکتہ کچھ اور ہے۔" مارک کی آنکھوں میں تفکر کے سائے تھے۔ "اگر پورا معاملہ ہوا کے دباؤ میں ہونے والی گڑبڑ کا نتیجہ ہے، اگر پریشرائزیشن پینل ہی اس کا سبب ہے تو ایک بات سمجھ لو۔"

خاموشی کا ایک لمحہ ان کے درمیان آ گیا جو بہت سے رازوں کا امین تھا۔

"اس نوع کے واقعات خال خال ہوتے ہیں۔ اگر تم دباؤ کے بگاڑ سے جنم لینے والے فضائی حادثات کی تلاش میں نکلو گے میرے دوست تو تمہیں ہزاروں فائلیں کھنگالنی پڑیں گی۔ اور شاید تب بھی تم ایسا کوئی واقعہ ڈھونڈ پاؤ۔ یہ اتنا انوکھا ہے کہ شاید کاک پٹ میں موجود افراد نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا ہو۔"

مارک کی بات سولا کی کے دل کو لگی۔ واقعی اس کا امکان تھا۔ ایسے آلات جنہیں عشروں پر محیط اپنے کیریر میں پائلٹوں نے ہمیشہ خاموش پایا ہو، اگر اچانک وہ چیخنے چلانے لگیں، تو وہ انہیں قطعی نہیں سمجھ پائیں گے۔

مارک سے ہونے والی گفتگو کے بعد ہی سولا کی نے فیصلہ کیا کہ اسے ہر اس مرحلے سے گزرنا ہوگا جس سے بدنصیب جہاز کے مسافر گزرے تھے، تاکہ وہ اس معاملے کو پوری طرح سمجھ سکے۔

لارنا کا ایئرپورٹ کے رن وے پر جہاز دوڑ رہا تھا۔ اس نے زمین چھوڑ دی۔ کچھ منٹ بعد وہ کئی ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ پائلٹوں کے ساتھ بیٹھا سولا کی تمام آلات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کیبن میں اس کی ماہر ٹیم موجود تھی جو جدید ترین آلات سے لیس تھی۔ وہ جہاز میں آنے والی تبدیلیوں پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

"ہم ساڑھے تین ہزار میٹر کی بلندی پر ہیں۔" سولا کی نے مائیک میں کہا۔

"اوکے۔" انجینئر پولسن کی آواز سنائی دی۔ وہ کنٹرول روم میں بیٹھا تھا۔ اسے خصوصی طور پر اس مشن میں شامل کیا گیا تھا۔ سولا کی کی درخواست پر سینئر تزیز لیز ارود بھی وہاں موجود تھا۔

"ہم مزید بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔" کنٹرول روم میں سولا کی کی آواز گونجی۔

جہاز اوپر اٹھ رہا تھا۔ اس میں موجود افراد کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ وہ اس پراسرار دنیا میں داخل ہو گئے تھے جہاں بوئنگ 737 پر ایک آسیب نے حملہ کیا تھا۔

ٹھیک ویسے ہی جیسے کچھ ماہ پہلے بدقسمت جہاز کے پائلٹ نے محسوس کیا تھا... اس جہاز کے کپتان نے اپنے

کاندھے پر چبھن محسوس کی۔ اسے پسینا آنے لگا۔ خود سولا کی کا
بھی یہی حال تھا اور ٹھیک تب ایک الارم سنائی دیا۔
"ٹیک آف کنفیگریشن الارم؟" معاون پائلٹ نے
کہا۔
"نہیں۔" اس کے باوجود کہ سولا کی کا دم گھٹ رہا تھا،
اس نے اطمینان محسوس کیا۔ "یہ کیبن الٹی ٹیوڈ وارننگ
(Cabin altitude warning) ہے۔ اور یہ ٹیک
آف کنفیگریشن وارننگ سے انتہائی حد تک مشابہ ہے۔"
سولا کی کھانس رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔
"ذرا ادھر دیکھو۔" اس نے اوپر لگے آلات کی طرف
اشارہ کیا جہاں کئی بتیاں روشن تھیں۔ اس کی انگلی ایک زرد
لائٹ کی سمت اٹھی ہوئی تھی۔ "یہ چھوٹی سی لائٹ اشارہ کر رہی
ہے کہ پریشرائزیشن سسٹم اس وقت مینول پر ہے۔"
"اسے دیکھنا تو بڑا ہی محنت طلب کام ہے۔" پائلٹ
نے کہا۔ "دھوپ تیز ہے۔ اس کی چمک میں یہ لائٹ دیکھ لینا
خاصا مشکل ہے۔"
"اور جب آپ اس کی توقع ہی نہ کر رہے ہوں تو پھر
امکان ختم ہی ہو جاتا ہے۔" سولا کی بڑبڑایا۔
تھوڑی اور بلندی پر جانے کے بعد ان کی آنکھوں کے
سامنے موجود منظر دھندلانے لگا۔ دم گھٹنے لگا تھا۔ پیچھے کیبن
میں بھی یہی حال تھا۔ کچھ سیکنڈز بعد مزید آلات چلانے
لگے۔ "کوشن لائٹ" یعنی وہ بتی بھی روشن ہو گئی جو بدقسمت
ہوابازوں کے لیے جہاز کے گرم ہونے کی کہانی بیان کر رہی
تھی مگر حقیقت کی دنیا میں اس بتی کا مطلب کچھ اور تھا۔
جونہی بتی روشن ہوئی کیبن کی چھت سے آکسیجن
ماسک گرے۔
وہاں موجود افراد نے فوراً ماسک چڑھا لیے۔ جوں ہی
آکسیجن ماسک گرنے کی اطلاع سولا کی کو ملی، اس نے
پریشرائزیشن سسٹم کو آٹو پر کر دیا۔ کچھ لمحوں بعد آکسیجن کی کمی
پوری ہو گئی۔ اب سب کچھ ٹھیک تھا۔
تجربہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ جہاز نے اپنا سفر جاری رکھا۔
ایک گھنٹے بعد وہ یونان کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ پروگرام کے
مطابق یونانی فضائیہ کے دو فائٹر جیٹ ذرا حرکت میں آ گئے۔
وہ بجلی کی رفتار سے اوپر اٹھے اور جہاز کے نزدیک پہنچ گئے۔
ان طیاروں میں وہی جوان سوار تھے، جنہوں نے ماہ اگست
میں اس سانحے کو بے حد نزدیک سے دیکھا تھا۔
سولا کی ہر بدقسمت لمحے کو گرفت میں لانا چاہتا تھا۔

اس کے طے کردہ پروگرام کے مطابق وہی پائلٹ جو اس
دوپہر بدقسمت جہاز کے کاک پٹ کے نزدیک پرواز کر رہا
تھا، اس جہاز کے نزدیک آیا۔
سولا کی نے ٹھیک ویسی صورت حال تخلیق کر رکھی تھی۔
پائلٹ نے سیٹ چھوڑ دی۔ معاون پائلٹ آگے کو جھک گیا۔
جیٹ میں بیٹھے پائلٹ نے اپنے مائیک میں کہا۔
"کن وکن وہی منظر جو میں نے اس روز دیکھا تھا۔"
اگلے ہی لمحے عملے کی وردی پہنے ہوئے ایک شخص کاک
پٹ میں داخل ہوا اور پائلٹ کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے
جیٹ میں موجود شخص کو دیکھ کر تین بار ہاتھ ہلایا۔
یہ لمحہ اہم تھا... جیٹ کا سوار اس اشارے کو جن الفاظ میں
بیان کرنے والا تھا، اس سے بہت کچھ صاف ہو جاتا۔
سولا کی خوش قسمت تھا کیونکہ جو کچھ وہ چاہتا تھا جیٹ
کے سوار نے بالکل وہی کہا۔
"میں نے کاک پٹ میں حرکت دیکھی ہے۔ وہ شخص
عملے کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ اور اس نے تین بار زمین کی
سمت اشارہ کیا ہے۔"
سولا کی نے گہرا سانس لیا۔ وہ مطمئن تھا۔ تجربے میں
موجود شخص نے تین بار دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلایا تھا مگر
پائلٹ کو یوں لگا کہ اس نے زمین کی سمت اشارہ کیا ہے...
شاید وہ جہاز کو گرانا چاہتا ہے۔
یعنی جیٹ پائلٹ بصری التباس کا شکار ہوا تھا۔
اینڈریوس جہاز گرانا نہیں، بلکہ اسے بچانا چاہتا تھا مگر یہ ہو
نہیں سکا۔
جہاز ایتھنز کے ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ اس میں ایندھن
بھرا گیا۔ کچھ گھنٹوں بعد وہ واپس قبرص کی سمت جا رہا تھا۔
سولا کی بہت سے سوالوں کے جواب حاصل کر چکا
تھا۔

☆☆☆

ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ واقعے کے پندرہ ماہ بعد ہونے
والی اس پریس کانفرنس میں تل دھرنے کو جگہ نہیں
تھی۔ کیمرے تیار تھے۔ میڈیا کے نمائندے مستعد نظر آ رہے
تھے۔ آج ایک معما حل ہونے کو تھا۔ ایک پراسرار راز سے
پردہ اٹھنے والا تھا۔
آج شام بوئنگ 737 کے معاملے کا خلاصہ ہونے
جا رہا تھا۔
ہال کے دروازے پر پہنچ کر سولا کی نے تمام نوٹس اپنے

اسسٹنٹ میسرز کو بگڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ''پریس کانفرنس تم کرو گے۔''

''میں... مگر کیوں؟'' وہ بوکھلا گیا۔

''کیونکہ تم بہت قابل ہو۔ تم نے ہر معاملے میں میری بھرپور مدد کی۔'' پھر وہ مسکرایا۔ ''اور ایک سبب یہ بھی ہے کہ اب میں ریٹائر ہونے والا ہوں۔ تمہارے لیے خود کو نمایاں کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔''

''مگر آپ کے ہوتے ہوئے یہ کچھ مناسب نہیں لگتا۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''تم ہر وہ بات جانتے ہو جو میں جانتا ہوں۔ تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''مگر میں یہ نہیں جانتا کہ اینڈریوس اتنی دیر آکسیجن کے بغیر زندہ کیسے رہا؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔'' سولا کی مسکرایا۔ ''مگر ہم جلد جان جائیں گے۔ اس معاملے کی ابھی پروا مت کرو۔ میڈیا کا دھیان اس طرف نہیں جائے گا۔ جاؤ، رپورٹرز تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

اس نے فائل اپنے اسسٹنٹ کو تھما دی، جس کے چہرے پر احساسِ تشکر تھا۔ جب وہ ہال میں داخل ہو گیا، سولا کی ہوٹل سے باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد کار مضافات کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ وہ اینڈریوس کے باپ سے ملنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

''معاملہ شیشے کی طرح صاف ہے۔'' ہال میں میسرز کی آواز گونجی۔ اس میں اعتماد تھا۔

''ایک معمولی سی غفلت اس جہاز کو لے ڈوبی۔'' اس نے وقفہ لیا۔ ''مگر یاد رکھیں، یہ غفلت جتنی معمولی تھی، اس کا سبب اتنا ہی اہم تھا۔ لندن سے آنے والے بوئنگ 737 کی انجینئرز نے جانچ کی تھی۔ ٹیسٹ کے دوران انہوں نے پریشرائزیشن سسٹم آٹو سے مینول پر کیا مگر بعد میں وہ اسے دوبارہ آٹو پر کرنا بھول گئے۔ یہ ایک معمولی واقعہ تھا۔ لیکن اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب جہاز کے پائلٹ آلات چیک کرتے ہوئے چوک گئے۔ اور یہ حیرت انگیز لگتا ہے۔ کیونکہ طریقۂ کار کے مطابق آلات کو تین بار چیک کیا جاتا ہے مگر انسان خطا کا پتلا ہے۔ ان سے غلطی ہو گئی۔ بدقسمتی سے جب دورانِ پرواز جہاز نے انہیں حالات کی نزاکت سے مطلع کرنا چاہا، وہ اس کو پیغام سمجھنے سے قاصر رہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟''

میسرز کی نظریں صحافیوں پر لگی تھیں۔ وہ متجسس تھے۔

اس نے بات کا سرا پکڑا۔ ''کیونکہ جن آلات نے شور مچایا، انہیں پائلٹوں نے کئی عشروں پہلے اپنے کیریئر میں کبھی شور مچاتے نہیں سنا تھا۔ جو بتیاں روشن ہوئیں، انہیں آج سے پہلے ان بدقسمت آدمیوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آ رہا ہے۔''

''آخر اس کا سبب کیا رہا؟'' ایک صحافی نے سوال کیا۔

''دراصل دورانِ پرواز اس نوع کے تکنیکی مسائل سے ہوا بازوں کا خال خال ہی سامنا ہوتا ہے۔ اس طرح کے واقعات آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ سمجھیں... یہ کبھی رونما ہوئے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے پائلٹس اور دونوں کے پائلٹ اس معاملے کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ ممکن ہے کہ دورانِ تربیت انہیں اس بابت بتایا گیا ہو مگر وہ اس روز ان اسباق کو بھول چکے تھے۔''

میسرز نے صحافیوں کو بتایا کہ ٹیک آف کنفیگریشن الارم اور کیبن الٹی ٹیوڈ وارننگ میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ایک زرد بتی... جو اشارہ دیتی ہے کہ پریشرائزیشن سسٹم مینول پر ہے، تیز دھوپ کے باعث انہیں دکھائی نہیں دی۔

اس شام میسرز سے درجنوں سوالات کیے گئے۔ اور اس نے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔ تفتیشی ٹیم اس مہلک غلطی تک پہنچ گئی تھی، جس نے اس بھیانک المیے کو جنم دیا۔ میسرز سب جانتا تھا، ماسوائے ایک بات کے... اور وہ دعا کر رہا تھا کہ کوئی اینڈریوس کے بارے میں نہ پوچھ لے۔ اس کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا کہ آخر وہ شخص اتنی دیر زندہ کیسے رہا۔

خوش قسمتی سے کسی نے اینڈریوس کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ انہیں دیگر مسئلوں کی پڑی تھی۔

ہاں، ایک شخص نے ان عجیب و غریب ٹیکسٹ پیغامات کی بابت ضرور پوچھا، جن سے متعلق دعویٰ کیا جاتا تھا کہ انہیں جہاز کے بدقسمت مسافروں نے آخری لمحات میں بھیجا تھا۔

میسرز نے انہیں افواہیں قرار دیتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ پولیس جلد ان بدمعاشوں تک پہنچ جائے گی جو ایسی خبریں پھیلا رہے ہیں۔

اس شام درجنوں سوالات ہوئے، مگر کسی نے اینڈریوس کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ شاید یہ فریضہ سولا کی

نے اپنے سر لے رکھا تھا۔ جو اس وقت اس کے باپ کے سامنے بیٹھا تھا اور اس کے بیٹے کے بارے میں ہر بات جاننے کا متمنی تھا۔ وہ رات گئے تک وہیں ٹھہرنے والا تھا۔

☆☆☆

"وہ انتہائی بہادر نوجوان تھا۔" بوڑھے کانسٹیبل نے سگار کا کش لیا۔

سولا کی خاموشی سے اسے سنتا رہا۔

"اور وہ جولی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس سے اچھی اور بات کیا ہوگی کہ وہ آخری لمحات میں اس پیاری لڑکی کے ساتھ تھا، جسے وہ شریک حیات بنانا چاہتا تھا۔" بوڑھے نے ایک اور کش لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ وہ پائلٹ بننا چاہتا تھا۔" سولا کی نے کہا۔ "اس نے ابتدائی کورس کر کے فلائنگ لائسنس بھی حاصل کر لیا تھا۔"

"ہاں یہ اس کا سپنا تھا۔" بوڑھے نے سر ہلایا۔ "فوج سے علیحدگی کے بعد اس کے ذہن میں یہ سودا سما گیا تھا۔"

سولا کی نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ شاہد مہر نے بتایا تھا کہ لڑکا کچھ عرصے فوج میں رہ چکا تھا۔

"وہ وہاں بھی خوش تھا۔ مشکلات کا مقابلہ کرنے کی اسے عادت تھی۔ وہ انتہائی سخت جان تھا۔"

"میں نے سنا تھا کہ وہ سانس روک لینے پر قادر تھا۔"

سولا کی نے ہوا میں تیر چلایا۔

"صحیح سنا۔ اور بچپن ہی سے یہ معاملہ تھا۔" بوڑھا خوش ہو گیا۔ "وہ اپنے چچا کے لڑکوں کے ساتھ سوئمنگ پول میں بیٹھ جاتا اور سانس روکنے کی مشق کرتا۔ بہترین اسکوبا ڈائیور تھا وہ۔"

بوڑھے کی نظریں ستاروں بھرے آسمان پر ٹکی تھیں۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "جولی سے اس کی ملاقات اسکوبا ڈائیونگ کے دوران میں ہی ہوئی تھی۔"

سولا کی اور بوڑھے کی گفتگو گھنٹوں جاری رہی۔ جب رات گئے وہ گھر لوٹ رہا تھا، اس کے ذہن میں ایک خاکہ بننے لگا تھا۔

اینڈریوس فوج میں رہ چکا تھا۔ وہ جہاز میں موجود دیگر افراد سے زیادہ سخت جان تھا۔ جب آکسیجن ماسک گرے ہوں گے تو سب میں سراسیمگی پھیل گئی، مگر اینڈریوس نے اپنے تجربے کے باعث حواس سنبھالے رکھے۔ دیگر افراد جہاں گہرے گہرے سانس لے کر سلنڈر کی آکسیجن تیزی سے خرچ کر رہے تھے، وہیں وہ فوج کی تربیت اور بچپن کی مشق کے طفیل دھیرے دھیرے سانس لے رہا ہوگا۔

سولا کی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"بارہ منٹ بعد سب ایک ایک کرکے بے ہوش ہو گئے مگر لڑکے کے حواس سلامت رہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "صحیح ہے، اس نے بیس منٹ نکال لیے، مگر پھر اسے آکسیجن کہاں سے ملی؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ بوئنگ 737 میں کچھ نشستوں کے درمیان اضافی آکسیجن ماسک کا اہتمام ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے انہیں استعمال کیا ہو۔

"چلو۔ چند منٹ اور مل گئے مگر پھر اس نے کیا کیا؟"

سولا کی نے تھوڑی کھجائی۔

گھر جانے کی بجائے اس نے جیپ دفتر کی سمت موڑ لی۔

کچھ دیر بعد وہ نیم تاریک کمرے میں بیٹھا فلائٹ ڈیٹا ریکارڈر پر موجود آوازیں سن رہا تھا۔ وہ مجسم کان بن گیا۔ ریکارڈر میں موجود ہر لمحہ اس کے لیے قیمتی تھا۔ وہ ایک ہلکی، مگر انتہائی اہم آواز کی تلاش میں تھا۔

یکسوئی کام آئی۔ اس نے ایک خفیف سی آواز کا سراغ لگا لیا، جو ابتدا میں نظرانداز کر دی گئی تھی۔

پہلے پہل یہ خیال کیا گیا تھا کہ ابتدائی 30 منٹ کی ریکارڈنگ کے بعد ٹیپ مکمل طور پر خاموش ہے... مگر یہ خیال غلط تھا۔

انتھک محنت اور یکسوئی کی بدولت اس خاموش دورانیے میں سولا کی نے کچھ آوازیں سنیں، جیسے بٹن دبائے جا رہے ہوں۔ پھر ایک کھٹکا ہوا۔

سولا کی نے پھر اس حصے کو سنا اور وہ سمجھ گیا کہ اس کے کانوں سے کس نوع کی آواز ٹکرا رہی ہے۔

وہ کاک پٹ کے دروازے پر لگی الیکٹرانک ڈیوائس کی آواز تھی۔

"اینڈریوس نے دروازے پر دستک دینے یا پائلٹ کو پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی۔" اس نے خود سے کہا۔ "اس نے حالات کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا تھا، سو وہ سیدھا دروازے تک آیا اور ڈیوائس پر کوڈ داخل کیا۔ کھٹکا یقینی طور پر دروازہ کھولنے کی آواز تھی۔"

کر یاں مل رہی تھیں۔ سولا کی نے اپنی توجہ مزید مرکوز کی۔ کھٹکے کی آواز کے بعد اُسے یوں لگا، جیسے کاک پٹ میں کوئی گہرے گہرے سانس لے رہا ہے۔ پھر کچھ سرسراہٹ ہوئی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ کھٹکا ہوا۔

سولا کی نے تصور بنانے کی کوشش کی۔

اینڈریوس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ہوگا۔ صورتِ حال نے اسے بہت زرد کر دیا۔ اس نے پائلٹ کو چھوڑ کر معاون پائلٹ پر توجہ مرکوز کی، جو بے حال اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ سرسراہٹ کی آواز اشارہ تھی کہ اینڈریوس نے اُسے آکسیجن ماسک پہنایا تھا۔

"لیکن پھر وہ... کاک پٹ سے واپس کیوں چلا گیا؟ اس نے اسی وقت کمانڈ کیوں نہیں سنبھال لی؟" سولا کی نے خود سے سوال کیا۔

اس نے تھرماس کافی پی، سر کھجایا، مگر عقدہ نہیں کھولا۔ تھک کر اس نے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا، اپنی دراز سے ایک سگار نکالا، اسے سلگاتے ہوئے بوڑھا کانسٹینن اُسے یاد آگیا اور ساتھ ہی اس کا کہا ایک جملہ یاد آیا۔ سولا کی کی آنکھیں چمکیں۔

"بلاشبہ۔ وہ جولی سے بہت محبت کرتا تھا۔" سولا کی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "گرل فرینڈ کی فکر اُسے ستا رہی ہوگی۔ ہاں وہ اس کی خیر خبر لینے واپس کیبن گیا ہوگا۔"

"تو آپ یہاں ہیں جناب!" اچانک دروازے میں ایک مانوس آواز گونجی۔

سولا کی کرسی سے اچھل پڑا۔ "مسیور تم... گھر نہیں گئے؟"

"کچھ سوالات بہت ظالم ہوتے ہیں سر۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ "ہمیں سونے نہیں دیتے۔"

"کیا معاملہ ہے لڑکے؟" سولا کی نے سوال کیا۔

"اینڈریوس کا معما مجھ پر سوار ہو گیا ہے۔"

"بیٹھو۔" سولا کی نے اُسے سگار اور کافی پیش کی۔

پھر وہ اُسے اپنا تجزیہ بتانے لگا۔ مسیور کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے اُسے سنجیدگی سے سن رہا تھا۔

"بس ایک مسئلہ باقی ہے.... آخر وہ اتنی دیر بغیر آکسیجن کے زندہ کیسے رہا؟" اس نے عادتاً ٹھوڑی کھجائی۔

"کوئی بغیر آکسیجن کے زندہ نہیں رہ سکتا۔" مسیور نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "کوئی بھی نہیں اور اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے..."

سولا کی خاموشی سے سنتا رہا۔

"اس نے مزید آکسیجن حاصل کر لی تھی اور یہ آکسیجن جہاز ہی میں موجود تھی۔" لڑکا براہِ راست اپنے سینئر کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"زبردست۔" سولا کی کھڑا ہو گیا۔ "یہ تو سامنے کی بات تھی۔ ہمارا دھیان پہلے اس طرف کیوں نہیں گیا۔"

"ہر بوئنگ 737 میں آکسیجن کے چار اضافی سلنڈر رکھے جاتے ہیں۔" مسیور کہہ رہا تھا۔ "جو مجموعی طور پر ڈھائی تین گھنٹے چل سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم جہاز کے ملبے سے ملنے والے سلنڈروں کا جائزہ لیں گے تو کم از کم تین تو ضرور خالی ہوں گے۔"

سولا کی کی آنکھیں چمک رہی تھیں، مگر پھر... چمک ماند پڑ گئی۔ ایک تو ذہن میں بدنصیب اینڈریوس کا خیال تھا، جو 120 بے ہوش انسانوں کے درمیان اکیلا تھا۔ بالکل تنہا۔ وہ گھنٹوں موت کے درمیان... زندہ رہنے کی جدوجہد کرتا رہا۔

"اس نے لڑنے کی کوشش کی۔ آخری لمحے تک۔" سولا کی نے دھیرے سے کہا۔

"وہ واقعی بہادر تھا۔" اسسٹنٹ نے گہرا سانس لیا۔ "شاید ہر انسان سے زیادہ بہادر جس سے میں آج تک ملا ہوں۔"

"قبرص کو اس پر فخر کرنا چاہیے۔" سولا کی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "وہ واقعی ایک نڈر انسان تھا۔"

☆☆☆

"وہ... ہمارا پیارا بچہ جہاز کے پچھلے حصے میں ماسک پہنے بیٹھا تھا۔"

سولا کی کی آواز میں جہاں تاسف تھا، وہیں افتخار بھی تھا۔ اینڈریوس کی کہانی بیان کرنے کی ذمے داری اس نے اپنے کاندھوں پر لی تھی۔

"وہ پائلٹ کی ہدایات کا منتظر تھا مگر اسے کوئی پیغام نہیں ملا۔ اس پر وہ ضرور چونکا ہوگا۔ عام حالات میں آکسیجن ماسک گرنے کے بعد جہاز ہنگامی لینڈنگ کرتے ہیں، مگر وہ بدقسمت جہاز مسلسل اڑ رہا تھا۔ اس عمل نے اسے اچنبھے میں ڈال دیا ہوگا۔ وہ اٹھا اور نشستوں پر لٹکتے اضافی ماسک سے آکسیجن لیتا ہوا کاک پٹ تک پہنچا جہاں خوف کا راج تھا۔"

سولا کی پرجوش تھا۔ اس نے بیان کیا کہ کیسے دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھتے انسانوں کے درمیان لڑکے نے زندہ رہنے کی کوشش کی۔ کیسے وہ مایوسی کے اس گہرے

میں آکسیجن سلنڈر کے سہارے سانس لیتا رہا۔ اس نے جولی اور اینڈریوس کی محبت کی بھی بڑے ہی جذباتی انداز میں منظر کشی کی۔

"اور آخر میں جب اس نے یونانی لڑاکا طیاروں کو جہاز کے گرد منڈلاتے دیکھا، اسے اندیشے نے گھیر لیا کہ شاید بوئنگ 737 کو گرا دیا جائے گا۔ تب وہ ارادہ بہادر بچہ خود کاک پٹ میں جا بیٹھا۔ شاید وہ اپنے چٹان سے عزم کے سہارے کچھ کر گزرتا مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ ایندھن ختم ہوگیا۔ تو صاحبان، یہ ہے اینڈریوس پروڈروموس کی کہانی۔ ایک بہادر انسان کا قصہ۔ جس نے اہل قبرص کے دل جیت لیے ہیں۔"

صحافی کھڑے ہوگئے۔ وہ تالیاں بجا کر اس نڈر شخص کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ ہال میں اینڈریوس کا بوڑھا باپ بھی موجود تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

☆☆☆

2007ء کے اوائل میں تحقیقی رپورٹ شائع ہوگئی، جس نے اس واقعے سے جڑے ہر اسرار سے پردہ اٹھا دیا۔

مرنے والوں کے لواحقین نے امریکی جہاز ساز ادارے بوئنگ پر مقدمہ دائر کر دیا۔ ان کے وکیل کانسٹینٹینن دور گیس نے عدالت میں نکتہ اٹھایا کہ کمپنی نے دو مختلف قسم کی ستم کی نشان دہی کے لیے بالکل ایک سا الارم رکھا تھا۔ یعنی ٹیک آف کنفیگریشن الارم اور کاک پٹ میں آکسیجن کی کمی کی اطلاع دینے والے الارم میں... اتنی مماثلت تھی کہ کوئی بھی دھوکا کھا جائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آئرلینڈ اور ناروے نے مذکورہ کمپنی سے جو جہاز خریدے تھے، ان میں بھی اس قسم کے مسائل کی نشاندہی کی گئی تھی۔

لواحقین نے کمپنی کے خلاف 76 ملین یورو ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔ مقدمے نے ملک گیر توجہ حاصل کی۔

2008 میں عدالت نے بوئنگ کمپنی سے منسلک چھ افراد کو غیر ارادی قتل کا ذمے دار ٹھہرایا، جن کا تعلق قبرص سے تھا۔ وہ برطانوی تھے اور ایک شخص بلغاریہ سے تھا۔ اسی برس کے آخر میں ہیلیوس ائیرویز کے چار عہدے دار اس مقدمے کی لپیٹ میں آگئے، جن کی غفلت اور غیر ذمے داری کو اس واقعے کا سبب ٹھہرایا گیا۔

یونانی عدالت میں بھی یہ کیس چلا۔ وہاں بھی ہیلیوس ائیرویز کے عہدے داران کو ذمے دار قرار دیا گیا۔ انہیں دس دس سال کی سزا سنائی گئی، جس کے خلاف اپیل دائر کر دی گئی۔

یہ افواہ بھی اڑی کہ بوئنگ کے کرتا دھرتا میڈیا خصوصاً کیس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید کسی حد تک یہ الزام درست تھی۔ کیس کو دونوں پائلٹوں کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ جواز یہ دیا گیا کہ انہوں نے احتیاطی تدابیر اختیار نہیں کیں اور کنٹرول روم کی ہدایت پر کان نہیں دھرا۔ بعد میں قبرص کی سول ایوی ایشن بھی اس مقدمے کی زد میں آگئی۔

یہ مقدمہ مختلف عدالتوں میں تاحال جاری ہے۔

☆☆☆

غیر یا تنگو یوتان کا ایک چھوٹا سا پُرسکون گاؤں ہے۔ وہ ایک سرسبز پہاڑی علاقہ ہے۔ یہ گاؤں ایتھنز سے کچھ پرے ہے۔

گاؤں کے ساتھ ایک پہاڑی سلسلہ ہے۔ اگر آپ پہاڑ پر چڑھیں تو چوٹی پر ایک مکان دکھائی دے گا۔ آپ کے دل میں تجسس ہوگا کہ اس اجاڑ جگہ بھلا کیوں کوئی رہنے لگا۔ آپ کھوج میں آگے بڑھیں گے۔ مکان کے نزدیک پہنچ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ کسی تنہائی پسند شخص کی رہائش گاہ نہیں، بلکہ ایک یادگار ہے۔

ان بدنصیبوں کی یادگار، جو 14 اگست کو ایک فضائی حادثے میں مارے گئے۔ وہاں ایک ستون ہے، جس کی اطراف ان کی تصویریں رکھی ہیں۔ ہاں، بوئنگ 737 ٹھیک اسی مقام پر گرا تھا۔ ہر سال جب یہ تاریخ آتی ہے تو مرنے والوں کے اہل خانہ اپنے پیاروں کی یاد میں اس پہاڑ کا رخ کرتے تھے۔

کبھی کبھار سولاکی اور میبر بھی یہاں آتے ہیں۔ سولاکی اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے۔ میبر کو ڈائریکٹر کا عہدہ سونپ دیا گیا ہے۔

ایک روز جب وہ دونوں اچھے دوستوں کی طرح اس یادگار کے قریب کھڑے تھے، میبر نے دھیرے سے کہا۔ "یہ کہانی بھی عجیب ہے۔ ایک ذرا سی غفلت، معمولی عدم توجہی اور نتائج انتہائی مہلک۔ آہ، یہ غفلت کی ایک گمبھیر کہانی ہے۔"

"غفلت کی کہانی؟" سولاکی نے سر ہلایا۔ "کہہ سکتے ہو۔ میں تو جب بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں، مجھے یہ محبت کی کہانی لگتی ہے۔ سچی محبت کی کہانی۔"

اس کی نظریں اینڈریوس اور جولی کی تصویروں پر ٹکی تھیں۔

☆☆☆

شیراز خان
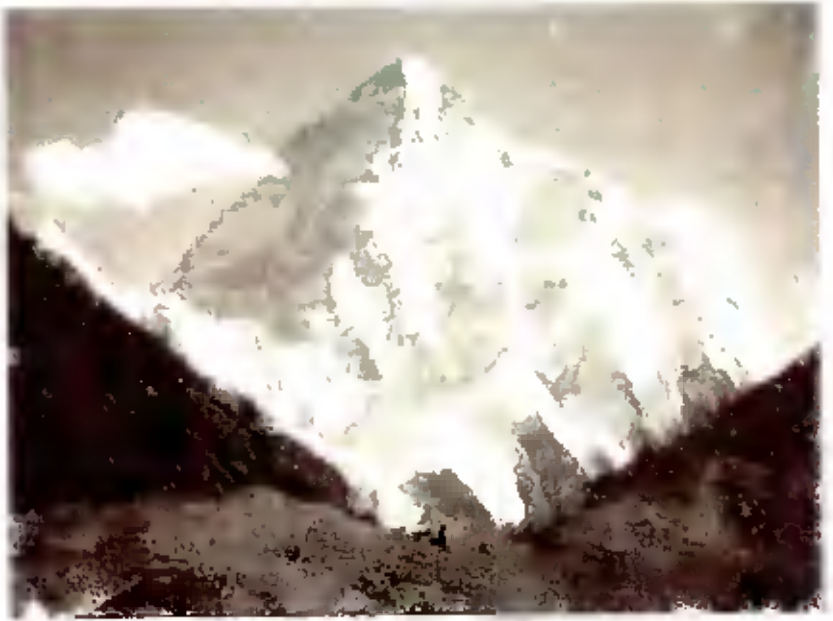
پراسراریت کی کوکھ سے کبھی کبھی ایسے واقعات جنم لے لیتے ہیں جن پر یقین کرنے کے لیے غور کرنا پڑتا ہے۔ یہ داستان بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ وقت گزاری کے تمام عوامل موجود ہیں اور پرلطف انداز تحریر بھی ہے۔

[illegible]

میں سمندر کنارے رہتا ہوں۔

میرے لاؤنج کی کھڑکی سے سمندر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ دور دور تک پھیلا ہوا عظیم سمندر، جس میں ہر وقت ہوا کے ارتعاش سے لہریں بنتی رہتی ہیں اور یہ لہریں ایک شور کے ساتھ کنارے کی طرف جھاگ اڑاتی ہوئی بڑھتی ہیں اور کنارے تک آتے آتے دم توڑ دیتی ہیں۔ ان کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔

میرے لیے یہ ایک دل چسپ نظارہ ہے۔ نہ جانے

اس فرتوں بوڑھے سمندر نے کیسے کیسے زمانے دیکھے ہوں گے۔ اس کے کناروں پر کیسی کیسی تہذیبیں آباد رہی ہوں گی جن کا اب نام و نشان باقی نہیں رہا ہے۔ نہ جانے کتنے محبت کرنے والوں نے اسے گواہ بنا کر قسمیں کھائی ہوں گی اور نہ جانے کتنے لوگ اس کی تہ میں ڈوب کر مچھلیوں کی خوراک بن گئے ہوں گے۔ نہ جانے کتنے جہازوں کو اس نے مسافروں سمیت اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہوگا۔

کاش! میں سامنے پھیلے ہوئے اس سمندر کی داستان جان سکتا۔ لیکن افسوس ہم ایک دوسرے کی زبانوں سے ناواقف ہیں۔ مگر ایک دوسرے کو محسوس کرتے رہتے ہیں۔

میں اس وقت بھی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا، جب میں نے ایک کشتی کو کنارے کی طرف آتے دیکھا۔ یہ بہت بڑی کشتی تھی۔ اس وقت چاند پوری طرح روشن تھا اسی لیے وہ کشتی واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ ایک بادبانی کشتی تھی۔ جس کے کئی بادبان ہواؤں کے زور سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ سمندر میں ایسی کسی کشتی کا ہونا حیران کرنے والا تھا۔

سمندر پر تو ایسی کشتیاں نہیں چلا کرتیں۔ یہ تو دریاؤں میں چلا کرتی ہیں۔ اور وہ بھی اتنے بادبانوں والی، جیسے پرانے دور کی کوئی کشتی ہو۔

میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ وہ کشتی بہت تیزی سے کنارے کی طرف آ رہی تھی، قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پتا نہیں کیا سلسلہ تھا۔ شاید ہواؤں کی تیزی اسے زبردستی ساحل کی طرف لا رہی تھی۔ لیکن اس وقت تو ہوا بھی اتنی تیز نہیں تھی۔

دوسرے کمرے میں بابا کھانے کی میز پر برتن وغیرہ رکھ رہے تھے میں نے گردن گھما کر انہیں آواز دی۔ "حبیب بابا۔ حبیب بابا!"

"جی میاں جی۔" دوسرے کمرے سے بابا کی آواز سنائی دی۔

"ذرا ادھر آئیں۔"

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا، وہ کشتی غائب ہو چکی تھی، بالکل غائب۔ جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ اتنی دیر میں بابا میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ "کیا بات ہے میاں جی؟" انہوں نے پوچھا۔

"بابا، ابھی میں نے ایک کشتی کنارے کی طرف آتے ہوئے دیکھی ہے۔" میں نے بتایا۔ "لیکن اب وہ دکھائی نہیں دے رہی۔"

"ہو سکتا ہے اس کا رخ دوسری طرف مڑ گیا ہو۔" بابا نے نارمل انداز میں کہا۔

"نہیں بابا، وہ کشتی ایک لمحے میں غائب ہوئی ہے۔ صرف ایک لمحے میں۔" میں نے بتایا۔ "اور وہ کوئی عام کشتی بھی نہیں تھی۔ پرانے زمانے کی بادبانی کشتی تھی۔ اس میں کئی بادبان لہرا رہے تھے۔"

بابا نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے انہیں میری دماغی صحت پر شک ہو۔ "میاں جی، آپ ایسا کریں، کھڑکی بند کر دیں۔ چاندنی راتوں میں نظروں کو وہم بھی ہو جاتا ہے۔"

"نہیں بابا، یہ میرا وہم نہیں تھا۔" ایسا نہ ہو کشتی کنارے پہنچ کر ڈوب گئی ہو۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں۔ شاید کسی کو ہماری مدد کی ضرورت ہو۔"

ہمارا اپارٹمنٹ جس طرف تھا وہاں زیر تعمیر عمارتیں تھیں۔ جن میں سے بہت کم آباد تھیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید اسی لیے لوگوں کی توجہ اس کشتی کی طرف نہیں گئی ہوگی۔

میں نے بابا کو ساتھ لیا اور اپنی ٹارچ لے کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ کشتی غائب ہوئی تھی۔ لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی کشتی ڈوبی ہوتی تو کچھ نہ کچھ آثار ہوتے۔

بہت دیر تک تلاش کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ واپسی میں بابا کچھ خاموش اور پریشان سے تھے۔ گھر پہنچ کر بابا نے مجھ سے کہا۔ "میاں جی، ایک بات بتاؤں، آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اسے بھول جائیں۔"

"وہ کیوں۔"

"پتا نہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ کوئی اور معاملہ ہے۔" بابا نے کہا۔ "سمندر کے سینے پر کبھی کبھی ایسی کشتیاں دکھائی دیتی ہیں جن میں سفر کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، یا پھر روحیں دکھائی دیتی ہیں۔"

"ارے نہیں بابا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں ہنس پڑا۔ "میری نظر کا دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے دھیان نہ دیا ہو اور کشتی دوسری طرف چلی گئی ہو۔"

گرچہ میں یہ کہہ تو رہا تھا لیکن خود مجھے اپنی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا وہ کسی صورت واہمہ

نہیں تھا۔ بلکہ کچھ اور تھی اور یہ کچھ اور کیا ہو سکتا تھا۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔

کئی دنوں تک پھر کچھ بھی نہیں ہوا۔

ایک رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس رات بابا اپنی بیمار بیوی کو دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ میں اپنے فلیٹ میں اکیلا تھا۔

عام طور پر جب میں تنہا ہوتا ہوں تو لکھنے پڑھنے کا کام لے کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اس وقت بھی کچھ لکھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔

میں نے دیوار گھڑی کی طرف دیکھا۔ ٹھیک ایک بج رہا تھا۔ اتنی رات گئے کون ہو سکتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں جرائم اتنے عام نہیں تھے اس لیے میں نے بے خوف دروازہ کھول دیا۔ سفید چوغے میں ملبوس ایک بہت خوبصورت لڑکی دروازے پر کھڑی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر بیس اکیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس کے خوبصورت بال آگے کی طرف اس کے سینے پر بکھرے ہوئے تھے اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ بری طرح بھیگی ہوئی تھی۔

اس کے بال، چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ ”کک...... کون ہیں آپ؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”کیا میں کچھ دیر کے لیے پناہ لے سکتی ہوں؟“ اس نے پوچھا۔ اس کی آواز بھی بہت خوبصورت تھی۔

”آجاؤ۔“ میں نے ایک طرف ہٹ کر راستہ دے دیا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کچھ کہے بغیر صوفے پر بیٹھ گئی۔

”کون ہو تم۔ کہاں سے آئی ہو؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”چار دن ہوئے ہماری کشتی سامنے ساحل پر ڈوب گئی تھی۔“ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”چار دن ہوگئے۔“ میں نے حیرت سے دہرایا...

اس وقت اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ کوئی غیر معمولی صورت حال ہے۔ یہ سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی، شاید لڑکی نہیں کچھ اور ہے۔

خوف اور سنسنی کی ایک لہر میرے وجود میں تیز دھار آرے کی طرح اترتی چلی گئی تھی۔

وہ لڑکی جیسے خلا میں گھورتے ہوئے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ ”میں نے منع بھی کیا تھا کہ ایسا نہ کریں۔ یہ ساحل لنگر انداز ہونے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ لیکن کسی نے بھی میری بات نہیں مانی اور سب کے سب ڈوب گئے۔“

”سب ڈوب گئے تو پھر تم...؟“ میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں... وہ ہنس پڑی۔ بہت عجیب ہنسی تھی اس کی۔ ”میں تو پہلے بھی کئی بار ڈوب چکی ہوں۔ بلکہ ہر سال ڈوب جاتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اس بار تو بہت جلدی باہر نکل آئی ورنہ پچھلی بار دو مہینوں کے بعد کنارے پر آئی تھی۔“

میرے خدا! وہ کیسی باتیں کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا تھا۔ کم از کم انسانی عقل تو اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ لڑکی تو ایک زندہ حقیقت کی طرح میرے سامنے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

”کیا تم پریشان ہو رہے ہو؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں اس وقت دل ہی دل میں آیات دہرا رہا تھا۔ جو کچھ بھی مجھے یاد آ رہا تھا۔ ”سنو۔“ اس نے مجھے پھر مخاطب کیا۔ ”کیا تم مجھے جانتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے خوفزدہ انداز میں گردن ہلا دی۔ ”میں تمہیں نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔

”میں عذرا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”عذرا!“

”ہاں، عذرا۔ کیا تم کو ناول وغیرہ پڑھنے سے دلچسپی ہے؟ تم نے رائیڈر ہیگرڈ کو پڑھا ہے؟“

”ہاں، پڑھا ہے۔ اس کی کئی کتابیں میرے پاس ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”تو پھر تم نے عذرا کو ضرور پڑھا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں یاد ہوگا، عذرا اور عذرا کی واپسی۔ میں وہی عذرا ہوں۔ نہ جانے کتنی بار مجھے موت آچکی ہے۔ کبھی سمندر میں ڈوب کر، کبھی پہاڑ سے گر کر، کبھی زہر کھا کر۔ لیکن میں ہر بار زندہ بھی ہو جاتی ہوں۔ شاید میری قسمت میں موت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں مرنے کے لیے ترس گئی ہوں۔ نہ جانے کتنی صدیوں سے موت کی آرزو میں بھٹکتی پھر رہی ہوں لیکن موت ہے کہ کترا کر نکل جاتی ہے۔“

خوف کے بے پناہ احساس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا چہرہ کتنا دمکتا ہوا ہے۔ اس کی آواز میں کیسی سرسراہٹ اور دلکشی

تھی۔ اس کے باوجود وہ کوئی روح تھی جو بھٹکتی ہوئی نہ جانے کیوں میرے اپارٹمنٹ تک چلی آئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ تم بہت پریشان ہو رہے ہو۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "گھبراؤ نہیں، میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ عذرا تو تم سے ملنے آئی تھی۔ کیوں...... اور کس لیے اس کا جواب آنے والا وقت بتائے گا۔ اس وقت تو میں اپنے ساتھیوں کے پاس واپس جا رہی ہوں۔ تم سے پھر ملوں گی۔ یاد رکھنا، پھر ملوں گی۔"

وہ اٹھی۔ اس نے اپنا چوغہ سنبھالا اور ہوا کے جھونکے کی طرح دروازے سے باہر چلی گئی اور میں اپنی جگہ گم صم بیٹھا رہ گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے وہ جگہ دیکھی۔ فرش پر دیکھا جہاں صوفے پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا پورا بدن بھیگا ہوا تھا۔ اس کا لباس بھیگا ہوا تھا لیکن فرش پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔

میں کوئی بزدل انسان نہیں ہوں۔ اگر بزدل ہوتا تو جس وقت وہ باتیں کر رہی تھی اسی وقت چیختا چلاتا ہوا اپارٹمنٹ سے باہر نکل جاتا۔

لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ حیرت کی انتہا نے میری زبان بند کر دی تھی۔ میں تقریباً سکتے ہی میں رہ گیا تھا۔

نہ جانے کس وقت مجھے ہوش آیا ہوگا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور چائے بنانے کچن کی طرف چلا گیا۔ ملازم کے طور پر میرے پاس صرف بابا ہی ہوا کرتے تھے۔ حالانکہ حکومت کی طرف سے میں دو تین ملازمین رکھ سکتا تھا۔ لیکن میں نے صرف بابا کو ترجیح دی تھی۔ بابا میرے پاس برسوں سے کام کر رہے تھے۔

میرے کام کی نوعیت بہت مختلف تھی۔ میں فنانس کا آدمی تھا۔ حکومت نے ماہر اقتصادیات کے طور پر میری خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ سالانہ بجٹ کی ابتدائی شکلیں میں ہی بنایا کرتا تھا۔ یہ کام بہت رازداری کا ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس دور افتادہ مقام پر بنے ہوئے ایک اپارٹمنٹ میں اپنی رہائش اختیار کر رکھی تھی۔

جہاں کوئی ڈسٹرب کرنے والا، کوئی آنے جانے والا نہیں تھا۔ اسی لیے میں دن رات موٹی موٹی کتابوں اور اپنے کمپیوٹر کے ساتھ مصروف رہتا۔

میرا اپارٹمنٹ ایک طرح کی ریفرنس لائبریری بھی بن چکا تھا۔ ہفتے میں ایک بار کچھ اور ماہرین بھی آیا کرتے اور معاشی اصلاحات کے حوالے سے سوچ بچار ہوا کرتی۔

یہ بہت نازک اور پیچیدہ کام تھا۔ ذرا سی غلطی یا بے پروائی سے سارے اعداد و شمار الٹ پلٹ ہو جاتے۔ سارا کھیل اعداد و شمار ہی کا ہوا کرتا ہے۔

میری نگاہیں پورے ملک کی معاشی صورت حال پر تھیں۔ ٹیکس، صنعتیں، تجارتی ادارے، ان کے ہر قسم کے گوشوارے میرے ریکارڈ میں تھے۔

اس بار میں نے حکومت سے کہا تھا کہ اگر میرے تجویز کردہ منصوبوں پر عمل کیا جائے تو اس ملک کی معاشی حالت بہت بہتر ہو سکتی ہے۔ اراکین حکومت کی ایک ہنگامی میٹنگ میں مجھے فری ہینڈ دے دیا گیا تھا کہ میں اپنے طور پر معاشی پالیسی مرتب کروں۔

اسی لیے میں یہ کام بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں کر رہا تھا۔

عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کوئی اس قسم کے اہم پروجیکٹ پر کام کرنے لگتا ہے تو وہ اپنے آپ کو باقی دنیا سے علیحدہ کر لیتا ہے تاکہ کسی قسم کا دباؤ اس پر نہ آ سکے۔

میری عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہے۔ صحت اچھی ہے۔ صورت شکل میں بھی ہزاروں سے بہتر ہوں۔ لیکن زندگی نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ میں اس کے رومانی اور جذباتی پہلوؤں کی طرف دھیان دے سکوں۔ اسی لیے میں نے نہ تو کسی کی محبت حاصل کی اور نہ ہی میری شادی ہو سکی ہے۔

ایک خشک مضمون لے کر میں نے اس میں کمال حاصل کر لیا۔ چند برسوں تک یونیورسٹی میں بھی پڑھاتا رہا ہوں۔ اس دوران میرے مضامین دنیا بھر کے قابل قدر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

شاید یہی سب دیکھتے ہوئے حکومت نے میری خدمات فنانس ڈپارٹمنٹ کے لیے حاصل کر لیں اور میں اس طرح اس مقام تک پہنچ سکا ہوں۔

میرے ساتھ پیش آنے والا یہ واقعہ بہت حیرت انگیز تھا۔ وہ آنے والی اگر روح تھی تو اس نے میری نہ جانے کس حس کو بے دار کر دیا تھا۔

وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو اس کے بقول ہزاروں سال پہلے مر چکی تھی۔ بہرحال وہ جو بھی تھی، مجھے اس سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ایک طرح کا سکون اور خوشی ملی تھی

اس کو دیکھ کر۔

اس رات اس لڑکی کا خیال آ رہا تھا۔ وہ کتنی خوبصورت تھی۔ میں نے رائیڈر ہیگرڈ کے اس پُراسرار ناول کو کئی بار پڑھا تھا۔ شی اور ریٹرن آف شی۔ عذرا اور عذرا کی واپسی۔

میرے پاس آنے والی لڑکی بھی ایسی ہی تو تھی۔ اتنی حیرت انگیز، اتنی خوبصورت۔

دوسری صبح بابا واپس آگئے تھے۔ میں نے بابا سے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا، نہ جانے کیوں۔ میں نے انہیں اس پُراسرار کشتی کے بارے میں تو بتا دیا تھا لیکن اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

دن بھر کی وہی مصروفیات رہیں۔ وہی اعداد و شمار، وہی الٹ پھیر۔ البتہ رات کے کھانے کے وقت بابا نے ایک ایسی بات کی کہ میں چونک پڑا۔ بابا نے پہلی بار ایسا کہا تھا۔ ''میاں جی، میری ایک بات مانیں گے؟''

''ہاں بابا، بتائیں کیا بات ہے۔''

''آپ شادی کرلیں جی۔'' بابا نے کہا۔

''کیوں بابا۔'' میں مسکرا دیا۔ ''کیا میری آزادی آپ کو اچھی نہیں لگ رہی؟''

''یہ بات نہیں ہے میاں جی، بلکہ اب آپ کو شادی کرلینی چاہیے۔'' بابا نے کہا۔

''ٹھیک ہے بابا، میں اس پر سوچوں گا۔'' میں نے بات ٹال دی۔

بابا نے میرے دل میں ایک احساس جگا دیا تھا۔ وہ احساس تھا تنہائی کا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی شاید میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

اس رات میں غیرارادی طور پر اپنی اس کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا جہاں سے سمندر دکھائی دیا کرتا تھا۔ چاند غائب ہو چکا تھا اس لیے سمندر بہت تاریک دکھائی دے رہا تھا۔ صرف اس کے بپھرنے کی آوازیں کانوں تک آ رہی تھیں۔

اور اچانک مجھے کچھ دکھائی دے گیا۔ سمندر کا کنارہ اچانک ہی روشن ہو گیا تھا۔ نہ جانے یہ روشنی کہاں سے آئی تھی۔ اس روشنی میں سمندر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

پھر میں نے پانی میں سے کسی کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ کوئی بہت آہستہ آہستہ پانی سے باہر آ رہا تھا۔ میرے خدا! یہ تو وہی لڑکی تھی۔ وہی سفید لبادے میں ملبوس۔ اتنے فاصلے

کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ روشنی جس نے سمندر کے اس حصے کو روشن کر دیا تھا، اس کے جسم سے نکل رہی تھی۔

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

پھر اچانک اندھیرا ہو گیا انتہائی گھور اندھیرا۔ نہ تو وہ لڑکی تھی اور نہ ہی سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ اندھیرے کی چادر ایک بار پھر ہر طرف پھیل چکی تھی۔

خدا معلوم یہ سب کیا بھید تھا، کون تھی وہ لڑکی۔ کیا واقعی وہ کوئی روح تھی یا اس کا کوئی اور بھید تھا۔

اس لڑکی نے خود کو دکھا کر ایک بار پھر مجھے نہ جانے کن جہانوں کی سیر کروا دی تھی۔ کیا میرے خوابوں کی تعبیر مجھے اس پُراسرار انداز سے ملنے والی تھی۔

اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بابا کھڑے تھے اور کچھ گھبرائے ہوئے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ''کیا ہوا بابا، خیر تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔''

''میاں جی، کوئی لڑکی آپ سے ملنے آئی ہے۔'' بابا نے بتایا۔ ''میں نے اسے لاؤنج میں بٹھا دیا ہے۔''

''کون ہے وہ لڑکی؟''

''میں نہیں جانتا میاں جی، آپ خود چل کر دیکھ لیں۔'' بابا نے بتایا۔ تو میں ان کے ساتھ چل دیا۔ لاؤنج میں وہی لڑکی بیٹھی تھی۔

☆☆☆

ایک پُراسرار منظر کا کردار اپنے منظر سے نکل کر میرے سامنے آ گیا تھا۔

میں لاؤنج میں اکیلا ہی آیا تھا، بابا ساتھ نہیں تھے۔ لیکن اب اس لڑکی کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔

میں سوچنے سے بھی معذور ہو رہا تھا۔ اس لڑکی کی اس طرح اچانک آمد نے میرے ہوش اُڑا دیے تھے۔ میری آہٹ پا کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس وقت بھی اس کے جسم پر سفید لبادہ تھا اور وہ سر سے پاؤں تک بھیگی ہوئی تھی۔ وہ اسی دن کی طرح خوبصورت دکھائی دے رہی تھی جس دن میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

''تم نے پہچانا مجھے؟'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''میں عذرا ہوں۔ کتابوں کے صفحات سے نکل کر

تمہارے سامنے آگئی ہوں۔"

"کک...... کیا چاہتی ہو تم؟" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم سے دوستی۔" اس نے کہا۔ "میں برسوں سے تمہاری تلاش میں بھٹک رہی ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"لیکن میں تو تمہیں نہیں جانتا۔"

"میں تو جانتی ہوں نا۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "تم کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ میں آج سمندر سے نکل کر سیدھی تمہارے پاس آئی ہوں۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ آج تمہارا ملازم بھی گھر پر ہے۔ اس کے باوجود میں آگئی۔ میں خود کو چھپانا نہیں چاہتی۔ تنگ آچکی ہوں خود کو چھپاتے ہوئے۔ کاش، کاش تم میرا ساتھ دے سکو۔"

"آخر تم ہو کون؟"

"تم نے ابھی بھی نہیں پہچانا۔ میں ایک بھٹکی ہوئی روح ہوں۔" اس نے کہا۔ "ہزاروں سال سے بھٹک رہی ہوں۔ صرف تمہارے لیے۔ کیا تم میری نجات کا سبب نہیں بنو گے۔"

"خدا کے لیے مجھے پریشان مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میں مسلمان ہوں، ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔"

"بہت سی باتیں انسانی سوچ سے ماورا ہوتی ہیں دوست۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "دیکھو، میں نے تمہیں اپنا دوست کہہ دیا ہے۔ اس دوستی کی حفاظت کرنا اور میرا ساتھ دینا۔ میں تمہیں اپنے بارے میں سب بتادوں گی۔ اس وقت تمہارا ملازم کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر آنے والا ہے۔"

ابھی اس نے بات ختم کی تھی کہ بابا ایک ٹرے میں چائے اور بسکٹ وغیرہ لے کر آگئے۔ انہوں نے وہ ٹرے ہمارے سامنے میز پر رکھ دی تھی۔ وہ لڑکی اچانک کھڑی ہوگئی۔ "اب میں چلتی ہوں۔"

"بیٹا، چائے تو پی لو۔" بابا نے اسے مخاطب کیا۔

"نہیں بابا، شکریہ۔ میں ایسی چیزوں سے بہت آگے جاچکی ہوں۔"

پھر اس سے پہلے کہ بابا کچھ بول سکتے یا میں کچھ کہتا وہ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی تھی اور پہلے کی طرح اس بار بھی فرش پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔

بابا شاید سکتے کی سی حالت میں دروازے کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ "میاں جی، فوراً اپنی زندگی کا صدقہ دے دیں اور اپنی حفاظت کے لیے کوئی بندوبست کرلیں۔"

میں سمجھ چکا تھا کہ بابا کیا کہنے والے ہیں۔ میں نے پھر بھی دریافت کیا۔ "خیر تو ہے بابا؟"

"میاں جی، یہ جو آئی تھی، یہ شاید انسان نہیں ہے۔ یہ کوئی اور مخلوق ہے۔" بابا جی نے بتایا۔

ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ بابا نے ٹھیک پہچانا۔ کوئی اور مخلوق، کوئی پراسرار مخلوق جو سمندر کی تہ سے نکلی اور سیدھی میرے پاس آگئی تھی۔

"بابا، آخر یہ کیا چکر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں میاں جی، لیکن آپ محتاط ہوجائیں۔" بابا نے کہا۔ "رات کو سونے سے پہلے خود پر دم کرلیا کریں۔"

"ٹھیک ہے بابا جی، میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے اپنی گردن ہلا دی۔

میں رات بھر خوف میں مبتلا رہا تھا۔ کئی سوال تھے جو میرے ذہن پر ڈنک مار رہے تھے۔ میرا اس لڑکی سے کیا رشتہ تھا؟ وہ میرے پاس کیوں آئی تھی؟ اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ مجھے صدیوں سے جانتی ہے؟ اس قسم کی باتیں تو فلموں اور کہانیوں میں ہوا کرتی ہیں۔

عام زندگی میں ایسا کہاں ہوتا ہے اور جب نہیں ہوتا ہے تو پھر یہ سب کیا تھا، کیوں تھا؟ وہ ایسی لڑکی تھی جس کو بھوت، پریت یا بھٹکی ہوئی روح تسلیم کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کا غیر انسانی ہونا تو سامنے کی بات تھی۔ اس وقت میں نے اپنے ذہن کا تجزیہ شروع کیا۔

عام حالات میں تو مجھے اس سے خوفزدہ ہونا چاہیے تھا۔ ڈرنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس مجھے اس سے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ دو بار اس کو فاصلے سے دیکھ چکا تھا۔ دو بار ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود میں اس سے خوف زدہ نہیں تھا۔ بلکہ ہر بار اس سے ملنے کی خواہش اور شدید ہوجاتی تھی۔

آخر کیوں؟ کاش! میرے پاس اس الجھے ہوئے سوال کا کوئی جواب ہوتا۔ دوسری صبح میں کسی حد تک معمول پر آگیا تھا۔ میں نے اپنا کام شروع کردیا۔ ابھی بھی کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

دن بھر کام کرتا رہا۔ شام کے وقت کمپوزر آگیا تھا۔ میں نے صفحات ٹائپ کرنے کے لیے دے دیے۔ وہ رات

دس بجے تک کام کرنے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

کھڑکی سے باہر نظر آنے والا سمندر پرسکون اور تاریک ہو رہا تھا۔ میں بہت دیر تک آنکھیں پھاڑے باہر کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ دو چار کروٹیں لینے کے بعد گہری نیند آ گئی تھی۔

نہ جانے کس وقت میری آنکھ کھل گئی تھی۔

میں نائٹ بلب جلا کر سونے کا عادی ہوں۔ کمرے کی ہر چیز واضح تھی۔ کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس کے باوجود کسی بات کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید کوئی اور بھی اس کمرے میں موجود تھا۔ لیکن وہ جو بھی تھا، میں اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

لیکن نہیں، اس کمرے میں تو صرف آوازیں تھیں۔ نامانوس سی آوازیں۔ جن میں گھنٹیوں کی آوازیں بھی ہم آہنگ ہو رہی تھیں۔

یہ بھنبھناہٹ سی تھی۔ جیسے بہت سے لوگ مل کر کچھ گا رہے ہوں۔ آوازیں دھیرے دھیرے واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ عورتوں اور مردوں کی ملی جلی آوازیں تھیں۔ ایک خاص لے اور سر کے ساتھ۔ ان میں گھنٹیوں کی آوازیں بھی شامل ہوتی جا رہی تھیں۔

بہت دل کش نغمہ تھا۔ میں جیسے اس نغمے کی روانی کے ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا۔ آوازیں مجھے اپنے ساتھ لیے جا رہی تھیں۔ کوئی نہیں تھا اس کمرے میں۔ اس کے باوجود وہ کمرا ان دیکھی ان ہونی آوازوں سے بھر گیا تھا جیسے وہ آوازیں ستاروں سے ہوتی ہوئی میرے کمرے میں آ رہی ہوں۔

بہت ہی پُر اسرار لیکن بہت دل کش اور لذت انگیز تجربہ حاصل ہو رہا تھا مجھے۔ میں گرچہ اپنے بستر ہی پر تھا۔ پھر بھی ہواؤں میں اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ بادلوں سے بھی پرے۔ دور، دور، بہت دور۔

پھر اچانک وہ آوازیں بند ہو گئیں۔

اب کمرے میں سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا جو شاید میری روح تک میں اترتا جا رہا تھا۔ وہ طلسم ختم ہو چکا تھا۔ لیکن میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔

ایک بار پھر خوف نام کی کوئی چیز نہیں، کوئی احساس نہیں تھا۔ جیسے میں بھی اس الوہی نغمے کا ایک حصہ ہی ہوں۔ جیسے یہ انجانا نغمہ میرے لیے اجنبی نہ ہو۔ میں شاید صدیوں سے اس نغمے کو سنتا چلا آ رہا ہوں۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح ہونے والی تھی۔ اب سونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں نے اٹھ کر بلب روشن کیے اور ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا۔

دوسری صبح میں میجر وسیم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک ماہر نفسیات تھا۔ فوج نے اس کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں اور وہ میجر کے عہدے پر فائز تھا۔ ہم دونوں بچپن کے دوست تھے۔ میں نے اسے اب تک کے سارے تجربات بتا دیے جنہیں وہ بہت حیران ہو کر سنتا رہا تھا۔

"حیرت انگیز!" وسیم نے میرے خاموش ہونے کے بعد کہا۔ "میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب تمہارے دماغ کا خلل ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم ایک مضبوط اعصاب کے آدمی ہو۔ تمہاری فیلڈ شمار یات ہے جہاں ایسے واہموں کا کوئی گزر نہیں پھر بھی تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اسے میں ایک غیر سائنسی صورت حال ہی کہہ سکتا ہوں۔"

"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود بابا اس لڑکی کو دیکھ چکے ہیں۔" میں نے بتایا۔

"یہی تو سب سے حیرت انگیز بات ہے۔" وسیم نے کہا۔ "اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ اگر وہم ہی ہوتا تو بابا اس کے گواہ نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود میں یہ چاہوں گا کہ دو چار باتیں بابا سے پوچھ لوں، اگر تمہاری اجازت ہو۔"

"اس میں اجازت والی کون سی بات ہے۔ تم کہو تو ابھی فون کر کے بابا کو بلا لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ تو کئی بار تمہارے پاس آ چکے ہیں۔"

"ہاں ہاں، وہ آسانی سے آ جائیں گے۔ تم بلوا لو ان کو۔ یوں سمجھو کہ میں نے اس پُر اسرار کیس پر کام ابھی سے شروع کر دیا ہے۔"

میں نے بابا کو فون کر کے انہیں وسیم کے دفتر پہنچنے کے لیے کہہ دیا۔ میں اور وسیم اس دوران اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔

بابا کو آنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

وسیم نے بابا کو اپنے کمرے میں ہی بلا لیا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وسیم نے بابا سے پوچھا۔ "بابا، آپ نے تو خود اس لڑکی کو دیکھا ہے جو حمادت سے ملنے آئی تھی۔"

"لڑکی...... کون سی لڑکی؟" بابا نے حیران ہو کر

پوچھا۔

''بابا! وہ لڑکی جو پُراسرار طریقے سے آئی تھی اور آپ نے اس سے بچنے اور ہوشیار رہنے کے لیے کہا تھا۔''

''نہیں میاں جی' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں تو کوئی لڑکی نہیں آئی۔''

میرا دل چاہا کہ میں اٹھ کر بابا کو طمانچہ رسید کر دوں۔ ان کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑنا شروع کر دوں۔ آخر کیا ہو گیا تھا انہیں۔ وہ اس لڑکی کے وجود ہی سے انکار کر رہے تھے جس کے بارے میں خود ان کا یہ خیال تھا کہ وہ کوئی غیر انسانی مخلوق ہے۔

''کیا ہو گیا ہے بابا آپ کو؟'' میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ لڑکی کے وجود ہی سے انکار کر رہے ہیں۔ جبکہ آپ نے خود اسے لاؤنج میں لے جا کر بٹھایا تھا اور اس کے بارے میں یہ کہا تھا کہ وہ کوئی غیر انسانی مخلوق ہے۔ میں اس سے بچ کر رہوں۔''

''نہیں میاں جی' ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔'' بابا نے پریشان ہو کر کہا۔

''اچھا آپ باہر جائیں۔'' وسیم نے بابا سے کہا۔

''وسیم' یہ کیا چکر ہے۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''یہ بابا جھوٹ کیوں بول رہے ہیں۔ جبکہ سب کچھ ان کی نگاہوں کے سامنے ہو رہا تھا۔''

''ریلیکس حماد' ریلیکس۔'' وسیم نے کہا۔ ''جو کچھ تم نے دیکھا یا جو کچھ بابا نے کہا وہ سب بھول جاؤ۔ اپنے آپ کو آرام دو' پُرسکون نیند لو۔ دماغ کو تھکا دینے والے کام نہ کرو۔ میں تمہیں کچھ میڈیسن دے رہا ہوں وہ استعمال کرو۔''

''رہنے دو اپنی دوائی۔'' مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ ''تم لوگوں نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے جبکہ میں بالکل ہوش میں ہوں۔ پاگل تو بابا ہو گئے ہیں جنہوں نے صاف انکار کر دیا۔ حد ہو گئی۔''

وسیم مجھے بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن میں اس کے دفتر سے باہر آ گیا۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ اس لڑکی کے وجود سے زیادہ اب مجھے بابا کے انکار پر حیرت ہو رہی تھی۔

بابا باہر کمرے میں میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ میں نے سوچا کہ اسی وقت ان پر برس پڑوں۔ انہوں نے انکار کر کے مجھے ایک طرح کا پاگل ہی ڈکلیئر کر دیا تھا۔

میں بابا کو لے کر گھر آ گیا۔ راستے بھر ہمارے درمیان خاموشی رہی تھی۔ گھر آ کر میں بابا پر پھٹ پڑا۔ ''بابا' یہ آپ نے کیسی بات کر دی۔ کیا آپ نے اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا؟''

''دیکھا تھا بیٹا۔'' بابا نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔

''تو پھر۔'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''پھر آپ نے ایسا کیوں کہا۔''

''اس لیے میاں جی کہ آپ اسے بھول جائیں۔ اپنے ذہن سے نکال دیں۔ اسے کوئی اہمیت نہ دیں ورنہ اسی طرح پریشان ہوتے رہیں گے۔''

''بابا' یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو اس کے پاس حل... تلاش کرنے گیا تھا۔ آپ نے مجھے پاگل بنوا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی طریقہ بتا دیتا۔ یا کسی ایسے شخص کے پاس بھیج دیتا جو اس راز کو حل کر سکے۔''

''شاید مجھ سے غلطی ہو گئی میاں جی۔'' بابا شرمندہ ہوئے جا رہے تھے۔ ''آپ بتائیں' آپ کے ذہن میں کیا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں ہے بابا۔ میں اس لڑکی کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ لڑکی یوں ہی میرے پاس نہیں آ رہی ہے۔ وہ بھٹکی ہوئی روح سہی لیکن مجھ سے اس کا تعلق ضرور ہے۔ اور یہ تعلق کیا ہے' یہ میں نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے وقت گزرنے کے بعد پتا چل جائے۔''

بابا نے میرے لہجے اور تیور سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس پُراسرار لڑکی کے لیے بے بس ہو چکا ہوں اور اس کا راز جاننے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔ اور دوسری بات کا بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں اس صورت حال سے خوفزدہ نہیں تھا بلکہ میرے ارادے کچھ اور پختہ ہو گئے تھے۔

پھر کئی دنوں تک کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہ کوئی منظر دکھائی دیا۔ نہ کوئی آواز آئی اور نہ ہی وہ بھیگی ہوئی لڑکی میرے پاس آئی۔

شاید ایک واہمہ تھا جو ختم ہو چکا تھا۔ اس کے نہ آنے سے ایک طرح کی بے چینی بھی ہونے لگی تھی۔ کسی چیز کی کمی کا احساس ہوتا جا رہا تھا۔

پھر ایک ہفتے کے بعد وہ پھر آ گئی۔ اس بار بھی بابا گھر پر نہیں تھے۔ اس نے دروازے پر دستک دی تھی۔ اور جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ بڑی بے پروائی اور بے تکلفی کے

سا کچھ اتر آ گئی تھی۔

آج اس نے سبز رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ بھیگی ہوئی بھی نہیں تھی۔ البتہ اس کا چہرہ پہلے کی طرح چمک رہا تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "آج میں تمہارے سامنے کسی اور روپ میں آئی ہوں نا۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے گردن ہلا دی۔ مجھ پر پھر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

"آج میں سمندر میں نہیں ڈوبی ہوں۔" اس نے کہا۔ "بلکہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ یہ میری ایک اور موت ہے۔"

"خدا کے لیے یہ بتا دو کہ یہ سب کیا ہے؟" میں گڑگڑایا۔ "تم نے مجھے پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔"

"میں آج اسی لیے آئی ہوں کہ تمہیں اس کیفیت سے نکال لوں۔" اس نے کہا۔ "آج میں تمہاری مدد حاصل کرنے آئی ہوں۔ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی ہوں۔"

"کہاں لے جاؤ گی مجھے؟"

"اپنے گھر، جو بہت دور پہاڑوں کے درمیان ہے۔" اس نے بتایا۔ "جہاں لہو کو برف بنا دینے والی ہوائیں چلتی ہیں اور جہاں سوائے برفانی سلوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جہاں کی سب سے بڑی دولت یاک ہیں جن کے بالوں سے ہمارے کپڑے تیار ہوتے ہیں اور جن کے دودھ سے ہماری پرورش ہوتی ہے۔"

"لڑکی آخر تم ہو کون؟ اور میں تم سے خوفزدہ کیوں نہیں ہوں؟ ایسا کیوں لگتا ہے جیسے میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست رہ چکے ہیں۔"

"ہاں، ہم دوست ہی تو تھے۔" اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ "ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوبصورت دن گزارے ہیں۔ اس وقت تمہارا نام وانگ ہوا کرتا تھا۔ اور میں لی پانگ تھی۔ ہم برفانی وادیوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بھٹکتے رہتے تھے۔ تم مجھے کوشاک کے نغمے سنایا کرتے اور میں تمہاری آواز پر رقص کیا کرتی۔ تم کو یاد ہوگا۔ تم بہت خوبصورت رانگا بجایا کرتے تھے۔"

وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی جو میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس کے باوجود اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا بلکہ میں خود کو اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پہاڑوں کے درمیان گھومتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

اس نے بتایا تھا کہ میرا نام وانگ ہے۔ لیکن میرا ایسا نام تو کبھی نہیں تھا۔ "بتاؤ، کیا تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی کچھ یاد نہیں آ رہا۔" میں نے کہا۔

"یاد کرو میرے محبوب! ہم شاوک میں رہا کرتے تھے۔" اس نے بتایا۔ "یاد کرو کہ ہمارے گھر شاوک میں تھے۔ میں وہاں کے راجا کی بیٹی تھی اور تم وہاں کے ایک تاجر کے بیٹے تھے۔ پھر ہماری ملاقات ہوئی تھی اور ہم ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے تھے۔"

"شاید یاد آ جائے۔" میں بے بسی سے بولا۔ "لیکن اس وقت کچھ یاد نہیں آ رہا۔ تم چلی جاؤ۔ میں نہیں جانتا کہ جب تم آئی ہو تو میں تمہیں دیکھ کر بے حال کیوں ہو جاتا ہوں۔ تم چلی جاؤ۔ تم جو بھی ہو، کم از کم میرے لیے نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ ہم میں اور تم میں بہت فرق ہے۔ تم کچھ اور ہو۔ کوئی اور مخلوق۔"

"ہاں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں ایک بھٹکتی ہوئی روح ہوں اور تم انسانی جسم میں ہو۔ لیکن یاد رکھو یہ سب کچھ عارضی ہے۔ میں بھی اور تم بھی۔ حقیقت کیا ہے، یہ بڑے معبد کے بڑے پروہت کو بھی نہیں معلوم ہوگی۔ سچائی کہیں دور بہت دور ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ہم اب دور نہیں رہ سکتے۔ ہمیں ایک دوسرے کے پاس آنا ہے۔ ہمیں پہلے کی طرح ایک ہونا ہے۔"

"ایسا شاید نہیں ہو سکے گا۔" میں نے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا۔" اس نے بہت پر یقین انداز میں اپنی گردن ہلائی۔ "میں اتنا فاصلہ طے کر کے تمہارے پاس یوں ہی تو نہیں آئی ہوں۔ تم کو شاوک آنا ہے۔ تم وہاں آؤ گے تو مجھے سکون مل جائے گا۔ میرا یہ بھٹکنا ختم ہو جائے گا۔ تم آؤ گے نا۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں، آؤں گا۔" میں نے نہ جانے کس ٹرانس میں اس سے وعدہ کر لیا۔

"شکریہ میرے محبوب۔" اس نے کہا۔ "اب میں چلتی ہوں۔"

اور وہ کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ میں اس کے پیچھے جا سکتا۔ اسی وقت ایک چیخ سنائی دی اور ایسا لگا جیسے چیخ کے ساتھ کوئی زمین پر زور سے گرا ہو۔

میں ٹرانس سے نکل آیا تھا۔ میں نے باہر روڈ لگا دی۔ بابا سیڑھیوں کے پاس بے ہوش گرے ہوئے تھے۔ میں بڑی مشکلوں سے بابا کو اٹھا کر اندر لایا تھا۔

☆☆☆

"میاں جی! آپ یہ گھر بدل لیں۔" بابا ہوش میں آنے کے بعد ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھے۔ "وہ بلا آپ کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ وہ آپ کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ آپ اس سے بچیں میاں جی۔"

"کیسے بچوں۔ آپ ہی نے تو وسیم سے کہا تھا کہ ایسی کسی لڑکی کا وجود نہیں ہے۔ میں ذہنی ہو گیا ہوں۔"

"وہ میری غلطی تھی میاں جی۔" بابا شرمندہ نظر آرہے تھے۔

"اچھا خیر چھوڑیں۔ اس وقت آپ کیوں بے ہوش ہو گئے تھے۔" میں نے پوچھا۔

"میں نے اس لڑکی کو دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔" بابا نے بتایا۔ "وہ چل تو رہی تھی۔ لیکن اس کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔ وہ جیسے ہوا میں تیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ بس یہی دیکھ کر میں بے ہوش ہو گیا۔"

"بابا! آج اس لڑکی نے مجھ سے بہت باتیں کی تھیں۔" میں نے کہا۔ "اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔"

"یہ سب چھوڑیں میاں جی۔ لعنت بھیجیں اس پر۔" بابا جلدی سے بولے "آپ ابھی میرے ساتھ کسی عامل کے پاس چلیں۔ اس کا اور کوئی حل نہیں ہے۔"

"میں ایک بار وسیم سے مشورہ کر لوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، مجھے بھی لے چلیں۔ میں بتا دوں گا کہ میں نے اس دن جھوٹ کیوں بولا تھا۔"

ہم ایک بار پھر وسیم کے سامنے تھے۔ بابا نے اسے بتا دیا تھا کہ اس دن انہوں نے غلط بیانی کیوں کی تھی۔ وسیم انتہائی حیران نظر آرہا تھا۔ "حماد! تم نے جو کہانی سنائی اور تمہارے ساتھ جو کچھ گزر رہی ہے وہ بہت حیرت انگیز ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس دور میں بھی ایسے واقعات پیش آسکتے ہیں۔ لیکن جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

"وسیم مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس لڑکی کا تعلق شاوک سے ہے۔" میں نے کہا۔ "فرض کرو ہم اگر غلطی تو جیہ کو

جبر مسیحی

حضر موت کے ایک عباسی خاندان کا غلام۔ آنحضورؐ مروہ کے قریب جبر کے مکان کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ قرآن کریم کی حلاوت اور اس کے علوم کی نورانیت جب قلوب کی تسخیر کرنے لگی اور کفار نے دیکھا کہ لوگ اس کے گرویدہ ہونے جا رہے ہیں اور کوئی تدبیر اسلام کی مخالفت میں کامیاب نہیں ہوئی تو انہوں نے طرح طرح کے افترا اٹھانے شروع کیے۔ کبھی اس کو سحر بتایا۔ کبھی اگلوں کے قصے اور کہانیاں کہا۔ کبھی یہ کہا کہ آنحضرتؐ نے یہ خود گھڑ لیا ہے اور ہر طرح کوشش کی کہ کسی طرح لوگ اس کتاب مقدس کی طرف سے بدگمان ہوں۔ انہیں فتنہ انگیزیوں اور مکاریوں میں سے ایک مکر یہ بھی تھا کہ انہوں نے جبر مسیحی جو ایک عجمی غلام تھا کے بارے میں کہا کہ وہ آنحضورؐ کو قرآن سکھاتا ہے اور آپؐ اس غلام کی باتیں سن کر اپنے الفاظ میں دہراتے ہیں۔ نیز وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر ہمیں اپنا مذہب تبدیل کرنا پڑا تو ہم مسیحی دین اختیار کرلیں گے۔ جب قریش نے اس بات کو عام کرنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل کی آیت 103 میں ان کے اس الزام اور گمراہی کی تردید کی۔ "اور ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک شخص آپ کو آیات قرآنی کی تعلیم دیتا ہے لیکن جس شخص کی جانب یہ لوگ اشارہ کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ قرآن واضح عربی زبان میں ہے۔" (103:16) اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ جس غلام کی طرف کفار مکہ یہ نسبت کرتے تھے اس کے دل کو بھی اس کلام کے اعجاز نے تسخیر کر لیا اور وہ بھی مشرف با اسلام ہو گیا اور آنحضورؐ کی خدمت میں رہنے لگے۔

مرسلہ: شفقل حسین۔ کراچی

ایک طرف رکھ دیجیے تب تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ لڑکی مجھے اپنے زمانے میں بلانا چاہتی ہے۔ شاید صدیوں سال پہلے میرا بھی تعلق اسی علاقے سے تھا۔ میں ابھی اس کی بات نہیں کر رہا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمیں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے یا سائنسی دور میں ایسے واقعات نہیں ہوا کرتے۔ یہ ایک الگ سبجیکٹ ہے۔ اس وقت تو یہ ہے کہ اس لڑکی کا نام لی چانگ تھا اور وہ وہاں کے کسی راجا کی بیٹی تھی اور میرا نام وانگ ہوا کرتا تھا۔''

''بالکل پُراسرار فلموں یا کہانیوں والی بات ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''اور وہ لڑکی کسی وجہ سے عتاب میں آجاتی ہے اور اسے مار دیا جاتا ہے۔ اور وانگ بھی ادھر اُدھر ہو جاتا ہے۔''

''اور اس کی بھٹکی ہوئی روح صدیوں کے بعد تم کو تلاش کر لیتی ہے۔'' وسیم نے میری بات مکمل کی۔

''ہاں، بظاہر تو یہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے بھائی۔''

''میں تو خود اس بات کو نہیں مان رہا ہوں۔ لیکن جو کچھ سامنے ہے اسے کیسے نظر انداز کر دیا جائے۔''

''یہ تو بہت الجھی ہوئی صورت حال ہے۔''

''بابا کا یہ مشورہ ہے کہ میں کسی عامل سے رجوع کروں۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم مشورہ دو۔''

''عامل وامل نہیں، کوئی روحانی بزرگ۔'' وسیم نے بتایا۔ ''بلکہ تم میرے ساتھ چلو۔ میں اپنے مرشد سے ملواتا ہوں۔ شاید ان کے پاس تمہاری اس پرابلم کا کوئی حل ہو۔''

☆☆☆

مولانا فضل الدین شمسی واقعی ایک روحانی بزرگ تھے۔

انتہائی نورانی چہرہ، پُرجلال آنکھیں اور دھیما لہجہ۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وسیم نے کسی سے بیعت کر رکھی ہے۔ اس دن اس نے پہلی بار بتایا تھا۔

شمسی صاحب سے مل کر میرا دل خوش ہو گیا تھا۔ ایک اندرونی مسرت حاصل ہونے لگی تھی۔ وہ عام عامل نہیں تھے بلکہ ایک اسکالر تھے۔

میں نے انہیں اب تک کی ساری کہانی سنا دی تھی۔ مولانا صاحب میری یہ داستان سن کر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے میرے لیے مراقبہ کیا۔ بہت دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے پھر آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ ''میاں، قدرت کے بھید بہت عجیب ہوتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہم میں سے ہر ایک کتنی کہانیاں لیے گھوم رہا ہے۔ میں نے تمہارے لیے مراقبہ کیا ہے۔ خدا سے دعا کی کہ وہ راستہ دکھائے اور راستہ دکھائی دے گیا۔''

''فرمائیں قبلہ! میں اس سلسلے میں کیا کروں۔'' میں نے کہا۔ ''اب تو میں حیران ہونے کے مرحلے سے بھی بہت آگے جا چکا ہوں۔''

''میاں، بہت الجھی ہوئی صورت حال ہے۔ شاید یہ راز اسی علاقے میں ہے جس کے لیے وہ روح تمہیں بار بار اشارے دے رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں وہاں تک کا سفر کرنا پڑ جائے۔'' مولانا نے بتایا۔ ''کیونکہ میں نے تمہارے تصور کے ساتھ برف پوش پہاڑیاں دیکھی ہیں۔''

''حضور! فرض کریں اگر حماد اس لڑکی کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اس کی بات ماننے سے انکار کرتا ہے تو پھر کیا ہوگا؟'' وسیم نے پوچھا۔

''یہ میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مقدر کے لکھے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جو کچھ تقدیر میں درج ہو چکا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔''

''قبلہ، فی الحال تو مجھے اس سے نجات کا طریقہ بتائیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ذہنی طور پر بہت پریشان ہو چکا ہوں اور مجھ سے کوئی کام بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔''

''اس کے لیے میں تمہیں حصار کا طریقہ بتا دیتا ہوں۔'' مولانا نے بتایا۔ ''تم روزانہ صبح اٹھ کر اور رات کے وقت حصار قائم کر لیا کرو۔ خدا نے چاہا تو تم بہت حد تک محفوظ ہو جاؤ گے۔''

''حماد کے لیے اتنا بھی ہو جائے تو بہت ہوگا۔'' وسیم نے کہا۔

مولانا صاحب نے مجھے دو آیات بتائیں اور حصار باندھنے کا طریقہ سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، اب تم ذہنی طور پر تو محفوظ ہو۔ لیکن میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ مقدر میں جو ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔''

ہم مولانا صاحب سے اجازت لے کر واپس آگئے۔ میں نے گھر آ کر بابا کو بھی بتا دیا کہ میں کس سے مل کر آرہا ہوں اور انہوں نے مجھے کیا بتایا ہے۔ بابا بھی یہ سن کر خوش ہو گئے تھے کہ میں اب حصار میں رہوں گا۔

اس رات میں نے حصار باندھا۔ ساری رات آرام سے گزر گئی۔ حالانکہ دل میں ایک خلش سی تو تھی۔ ایسا محسوس

ہو رہا تھا جیسے وہ لڑکی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی شکوہ کر رہی ہو۔ یہ کہہ رہی ہو کہ میں نے اس کا راستہ روک کر اچھا نہیں کیا۔ وہ تو میرے پاس مدد مانگنے آئی تھی۔ لیکن میں نے اس کی مدد کے بجائے اپنے گھر کے دروازے اس کے لیے بند کر لیے۔ میں نے اسے دھوکا دیا ہے۔ بے وفائی کی ہے اس کے ساتھ۔

کچھ اسی قسم کے خیالات آتے رہے تھے۔ دکھ سا ہونے لگا تھا۔ اس نے میرا بگاڑا ہی کیا تھا۔ کیا نقصان پہنچایا تھا اس نے۔ کچھ بھی تو نہیں۔

شاید اسے مجھ سے امیدیں ہوں گی۔ لیکن میں نے اس کی امیدیں خاک میں ملا دی تھیں۔ دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا تھا۔

لیکن یہ کیفیت بھی بس کچھ دنوں تک رہی، اس کے بعد آہستہ آہستہ سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔ میں حصار باندھ کر سویا کرتا اور صبح اٹھ کر بھی حصار باندھ لیتا۔ بابا بھی بہت خوش تھے کہ اس بلا سے میری جان چھوٹ گئی ہے۔

اب میں اپنے کام پر بھی پوری توجہ دے رہا تھا۔ میں نے اس دوران بہت ورک کر لیا تھا۔ اپنی رپورٹس بنا کر حکام کو بھیجتا رہا تھا۔

اس دوران وزارت معاشیات سے حکم آیا کہ میں فوری طور پر شنگھائی روانہ ہو جاؤں جہاں مجھے ایک اقتصادی پروجیکٹ کا جائزہ لے کر اس پر رپورٹ لکھنی تھی۔

میں نے شاید یہ نہیں بتایا ہے کہ اس قسم کا سفر میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مجھے اکثر اسی طرح بھیج دیا جاتا تھا۔ میرے سفری کاغذات وغیرہ ہروقت تیار رہتے تھے۔

اس کے علاوہ میرا سفری سوٹ کیس ہروقت تیار ہوتا تھا۔ بابا مجھے ملکوں ملکوں کا مسافر کہا کرتے تھے۔ میرے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ اب میں سفر سے پریشان ہونے لگا تھا۔

دل یہی چاہتا تھا کہ میں بس ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ہوم ورک کرتا رہوں۔ لیکن جانا بھی ضروری ہوتا تھا۔ کیونکہ اس قسم کے دورے بہت ضروری ہوا کرتے تھے۔

میں نے جب بابا کو اپنے جانے کا بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئے تھے۔ "ٹھیک ہے میاں جی! ضرور جائیں۔ آپ کا دھیان بھی بٹ جائے گا۔"

دھیان بٹنے سے بابا کی مراد وہی لڑکی ہوگی جسے میں تقریباً بھول ہی چلا تھا۔

جبت

بے حقیقت، بے فائدہ اور بے اصل چیز۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔ "کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا یہ حال ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کو کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں (51-4) اسلام کی زبان میں جادو، کہانت (جوتش)، فال گیری، ٹونے ٹوٹکے، شگون اور دوسری تمام وہمی و خیالی باتوں کو جبت کہا گیا ہے۔ آنحضورؐ کا ارشاد مبارک ہے۔ "جانوروں کی آوازوں سے فال لینا، زمین پر جانوروں کے نشانات قدم سے شگون نکالنا اور فال گیری کے دوسرے طریقے سب۔ "جبت" کے قبیل سے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الحکمت) پس جبت کا مفہوم وہی ہے جسے اردو میں اوہام کہا جاتا ہے۔

مرسلہ: دانش۔ لاہور

جب الحزن

غم کا کنواں۔ غم والا گڑھا۔ جہنم کا ایک گڑھا جس سے جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جب الحزن سے اللہ کی پناہ مانگا کرو۔" صحابہ نے عرض کی۔ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب الحزن کیا ہے۔" آپ نے فرمایا "جہنم میں ایک نالہ ہے جس سے جہنم بھی دن میں چار سو بار پناہ مانگتی ہے۔" صحابہ نے عرض کیا۔ "اس میں کون داخل ہوگا؟" آپؐ نے فرمایا "جو شخص دکھلاوے کے لیے قرآن شریف پڑھتے ہیں۔"

مرسلہ: نگار سلطانہ۔ بارکی پور

میرے ساتھ دو اور بھی جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک بہت بڑا سول انجینئر تھا، اکرم حمید اور دوسرا ایک بیورو کریٹ تھا، احتشام۔

نہ جانے کیوں مجھے ان بیورو کریٹس سے وحشت ہوا کرتی ہے۔ یہ اپنے آپ ہی کو عقل کل سمجھا کرتے ہیں اور ہر بات میں مداخلت ضروری سمجھتے ہیں۔

بہر حال میری پسند ناپسند سے کیا ہوتا تھا۔ ہونا تو وہی تھا جو حکومت چاہتی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد ہی اڑ جانا سے ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

بہت عجیب روٹ تھا۔ ہندوستان کو کراس کر کے نیپال کی فضاؤں سے گزر کر تبت کو کراس کرتے ہوئے چین میں داخل ہونا تھا۔ راستے میں کہیں رکنا نہیں تھا۔ یہ ایک نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔

رات کا وقت تھا۔ ہم ہندوستان کی سرحد کراس کر چکے تھے۔ ڈیڑھ سو مسافر تھے۔ عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے اور مرد بھی۔

ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی منزل اپنے اپنے راستے ہوں گے۔ نہ جانے کس کے ساتھ کیسی کہانیاں ہوں۔ کچھ سو رہے تھے، کچھ جاگے ہوئے تھے۔ کسی نے یوں ہی آنکھیں بند کر رکھی ہوں گی کہ اچانک کچھ ہوا۔

ایک زبردست جھٹکا۔

اس جھٹکے نے سونے والوں کو خوفزدہ کر کے بیدار کر دیا۔ جو جاگے ہوئے تھے وہ چیخنے لگے۔ ایک اور جھٹکا۔ جہاز شاید اچانک اپنی سطح سے بہت نیچے آ گیا تھا۔ اسی وقت اناؤنسر کی آواز سنائی دی۔ ''مسافروں سے التماس ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ سکون سے بیٹھے رہیں۔ ہمارا جہاز ائر پاکٹ میں پھنس گیا ہے لیکن ہم اس سے نکل آئیں گے۔''

اس کے ساتھ جہاز کی روشنیاں گل ہو گئیں۔ کچھ ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ ایک چیخ سنائی دی۔ بھیانک زبن، پھر جہاز قلابازی کھانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی پچھلی طرف سے تیز روشنی آنے لگی۔ جہاز کے پچھلے حصے میں آگ لگ چکی تھی۔ جہاز پائلٹ کے کنٹرول سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ کسی بدمست ہاتھی کی طرح... ہزاروں فٹ کی بلندی پر چکر کھائے جا رہا تھا۔ گھومتا جا رہا اچانک آسمانی بجلی کے سے کڑاکے کے ساتھ اس کے کئی شیشے ٹوٹ کر بکھر گئے۔

ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ اب صرف ایک منزل سامنے تھی اور وہ منزل تھی موت۔ ہم بہت تیزی کے ساتھ موت کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

خدا کی پناہ!

اس اذیت، اس خوف اور اس لمحے کو کون فراموش کر سکتا ہے..... مجھے درد کے احساس کے ساتھ ہوش آیا تھا۔ میری ایک ٹانگ سیٹ میں پھنس کر مڑ چکی تھی۔ اس وقت کچھ نہیں معلوم تھا کہ ہم کہاں ہیں اور ہم پہ کیا گزری ہے۔

گھپ اندھیرا۔ ایسا اندھیرا کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میری جیب میں لائٹر بھی نہیں تھا۔ ائر لائن میں آج کل ایسی چیزیں رکھوالی جاتی ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مسافروں کے ساتھ کیا گزری ہے۔ ان میں سے کتنے زندہ ہیں اور کتنے مر چکے۔ خود میں کس طرح زندہ تھا؟ پھر ایک طرف سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ کراہنے والا کچھ بول بھی رہا تھا۔ میں نے خود کو سیٹ سے نکالنا چاہا لیکن میری ٹانگ بری طرح دبی ہوئی تھی۔

کراہنے والے کے الفاظ اب سمجھ میں آ رہے تھے۔ وہ انگریزی میں کچھ بول رہا تھا۔ انگریزی یقیناً اس کی مادری زبان ہوگی۔ کیونکہ فطری طور پر لوگ مصیبت کے وقت اپنی مادری زبان ہی استعمال کرتے ہیں۔

میں نے ایک بار پھر خود کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن درد کی ایک تیز لہر نے مجھے بے حال کر دیا۔ ایسی تکلیف تھی کہ میں چیخ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

دوبارہ جب آنکھ کھلی تو دن ہو چکا تھا۔ جہاز کے اندر بھی روشنی تھی اور میں جو کچھ بھی دیکھ رہا تھا، وہ بہت پریشان کر دینے اور لرزا دینے والا تھا۔

شاید سب ہی مر چکے تھے۔ کٹی ہوئی لاشیں میرے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ خدا جانے میں کس طرح زندہ رہ گیا تھا۔ یا شاید وہ زندہ تھا جس کی کراہیں ابھی تک سنائی دے رہی تھیں۔

میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا اکرم حمید اور بیورو کریٹ احتشام بھی مر چکے تھے۔ موت نے کسی کو مہلت نہیں دی تھی۔ سب کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

میں نے اپنی دبی ہوئی ٹانگ پر دھیان دیا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے مجھے اندازہ نہیں

زور بانھا۔ میں اپنی ٹانگ کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے یہ جاننے کے بعد ٹانگ بالکل سیدھی کر لی اور آہستہ آہستہ آسانی کے ساتھ باہر نکال لیا۔

مجھے چوٹ تو لگی تھی لیکن وہ چوٹ شدید نہیں تھی۔ جبکہ جہاز کے سارے مسافر ہلاک ہو گئے تھے۔ میرے دونوں ساتھی بھی مر چکے تھے۔ بے چارے مکرم حمید کا تو یہ پہلا غیر ملکی سفر تھا اور یہی اس کا آخری سفر ثابت ہوا۔

ہر طرف کچلی اور پچکی ہوئی لاشیں تھیں۔ اور ان کے درمیان میں اکیلا زندہ تھا۔ خدا جانے میں کیوں اور کس طرح زندہ رہ گیا تھا۔

کراہنے کی آوازیں پچھلی طرف سے آرہی تھیں۔ شاید وہی ایک زندہ تھا۔ میں آہستہ آہستہ پچھلی طرف بڑھنے لگا۔ وہ میرے اندازے کے عین مطابق کوئی انگریز ہی تھا جو بری طرح دبا ہوا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون اس کے چہرے پر جم چکا تھا۔ اس کا لباس بھی خون آلود تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر اسے ہاتھ لگایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "پانی، پانی پلا دو۔"

میں نے پانی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ پلاسٹک کی پانی والی کئی بوتلیں ادھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک بوتل اٹھائی اور اس وقت احساس ہوا کہ میں کس جہنم میں پہنچ چکا ہوں۔

وہ برف کا جہنم تھا۔

نہ جانے کیوں اب تک انتہائی شدید ٹھنڈ کے باوجود ابھی سردی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ میرا جسم ابھی گرم تھا یا میں نے احتیاطاً گرم کپڑے پہن لیے تھے جو اس وقت میرے کام آگئے تھے۔ ٹھنڈ کا احساس پانی کی بوتل کو دیکھ کر ہوا تھا۔ بوتل کا پانی برف بن چکا تھا۔

میں نے کسی نہ کسی طرح دو چار قطرے اس کے منہ میں ٹپکائے۔ "بہت بہت شکریہ دوست۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "شاید ہم دونوں ہی زندہ رہ گئے ہیں، کیوں؟"

"ہاں۔" میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ "ٹھہرو! میں تمہیں نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"پلیز! میں نے اس سے پہلے خود کو اتنا بے بس کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔" اس نے کہا۔

میں نے اس کے اوپر گرا ہوا سامان اٹھانا شروع کر دیا۔ نہ جانے کیا کیا اس پر گرا ہوا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق وہ ایک جوان العمر انسان تھا۔ اسے بوجھ سے نجات دلوانے کے بعد میں ایک بار پھر اس طرف چلا آیا جہاں ایمرجنسی میں کام آنے والی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ خاص طور پر فرسٹ ایڈ بکس جو ہر جہاز کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

وہ بکس ایک خوبصورت سی ائر ہوسٹس کی لاش کے نیچے دبا ہوا مل گیا تھا۔ نہ جانے یہ بے چاری کون ہوگی۔ کیا نام ہوگا اس کا۔ نہ جانے اس سفر سے کتنی امیدیں باندھ رکھی ہوں گی۔ نہ جانے اس کے کتنے بھائی بہن ہوں گے جو اس کا انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے۔

اور جہاں تک میرا سوال تھا تو میرا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف بابا تھے جو حادثے کی خبر سن کر کچھ دنوں تک مجھے یاد کرتے رہ جائیں گے یا پھر سرکاری حکام ہوں گے جو افسوس کا اظہار کریں گے۔ اس کے بعد خاموشی ہو جائے گی۔

میں نے اس زخمی کے پاس واپس جا کر اس کے زخموں کو صاف کیا اور اس کی ڈریسنگ کر دی۔ "بہت بہت شکریہ دوست۔" اس نے کہا۔ "اگر میں اس جہنمی علاقے سے زندہ نکل گیا تو ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گا۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"جاوا۔" میں نے بتایا۔ "آسان سا نام ہے اور تم۔"

"میرا بھی آسان سا نام ہے۔" وہ مسکرایا۔ "تم مجھے جان کہہ سکتے ہو۔"

"او کے جان! اب میں ذرا حالات کا جائزہ لے لوں۔ پہلے یہ دیکھ لوں کہ یہ جہاز کس علاقے میں گرا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ سیکڑوں میل دور تک بھی کوئی آبادی نہیں ہوگی۔" جان نے کہا۔ "اگر آبادی ہوتی تو اب تک ہمارے لیے مدد آچکی ہوتی۔ برفیلے میدان کی وجہ سے آگ بھی نہیں لگی۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ پھر بھی میں دیکھ لیتا ہوں۔"

میں نے یہ حماقت کی کہ میں بغیر کسی حفاظتی اقدام کے جہاز کے پچھلے حصے سے نکل کر باہر آگیا تھا۔ او خدا! ایسا لگا جیسے مفلوج ہو گیا ہوں۔

میرے چہرے پر برف نے تھپڑے مارنے شروع کر دیے۔ آنکھوں کے آگے برفانی اندھیرا چھا گیا۔ خدایا

یحییٰ بن لعمیر

حافظ قرآن اور دوسرے علوم میں یگانۂ روزگار، کنیت ابوسلیمان اور قبیلہ قیث سے تعلق رکھتے تھے۔ زبان کے ماہر صرف ونحو کے عالم اور مشہور محدث۔ آپ سے قبل قرآن پاک میں نقطے نہیں ہوتے تھے جس سے قرأت میں دقت ہوتی تھی۔ آپ نے نقطے لگائے۔ 119ھ میں وفات پائی۔

یحییٰ خان

1938ء میں فوج میں کمیشن ملا۔ ابتداء میں ایک برس تک ورسٹر رجمنٹ کی دوسری بٹالین سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد بلوچ رجمنٹ میں تعینات ہوئے۔ اسی عہدے پر آپ کو سرحدی صوبے میں فوجی کارروائی کرنا پڑی۔ دوسری جنگ عظیم میں اپنی رجمنٹ کے ساتھ نمایاں کام سرانجام دیے۔ وہاں سے 1945ء میں وطن پہنچے۔ یہاں پہنچ کر اسٹاف کالج کوئٹہ کو جوائن کیا۔ اس کے بعد مختلف اسٹاف عہدوں پر متمکن رہے۔ بعد میں اسی کالج میں انسٹرکٹر مقرر ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد آپ اس کالج میں واحد مسلمان انسٹرکٹر تھے۔ آزادی کے بعد ڈویژن ہیڈکوارٹرز اور جنرل ہیڈکوارٹرز میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ 1957ء میجر جنرل کے عہدے پر ڈپٹی چیف آف دی آرمی اسٹاف مقرر ہوئے۔ 1962ء میں مشرقی پاکستان کے ڈویژن آفیسر کمانڈنگ مقرر ہوئے۔ مرکزی دارالحکومت کی تعمیر کے لیے اسی دور میں ایوب خان نے سپیشل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے نام سے ادارہ قائم کیا۔ اس کے اولین چیئرمین بھی آپ ہی مقرر ہوئے۔ اسی طرح اس کی تعمیر کے ماسٹر پلان کی ترتیب اور اس پر عمل میں شریک ہوئے۔ ستمبر 65ء کی جنگ میں چھمب میں اعلیٰ کارکردگی پر ہلالِ جرأت کا فوجی اعزاز دیا گیا۔ مارچ 1966ء میں ڈپٹی کمانڈر انچیف اور جنرل موسیٰ کے جانشین مقرر ہوئے۔ چند ہی ماہ بعد 19 ستمبر کو جنرل موسیٰ کے ریٹائر ہونے پر بری فوج کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ 1969ء میں صدر ایوب کے مستعفی ہونے کے بعد صدر مملکت بنے اور دسمبر 1971ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ بعد کی حکومت نے انہیں نظر بند کردیا جو مارشل لا حکومت نے ختم کی۔

مرسلہ: سلمان یحییٰ خشوق، جھنگ خیل

جانتا ہے کہ میں کس طرح جہاز تک واپس آنے میں کامیاب ہوا تھا۔ بہت دیر تک میں اپنے ہوش میں نہیں رہا تھا۔ پھر میں نے جان کو بتایا۔ "جان، سردی... بے پناہ سردی۔ میں نہیں بتا سکتا کہ یہاں کا ٹمپریچر کیا ہوگا۔"

"مجھے اندازہ ہے۔ ان جہنمی علاقوں میں درجہ حرارت منفی میں اور تیس کے درمیان ہوا کرتا ہے۔" اس نے بتایا۔

"میرے خدا! پھر تو ہم برف کے ہوکر مرجائیں گے۔"

"دیکھو میرے دوست دیکھو۔" اس نے کہا۔ "جہاز میں سب سے پہلے خوراک تلاش کرو۔ گرم کپڑے، کمبل وسامان وغیرہ ڈھونڈو۔ ورنہ ہماری موت میں اب زیادہ فاصلہ نہیں رہ گیا ہوگا۔"

وہ بے چارہ فی الحال اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے یہ کام خود مجھے کرنا پڑا تھا۔ بہت دیر کی تلاش کے بعد خوراک اور لباس کی بہت بڑی مقدار مل گئی تھی۔

میں نے زندگی میں کبھی اتنی لاشیں نہیں دیکھی ہوں گی۔ میں اس معاملے میں بہت حساس تھا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اس وقت کسی قسم کا احساس نہیں ہورہا تھا۔ ذہن پر ایک دھند سی جم گئی تھی۔ وہی دھند مجھے بے حس بنا رہی تھی۔ میں اسی بے حسی کے عالم میں کام کرتا جارہا تھا۔

سب کے سب مرچکے تھے۔ جوان، بوڑھے، بچے مرد اور عورتیں سب مرچکے تھے۔ عملے کے لوگ بھی اپنی آخری منزل کو پہنچ چکے تھے۔ ہر طرف موت نے اپنا تسلط رچادیا تھا۔ ایسی بھیانک خاموشی تھی کہ سوائے تیز ہواؤں کی سائیں سائیں کے اور کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے تمام چیزیں ایک طرف کیں اور جان کے پاس واپس آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کیا کیا چیزیں دریافت کرچکا ہوں۔

"ریڈیو پر پیغام دیا جاسکتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ سارے آلات بری طرح ٹوٹ چکے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "بظاہر ہمارے یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"لعنت ہو ہم کس جہنمی مقام پر آکر پھنس گئے۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ جہنمی کہنا اس کا تکیہ کلام تھا اور یہ اس کی زبان سے اچھا بھی لگتا تھا۔

میں نے اسے کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں بتادیا اور یہ بھی بتادیا کہ میں نے سب چیزیں سمیٹ لی ہیں۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ ”جان! کیا ہم ان ہی لاشوں کے درمیان رہیں گے۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“ اس نے پوچھا۔

”جان! کیوں نہ ان لاشوں کو برف میں دفن کردیا جائے ورنہ بو پھیلنے لگے گی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ اول تو بدبو پھیلنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہاں بے پناہ ٹھنڈ ہے اور سخت سردی میں لاشیں خراب نہیں ہوتیں اور دوسری بات یہ ہے کہ تم کہاں تک ان لاشوں کو دفناتے رہو گے۔ تمہیں ابھی زندہ رہنے کے لیے انرجی کی ضرورت ہے۔ لاشوں کے چکر میں پڑ گئے تو ساری انرجی ضائع ہوجائے گی۔“

اس کی یہ بات بالکل درست تھی۔

میں اکیلا اتنی ڈھیر ساری لاشیں برف میں دفن نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس برف کھودنے کے اوزار بھی نہیں تھے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ لاشوں کو اسی طرح رہنے دیا جائے۔

خوراک کا اتنا ذخیرہ تھا کہ میں اور جان کئی مہینوں تک گزارا کرسکتے تھے۔ لیکن کیا کئی مہینوں تک ہمیں وہیں رہنا تھا۔

میں نے جہاز سے گرم کپڑے اکٹھے کرلیے۔ پھر دستانے، موزے، موٹے موٹے جیکٹس، برف میں کام آنے والی جیکٹس، کمبل، غرضیکہ اس قسم کے سامان کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہمارے لیے طرح طرح کی جان بچانے والی ادویات کا ذخیرہ بھی مل گیا تھا۔

وہ پورا دن اسی قسم کی محنت میں گزر گیا تھا۔ شام کے وقت میں نے بسکٹ پنیر اور خشک گوشت جان کے ساتھ مل کر کھایا۔ جان ایک زندہ دل آدمی ثابت ہورہا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ ”یار! میں تو کم بخت ایک لڑکی کی وجہ سے مارا گیا۔“ اس نے بتایا۔

”کون سی لڑکی؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک چینی لڑکی تھی۔ عجیب سا نام تھا اس کا۔ ایک تو ان کم بختوں کے جیسی نام اور چہرے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔“ وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ ”وہ مجھے انگلینڈ میں ملی تھی۔ مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے اس سے پوچھا مجھ سے شادی کروگی۔ وہ فوراً تیار ہوگئی لیکن شرط یہ تھی کہ شادی دیوار چین

ہبل

دور جاہلیت میں عرب کا سب سے بڑا بت جو کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔ 8ھ میں فتح مکہ کے وقت رسول مقبولﷺ نے اسے پاش پاش کردیا۔ یہ سرخ عقیق کا بنا ہوا تھا اور شکل شباہت میں انسان۔۔۔ جیسا تھا۔

یزیدیہ

یزیدیہ یا یزیدی، کردستانی قبائل کا نام۔۔۔۔۔ یہ قبائل شمالی عراق میں پھیلے ہوئے ہیں یہاں سے 40 میل شمال میں ان کا امیر رہتا ہے۔ یہیں سے شمال کی جانب تین گھنٹے کے سفر پر ان کے سابق چیف شیخ عدی کا مزار ہے۔ یہ لالش کے مقام پر ہے۔ عراق کے علاوہ یہ شام میں بھی رہتے ہیں۔ یزید بن معاویہ یا اموی خلفا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ فارس کے ایک شہر اور عربی لفظ یزدت سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں خدا کا عبادت گزار۔ اگرچہ یہ آپس میں کوئی ربط نہیں رکھتے لیکن پھر بھی سب کا رہن سہن ایک سا ہے۔ شام کے یزیدی لمبی داڑھی اور گھنے بال رکھتے ہیں۔ ان کے بال آنکھ کے اوپر اور ہونٹوں تک پر اگ آتے ہیں۔ وہیں ان کی ایک اور نسل رہتی ہے یہ جرمنی ہے۔ ان کی کچھ خصوصیات آرمینیا کے باشندوں سے ملتی جلتی ہیں۔ بعض جیسے کرد اور بعض قبائلی عربی زبان بولتے ہیں اور ان کی کتب بھی اسی زبان میں ہیں۔ مذہبی طور پر یہ دوزخ پر یقین نہیں رکھتے۔ ایک روایت کے مطابق دوزخ کی آگ کو آنسوؤں سے دھو دیا گیا ہے۔ یہ روزانہ صبح کو عبادت کرتے ہیں۔ ماہ دسمبر میں تین یوم کا روزہ رکھتے ہیں اور اسے مشروب سے کھولتے ہیں۔ ان کے مطابق بدھ کا دن مقدس دن ہے اور ہفتے کا دن آرام کا ہے۔ ان کی عبادت گاہوں میں افریقی طرز کی آرائش بھی نمایاں رہتی ہیں۔ سانپ، خنجر اور اس قسم کی دوسری اشیاء دیواروں میں کندہ ہوتی ہیں۔ 15 سے 20 ستمبر تک شیخ عدی کے مقبرے پر حاضری دیتے ہیں جو ان کی اہم مذہبی رسم ہے۔ اپریل کا پہلا بدھ بھی بڑے زور و شور سے مناتے ہیں۔

مرسلہ: نوشین مشتاق، سرائے مدھو

رہی گی۔ یہ ایک یادگار شادی ہوتی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے فلاں تاریخ کو دیوار چین پر ملے گی۔ اس نے جگہ کا نام بھی بتایا تھا جو میں نے اپنی ڈائری میں لکھ لیا ہے۔"

"اس نے انگلینڈ میں شادی کیوں نہیں کی۔" میں نے پوچھا۔

"تم مشرقی لوگ بھی عجیب ہوتے ہو۔" اس نے کہا۔ "اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے بغیر شادی نہیں کر سکتی جو دیوار چین کے پاس اسی علاقے میں رہتے تھے جس کا نام ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔ بس میں اس سے ملنے کے لیے روانہ ہوا اور یہ حادثہ ہو گیا۔"

"جان اب کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوگا دوست۔" اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "وہ دیوار چین پر میرا انتظار کرتی رہے گی اور جب انتظار کرتے کرتے تھک جائے گی تو اسے کوئی اور جان مل جائے گا۔"

جان کی آواز میں کرب بھی تھا، مایوسی بھی اور ایک تکلیف دہ طنز بھی۔ جیسے وہ اپنی تقدیر سے شاکی ہو کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا۔ وہ تو محبت حاصل کرنے جا رہا تھا اور محبت اسے موت کی طرف لے آئی تھی۔

☆☆☆

ہم نے ایک رات بھی گزار لی۔

رات کے وقت درجۂ حرارت مزید گر گیا تھا۔ میں اور جان دو دو کمبلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتاتے بتاتے تھک چکے تھے۔

ہم نے ایک دوسرے کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ہمیں نیند آ گئی۔ یہ کیسا سفر تھا جس کے چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں اور باہر ہوا تیز اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔

صبح آنکھ کھلی تو روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔ سورج ہمیشہ نئی امیدیں اپنے ساتھ لے کر آیا کرتا ہے۔ پھر سے جینے کی تمنا بیدار ہونے لگتی ہے۔

جان بھی جاگ اٹھا۔ ہم نے ناشتا کیا۔ ناشتے کے دوران جان نے کہا۔ "یار، اس برفیلی جگہ پر اگر کافی یا چائے وغیرہ مل جائے تو مزہ آ جائے۔"

"جان، چائے اور کافی کا بہت سامان موجود ہے۔" میں نے بتایا۔ "لیکن پرابلم یہ ہے کہ آگ کیسے جلائی جائے۔"

"دیکھو بھائی، کوئی نہ کوئی چیز مل ہی جائے گی۔" جان نے کہا۔ "جہاز میں تو بہت کچھ ہوا کرتا ہے۔ لیکن یار آگ جہاز کے اندر مت جلانا، باہر چلے جانا۔ ایسا نہ ہو کہ پورے جہاز میں آگ ہی آگ بھر جائے۔"

جان کے کہنے پر میں نے تلاش شروع کر دی۔ جلانے کے لیے تو بہت سی چیزیں مل رہی تھیں۔ لائٹرز اور ہیٹرز وغیرہ بھی تھے۔ لیکن چولہا ٹائپ کی کوئی چیز نہیں تھی جس پر چائے وغیرہ بنائی جائے۔

"یار، میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔" میں نے جان سے کہا۔ "ہو سکتا ہے کوئی ایسی چیز مل جائے۔"

"میرے دوست بہت احتیاط سے جانا۔ اور ہو سکے تو اپنے ساتھ ایک رسی بھی رکھ لو۔ اس کا ایک سرا اپنی کمر سے باندھ لینا۔ جہاز میں ایسی طویل رسیاں بھی رکھی جاتی ہیں۔"

"لیکن کیوں، اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے۔" اس نے کہا۔ "صحرا، سمندر اور برف کا میدان، تینوں کی کیفیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ بھٹک گئے تو پھر راستہ نہیں ملتا۔ آدمی نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتا ہے۔ اسی لیے میری بات مانو، تلاش کرو۔ رسی ضرور مل جائے گی۔"

ایسی ایک طویل رسی جہاز کے اسٹور روم سے مل ہی گئی۔ میں نے اپنے آپ کو پوری طرح ڈھانپ کر رسی کا ایک سرا اپنی کمر سے کس کر باندھ لیا۔ دوسرا سرا جہاز کی ایک سیٹ سے باندھ لیا۔ جان اس وقت میری طرف سے بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ "یار دیکھ کے جانا۔ ان جیسی علاقوں میں کہیں کہیں برف کی تہہ بہت کچی ہوتی ہے۔ ایک قدم پڑا اور بندہ سمندر میں اترتا چلا گیا۔"

"تم اس کی پروا مت کرو۔ میں نے اسٹک لے لی ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں بہت سنبھل سنبھل کر آگے بڑھوں گا۔"

میں جان کو خدا حافظ کہہ کر جہاز سے باہر آ گیا۔ ایک لمحے کے لیے ہواؤں کے جھکڑ نے میرے پاؤں اکھاڑ دیے تھے۔ اگر میں نے خود کو اچھی طرح محفوظ نہ کر لیا ہوتا تو پتا نہیں کیا حشر ہوتا۔

میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس وقت کتنی سردی تھی۔ رگوں میں دوڑنے والا خون تک جمتا جا رہا تھا۔ برف کے ذرات روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہے تھے۔ اگر میں نے مخصوص چشمہ نہیں پہن رکھا ہوتا تو شاید ایک قدم بھی

آگے نہیں بڑھا سکتا۔

ہر طرف سوائے برف کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ جانے ہم کہاں لا کر پھینک دیے گئے تھے۔ نہ جانے یہ مقام جہازوں کی گزرگاہ بھی تھا یا نہیں۔

کسی کو کیا معلوم کہ اس وقت دو آدمی برف کے سمندر میں موت اور زندگی کی جنگ لڑے جا رہے ہیں۔

میں چھڑی کی مدد سے راستہ بنا کر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ میں کیا تلاش کر رہا ہوں یا مجھے کیا تلاش کرنا چاہیے۔ بس ایک امید کے سہارے آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک میں نے ایک آواز سنی۔

یہ آواز میری سماعت کا دھوکا نہیں تھی بلکہ آوازیں تھیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ زندگی کی علامت۔

یہ آوازیں ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوئی مجھ تک آ رہی تھیں۔

ایسا لگتا تھا جیسے چاروں طرف سے آ رہی ہیں۔ کتے یوں ہی تنہا تو نہیں ہو سکتے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ اسکیمو ہماری تلاش میں نکلے ہوں۔ ان کے ساتھ عام طور پر کتے بھی ہوا کرتے ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہوں۔

"ہیلپ، ہیلپ" میں دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر زور سے چلانے لگا۔ "ہیلپ، ہیلپ۔"

سینے پر جیسے کسی نے گھونسا رسید کر دیا ہو۔ برف کے ذرات اندر گھس آئے تھے۔ کھانسی کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ میں کھانستے کھانستے دوہرا ہو گیا۔

آوازیں بھی ختم ہو گئی تھیں۔ اب پھر سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا جو پہلے سے زیادہ ہولناک ہو گیا تھا۔ اب مجھ میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

میں رسی کو پکڑے پکڑے جہاز میں واپس آ گیا۔

جان کی آنکھیں میرے انتظار ہی میں لگی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا دوست! کامیابی یا ناکامی۔" جان نے پوچھا۔

"دونوں۔" میں نے جواب دیا۔ "ناکامی اور ایک امید بھی سامنے آئی ہے۔ میں نے کچھ فاصلے سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنی ہیں۔"

"کتوں کی آوازیں۔" جان سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی کہیں آس پاس ہی منڈلا رہی ہے۔"

"ہاں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ میں زندگی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر پایا۔" میں نے کہا۔

ہدایت

شیخ برہان الدین کی شہرۂ آفاق تصنیف ہدایہ فن نوامین پر ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ چار جلدوں میں چھپ کر لندن سے 1791ء میں شائع ہوا۔

شیخ برہان الدین 530ھ میں مارغینان میں پیدا ہوئے۔ ہدایت کے لغوی معنی "رہنمائی" کے ہیں اور یہ لفظ قرآن مجید میں متعدد سورتوں مثلاً البقرہ 143، نحل 30 وغیرہ میں آیا ہے۔ ہدایت حاصل کرنے کے لیے انسان کو صاحب الہدایت سے رجوع کرنا چاہیے۔ اسی لیے آل عمران کی 72 ویں آیت میں کہا گیا ہے کہ اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے۔ پیغمبر، آسمانی صحیفے و کتب انسانی ہدایت کے لیے ہی بھیجے گئے۔

مرسلہ: ربیعہ قادری عطاری، جہلم

اور اسی وقت کچھ ہوا۔ کچھ عجیب سی بات کچھ آوازیں آئیں۔ انسانی آوازیں۔ جہاز کے قریب، بہت قریب۔ دروازے پر کچھ سائے سے لہرائے اور کچھ لوگ جہاز کے دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔

☆☆☆

ہم اس وقت ایک گرم خیمے میں تھے۔

زندگی ہماری طرف آ چکی تھی۔ آنے والے مقامی قبائل تھے جو بھٹکتے ہوئے اس طرف آ نکلے تھے۔ انہوں نے جہاز کو گرا ہوا ملبا دیکھ لیا تھا۔

میں نے جن کتوں کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ کتے ان ہی کے تھے۔ مزید خوش نصیبی یہ ہوئی تھی کہ ان میں سے ایک آدمی اچھی خاصی انگریزی بھی بول لیتا تھا۔ اس وقت حیرت کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ بلکہ اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دینے کا وقت تھا۔ سو ہم نے ان لوگوں سے مدد کی درخواست کی اور وہ ہمیں اپنے پڑاؤ پر اٹھا کر لے آئے۔

جان کو کوئی مرہم وغیرہ لگا کر کھالوں کے بستر پر لٹا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک گرما گرم مشروب پینے کو دیا گیا۔ یہ چائے کی ایک قسم تھی۔ جس کو بٹری Butter Tea کہا جاتا تھا۔ وہ چائے پی لینے کے بعد ہم خود کو پوری طرح توانا محسوس کرنے لگے تھے۔

"ہاں دوستو! اب تم لوگ بتاؤ۔ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟" اس نوجوان نے پوچھا۔ "چلو سب سے پہلے میں اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام کوبان ہے۔" اس نے بتایا۔ "ہم بان لوگ ہیں۔ آدھے بان شہروں میں رہتے ہیں یا

اور آرہے ہیں پرانے انداز سے آج بھی پہاڑوں کی راہوں میں بھٹکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔"

"کوپان، پہلے تو یہ بتاؤ کہ ہم ہیں کہاں۔" میں نے پوچھا۔ "یہ کون سا ملک ہے۔ کون سی جگہ ہے۔ کیونکہ جب جہاز کا حادثہ ہوا تو ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔"

"یہ ملک تبت ہے۔" اس نے بتایا۔ "ہم جس علاقے میں ہیں۔ اس کا سرا چین کے سنکیانگ صوبے سے جاکر مل جاتا ہے۔ یوں سمجھو کہ بہت سے علاقے Beji اور سنکیانگ کی حد میں آتے ہیں۔"

اس وقت اس خیمے میں اور بھی کئی بوڑھے مرد عورتیں وغیرہ موجود تھے جو بہت حیرت اور دلچسپی سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

ہم جو بھی کہتے کوپان اس کا ترجمہ کرکے ان لوگوں کو بتا دیتا۔ ہم نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا رہا تھا۔

"اب تم لوگ آرام کرو۔" کوپان نے کہا۔ "اور تمہاری چوٹ دو دنوں میں ٹھیک ہوجائے گی۔" یہ اس نے جان سے کہا تھا۔

"میرے دوست، تم انگریزی کیسے جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اپنا بہت وقت لہاسا میں گزارا ہے۔ اتنا تو جانتے ہی ہوگے کہ لہاسا تبت کا دارالحکومت ہے۔"

"ہاں، یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" جان نے کہا۔ "لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ جہنمی سفر مجھے لہاسا کے قریب لے آئے گا۔"

"چلو، اب تو آگئے ہو۔" کوپان مسکرا کر بولا۔ "اب کیا ہوسکتا ہے۔"

"کوپان، کیا ہم یہاں سے باہر نکل سکتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے اپنے ملک کی طرف۔"

"اس کے لیے لہاسا جانا ہوگا۔" کوپان نے کہا۔ "وہاں سے تمہیں تمہاری حکومت اپنے ملک بلالے گی۔"

"تو پھر یہ بتاؤ ہم لہاسا کیسے جائیں گے۔"

فی الحال ایک ہفتے کے بعد ہمارا ایک فیسٹول ہے۔" کوپان نے بتایا۔ "ہم اس تہوار کو مون لام دعاؤں کا تہوار کہتے ہیں۔"

"کچھ اس کے بار... بتادو۔" جان نے کہا۔ "یہاں سے اگر نکا... ت میں اضافہ بھی ہوگا۔"

Monlam prayer fastival

ہمارے کیلنڈر کے حساب سے دوسرے مہینے میں آتا ہے۔" کوپان نے بتایا۔ "یہ تہوار، رقص، موسیقی اور تفریح کا تہوار ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا ہمارے پہلے دلائی لاما سونگ کھاپا نے 1049 میں کی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک ہر سال منایا جاتا ہے۔"

"کیا اس تہوار کا بندوبست تم لوگ اسی جگہ کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو..... یہاں سے دور ایک مقدس مقام ہے شارک، ہم سب وہاں جمع ہوجاتے ہیں۔"

"کیا؟" میری زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ "جگہ کا نام کیا بتایا؟"

"شارک۔" کوپان نے اپنی بات دہرائی۔ "ہم سب وہاں کے بڑے معبد میں جاکر اپنی رسومات کی ادائیگی کرتے ہیں۔"

میرے خدا! یہ تو وہی نام تھا جو اس پراسرار لڑکی نے بتایا تھا۔ شارک، مقدس مقام جہاں کی وہ رہنے والی تھی اور جہاں میں رہا کرتا تھا۔

کیا قدرت نے یہ حادثہ جان بوجھ کر بڑی پلاننگ کے ساتھ کیا تھا کہ میں شارک پہنچ جاؤں۔ میرے خدا یہ کیسا بھید تھا۔

مجھے مولانا حسن کی باتیں بھی یاد آنے لگی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ تقدیر میں جو لکھ دیا جاتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ ڈوری ہلانے والے ہاتھ کھینچ کر لے ہی آتے ہیں۔ جس طرح میں کھنچ کر یہاں تک آگیا تھا۔ کیا ضروری تھا کہ مجھے چین میں پروجیکٹ مل جاتا۔ کیا ضروری تھا کہ جہاز کو حادثہ پیش آتا۔ کیا ضروری تھا کہ میں اس وقت ان اجنبیوں کے ہاتھ لگتا جب ان کا تہوار منایا جا رہا ہو۔

کوئی ضروری نہیں تھا۔ لیکن سب کچھ ضروری ہوگیا تھا۔ بلکہ میرے لیے ضروری کردیا گیا تھا۔ مجھ پر قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے ایک جال پھینک دیا تھا اور میں اس جال میں لپٹا ہوا اپنی نادیدہ تقدیر کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن اتنا ضرور احساس ہو رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہے وہ بہت پراسرار اور بہت حیرت انگیز ہے۔

جاری ہے

کمسن فتنہ

امجد رئیس

امریکا کے صدر نے خصوصی ہدایت جاری کی۔ محکمہ خفیہ حرکت میں آگیا تھا۔ سب مل کر اس شخص کو ڈھونڈ رہے تھے جس نے امریکا و یورپ کی بڑی بڑی کمپنیوں کو دیوالیہ بنا دینے کی سازش کی تھی۔ لاکھوں ڈالرز کا نقصان ہوا تھا۔ ''یاہو'' جیسی بڑی کمپنی کو ''ہیک'' کر لیا گیا تھا۔ محکمہ خفیہ کے اہلکار جب اس کو گرفتار کرنے پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اتنا کم عمر شاطر اس سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھا تھا

ڈیسک پر موجود بوم باکس سے موسیقی کی لہریں منتشر ہو رہی تھیں۔ 15 سالہ ہیکر چمکیلی اسکرین کو گھورتا ہوا ماؤس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کلک... کلک... فائبر آپٹک وائر کے ذریعے ہزاروں میل دور الیکٹرونک سگنل ہیکر کے پرسنل کمپیوٹر سے متحدہ ہائے امریکا کی ایک یونیورسٹی کے سپر کمپیوٹر میں داخل ہو رہے تھے۔

چرائے ہوئے پاس ورڈ نے رکاوٹ گرا دی۔ کلک... کلک... اور ہیکر نے دیو قامت مشین کا کنٹرول

اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اسے پردہ کے طور پر استعمال کرنے جا رہا تھا تاکہ کوئی اس کے پرسنل کمپیوٹر کو ٹریک ڈاؤن نہ کرے۔ بعض کے نزدیک یہ انٹرنیٹ کی تاریخ میں ورلڈ وائڈ ویب پر جدید جارحانہ حملوں میں سے ایک تھا۔

سپر کمپیوٹرز میں کینیڈین ہیکر نے خاص سافٹ ویئر ٹول انسٹال کیا۔

اسی طرح وہ ایک درجن یونیورسٹیوں کے "مین فریم" میں گھس گیا اور سب میں اپنا ڈیمن شامل رہیا۔ وہ مہلک سوفٹ ویئر کے بیج رہا بو رہا تھا۔

آخر میں اس نے ایک بٹن دبایا اور چند سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی سائٹ یاہو Yahoo.com پر حملہ کر دیا۔ 7 فروری 2000 پیر کا دن۔ Yahoo کی سائٹ اندھیروں میں گم ہو گئی۔ Yahoo کے مضبوط قلعے میں شگاف پڑ گیا اور سائٹ نے دم توڑ دیا۔ ہزاروں لاکھوں استعمال کنندگان خبروں، ای میل، تجارتی اور دوسری اطلاعات سے محروم ہو گئے۔

آنے والی دوپہر کو پراسرار ہیکر نے نقب شدہ یونیورسٹیوں کے مین فریمز کو بطور "زومبی" استعمال کرتے ہوئے دیگر بڑی ویب سائٹس پر حملہ کر دیا۔ BUY.COM کے وال اسٹریٹ پر ابتدائی دن تھے جب وہ اچانک ناقابل استعمال ہو گئی۔ پھر E-Bey جیسی سائٹ بھی ڈوب گئی۔ CNN نیٹ سے دو گھنٹے کے لیے غائب ہو گئی۔ Ama204.com ایک گھنٹے تک ناکارہ رہی۔ بدھ کی صبح حصص کی خرید و فروخت کرنے والے ڈی ٹریڈ فنشل سرنگوں رہے تھے۔

سائبر سیکیورٹی کے ماہرین نے اسے DDOS کا نام دیا۔ ڈسٹری بیوٹرز ڈینائل آف سروس۔ جس کے حملوں نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں کہ شمالی امریکا کا آئی ٹی کا سسٹم کتنا غیر محفوظ ہے۔

مختلف کمپنیوں کے ہوم پیج بند ہونے سے عوام کے ملینز ڈالرز ڈوب گئے۔

☆☆☆

وہائٹ ہاؤس کے لیے یہ ایک سنجیدہ معاملہ تھا جو نہ صرف معیشت کے لیے خطرہ تھا بلکہ قومی سلامتی کے لیے بھی ایک دھمکی تھی۔ پریزیڈنٹ بل کلنٹن دشمن کو دبوچنا چاہتا تھا لیکن یو ایس نیشنل انفرا اسٹرکچر پروٹیکشن سینٹر (NIPC) کے تحقیق کنندگان جو واشنگٹن میں FBI کے ہیڈ کوارٹر میں تھے وہ دوسرے اداروں کو دیکھ رہے تھے جب کہ FBI، CIA، نیشنل سیکیورٹی ایجنسی (NSA)، ڈیپارٹمنٹ آف ڈیفنس اینڈ جسٹس اور NASA کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

کی بورڈ کے مجرم کو پکڑنا ایسا ہی تھا جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی کو تلاش کرنا۔

FBI کا سائبر انویسٹی گیشن چیف ران ڈک اس صورت حال سے پریشان تھا کیونکہ یہ کارروائیاں بہت بڑے بحران کو بھی جنم دے سکتی تھیں۔ ہیکر محفوظ کمرشل سائٹس کو نشانہ بنا سکتے تھے تو ایئر ٹریفک کنٹرول سسٹم، پینٹاگون کا کمپیوٹر نیٹ ورک اور بجلی کے نظام کو بھی الٹ سکتے تھے اگر ایسا ہو جائے تو؟ منظر نامے کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

FBI کو فرض کرنا پڑ رہا تھا کہ یہ سب محض تجسس یا تجربے کی حد تک ہے۔ 10 فروری تک ران ڈک نے ایک ٹاسک فورس تشکیل دی اور FBI 13700 اسکواڈ ممبرز کے اسٹریٹجک انفارمیشن سینٹر کی گہرائی میں ایک بڑا کانفرنس روم ٹروپس کے حوالے کر دیا۔

NIPC کے کارکن بارہ بارہ گھنٹے کی شفٹوں میں کمپیوٹرز پر کام کر رہے تھے۔ ہیکرز خود بھی انٹرنیٹ پر چیٹنگ کرتے تھے۔ ان میں بہت کم تھے جن کو یقین تھا کہ یہ حملے کوئی اکیلا ہیکر کر رہا ہے۔

ایجنٹس، الیکٹرونکس ٹریفک ریکارڈز کا تجزیہ کر رہے تھے۔ یہ ریکارڈز ان کمپنیوں کا تھا جو اب تک نشانہ بنی تھیں۔ انہیں ایک کلیو چاہیے تھا کہ حملہ آور سے کس علاقے کا ہے؟

جمعرات تک FBI اس نتیجے تک پہنچ گئی کہ بعض وارداتوں میں ہیکر یا ہیکرز نے برقی نقاب کی آڑ لی تھی۔ یعنی الیکٹرونکس کے ذریعے جھانسا دیا تھا کہ وہ فلاں جگہ سے کارروائی کر رہے ہیں۔ درحقیقت ہیکر نے ان کو الوبنانے کی کوشش کی تھی۔

اسی دوران میں الیکٹرونک حملے معاً غائب ہو گئے کیونکہ دنیا میں فرنٹ پیج پر خبر لگ گئی تھی کہ FBI ہیکر کے تعاقب میں ہے۔ اکثر وارداتیں ابتدائی تین دنوں میں ہوئی تھیں۔

☆☆☆

لاس اینجلس میں ایلیٹ سائبر اسکواڈ کے کمرے میں پرسنل کمپیوٹرز مسلسل کام کر رہے تھے اور گرم ہو گئے تھے۔ الف

پی آئی کی اسپیشل ایجنٹ جل نیبک کی عمر 35 برس تھی۔ وہ متواتر حالات کا جائزہ لے رہی تھی۔

نیبک اس سے پیشتر بھی کئی بار ہیکرز سے نمٹ چکی تھی لیکن اس بار کوئی قطعی مختلف شخص ٹکرایا تھا۔ پھر اس کی توجہ CNN کی خبروں کی جانب چلی گئی۔ افواہیں اور قیاس آرائیاں زوروں پر تھیں لیکن کسی کو کوئی ٹھوس بات معلوم نہیں تھی۔

ہزار طرح کی کوششوں کے بعد بھی FBI جیسے پیشہ ور ایجنٹ بہت کم معلوم کر پائے تھے۔ چھان بین کرتے ہوئے اڑتالیس گھنٹے گزر چکے تھے۔

FBI نے واشنگٹن میں ایک بڑی پریس کانفرنس کی۔ اپنے حجم کے اعتبار سے یہ کانفرنس 1995ء کے بعد سب سے بڑی کانفرنس تھی۔ اس سے قبل 1995ء میں اوکلوہاما سٹی کے بمباری کیس میں ایک پرہجوم پریس کانفرنس ہوئی تھی۔

سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔ میڈیا والے نئی بات معلوم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔

"یہ حملے کتنے موثر اور جدید ہیں؟" ایک رپورٹر نے زک سے سوال کیا۔

"مارکیٹ میں ان گنت الیکٹرانک ٹولز ہیں اور کوئی پندرہ سال کا بچہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟" دوسرا سوال آیا۔ "کیا ہم سب ہروقت خطرے میں ہیں؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہم سمیت متعدد ادارے ہمہ وقت چوکس رہتے ہیں۔"

"پھر یہ سب کیسے ہوا؟"

"آپ لوگ جلد ہی اچھی خبر سنیں گے۔" زک نے جان چھڑائی۔

☆☆☆

14 فروری کی شام تھی۔ ارلین ساہبرا ٹیک کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ مانٹریال میں رائل کینیڈین ماؤنٹڈ پولیس (RCMP) کا کارپورل، مارک گوسلن کو پیجر پر اشارہ موصول ہوا۔ وہ اسی وقت گھر پہنچا تھا اگرچہ اس نے اپنی بیوی کے ہمراہ رومانی ویلنٹائن ڈے ڈنر کا پروگرام بنایا ہوا تھا تاہم ایک فرض شناس آفیسر کی مانند اس نے پیجر کے پیغام کا جواب دینے کے لیے فون اٹھالیا۔

مارک سابقہ پولیس کمانڈو تھا۔ اس نے تقریباً نصف زندگی RCMP میں دہشت گردی کے خلاف لڑتے گزاری تھی۔ علاوہ ازیں اس نے باڈی گارڈ اور سراغرسانی کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ منشیات کے کیس اس کے علاوہ تھے۔ مارک گوسلن اب 37 سال کا تھا اور سائبر کرائم میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہا تھا۔ وہ کینیڈا کا چوٹی کا ہیکر اسپیشلسٹ تھا۔

پیجر کا پیغام وصول کرکے اس نے فون نمبر ملایا۔

دوسری جانب بات کرنے والے 800 کلومیٹر دور تھے۔ زولنگر اور جینسکی (Genetski)۔ دونوں کا تعلق امریکا کے جسٹس ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ وہ واشنگٹن میں سائبر کرائم پروزیکیوٹر تھے۔

"مجھے تمہاری شام برباد کرنے کا افسوس ہے لیکن یہاں ایک مسئلہ آن پڑا ہے۔" زولنگر نے کہا۔ "یوں لگتا ہے کہ تمہیں اس پر کام کرنا پڑے گا۔" زولنگر نے گزشتہ ہفتے ویب سائٹس پر حملوں کے بارے میں بتایا۔

"ہم اب تک اتنا ہی جان پائے ہیں کہ ہیکر مانٹریال میں ہے۔ ہم نے آن لائن ایک ہیکر کی چیٹنگ سنی تھی جو کسی ایسے شخص سے بات کر رہا تھا جس نے اپنا نام "مافیا بوائے" رکھا ہوا ہے۔ مافیا بوائے شیخی بگھار رہا تھا کہ 12 فروری کو اس نے ڈیل (deel.com) کو بٹھا دیا تھا لیکن کمپنی نے اسے خبر بننے نہیں دیا۔"

سب سے زیادہ اہم ٹپ انہیں اعداد سے ملی۔ ہر کمپیوٹر کا ایک خاص IP ہوتا ہے۔ یہ انٹرنیٹ پروٹوکول ہے۔ جب بھی استعمال کنندہ لاگ ان ہوتا ہے تو انٹرنیٹ سروس پرووائڈر ایک نمبر تفویض کرتا ہے۔

مافیا بوائے جس کے ساتھ چیٹنگ کر رہا تھا وہ ایک خفیہ انفارمر ہے۔ مافیا بوائے نے ایک فائل اس انفارمر کو منتقل کی اور انفارمر نے اس کا آئی پی نمبر نوٹ کرلیا۔ بعد ازاں جل نیبک نے ISP کو ٹریس کرلیا جو مانٹریال میں ہے۔ یعنی "ٹوٹل نیٹ"۔ مارک گوسلن خاموشی سے سن رہا تھا۔

FBI کے ایجنٹوں نے یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، سانٹا باربرا کا دورہ کیا جہاں کے سسٹم ایڈمنسٹریٹر کو یقین تھا کہ کوئی سافٹ ویئر نہایت منظم طریقے سے وہاں پلانٹ کیا گیا تھا۔ جل نیبک نے معلوم کرلیا کہ وہ سوفٹ ویئر امریکن ہیکر نے ڈیزائن کیا تھا۔ ہیکر کا نام "Sink hole" ہے اور یہ تھی ہیکر کو رجسٹر کیا گیا تھا۔ ان چند

ہیکرز میں مافیا بوائے بھی ہے جو انٹرنیٹ کے لیے ٹوٹل نیٹ کی خدمات حاصل کرتا ہے۔

اب FBI کے پاس نام اور نمبر ہے گھڑی کی سوئیاں حرکت میں ہیں کیونکہ ٹوٹل نیٹ والے ہر 72 گھنٹے بعد اکثر IP ایڈریس لاگ مٹا دیتے ہیں۔ اسی لیے سراغ رسانوں کو تیزی سے حرکت کرنی ہے۔

"ہمیں تمہاری مدد کی شدید ضرورت ہے۔" زولنگر نے مارک گوسولن کو بتایا کہ وہ چاہتے ہیں مارک ٹوٹل نیٹ کا کمپیوٹر لاگ محفوظ رکھنے میں اپنا اثر استعمال کرے۔ اس طرح بہت ممکن ہے کہ وہ لوگ بروقت مافیا بوائے کی شناخت حاصل کرلیں۔

مارک چند لمحے سوچتا رہا کہ اسے جج کو قائل کرکے سرچ وارنٹ لینا پڑے گا تب ہی وہ فرم کے ریکارڈ تک پہنچ سکے گا۔

"میں تیار ہوں۔" بالآخر اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

ڈیلفائن ڈے کا سنایا ہوا ہوا لیکن اگر وہ چاہتی تو کوئی عورت مارک کو معاف کرسکتی تھی تو وہ خود اس کی بیوی تھی۔ وہ ایک RCMP وکیل تھی۔ وہ دونوں 1994ء میں ایک دوسرے سے شناسا ہوئے۔ ایک ساتھ کام کیا پھر شادی بھی کرڈالی۔ دونوں سائبر کرائم کے کیسز پر ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔

کینیڈین قانون نافذ کرنے والے ادارے بذات خود بیرونی حکومتوں کی انٹیلی جنس کی تصدیق کرتے تھے تاکہ وارنٹ کی بنیاد فراہم ہوسکے۔ مارک گھر سے ہی آن لائن ہوا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ FBI کی کہانی کی تصدیق کرلے گا اور کوئی نہ کوئی کلیو بھی برآمد کرسکے گا۔

اس نے تصدیق کی کہ مافیا بوائے نے ہیکرز کے لیے ایک ویب سائٹ، مانٹریال کے ISP ڈیلفی سپرنیٹ کے ذریعے تشکیل دی تھی۔ ڈیلفی سپرنیٹ نے اسے بند کردیا تھا۔

اگلے دن متحدہ امریکا کے جسٹس ڈیپارٹمنٹ کے وکلا خبر کے لیے بے صبری کا اظہار کررہے تھے۔ جنسکی نے مارک کا موبائل نمبر ملایا۔ لائن ملتے ہی اس نے بے صبری سے سوال کیا۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں برف میں ڈرائیو کررہا ہوں۔" جواب آیا۔

"مجھے گاڑی ایک طرف لگانے دو۔"

"ڈیلفی سپرنیٹ اور ٹوٹل نیٹ کے لیے مجھے جج کے گھر سے وارنٹ لینا پڑا۔" اس نے کار روک کر جواب دیا۔ "دونوں ISPs مانٹریال میں ہیں۔ میں وہیں جارہا ہوں۔"

جنسکی، مارک کی تیز رفتاری سے متاثر ہوا تھا۔ اس کو خیال آیا کہ یہ آدمی ضرور کچھ کر دکھائے گا۔

مارک ٹوٹل نیٹ کے دفتر میں ریکارڈ کھنگال رہا تھا۔ اسے مافیا بوائے کا اکاؤنٹ مل گیا جسے متعدد لوگوں کی شکایات کے بعد معطل کردیا گیا تھا۔ وہاں سے وہ نیٹ کیبھرائن انٹرنیٹ پر ڈیلفی سپرنیٹ تک پہنچا۔

یہاں پر مافیا بوائے ون اور ڈیرک کے نام سے مشترکہ اکاؤنٹ تھا۔ یہ بھی غلط استعمال کی وجہ سے بند تھا۔

وہ واپس RCMP کے علاقائی ہیڈ کوارٹرز میں آگیا جو ویسٹ ماؤنٹ کے پڑوس میں تھا۔ رات سرد تھی۔ وہ اپنے مخصوص کمرے میں کرسی پر موجود تھا۔ ڈیسک لیمپ روشن کرکے اس نے کاغذات اور دستاویزات برآمد کیں اور سر کھپانے لگا۔ مارک ٹوٹل نیٹ اور ڈیلفی کے اکاؤنٹ رجسٹریشن کا موازنہ کررہا تھا۔ نام مختلف تھے۔ پتے مختلف تھے، کریڈٹ کارڈ نمبر مختلف تھے اور ممکن تھا کہ یہ بھی جعلی ہوں۔ اسے کوئی لنک نہیں مل رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے ہر اکاؤنٹ کا فون نمبر دیکھنا شروع کیا اور اسے دو یکساں نمبر مل گئے۔ اس نے اپنی کرسی گھمائی۔

ٹیلی فون ڈائریکٹری کے آن لائن کو کلک کرکے نمبر ٹائپ کیا۔ نتیجہ سامنے آگیا۔ یہ مانٹریال کا نواحی علاقہ تھا۔ مارک سوچ میں پڑ گیا۔ "میں نے یہ پتا کہاں دیکھا تھا؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ وہ اپنی یادداشت کو کرید رہا تھا۔ رہائشی کے نام کا آخری حصہ بھی اسے شناسا معلوم ہوا۔ پتا "ال بزارڈ" کا تھا۔

چھٹی حس کے تحت وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کیبنٹ سے ایک زرد رنگ کا فولڈر نکالا۔ کچھ دیر بعد اس کی الجھن دور ہوگئی۔ چند ماہ قبل FBI نے اس کے ساتھ رابطہ کیا تھا۔

مسئلہ ڈیرک نامی ہیکر سے متعلق تھا جو ڈیلفی سپرنیٹ کا کلائنٹ تھا۔ ہیکر کا آئی پی نمبر ایک اکاؤنٹ تک جاتا تھا۔ یہ "اسپرنٹ کینیڈا" مانٹریال میں تھا۔ بعد ازاں تحقیقات سرد خانے کی نذر ہوگئیں۔

مارک نے پتا حاصل کیا تھا۔ اسپرنٹ اکاؤنٹ کا

جبل الطارق

ہسپانیہ کے صوبے قادس کے جنوب مغرب میں ہسپانیہ کی انتہائی جنوبی حد پر ایک آبادی جو سطح سمندر پر بڑھتی ہوئی ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ڈھائی مربع میل ہے۔ ہسپانیہ کے قطعہ ارضی سے ایک ریگستانی ٹکڑے کے ذریعے منسلک ہے۔ جبل الطارق کو ہر دور میں بحیرہ روم کی کلید کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس وجہ سے ہر دور میں اس کے استحکام پر خاص توجہ دی جاتی رہی ہے۔ زمانہ قدیم میں اسے قادس، ہر کیولیم (Herculeum) کہا جاتا تھا۔ عرب اسے فلیج الزقاق کہتے ہیں۔ اس کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ 92ھ/711ء میں طارق بن زیاد اس کے ساحل پر اترا تھا اور اس کو فتح کیا۔ اس کا دوسرا نام جبل الفتح ہے۔ جبرالٹر جبل الطارق ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ عربوں کے عہد حکومت میں جبل الطارق کی بندرگاہ، شہر اور قلعہ جو موروں نے بنایا تھا جہازوں کے لیے ایک محفوظ مستقر کا کام دیتا رہا۔ جب خلیفہ عبدالمومن الموحد اپنی افریقی مہم (554ھ/1159ء تا 555ھ/1160ء) سے واپس آیا تو اس نے اپنے بیٹے یوسف والی اشبیلیہ کو جبل الطارق میں ایک نیا شہر بسانے کا حکم دیا۔ تاکہ وہ شہر قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ پر ہونے والے حملوں کا مقابلہ کر سکے اور زبردست لشکر کشی کے لیے ایک مستقر اور محل اجتماع کا کام دے تاکہ وہاں فوجیں ٹھہرائی جا سکیں۔ چنانچہ ایک خوب صورت شہر جس میں ایک جامع مسجد اور خلیفہ کے لیے ایک محل تعمیر کیا گیا۔ المومن نے 555ھ/نومبر 1160ء میں نئے شہر کا معائنہ کیا اور اس کا نام مدینۃ الفتح رکھا۔ 709ھ/1309ء میں فرڈیننڈ چہارم نے شاہ قشتالہ کے لیے اس پر حملہ کیا اور فاتح ہو گیا۔ لیکن 1333/733 میں مراکش کے بنو مرین نے اسے فتح کیا۔ بعد میں غرناطہ کے ناصری سلطان یوسف ثالث نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کا قبضہ 813ھ/1410ء سے 866ھ/1462ء تک رہا۔ بالآخر 20 اگست 1462ء کو مدینہ شدونہ کے ڈیوک فرمان نے ہنری چہارم شاہ قشتالہ کے لیے اسے فتح کیا۔ 1462ء سے 1502ء تک جبل الطارق قزمانوں کی موروثی جاگیر رہا اور بعد میں دوبارہ بادشاہ کی ملکیت میں آ گیا۔ 1704ء میں ہسپانیہ کی جنگ تخت نشینی کے موقع پر امیر البحر سر جارج روک نے اس پر قبضہ کر کے اسے برطانیہ کے حوالے کر دیا۔ بعد میں اسے کئی محاصروں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں 1779ء تا 1783ء کا محاصرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں جبل الطارق نے جنرل ایلیٹ کے ماتحت ہسپانیہ اور فرانس کے محاصرے کا مقابلہ کیا۔ 10 ستمبر 1967ء میں جبل الطارق کے باشندوں کو موقع دیا گیا کہ آیا وہ برطانیہ کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا اسپین کے اقتدار کے تحت آنا چاہتے ہیں چنانچہ انہوں نے برطانیہ کے ساتھ الحاق کو ترجیح دی۔ جبل الطارق ایک اہم بحری اڈہ ہے۔ 1973ء میں اس کی کل آبادی 29927 تھی جو برطانوی، یہودی اور مراکشی باشندوں پر مشتمل ہے۔ اتنی تعداد میں برطانوی حکومت کا حفاظتی دستہ بھی شامل ہے۔ جبکہ سقوط غرناطہ سے قبل یہاں صرف مسلمان آباد تھے جن کو یہاں سے نکال باہر کر دیا گیا تھا اور انہی کی جگہ عیسائیوں کو آباد کیا گیا۔

مرسلہ: عباس ہنگری۔ لاہور

بتا بھی وہی تھا۔ یعنی ہنگر یہاں مانٹر بال میں ہے۔ اس نے سوچا۔

اسے جھٹکا لگا کہ تاریخ کا سب سے بڑا ہنگر کیسے اس کی گود میں آن گرا ہے۔

دوسرے روز دس بجے تک کینیڈین تحقیقات کے مطابق RCMP کو پتا چل گیا تھا کہ ہاتا ہوا نے رات کہاں سویا تھا۔ وہ لوگ اس کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اب ہارک کو فون ٹیپ کرنے کے لیے ضروری شہادتیں جمع کرلی تھیں۔

☆☆☆

جمعے کے دن فروری 18 کو نگل فون پر بات کر رہی تھی۔ جب اس کے باس نے اظہار کیا کہ "تمہیں مانٹریال میں تمہاری ضرورت ہے۔ وہ اس وقت ایریزونا میں تھی۔ باس کا کہنا تھا کہ RCMP ہنگر کے قریب پہنچ گئی ہے۔ تم سرچ وارنٹ کے لیے انہیں معلومات فراہم کرو گی۔"

"میں پہنچ جاؤں گی۔" نگل نے جواب دیا۔ وہ ہیجان کی کیفیت محسوس کر رہی تھی کیونکہ یہ ایک ہائی پروفائل کیس تھا۔

مارک نے بگل کو مانٹریال ہوٹل میں خوش آمدید کہا۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ وہ دونوں ایک سال قبل FBI کے کمپیوٹر کرائم کے سیمینار میں ورجینیا میں ملے تھے۔

جب وہ دونوں RCMP کے ہیڈکوارٹرز کی جانب سفر کر رہے تھے تو مارک نے بگل کو اب تک کی کارگزاری کے بارے میں بتایا۔

RCMP نے اجازت نامہ حاصل کر لیا جس کی مدد سے وہ "ال بزارڈ" کے پتے پر فون ریکارڈ حاصل کر سکتی تھی۔ وہاں کا رہائشی ٹرانسپورٹیشن کے کاروبار سے منسلک تھا۔ اسی فون نمبر سے فون نیٹ کو کالز کی گئی تھیں۔ جلد ہی ان کو اکاؤنٹ کی معلومات حاصل ہو گئیں۔ اس کے ساتھ دوسرے شواہد کو ملا کر وہ قانونی طور پر اس قابل ہو گئے کہ فون ٹیپ کرنا شروع کر دیں۔ RCMP نے یہ بھی معلوم کیا کہ ال بزارڈ کے رہائشی نے انٹرنیٹ پر کیا سرگرمیاں جاری رکھی تھیں۔

فون ٹیپ کرنے کے انتظامات مکمل ہوئے تو انکشافات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ فروری 25 تک RCMP کو یقین ہو گیا کہ ہیکر 45 سالہ باپ اور سوتیلی ماں کے ساتھ یہیں رہتا ہے۔ مافیا بوائے کی عمر صرف 15 برس تھی۔ وہ سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔

حیرت انگیز طور پر چند فیملی ممبرز کو "مافیا بوائے" کے "کارناموں" کا پتا تھا اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے۔ ایک لڑکے کو فون پر اپنے دوست سے یہ کہتے سنا گیا کہ "اس کا بھائی جینیس ہے اور اسے پکڑا نہیں جا سکتا۔"

مافیا بوائے کو بھی پتا تھا کہ اس کی دھوم مچی ہوئی ہے اور FBI اس کے پیچھے لگی ہے تاہم اسے یقین تھا کہ وہ اس تک نہیں پہنچ سکتے اور اگر پہنچ بھی گئے تو اس کی شہرت اس کی مدد کرے گی کہ وہ ایک انٹرنیٹ سیکیورٹی کمپنی کی بنیاد رکھ سکے۔

سات ہفتے تک RCMP اس کی نگرانی کرتی رہی۔ انٹرنیٹ کی سرگرمیوں سے بھی آگاہ رہی اور فون کالز بھی ٹیپ کرتی رہی۔

اپریل کے دوسرے ہفتے میں انہوں نے ایک سنسنی خیز کال پکڑی۔ مافیا بوائے کا باپ اپنے کاروباری حریف پر حملے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ جس کی وجہ ایک بزنس ڈیل تھی جو اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

اگرچہ RCMP یہ پہلے ہی معلوم کر چکی تھی کہ مافیا بوائے نے غیر قانونی طور پر بیرون ملک 75 یونیورسٹیوں کے کمپیوٹرز تک رسائی حاصل کی تھی۔ پولیس کو مزید شہادتوں کی ضرورت تھی اور نگرانی کا سلسلہ جاری رہنا تھا لیکن مافیا بوائے کے باپ کے منصوبے نے صورت حال تبدیل کر دی اور مارک کو مانٹریال پولیس کو آگاہ کرنا پڑا کہ وہ انہیں پکڑنے کا فیصلہ کرے۔

15 اپریل، اتوار کی صبح تین بجے جب انٹرنیٹ کے پہلے حملے کو دس ہفتے گزر چکے تھے۔ پولیس اور RCMP کے درجن بھر افراد نے ال بزارڈ کے چھوٹے قلعہ نما رہائش گاہ پر ہلہ بول دیا۔ وہاں مافیا بوائے کے لیے چار کاروں کے گیراج اور ایک باسکٹ بال کورٹ تھا۔

مارک نے دروازہ بجایا تھا۔ کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے میگافون پر وارننگ دی۔ مافیا بوائے کے باپ نے دروازہ کھولا اور انہیں اندر آنے دیا۔ اس کو فی الفور ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔

مافیا بوائے خود چند بلاک دور اپنے دوست کے گھر پر تھا۔ اس کے باپ کو فون پر مارک سے اس کی بات کرانی پڑی۔

مارک نے اس چھوکرے سے کہا کہ وہ وہیں ان کا انتظار کرے اور یہ کہ کہانی ختم ہو گئی ہے۔

ہوشیار لڑکا جانتا تھا کہ اب وہ فرار نہیں ہو سکتا۔ کچھ دیر بعد مارک چند ساتھیوں کے ہمراہ اس تک پہنچ گیا۔

انٹرنیٹ کا فتنہ جس نے دنیا کو حتیٰ کہ متحدہ ہائے امریکا کے صدر تک کو پریشان کر دیا تھا اور متعدد ایجنسیاں اس کی تلاش میں سرگرداں رہی تھیں۔ وہ صرف پندرہ سال کا ایک دبلا پتلا لڑکا تھا جس نے یہ سب کچھ شیخیاں بگھارنے کے لیے کیا تھا۔ وہ ڈھیلے کپڑوں میں تھا۔ بال سیاہ تھے۔ جیکٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ چہرے پر تاثر تھا۔ سیاہ رنگ کی بیس بال کیپ سر پر الٹی چڑھائی ہوئی تھی۔

اگرچہ لڑکے نے شروع میں احتجاج کیا اور خود کو معصوم ثابت کرنے کی کوشش کی جو بار آور ثابت نہ ہو سکی۔ بالآخر 18 جنوری 2001 کو اس پر 58 الزامات لگے جو اس نے تسلیم کر لیے۔

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک ملک کی ملکہ تھی، مطلق العنان ملکہ پھر بھی ایک معمولی شخص نے اسے بے وقوف بنا دیا۔ یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ اس خطا پر کشتوں کے پشتے لگ جاتے مگر شہنشاہِ اعظم نے دانائی سے کام لیا۔ یہ اس کی بہت سی بیویوں میں سے ایک تھی اور سابق شہنشاہ کے ساتھ وہ زندگی گزار چکی تھی۔ بس اسی نکتے کو ذہن میں رکھ کر اس نے مجرم تک پہنچنے کی سعی کی اور بالآخر اس نے مجرم کو پہچان بھی لیا۔ لیکن سزا دینے کی بجائے معاف کردینا بہتر جانا۔

فیصلہ جذباتی ہوتا تو بدنامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا

جب جنوبی اٹلی کے بادشاہ نے پاویا کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو اس نے سابق بادشاہ آنجہانی اتھارن کی بیوی لیجینا کو اپنی ملکہ بنالیا۔

ملکہ لیجینا بڑی ذہین اور تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ حسین بھی اتنی تھی کہ اٹلی اور یورپ کے دیگر ممالک میں کہیں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ یہاں تک کہ یورپ کے بڑے بڑے نامور شہنشاہ اس پر نظر رکھتے تھے لیکن افسوس کہ وہ جتنی حسین تھی اپنے محبوبوں کے معاملے میں اتنی ہی بدقسمت بھی واقع

ہوئی تھی۔

شاہ کی دانائی اور جوانمردی کے سبب ملک کے حالات بہت پُرسکون اور عوام خوش حال تھے۔

ملکہ کا ایک سائیس تھا جو بہت نچلے خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن اپنی وجاہت اور قدوقامت کے اعتبار سے بادشاہ کا ہم پلہ نظر آتا تھا۔ یہ شخص بھی اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے زندگی کے دوسرے شعبوں میں منفرد حیثیت کا حامل تھا۔ یہ ملکہ کی بدقسمتی ہی تو تھی کہ وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہوگیا۔ یہ مسئلہ بڑا سنگین تھا کیوں کہ کہاں ایک معمولی سائیس اور کہاں ایک جلیل القدر ملکہ...... وہ اکثر پریشان رہا کرتا اور اس پیچیدہ مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہتا لیکن راز دل کسی پر عیاں نہ کرتا۔ اس نے اس مسئلے میں اتنی رازداری برتی کہ جب وہ ملکہ کے سامنے ہوتا تو اتنی احتیاط برتتا کہ اپنی کسی حرکت سے بھی واردات قلبی کا اظہار نہ ہونے دیتا۔ دلی مراد بر آنے کی کوئی شکل نہ تھی لیکن اسے فخر تھا کہ اس نے جس خاتون کو دل دیا ہے وہ کوئی معمولی حیثیت کی نہیں ہے، ایک ملک کی ملکہ ہے۔ وہ ملکہ کی خدمت گزاری کے لیے اس طرح مستعد رہتا کہ اس کے دوسرے ساتھی اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ پاتے چنانچہ وہ ہر اس کام کی انجام دہی میں اپنی پوری صلاحیتیں صرف کرتا جس سے ملکہ کی خوشنودی حاصل ہوسکتی تھی۔

حسن اتفاق کہ ملکہ جب سے گھڑسواری کا ارادہ کرتی زیادہ تر اس گھوڑے کا انتخاب ہوتا جس کی دیکھ بھال اس سائیس کے ذمے تھی اور جب بھی ایسا ہوتا سائیس ملکہ کی خدمت کو اپنے لیے نعمت تصور کرتا اور دل و جان سے خدمت انجام دیتا۔ ہر وقت گھوڑے کے ساتھ ساتھ رہتا ملکہ کو تنہا نہ چھوڑتا بلکہ خود بھی ایک گھوڑے پر سوار ہوکر اس کے ساتھ سفر کرتا تاکہ اگر ملکہ کسی مصیبت سے دوچار ہو تو وہ اس کی بروقت مدد کرسکے۔

تجربہ کہتا ہے کہ عشق میں مایوسی اور ناامیدی جتنی بڑھتی ہے، آتش عشق اتنی ہی فروزاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت اس غریب کی بھی تھی۔ ناامیدی کے سیاہ بادل اس کے دل پر چھائے ہوئے تھے اور اب اس کے لیے عشق کو ہر حد پوشیدہ رکھنا مشکل تھا۔ جب اس پر مایوسی زیادہ غلبہ پاتی تو وہ اپنی زندگی کے خاتمے کے بارے میں سوچنے لگتا۔

چنانچہ بڑے غوروخوض کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس طرح خودکشی کرے کہ جس سے دنیا جان لے کہ اس کی موت کا سبب ملکہ کی محبت تھی لیکن اس مایوسی کے علاوہ ایک پُرامید تجویز بھی اس کے ذہن میں تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ ایک مرتبہ ضرور اپنی جان خطرے میں ڈال کر کلی یا جزوی طور پر اس آگ کو سرد کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس سلسلے میں اس نے ملکہ سے اپنا حال دل کہنے یا اسے خط لکھنے کے ذریعے اپنی محبت سے مطلع کرنے کی کوئی کوشش نہ کی کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسی تمام کوششیں ناکام رہیں گی۔ وہ تو اس بات کا قائل تھا کہ اظہار عشق بانامہ و پیام کی بجائے ملکہ کے چشمہ جانب سے سیرابی حاصل کرنے کی کوشش کرے، اس کے لیے ذرا مشکل اسے دکھائی دیا وہ یہ تھا کہ وہ بادشاہ کے بھیس میں کسی طرح ملکہ کے بستر تک پہنچ جائے کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ بادشاہ ہر رات ملکہ کے پاس نہیں جاتا اور یہ کہ ملکہ کے پاس جانے کے لیے بادشاہ کا کوئی اصولی پروگرام نہیں ہوتا۔

اپنی مقصد براری کے لیے وہ کئی راتوں تک اس بڑے ہال میں چھپا رہا جو ملکہ اور بادشاہ کے کمروں کے درمیان واقع تھا۔ اس طرح وہ بادشاہ کے آنے جانے کے پروگرام سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ وہاں بادشاہ کب جاتا اور کب واپس آتا ہے، اس وقت اس کے جسم پر کون سا لباس ہوتا ہے اور وہ کس طرح ملکہ کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

ایک رات جب وہ اس ہال میں چھپا ہوا تھا تو اس نے بادشاہ کو ملکہ کے کمرے کی جانب جاتے دیکھا۔ وہ ایک لمبے چغے میں ملبوس تھا۔ ایک ہاتھ میں شمع تھی اور دوسرے میں ایک چھوٹا سا عصا۔ دروازے پر پہنچ کر بادشاہ نے کوئی لفظ ادا کیے بغیر اپنا عصا دو بار آہستہ آہستہ دروازے سے مارا۔ دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ کسی نے اس کے ہاتھ سے شمع لے لی اور بادشاہ اندر داخل ہوگیا۔

سائیس نے اس تمام کارروائی کو غور سے دیکھا اور اس رات تک وہاں چھپا رہا جب تک بادشاہ ملکہ کے کمرے سے واپس نہ چلا گیا۔

اب سائیس کے لیے گوہر مقصود حاصل کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس نے آئندہ شب اس انداز میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے بڑی تگ و دو کے بعد بادشاہ کے چغے سے ملتا جلتا ایک چغہ حاصل کیا۔ ایک معمولی سا عصا لیا اس کے بعد اس نے خوب نہا دھو کر اپنے جسم پر خوشبو ملیں تاکہ اس کے جسم میں بسی ہوئی پسینے کی بدبو سے ملکہ کا دماغ نہ پراگندہ ہو جائے اور صورت حال بھانپ نہ لے۔ بادشاہ کے حلیے اور

لباس میں وہ اپنی جگہ جا کے چھپ گیا جہاں سے وہ بادشاہ کو آتے جاتے دیکھ چکا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے رات کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

رات کو اس نے شمع روشن کی اور دل میں یہ طے کر لیا کہ وہ آج یہاں سے بامراد واپس جائے گا یا پھر اپنی زندگی کے اس عظیم مقصد کے حصول کی خاطر جان دے دے گا۔ یہ طے کر کے وہ ہال سے گزرتا ہوا ملکہ کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ لکڑی سے دو مرتبہ دستک دی۔ فوراً ہی نیند میں ڈوبی ہوئی خمور آنکھوں والی دراز قد خادمہ نے دروازہ کھولا اس نے سائیس کے ہاتھ سے شمع لے کر ایک طرف رکھ دی۔ سائیس نے کوئی لفظ بھی ادا کیے بغیر چغہ اتارا، چھپر کھٹ کے پردے ہٹائے اور ملکہ کے پہلو میں جا کر لیٹ گیا۔ ملکہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ سائیس خوب جانتا تھا کہ بادشاہ جب غصے میں ہوتا ہے تو وہ نہ کسی سے بات کرتا ہے اور نہ ہی کسی کی کوئی بات سنتا ہے۔ چنانچہ اس نے غصے کی اداکاری کرتے ہوئے نہ تو ملکہ سے کوئی بات کی نہ ہی ملکہ نے اس سے کوئی بات کی کیوں کہ وہ بھی یہ جانتی تھی کہ بادشاہ سخت مغلوب الغضب واقع ہوا ہے اور اس طرح یہ سائیس دیر تک خوابوں کی دنیا میں کھویا رہا اور ملکہ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ کافی وقت گزر گیا تو اس کے دل میں یہ اندیشہ گزرا کہ کہیں یہ مسرت کسی غلطی کے نتیجے میں رنج و الم میں نہ بدل جائے۔ طرحدار کر رہا تھا، اپنا چغہ پہنا خادمہ سے شمع لی، عصا اٹھایا اور زبان سے کوئی لفظ ادا کیے بغیر ملکہ کے کمرے سے باہر آیا اور جتنی جلدی ممکن تھا اپنے بستر پر پہنچ گیا۔

ابھی سائیس کو گئے ہوئے چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ بادشاہ نیند سے بیدار ہوا اور ترنگ میں آ کر اٹھا اور ملکہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

جب وہ حسب معمول ملکہ کے پاس پہنچا تو ملکہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیوں کہ بادشاہ کی رفاقت میں پہلی بار وہ اس سانحے سے دوچار ہوئی تھی کہ بادشاہ ایک رات میں دو بار وہاں آیا تھا۔

جب بادشاہ اس کے بستر پر دراز ہو گیا اور اس سے چہلیں کرنے لگا تو ملکہ کی ذرا ہمت بڑھی۔ اس نے ازراہ تفنن کہا۔

''اے میرے سرتاج! آخر آج اس خلاف معمول تشریف آوری کا کیا مطلب ہے؟ ابھی چند لمحے قبل ہی آپ میرے ساتھ تھے اور آپ نے معمول سے کہیں زیادہ پریشان کیا تھا اور اب آپ پھر میرے پاس موجود ہیں اس ناچیز خادمہ کی رائے میں آپ کو اپنی صحت کے سلسلے میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔''

ملکہ کے ان الفاظ سے بادشاہ کو فوراً احساس ہوا کہ ضرور کسی شخص نے ملکہ کو دھوکا دیا ہے لیکن بادشاہ تھا بڑا زیرک۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ملکہ کی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دے گا کیوں کہ نہ تو ملکہ اس کی اصل حقیقت سے واقف تھی اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص اس نابکار کے سوا جس نے یہ حرکت کی تھی وہ ہی اس سے واقف تھا۔

بادشاہ کی جگہ کوئی اور بے وقوف شخص ہوتا تو ایسا کبھی نہ کرتا۔ بلکہ ملکہ پر طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا۔ مثلاً ''میں تو یہاں نہیں آیا تھا پھر کون تھا وہ، کہاں گیا وہ؟ یہاں کس طرح داخل ہوا وغیرہ وغیرہ۔''

ان سوالات سے نہ صرف یہ کہ ملکہ بلاوجہ پریشان ہوتی بلکہ جس لطف سے وہ چند لمحے قبل روشناس ہو چکی تھی اسے بار بار حاصل کرنے کی سبیلیں نکالتی۔ اس طرح بادشاہ نے عالی ہمتی اور دانائی سے کام لے کر خود کو اور ملکہ کو ذلت و رسوائی سے بچا لیا لیکن اس وقت جس خوش دلی اور عاشقانہ انداز میں وہ ملکہ سے باتیں کر رہا تھا اس سے کہیں زیادہ غم و غصہ اس کے وجود میں سرایت کرتا جا رہا تھا جسے وہ اپنے الفاظ اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کہنے لگا۔

''تو کیا ہم ایک مرتبہ تمہاری قربت حاصل کر کے دوبارہ تمہارے پاس نہیں آ سکتے؟''

''اے ذی وقار بادشاہ۔'' ملکہ نے لرزتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات نہیں۔ بادشاہ شیر دل کا تمیز ہو لیکن اسے اپنی صحت کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔''

''تو یوں کہو نا۔'' بادشاہ نے کہا۔ ''میری جانا! ہم تمہارے اسیر ہیں تمہارا مشورہ ہم آنکھ بند کر کے ماننے کو تیار ہیں۔'' اور یہ کہہ کر وہ ملکہ کو ہاتھ لگائے بغیر جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا۔

بادشاہ اس واقعے کے بعد اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ غصے سے اس کا برا حال تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خفیہ طور پر اس شخص کا پتا چلا کر ہی رہے گا جس نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس نے اس بات کا تو اندازہ لگا ہی لیا تھا کہ وہ نابکار محل ہی کے افراد میں سے ایک ہے اور وہ جو کوئی بھی ہو ابھی زیادہ دور نہ گیا ہو گا اس لیے اس نے ایک چھوٹی سی لالٹین روشن کی اور اس کی مدھم روشنی کی مدد سے شاہی اصطبل کے اوپر بنے ہوئے کمرے میں جا پہنچا جہاں اس کے خادموں کی بڑی تعداد

ہوا کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مجرم کا دل اس وقت بھی بڑی تیزی سے دھڑک رہا ہوگا اور اس کی نبض بہت تیز چل رہی ہوگی اور یہی وہ دو چیزیں تھیں جن کی مدد سے وہ اب محل کے تمام افراد کو ٹٹولنا چاہتا تھا۔ اس لیے ایک سرے سے دوسرے سرے تک وہ تمام سوتے ہوئے افراد کی نبضیں ٹٹولتا اور سینے پر کان رکھ کر دل کی دھڑکنیں سنتا چلا گیا۔

کمرے میں ہر شخص سو رہا تھا۔ سوائے سائیس کے جو ابھی ابھی ایک "خطرناک مہم" سے واپس لوٹا تھا۔ اس نے بادشاہ کو جب کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو لرز اٹھا۔ وہ سمجھ گیا کہ بادشاہ آج خلاف معمول جب اس کمرے میں آیا ہے تو اس کا سبب سوائے خود اس کی تلاش کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اسے پسینا آگیا اور اس کے دل کی دھڑکنیں جو پہلے ہی کافی تیز تھیں کچھ اور بڑھ گئیں۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل اچھل کر اس کے حلق میں اٹک آیا ہو۔ خطرہ بہت قریب تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر بادشاہ نے اسے پہچان لیا تو اس کی موت یقینی ہے۔ اس کے ذہن میں خطرے سے نمٹنے کے لیے بہت سی باتیں آئی رہیں اور بجلی کے کوندوں کی طرح معدوم ہوتی رہیں اور جب بادشاہ قریب آیا تو لالٹین کی مدھم روشنی میں بادشاہ نے دیکھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ بادشاہ کو اس حالت میں دیکھ کر سائیس کو قدرے اطمینان ہوا اور اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ خود کو سوتا ہوا ظاہر کرے اور دیکھے کہ بادشاہ کرتا کیا ہے؟"

اب تک بادشاہ نے جتنے آدمیوں کی دل کی دھڑکنوں کا معائنہ کیا تھا ان کے متعلق اس کی رائے یہی تھی کہ ان میں کوئی بھی مجرم نہ تھا لیکن جب وہ سائیس کے قریب آیا تو وہ اس کے دل کی غیر معمولی دھڑکن پر حیران رہ گیا۔

"او وہ یہی وہ منچلا شخص ہے۔" اس نے دل میں کہا۔

بادشاہ اس حادثے کی اطلاع کسی اور شخص کے کانوں تک نہیں پہنچنے دینا چاہتا تھا لہٰذا اس نے قینچی نکالی اور سائیس کے سر کے ایک طرف کے بال کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیے تاکہ صبح مجرم کو پہچان سکے اور وہ اسے دربار میں بلا کر مناسب طور پر سزا دے سکے۔ اس زمانے میں مرد لمبے لمبے بال رکھا کرتے تھے۔

یہ کارروائی کرنے کے بعد بادشاہ اپنے کمرے کی طرف لوٹ گیا۔

سائیس بھی چالاک تھا اس نے بادشاہ کی ایک ایک حرکت اچھی طرح دیکھ لی تھی اور سمجھ گیا تھا کہ بال کاٹنے کا مطلب کیا ہے۔ کمرے میں گھوڑوں کے بال کاٹنے کی بہت سی قینچیاں موجود تھیں چنانچہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ اٹھا۔ ان میں سے ایک قینچی لی اور بالکل اسی طرح جس طرح بادشاہ نے اس کے بال کاٹے تھے۔ اس نے تمام سوتے ہوئے لوگوں کے سر کنپٹیوں پر سے صاف کردیے اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنے بستر پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

صبح ہوتے ہی بادشاہ نے حکم جاری کردیا کہ محل کے تمام خدام محل کے دروازے کھلنے سے پہلے اس کی خدمت میں ننگے سر حاضر ہوں اور جب تمام خدام ننگے سر اس کے سامنے کھڑے ہوگئے تو اس نے اس شخص کو پہچاننا چاہا جس پر رات اس نے نشان لگایا تھا۔ اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ تمام خادموں کے سروں کے بال بالکل اس طرح صاف ہیں جس طرح اس نے ایک نوکر کے بالوں کو صاف کیا تھا۔ بادشاہ پریشان ہوگیا۔ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ "جس شخص کی مجھے تلاش ہے یوں تو وہ بہت بدطینت ہے لیکن ہے ذہین۔"

اسے اندازہ ہوگیا کہ ایسے شخص کا سراغ لگانے کے لیے بڑی چھان بین کی ضرورت ہوگی اور چھان بین کے نتیجے میں یہ راز بھی افشا ہوسکتا ہے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک معمولی کمینہ خصلت انسان سے ایک چھوٹا سا انتقام لے کر اتنی بڑی رسوائی مول لے۔ اس نے طے کیا کہ اسے تنبیہ کردی جائے اور اسے یہ بتا دیا جائے کہ اسے پہچانا جاچکا ہے۔ لہٰذا اس نے کہا۔

"جس شخص نے یہ حرکت کی ہے آئندہ اسے دہرانے کی جرأت نہیں ہونی چاہیے۔ بس اب تم اطمینان سے جاسکتے ہو۔"

بادشاہ کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ان سب کو تحت اذیت دیتا۔ تحقیقات کراتا۔ ان سے سوالات کرتا اور ان تمام کارروائیوں کے بعد نتیجہ کیا ہوتا؟ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ایک ایسی بات جسے راز میں رہنا چاہیے چاروں طرف پھیل جاتی۔

جن خدام نے بادشاہ کے یہ الفاظ سنے تھے وہ عرصے تک ان کا مطلب نکالنے کی کوشش میں لگے رہے اور کچھ نہ سمجھ سکے لیکن خود سائیس جس کے لیے یہ الفاظ ادا کیے گئے تھے سب کچھ سمجھ چکا تھا اور اس کے صبر و ضبط کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس نے پھر زندگی میں نہ تو ایسی دوبارہ جسارت کی اور نہ اس راز پر سے پردہ اٹھنے دیا۔

◆◆◆

اکتوبر

منظر امام

عیسوی سال کے دسویں مہینے میں یوں تو بے شمار قابل ذکر واقعات گزرے ہیں لیکن اس بار صرف چند ایک نہایت اہم واقعات کو احاطۂ تحریر میں لارہا ہوں۔

معلومات کے شائقین کی ضروریات، توقعات

جولین اور جارجین کلینڈر کے مطابق سال کا دسواں مہینا 31 دنوں کا ہوتا ہے۔ جب کہ رومن کلینڈر میں یہ آٹھواں مہینا تھا۔ لاطینی میں اسے octo یعنی آٹھ کہتے تھے۔ اس مہینے زمین کے شمالی حصوں میں خزاں اور جنوبی حصوں میں بہار ہوتی ہے۔ عام طور پر اکتوبر اسی دن سے شروع ہوتا ہے جس دن سے جنوری اور اسی دن ختم ہوتا ہے جس دن فروری۔

نیپال میں dashcin زے منایا جاتا ہے۔ دنیا

کے دوسرے حصوں میں اسے halloween day
بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک بہت قدیم رسم ہے۔ caltic
تہذیب میں اس تہوار کی خاص اہمیت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ
ان کے آباؤ اجداد کی ارواح اس دن جمع ہوتی ہیں اور اپنی
پسند کی چیزیں طلب کرتی ہیں اس لیے بہت سی قربانیاں دی
جاتی تھیں۔ caltic تہذیب سے یہ رسم عیسائیوں میں
آئی۔ اب فیشن کے طور پر منائی جاتی ہے۔ طرح طرح کے
بھیس بدلے جاتے ہیں۔ روحوں کا سوانگ رچایا جاتا ہے۔

پہلی اکتوبر کو یونان میں یوم آزادی منایا جاتا ہے اور
2 اکتوبر کو ہندوستان میں گاندھی جی کا جنم دن۔ اس تاریخ
کو پوری دنیا میں عدم تشدد کا دن منایا جاتا ہے۔ 3 اکتوبر کو
جرمن میں جرمن یونٹی ڈے ہوتا ہے۔ یہ وہ دن ہے جب
مشرقی اور مغربی جرمنی دیوار برلن گرا کر ایک ہو گئے تھے۔ یہ
دیوار روس نے کھڑی کی تھی۔

پرتگال میں پرتگالی ری پبلک کا دن۔ انٹرنیشنل ورلڈ
نیچر ڈے۔ مصر میں مسلح افواج کا دن۔ 6 اکتوبر کو جنگ یوم
کپور اسے عرب اسرائیل جنگ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ 6
اکتوبر سے 26 اکتوبر 1973ء کے درمیان مصر و شام کے
عرب اتحاد اور اسرائیل کے درمیان لڑی گئی تھی۔ اس جنگ
کا آغاز یہودیوں کے تہوار یوم کپور پر ہوا۔ اس لیے کپور کی
جنگ بھی کہتے ہیں۔ اس جنگ کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ
1967ء سے اسرائیل نے جزیرہ نما سینا اور گولان کی
پہاڑیوں پر قبضہ کر کے نہر سوئز کو بند کر دیا تھا۔ نہر سوئز مصر کی
ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس کی معیشت کا دارومدار اسی نہر پر
ہے۔ اس نہر کو مصر میں ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے لیکن یہ
نہر اسرائیل کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بند پڑی ہوئی تھی اور
مصر کٹ کر رہ گیا تھا۔ اسے اپنی بقا کے لیے سعودی عرب،
لیبیا اور کویت وغیرہ کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔

اس صورت حال کے پیش نظر مصر اور شام نے جزیرہ
نما سینا اور گولان کی پہاڑیوں پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں
اگرچہ اسرائیل کی پوزیشن مضبوط رہی تھی۔ اس کے باوجود
معاہدے کے مطابق اسے وہ علاقے واپس کرنے پڑے
تھے جن پر اس نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ جزیرہ نما سینا کے
ڈھائی ہزار مربع میل کے علاقے سے بھی محروم ہو گیا۔

اس زمانے میں مصر کا قومی دن 23 جولائی کو ہوا کرتا
تھا لیکن صدر انور السادات نے اس جنگ کی یادگار کے طور
پر یہ دن 16 اکتوبر کو کر دیا۔

12 اکتوبر کو نیشنل ڈے آف اسپین ہے۔ اسی تاریخ
کو کولمبس نے امریکا کو دریافت کیا تھا اسی خوشی میں یہ دن
منایا جاتا ہے۔

اسپین میں اس دن کو fiesta nacional
de espana کہتے ہیں جب کہ دوسرے ملکوں میں
کولمبس ڈے کہلاتا ہے۔ کولمبس 1492ء میں امریکا پہنچا
تھا۔ اس دن اسپین میں خوب جشن ہوتا ہے۔ میڈرڈ میں
ایک شاندار فوجی پریڈ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

کینیڈا میں اکتوبر کے دوسرے سوموار کو
thanks giving day منایا جاتا ہے۔

جاپان میں ہیلتھ اور اسپورٹس ڈے بھی اکتوبر کے ہر
دوسرے سوموار کو منایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ امریکا کے کئی
علاقوں میں کولمبس ڈے بھی ہر دوسرے سوموار (اکتوبر) کو
مناتے ہیں۔ 15 اکتوبر کو ہونے والی ماؤں اور شیر خوار
بچوں کی حفاظت کا دن ہوتا ہے۔ 16 اکتوبر کو ورلڈ فوڈ ڈے
ہوتا ہے۔ 18 اکتوبر کو الاسکا ڈے ہوتا ہے۔

اس تاریخ کو امریکی ریاست الاسکا میں سرکاری
تقریب ہوا کرتی ہے۔ 18 اکتوبر 1867ء میں یہ علاقہ
روس سے امریکا کو منتقل کر دیا گیا تھا۔ امریکا نے روس سے
یہ علاقہ باقاعدہ خریدا تھا۔ یہ معاہدہ مارچ 1867ء میں
7.2 امریکی ڈالر میں ہوا تھا۔ پھر اکتوبر میں یہ باقاعدہ طور
پر امریکا کو منتقل ہو گیا۔ سٹ کا کے قلعے میں روسی افواج
نے اپنا جھنڈا اتار لیا تھا اور امریکا کا پرچم لہرا دیا گیا تھا۔

19 اکتوبر کو آئرن کا دن منایا جاتا ہے۔

20 اکتوبر کو spirit day ہوتا ہے۔ اس تاریخ
کو دنیا کے بہت سے ملکوں میں بچے رنگ برنگی قبائیں پہن کر
آتے ہیں اور اپنے آپ کو اسپرٹ یعنی روح سے ظاہر کرتے
ہیں۔ 21 تاریخ کو ایپل ڈے ہوتا ہے۔ 23 اکتوبر کو
ہنگری کے انقلاب کی یاد منائی جاتی ہے۔ 24 اکتوبر کو
uno کا دن ہوتا ہے۔ 1947ء میں یو این او کی جنرل
اسمبلی نے ہر سال 24 اکتوبر کو یو این او ڈے منانے کا اعلان
کیا تھا۔ دنیا کے ہر ممبر ملک میں یہ دن منایا جاتا ہے۔

اس دن دنیا کے حالات اور واقعات پر مذاکرات
ہوتے ہیں۔ ثقافتی پروگرام کیے جاتے ہیں اور دنیا کو بہتر
بنانے کے لیے آئندہ کے منصوبے ہوتے ہیں۔

25 اکتوبر رومانین فوج کا دن۔

26 اکتوبر آسٹریا کا نیشنل ڈے۔

27اکتوبر سینٹ ونسنٹ اور گریناڈا میں آزادی کا دن ہوتا ہے۔

آپ میں سے بہت سے لوگوں نے ان علاقوں کے بارے میں سن رکھا ہوگا، چلیں کچھ تفصیل دے دیتے ہیں۔

ونسنٹ اور گریناڈا ایک بہت چھوٹا ملک ہے۔ یہ ملک بنیادی طور پر جزیروں پر مشتمل ہے۔ یہ امریکا کے قریب بحیرہ کیریبین میں ہے۔ اس کے حقیقی باشندے کچھ اور ہوا کرتے تھے۔ یہ بہادر لوگ تھے۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود انہوں نے بہت عرصے تک مغربی حملہ آوروں کو روکے رکھا تھا۔

اس ملک کا کل رقبہ 389 مربع کلو میٹر ہے اور 2007ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی کل ایک لاکھ دس ہزار تھی۔ اس کا صدر مقام کنگز ٹاؤن ہے۔ یہاں انگریزی بولی جاتی ہے۔ ملکہ الزبتھ دوم کو سربراہ مانا جاتا ہے۔ اس ملک نے 27اکتوبر 1979ء میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی تھی۔

27اکتوبر ہی کو ترکمانستان کا یوم آزادی ہوا کرتا ہے۔ یہاں مسلمان آباد ہیں۔ یہ وسط ایشیا کا ایک اہم ملک ہے۔ 1861ء میں روس نے اس پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی مذہبی آزادی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس ملک کو 27اکتوبر 1991ء میں آزادی حاصل ہوئی تھی۔ اس کی جغرافیائی صورت حال کچھ یوں ہے۔ جنوب مشرق میں افغانستان، جنوب میں ایران، جنوب مغرب میں ازبکستان اور شمال مغرب میں قازقستان ہے۔ دارالحکومت اشک آباد ہے جو ملک کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ یہاں کی زبان ترکمانی ہے۔ اس کا رقبہ 188456 مربع میل ہے اور اس کی آبادی ساٹھ لاکھ کے قریب ہے۔

اس کے برعکس جب ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو فخر بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔ فخر تو اس بات پر ہوتا ہے کہ ہمارا ملک کتنا وسیع اور کتنا بڑی آبادی کا ملک ہے اور افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے رہ گئے۔

29اکتوبر ترکی میں یوم جمہوریہ۔

بادشاہت کے خاتمے کے بعد جب مصطفیٰ کمال پاشا نے 29اکتوبر 1923ء میں اعلان کیا کہ ترکی آج سے جمہوریہ ترکی ہوگا تو اسی دن سے یہ دن منایا جانے لگا ہے۔

اب ہم تاریخ وار اکتوبر کا جائزہ لیتے ہیں۔

کیم اکتوبر 1908ء میں ہنری فورڈ نے ماڈل T متعارف کروایا تھا۔

1870ء میں پیٹر وان کی پیدائش ہوئی۔ یہ ہالینڈ کی فوج کا آرٹلری آفیسر تھا۔

کیم اکتوبر 1904ء اوٹو فرسٹ کی پیدائش ہوئی۔ یہ شخص ایٹم بم بنانے والی ٹیم کا ایک اہم رکن تھا۔

1916ء میں ہنگری کے نابجر ونج کی پیدائش ہوئی۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور ٹیکسٹائل ڈیزائنر تھا۔ اس نے شہزادی الزبتھ کی شادی کا ڈریس تیار کیا تھا۔ 1957ء میں مشہور پرنٹ ٹیلیگو متعارف کروایا۔ بے شمار اعزازات سے نوازا گیا۔

کیم اکتوبر 1931ء میں رجنالڈ بال کی پیدائش ہوئی۔ یہ شخص تھائی رائڈ اور غدود کی دوسری بیماریوں کے علاج کا ماہر تھا۔

کیم اکتوبر 1959ء میں روڈ اسٹرسنگ کی نوائے لائٹ زون کی پہلی قسط رجسٹر ہوئی تھی۔

کیم اکتوبر 1989ء میں پاکستان کی دوبارہ کامن ویلتھ میں شمولیت۔

کیم اکتوبر 2005ء مشہور محقق اور ادیب جناب شان الحق حقی کا ٹورنٹو میں انتقال ہوا۔

2اکتوبر 1950ء میں pea nuts comic strip کی پہلی اشاعت۔

2اکتوبر 1932ء برطانوی انتھراپولوجسٹ ایڈورڈ برنٹ کی پیدائش۔ اس شخص نے انتھراپولوجیکل سائنس میں کام کیا اور کئی برسوں کی محنت کے بعد آخرکار انسانوں میں ایک ذہنی خرابی animism کا سراغ لگایا۔

2اکتوبر 1852ء میں ولیم رام سے کی پیدائش ہوئی۔ اس نے نیون گیس دریافت کی تھی۔

1891 ہنری زان لوورز کی پیدائش۔ اس شخص نے باسکٹ بال کے لیے ایک خاص قسم کا سوئچ بورڈ بنایا تھا۔

2اکتوبر 1907ء میں برطانوی بایو کیسٹ ہنری وان کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1957ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

2اکتوبر 1907ء ہی میں اسکاٹ لینڈ کا ایک بایو کیسٹ پیدا ہوا۔ اس نے انسانوں پر موروثی اثرات پر ریسرچ کی اور 1957ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

2اکتوبر 1914ء امریکی راکٹ سائنس داں جیک پرسا کی پیدائش۔

12 اکتوبر 1963ء میں مارٹن لوتھر کنگ کی مشہور تقریر "میرے خواب" کاپی رائٹ ہوئی۔

تین اکتوبر 1982ء میں سونی کمپنی نے پہلا compact ڈسک ریکارڈ پلیئر متعارف کروایا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں مارکیٹ بنالی تھی۔

1906ء میں مشہور سگنل s.o.s متعارف ہوا۔

s.o.s ایک مدد کوڈ سگنل ہے۔ اس کا استعمال پہلی بار 1905ء میں جرمنوں نے کیا تھا اور اسے بین الاقوامی طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ s.o.s کا مطلب ہے ہمارے جہاز کو بچاؤ یا ہمیں بچاؤ۔ یہ کوڈ جنگ کے دوران میں بہت استعمال ہوا اور کام آیا۔

13 اکتوبر 1803ء میں جان گورے کی پیدائش ہوئی۔ اس نے ریفریجریٹر کو ٹھنڈا رکھنے کا سسٹم بنایا تھا۔

13 اکتوبر 1844ء میں پیٹرک مینسن کی پیدائش۔ اس شخص کو ادویہ سازی کا لارڈ کہا جاتا ہے۔

13 اکتوبر 1854ء کو ولیم گراگورز کی پیدائش ہوئی۔ یہ امریکی سرجن جنرل تھا۔ اس نے زرد بخار yellow fewer کے لیے بہت کام کیا۔

1904ء میں برطانوی بائیوکیمسٹ چارلس ہیڈرسن کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1987ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

13 اکتوبر کو شاکلے بارڈین اور براٹین نے ٹرانسسٹر کو پیٹنٹ کرایا تھا۔

چار اکتوبر اسپوتنک اوّل خلا میں گیا۔ 1953ء میں اسپوتنک اوّل زمین کے مدار میں چھوڑا گیا۔ یہ پہلا مصنوعی سیارہ تھا جسے سوویت اتحاد نے 14 اکتوبر 1952ء کو زمین کے مدار میں 250 کلومیٹر بلندی پر بھیجا تھا۔ اس کا مقصد زمین کی فضائی معلومات حاصل کرنا تھا۔ تین ماہ بعد یہ زمین پر واپسی کے دوران میں جل کر مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا۔

14 اکتوبر 1832ء میں ولیم گرگس کی پیدائش ہوئی۔ اس نے فوٹو کرومیٹو گرافی ایجاد کی۔

14 اکتوبر 1949ء میں چاینا ٹیڈ کے لیے ایک انچ بالوبنگ منظور ہوئی۔

1905ء میں رے کراک کی پیدائش ہوئی۔ یہ شخص مشہور فاسٹ فوڈ چین میکڈونلڈ کا ماسٹر مائنڈ کہلاتا ہے۔ پیدائش 15 اکتوبر 1905ء ہے جب کہ اس کا انتقال 14 جنوری 1984ء کو ہوا تھا۔ یہ امریکی بزنس مین تھا۔

1954ء میں میکڈونلڈ میں شامل ہوا اور اسے دنیا بھر کا سب سے کامیاب فاسٹ فوڈ چین بنا دیا۔

اس کی کامیابی اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ٹائم میگزین نے اسے اس صدی کی دنیا کی سو بڑی شخصیات میں شامل کیا ہے لیکن اس نے کامیابی اپنی عمر کے آخری حصے میں دیکھی۔ جب یہ پچاس سے اوپر کا ہو چکا تھا اور کامیابی کا لطف نہیں اٹھا پایا تھا۔

5 اکتوبر 1713ء۔ فرانسیسی محقق ڈینس ڈیڈیرٹ کی پیدائش ہوئی۔ اس محقق نے انسائیکلوپیڈیا کی تدوین اور ترتیب میں بہت کام کیا ہے۔

پانچ اکتوبر 1864ء کو لوئیس لوئز کی پیدائش ہوئی۔ اس نے کیمرے کے سامان تیار کیے اور فلم دیکھنے کے لیے پروجیکٹر بنایا۔

15 اکتوبر کو پاکستان اور بنگلا دیش اپنے سیاسی جھگڑے طے کرنے پر راضی ہوئے تھے۔

چھ اکتوبر 1889ء میں ایڈیسن نے پہلی متحرک فلم دکھائی۔

1876ء امریکن لائبریری ایسوسی ایشن کا قیام ہوا۔

1824ء ہنری چاڈوک۔ بیس بال کا کھلاڑی جس نے اس کھیل کے لیے اصول وضع کیے۔

1866ء ریجنالڈ فیسن ڈین۔ ایک موجد۔ اس شخص نے پہلی مرتبہ ریڈیو کے آلے سے کام لے کر موسیقی کا پروگرام نشر کیا۔

1918ء میں ابراہام روبن سن کی پیدائش ہوئی۔ یہ جرمن کا ریاضی داں تھا۔

16 اکتوبر 1940ء کو جان ریمارناک کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک امریکی سائنس داں تھا۔

16 اکتوبر 1941ء کو چیسٹر کارلسن نے الیکٹرک فوٹو گرافی متعارف کروائی جس کو آج فوٹو کاپنگ کہا جاتا ہے۔

16 اکتوبر 1955ء پاکستان میں اس وقت کے گورنر جنرل غلام محمد نے استعفیٰ دے دیا۔

16 اکتوبر 1988ء کو چھ سیاسی جماعتوں کا اتحاد ہوا۔ چونکہ ملک میں عام انتخابات کے لیے تیاریاں زوروں پر تھیں۔ لہٰذا پیپلز پارٹی کے مقابلے میں کامیابی کے لیے 16 اکتوبر 1988ء کو [illegible] کی آٹھ سیاسی و مذہبی جماعتوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کی تشکیل دینے کا اعلان کیا۔ ان میں نیشنل پیپلز پارٹی، جمعیت المشائخ، ضرب جہاد،

مسلم لیگ (فدا گروپ) جمعیت العلمائے اسلام (درخواستی گروپ)، آزاد گروپ، نظام مصطفیٰ گروپ بعد میں جماعت اسلامی بھی ان میں شامل ہو گئی تھی۔ یہ اتحاد IJI کہلایا تھا۔

16 اکتوبر 1993ء انتخابات، پیپلز پارٹی نے مسلم لیگ کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔

1957ء میں امریکن بینڈ اسٹینڈ کا افتتاح ہوا۔ یہ ایک مشہور امریکن میوزک گروپ ہے جو عام مجمعوں پر پرفارمنس دیا کرتا تھا۔ 1959ء سے 1989ء تک پورے ملک میں موسیقی کے سُر بکھیرتا رہا۔ اس کو چلانے والے باب بارن، ولیم اسٹیوارٹ اور ڈک کلارک وغیرہ تھے۔

1927ء میں اسکاٹ لینڈ کے مشہور سائیکولوجسٹ آر ڈی لینگ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے ذہنی امراض اور سائیکوسس پر کام کیا اور کتابیں لکھیں۔

17 اکتوبر 1975ء کو marliner نے گھٹنوں کے جوڑوں کو بدلنے کا سسٹم پیٹنٹ کرایا۔

17 اکتوبر 1954ء کو وزیر خارجہ ظفر احمد خان انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے ممبر منتخب ہوئے۔

17 اکتوبر 1958ء کو ایوب خان نے ملک میں مارشل لا نافذ کیا۔

8 اکتوبر 1917ء میں برطانوی بائیوکیمسٹ روڈنی پورٹر کی پیدائش ہوئی۔ اس نے میڈیسن میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

8 اکتوبر 2005ء پاکستان کی تاریخ کا ایک بھیانک دن۔ کشمیر اور kpk میں ایک خطرناک زلزلہ آیا۔ اس زلزلے نے علاقے کے علاقے ملیامیٹ کر دیے۔ اندازے کے مطابق ہزاروں افراد اس زلزلے میں ہلاک ہوئے تھے۔ اس زلزلے کی شدت ریکٹر اسکیل پر 7.6 تھی۔

حکومتی اعداد و شمار کے مطابق جاں بحق ہونے والوں کی تعداد 74 ہزار تھی۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق تیس ہزار مربع کلومیٹر سے زائد رقبے پر پھیلنے والی تباہی سے بے گھر ہونے والوں کی تعداد پچاس لاکھ سے زائد تھی۔

نو اکتوبر 1873ء میں جرمن فزسٹ ہرکارل شوانہ کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے آئن اسٹائن کے مشہور فیلڈ ایکویشن کا صحیح حل دریافت کیا تھا۔

نو اکتوبر 1876ء میں پہلی بار کسی فون پر دو طرفہ

جبیل

خلیج فارس کے کنارے سعودی عرب کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ، جو جبیل کے نام سے بھی مشہور ہے۔ جبیل ربع الخالی کے شروع ہی میں واقع ہے جو ریاض کی طرف جانے والی ایک کاروانی گزرگاہ اور موزوں راستہ ہے۔ قبیلہ آل بوعینین کے افراد دعوے کرتے ہیں کہ اس مقام پر ان کے جد امجد خویلد بن عبداللہ بن وارم آباد ہوئے تھے اور اس کا جبیل نام وہاں کے دو بہتے ہوئے چشموں کی وجہ سے پڑا تھا۔ ایک روایت کے مطابق کسی وقت یہاں پر قبیلہ عبدالقیس بھی سکونت پذیر تھا۔ اوائل اسلامی عہد میں یہ علاقہ اپنے کھجور کے درختوں کی وجہ سے خوب مشہور تھا۔ موجودہ شہر 1330ھ/1911ء کے قریب آل بوعینین کے افراد سے آباد تھا جو ایک مقامی جھگڑے کی بنا پر ترک حکام کی اجازت سے قطر سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ یہ لوگ مسلکاً مالکی تھے اور صدف گیری یا دوسرے پیشوں سے گزر بسر کرتے تھے۔ 1331ھ/1913ء میں جب سلطان عبدالعزیز السعود نے الحسا حاصل کیا تو جبیل سعودی حکومت میں شامل ہو گیا۔ 1334ھ/1916ء کے صلح نامے کی رو سے جب برطانیہ نے سلطان عبدالعزیز کا قبضہ تسلیم کر لیا تو یہ قبضہ باقاعدہ طور پر سعودی عرب کا علاقہ سمجھا جانے لگا۔ شروع شروع میں جبیل وسطی عرب میں بھیجے جانے والے سامان کے لیے ایک درآمدی بندرگاہ بن گئی۔ دمام میں بندرگاہ و ریل اور سڑکوں کا مرکز بن جانے سے جدید رسل و رسائل میں ترقی ہوئی تو اس کی اہمیت کم ہو گئی۔

مرسلہ: نثار حفیظ۔ ملتان

بات چیت ہوتی تھی۔ رابطے کی فیلڈ میں یہ بہت بڑا کارنامہ تھا اور اب تو بچہ بچہ بھی موبائل لیے گھومتا رہتا ہے۔

نو اکتوبر آئزک سنگر نے اپنی سلائی مشین متعارف کروائی (سنگر سلائی مشین)۔ اس مشین کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ سلائی مشین کا نام آتے ہی ذہن میں سنگر کا نام آجاتا ہے اور آج بھی اس کمپنی کی سلائی مشین کروڑوں کی تعداد میں پوری دنیا میں موجود ہیں۔ سلائی مشین کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ بھی ہے۔ پہلی سلائی مشین ابتدائی حالت میں 1830ء میں فرانس کے برتھ لیمی نے بنانے کی کوشش کی تھی۔ پیرس کے درزیوں کو جب پتا چلا تو انہوں نے اس بے چارے پر حملہ کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شخص ان کی روزی پر لات مار رہا ہے۔ اس کو اتنا مارا کہ وہ بری طرح زخمی ہو گیا اور اس قسم کے تجربے سے کانوں کان پکڑ لیے۔

دس اکتوبر 1942ء میں جیمز مارشل کی پیدائش ہوئی۔ انگلینڈ میں ہنری کیونڈش کی 1731ء میں۔ سویڈن کے ماہر نباتات ارک کی پیدائش 1752ء میں ہوئی۔

10 اکتوبر 1911ء میں ہنری فورڈ نے اپنے آٹو موبائل ٹرانسمیشن سسٹم کے لیے پیٹنٹ حاصل کیا۔

10 اکتوبر 2002ء میں عام انتخابات پاکستان میں ہوئے۔ اس میں کوئی بھی جماعت واضح اکثریت حاصل نہ کرسکی کہ حکومت سازی کرسکے۔ لہٰذا جوڑ توڑ کی سیاست کا آغاز ہو گیا۔ البتہ اس انتخابات کے نتیجے میں تقریباً تمام قابل ذکر جماعتوں کو قومی اسمبلی کے ایوان میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ لہٰذا سردار فاروق احمد خان لغاری، عمران خان اور علامہ طاہر القادری بھی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔

گیارہ اکتوبر 1821ء میں برطانوی سوشل ورکر جارج ولیم نے ymca قائم کی۔ یہ ادارہ پوری دنیا میں قائم ہے۔ اس کا پورا نام the young man christian association ہے۔ اس کے تین بڑے مقاصد تھے۔ صحت: جسم کے لیے۔ صحت: ذہن کے لیے اور صحت روح کے لیے۔ یہی اس ادارے کا منشور ہے۔

11 اکتوبر 1884ء کو جرمن کیمسٹ فریڈ رچ کی پیدائش ہوئی اس نے براؤن کوئلے سے بین زائن (ایک عنصر) الگ کیا اور نوبل انعام حاصل کیا۔

11 اکتوبر 1841ء میں جان رینڈ نے ایک ٹیوب متعارف کروایا۔ جو آج کل ہر گھر میں ہوتا ہے۔ جی ہاں یہی وہ ٹیوب ہے جس میں ٹوتھ پیسٹ ہوا کرتا ہے۔

12 اکتوبر کو میکسیکو میں کسانوں کا دن ہوتا ہے۔ اسے dia de laraza کہا جاتا ہے۔ میکسیکو میں قدیم زمانے سے کسانوں کے یہاں ایک قبیح رسم چلی آرہی تھی۔ اب تو یہ رسم متروک ہو گئی ہے لیکن آپ کی دلچسپی کے لیے کہہ رہا ہوں کہ اندازہ لگائیں کہ اس دنیا میں کیا کیا رسومات ہوا کرتی ہیں۔ میکسیکو کے لوگ مردوں کے علاوہ بارہ یا تیرہ سال کی معصوم بچیوں کو بھی مکئی کی دیوی کا خطاب دینے کے بعد قتل کر دیتے تھے۔ ان لوگوں کی مکئی کی دیوی کا نام چیکو مسکو پائل تھا۔ وہ اس بچی کو مکئی سے بنے زیورات پہنانے، یہ تہوار مکئی کی فصل پکنے پر منایا جاتا تھا۔ وہ معصوم بچی کو ان زیورات کے ساتھ سارا دن گلیوں میں لیے پھرتے۔ وہ بھوک اور افلاس کے مارے لوگوں کو فصل پکنے کی خوشی میں ناچ گا کر خوش کرتی۔ وہ لوگ ان ایام میں روزے بھی رکھتے تھے۔ شام کے وقت جامہ کو لالٹینوں کی روشنی سے منور کیا جاتا اور تمام لوگ وہاں اکٹھے ہو جاتے۔ آدھی رات کے وقت موسیقی کا پروگرام شروع ہو جاتا جو ساری رات جاری رہتا۔ اس دوران مختلف اقسام کے بیجوں سے بھرا ایک لکڑی کی اس الماری کے سامنے لایا جاتا جس میں لکڑی سے بنی مکئی کی دیوی رکھی ہوئی مورتی کے حضور تمام لوگ مختلف اجناس کے نذرانے پیش کرتے۔ راہبوں کا ایک جلوس مشعلیں لیے معبد میں داخل ہوتا۔ ان کے درمیان دیوی کے بھیس میں معصوم بچی ہوتی۔ مظلوم بچی کو نذرانوں کے ڈھیر پر کھڑا کر دیا جاتا اور لڑکی کو اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکانے کو کہا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی موسیقی کا شور تیز ہو جاتا۔ راہب نذرانے لے کر لڑکی کے گرد چکر لگاتا۔ اس ہنگامے میں ایک تیز دھار خنجر ہاتھ میں اٹھائے کر آگے بڑھتا اور لڑکی کے سر پر بندھے مکئی کے پتوں کو بالوں سمیت کاٹ لیتا۔ یہ بال اور پتے مورتی کے حضور پیش کیے جاتے۔ اس کے ساتھ ہی اچھی فصل کی خواہش میں سب لوگ دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیتے۔ وہ دیوی سے التجائیں کرتے، دعائیں مانگتے، اس کی پوجا کرتے۔ اس تقریب کے اختتام پر اس لڑکی کو نذرانوں کے ڈھیر سے نیچے اتار لیا جاتا اور رات کا باقی حصہ لڑکی کی نگرانی میں گزار دیتے۔ اگلے دن پھر تمام لوگ معبد میں اکٹھے ہو

جاتے۔ راہب لڑکی کو دیوی کے لباس میں سب کے سامنے لاتا اور اسے ہاتھوں کا سہارا دے کر کٹہرے میں کھڑے ہونے کا حکم دیتا۔ چند راہب مل کر کٹہرے کو اپنے سروں پر اٹھا لیتے اور اسے ریوتا "پنڑ یلو پر چلی" کے دو یا دو ہال کا چکر لگا کر واپس نذرانوں کے ڈھیر کے پاس لے آتے۔ موسیقی دوبارہ شروع ہو جاتی۔ پھر مرد اور عورتیں اپنے اپنے کانوں کا ایک حصہ کاٹ کر کنکی کی دیوی کے حضور خون کا نذرانہ پیش کرتے۔ تقریب کے بعد تمام لوگ خوشی خوشی اپنے گھروں کو لوٹ جاتے اور ضیافت تیار کرتے۔ ضیافت کے بعد لوگ دوبارہ معبد میں اکٹھے ہو جاتے جہاں کنکی دلہن کی تکفین ہوتی۔ بچی کو پجاری نذرانوں کے ڈھیر پر رکھتا دیتا اور چابک دستی سے اس کی شہ رگ کاٹ دیتا۔ اس کے ابلتے ہوئے خون کو ایک برتن میں جمع کر لیا جاتا اور ہر شخص اس خون کو اپنے چہرے پر لگا لیتا۔ اتنی تفصیل سے اس قبیح رسم بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ دنیا کس قسم کے وحشیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہمیں اپنے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے ایسی رسموں کا خاتمہ کر دیا۔

12 اکتوبر 1860ء میں المبرا کی پیدائش ہوئی۔ یہ شخص کائنز... کپاس کا موجد تھا۔

21 اکتوبر 1923ء امریکی ماہر غذائیات جین ہاٹز کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے وزن جانچنے کا پیمانہ مقرر کیا۔

12 اکتوبر 1972ء میں بے مثال گلوکار اسٹیو ونڈر نے اپنی میوزک اور اپنا مشہور نغمہ you are the sunshino of my life رجسٹر کروایا تھا۔ یاد رہے کہ ونڈر نے 1954ء میں اپنا پہلا نغمہ اس وقت رجسٹر کروایا تھا جب وہ صرف بارہ برس کا تھا۔

پاکستان میں 12 اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کو ہاؤس اریسٹ کروایا۔ یہ ہماری حالیہ تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ بہتر ہے کہ اپنے پڑھنے والوں کو اس کے پس منظر سے بھی آگاہ کر دیا جائے۔ وزیراعظم نواز شریف امریکا میں "اعلان واشنگٹن" معاہدہ کر کے واپس پاکستان آئے تو ملک کے بہت سے حلقے وزیراعظم کے اس اقدام کے حامی نہ تھے کیونکہ وزیراعظم کارگل سے مجاہدین کے انخلا کا معاہدہ کر کے آئے تھے۔

13 جولائی 1999ء کو وزیراعظم میاں نواز شریف نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے اپنے زیر کنٹرول مقبوضہ علاقوں سے نکل آنے کی اپیل کی۔ وزیراعظم نے یہ بھی کہا کہ میں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ میں ڈپلومیسی کو ایک اور موقع دینا چاہتا ہوں اور یہ فیصلہ جلدی اور نہ ہی کسی دباؤ کے تحت کیا گیا ہے۔ میاں نواز شریف کے اس اقدام سے وزیراعظم اور فوج کے درمیان بداعتمادی کی فضا پیدا ہو گئی۔ عسکری حلقے وزیراعظم سے ناراض تھے۔ اس کے علاوہ کشمیریوں میں بھی اعلان واشنگٹن سے تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ آل پارٹیز حریت کانفرنس کے سیکریٹری جنرل غلام محمد نے سوئیڈش انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی گجرات میں پرجوش انداز میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مقبوضہ کشمیر میں لگائی گئی آگ کو مجاہدین بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ آگ بہت زیادہ ہے۔

یروشلم

بیت المقدس کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں اس لفظ کا مطلب "امن" تھا۔ بعد میں خیال کیا گیا کہ شلم (خدا) کے مفہوم میں آتا ہے۔ اس کی مقدس حیثیت سے کسی کو انکار نہیں۔ یہ مسلمان، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے مقدس حیثیت کا حامل ہے۔ اس کی اسی حیثیت نے اس کے سینے پر متعدد جنگوں کے نشان رقم کیے۔ قدیم شہر کے گرد ڈھائی میل لمبی دیوار تھی۔ تاریخی اعتبار سے شہر قدیم شہروں میں شمار ہوتا ہے جو پتھروں کے زمانے میں بھی قبل انسانی زندگی کے آغاز کے مراحل تک پہنچتی ہے۔ 1400 ق م میں جوشا کی فتح سے قبل یہ شہر مصر کا تھا جب یہودیوں نے علاقے کو اپنے کنٹرول میں لیا تو یہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ یہودہ اور بنجمن۔ 790 ق۔م میں اسرائیل کے بادشاہ نے یروشلم پر قبضہ جما لیا اور دیواروں کو گرا ڈالا جنہیں بعد میں اماز یہ کے بیٹے ازسب نے از سر نو تعمیر کیا۔ 586 ق م میں یروشلم بابل کے بادشاہ بنوشد نزار کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ فاتح نے یہودیوں کو ملک بدر کیا جنہیں بعد میں فارس کے بادشاہ سائرس نے 538 ق م میں دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ یروشلم کی تمام تر حیثیت اس کی عسکری حیثیت کی وجہ سے بھی ہے کہ یہ مشرق وسطیٰ میں مرکزی مقام رکھتا ہے۔

مرسلہ: نیاز جوکھیو، سکھر

جسے بجھانے کے لیے فائر بریگیڈ کی ضرورت ہے اور ہماری فائر بریگیڈ پاکستانی فوج ہے۔ خدا کی قسم یہ فائر بریگیڈ آگ بجھانے کی غرض سے ہمارے گھروں کے نزدیک آگیا تھا مگر وزیراعظم نواز شریف نے اسے واپس جانے کا حکم دے دیا (یہ تقریر ریکارڈ پر ہے)۔ میاں نواز شریف کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ عسکری حلقے ان کے اس اقدام سے خوش نہیں ہیں۔ انہوں نے اختلافات کی شدت کو کم کرنے کے لیے آرمی چیف جنرل پرویز مشرف کی مدت ملازمت 1999ء میں بطور چیف آف آرمی اسٹاف اور چیئرمین جوائنٹ چیفس آف کمیٹی اکتوبر 2001ء تک توسیع کردی۔ اس پر بحریہ کے ایڈمرل فصیح بخاری نے استعفیٰ دے دیا۔ اس اقدام کے باوجود فوج اور وزیراعظم کے تعلقات معمول پر نہ آسکے۔ چنانچہ 10 اکتوبر 1999ء کو جب جنرل پرویز مشرف سری لنکا کی پچاسویں سالگرہ کی تقریب میں شرکت کے لیے کولمبو گئے تو ان کی غیر موجودگی میں 12 اکتوبر 1999ء کو وزیراعظم نواز شریف نے لیفٹیننٹ جنرل خواجہ ضیاء الدین بٹ کو جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں پرویز مشرف کی جگہ نیا آرمی چیف مقرر کردیا۔ چیف آف جنرل اسٹاف جنرل عزیز کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ جنرل پرویز مشرف کو برطرف کیے جانے کا حکم پاکستان ٹیلی ویژن پر ساڑھے چھ بجے نشر کردیا گیا۔ 12 اکتوبر کو جب پرویز مشرف کا طیارہ سری لنکا سے پاکستان واپس آنے کے لیے اڑا تو کراچی ائرپورٹ کے ڈائریکٹر کو فون پر حکم ملا کہ وہ جنرل پرویز مشرف کا طیارہ ائرپورٹ پر اترنے نہ دے، بلکہ اسے واپس بھیج دیا جائے۔ طیارے کے پائلٹ کو بھی یہ پیغام ملا لیکن اس نے طیارہ زبردستی رن وے پر اتار لیا۔ اس کے بعد ائرپورٹ کو مکمل طور پر بند کردیا گیا اور فوج نے ائرپورٹ کو گھیرے میں لے لیا۔ چھ بج کر 35 منٹ پر فوج کے دستے اسلام آباد ٹی وی سینٹر میں داخل ہو گئے اور ٹی وی سینٹر پر قبضہ کرلیا۔ تھوڑی دیر بعد میاں نواز شریف، شہباز شریف، مشاہد حسین سید، سرتاج عزیز، راجا نادر پرویز، سید غوث علی شاہ اور دیگر مسلم لیگی قیادت کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی عملی طور پر میاں نواز شریف کی حکومت ختم ہوگئی۔

تیرہ اکتوبر 1821ء میں جرمنی کے روڈولف ورشا کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص کو پیتھالوجی کا گاڈ فادر کہا جاتا ہے۔

1863ء میں فرانسیسی کان کنی کے انجینئر اگست راتو کی پیدائش ہوئی۔ اس نے راتو اسٹیم ٹربائن بنایا۔

13 اکتوبر 1893ء میں ہیپی برتھ ڈے کے بول رجسٹر ہوئے۔ یہاں پر یاد دلا دوں کہ یہ نغمہ سونگ اسٹوریز فار دی کنڈر گارٹن نامی کتاب کے گیت گڈ مارننگ ٹو آل سے لیا گیا ہے۔

یہ کتاب ملڈرڈ ہل اور پیٹی ہل نے لکھا تھا۔

14 اکتوبر 1853ء۔ آٹو کا موجد آلوڈ ہائنز کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے پہلے آٹوز بنا کر امریکن آٹو انڈسٹریز کی بنیاد رکھ دی تھی۔

16 اکتوبر کو ڈکشنری ڈے منایا جاتا ہے۔ یہ تاریخ نوح ویبسٹر کی پیدائش کی ہے۔ اس کی پیدائش 1758ء میں ہوئی تھی اور مشہور زمانہ ویبسٹر ڈکشنری اس کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

16 اکتوبر 1708ء کو البرچ وان ہیلر کی پیدائش۔ یہ ایک سوئس سائنس داں تھا۔

1925ء میں لورین سوان کی پیدائش ہوئی۔ یہ شخص مواصلات کا ماہر تھا۔

1930ء میں برطانوی فرسٹ جان پول کنگ پیدا ہوا تھا۔

16 اکتوبر 1900ء میں فرینک اسکاریکو نے الیکٹرک ٹرین کے لیے کنٹرول کا سسٹم پیٹنٹ کروایا۔

16 اکتوبر 1951ء میں قائد ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا۔ تقریباً پونے چار بجے لیاقت علی خان کمپنی باغ راولپنڈی میں شہری اور کنونشن مسلم لیگ کے زیر اہتمام منعقد کیے ایک جلسے میں خطاب کے لیے تشریف لائے تھے۔ تقریباً پندرہ ہزار افراد جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ تلاوت کے بعد شیخ مسعود صادق چیئرمین جدید راولپنڈی نے سپاس نامہ پڑھا۔ مقامی مسلم لیگ کے صدر محمد عمر نے پنڈی کے شہریوں کی طرف سے نواب زادہ کو خوش آمدید کہتے ہوئے حاضرین سے خطاب کی دعوت دی۔ نواب زادہ لیاقت علی خان خطاب کے لیے آئے اور مائیک کی جانب بڑھے۔ ابھی آپ نے برادران ہی کہا تھا کہ سید اکبر نامی ایک شقی القلب نے آپ پر دو گولیاں چلا دیں۔ قائد ملت لڑکھڑائے۔ دوبار کلمہ طیبہ پڑھا۔ آپ کی زبان پر آخری الفاظ تھے "خدا پاکستان کی حفاظت کرے"۔ چونکہ قائد ملت کو ایک منظم

سازش کے تحت شہید کیا گیا تھا اس لیے جب جلسہ گاہ میں آپ کو گولیاں ماری گئیں تو اس افراتفری میں پولیس کے ایک آفیسر نے قاتل کو بھی وہیں پر گولی مار کر ہلاک کر دیا اور یہ راز ابھی تک راز ہی ہے کہ انہیں کس وجہ سے شہید کیا گیا اور کس نے کرایا۔ شہادت کے بعد لیاقت علی خان کو کراچی میں مزار قائداعظم کے احاطے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک المناک واقعہ۔

16 اکتوبر 1979ء۔ جنرل ضیاء نے سیاسی پارٹیوں پر پابندی اور سینسر شپ عائد کر دی تھی۔

16 اکتوبر 1985ء۔ نیشنل اسمبلی نے آٹھویں ترمیم منظور کی۔

17 اکتوبر 1963ء کو جوڑکس ہنڈکوانسی کی پیدائش ہوئی۔ یہ شخص ایک بڑا ریاضی داں تھا۔

1806ء میں سوئس ماہر نباتیات، الفانسو کنڈول کی پیدائش۔

1947ء میں چارلس اے انجیس کی پیدائش۔ یہ ماکرو مارکیٹنگ کا ریسرچر تھا۔

1961ء میں زبدہ مارک ہاٹ راک کینڈی رجسٹر ہوا تھا۔

پاکستان میں 17 اکتوبر 1951ء میں ملک غلام محمد گورنر جنرل اور خواجہ ناظم الدین وزیراعظم مقرر ہوئے۔

17 اکتوبر 2004ء میں ایک پاکستانی فزیشن ڈاکٹر محمد سید فضل کریم بھیانی کے پاس دنیا کے سب سے چھوٹے سائز کے قرآن شریف کے نسخے کا انکشاف ہوا گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں یہ نسخہ شامل کر لیا گیا۔

اٹھارہ اکتوبر 1954ء میں سوئس انجینئر اندرے سولومن کی پیدائش۔

اٹھارہ اکتوبر 1859ء میں مشہور فرانسیسی فلاسفر ہنری برگ سان کی پیدائش ہوئی۔ یہ عہد حاضر کا بہت بڑا فلاسفر تھا اس نے 1927ء میں نوبل حاصل کیا تھا۔

برگسان نے اپنے خیالات اور نظریات سے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ یہ 1859ء میں پیرس میں پیدا ہوا اور 4 جنوری 1941ء کو اس کی وفات ہوئی تھی۔ اس کی کتابیں فلسفے کے نئے جہت دکھاتی ہیں اور ان کتابوں پر دنیا بھر کے دانشور بحث کیا کرتے ہیں۔

1889 time and free wilt میں شائع۔

1896 matter and memory ء میں شائع۔

1907 creative rvolution ء میں شائع ہوئی اور the two sources of morality and relegion 1932ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک بہت اہم کتاب ہے۔

اٹھارہ اکتوبر 1931ء میں ایڈیسن کا انتقال ہوا۔

اٹھارہ اکتوبر 2007ء پاکستان میں آٹھ برسوں کے بعد بے نظیر کی وطن واپسی ہوئی تھی۔

انیس اکتوبر 1814ء میں پہلی بار امریکا کا ترانہ slar spangle گایا گیا۔

1879ء میں تھامسن ایڈیسن نے پہلی بار بجلی کی قوت سے بلب جلانے کا کامیاب مظاہرہ کیا۔

19 اکتوبر 1859ء کو جرمن انجینئر جارج مارکی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے ٹرین میں بریک سسٹم بنایا تھا۔

1895ء میں امریکی سوشیالوجسٹ جوہی مام فورڈ کی پیدائش ہوئی۔

1910ء میں ہندوستانی اسٹرو فزسٹ، سبرامنیم کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1983ء میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔ انیس اکتوبر کو رے براڈ بیری کا مشہور ناول ورز نگ ہائٹ 451 رجسٹر ہوا۔ یہ کتاب اس کی کہانیوں کی سابقہ کتاب دی فائر مین کا سلسلہ ہے۔

19 اکتوبر 1993ء میں بے نظیر بھٹو وزیراعظم بن گئیں۔ اس موقع پر اپوزیشن لیڈر میاں نواز شریف نے بھی حکومت سے غیر مشروط تعاون کا اعلان کیا۔ 27 اکتوبر 1993ء کو وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے قومی اسمبلی کے ایک خصوصی اجلاس میں اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ انہیں 122 ووٹ حاصل ہوئے۔

بیس اکتوبر 1891ء میں سرجیمز چاڈرک کی پیدائش ہوئی۔ اس نے ایک عنصر نیوٹرون دریافت کیا تھا۔ 1906ء میں کرکٹ جانسن کی پیدائش۔ 1812ء میں آسٹن فلنٹ کی پیدائش ہوئی۔ یہ انیسویں صدی کے دل کے امراض کی تحقیقات کے بانی ہیں۔ 1859ء میں جان ڈیوے کی پیدائش، یہ ایک فلاسفر ماہر تعلیم اور مصنف تھا۔ اس کی پیدائش ورمانٹ امریکا میں ہوئی تھی اور وفات کا سال ہے 1952 اس کے نظریات نے تعلیم کی بہتری پر بہت گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ یہ فلاسفر ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات بھی تھا۔

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور فلک کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستانِ حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ دائمی دشمنی میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے سویرا کو اغوا کر لیا اور مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر یاسمین کو بھی بلوا لیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "ڈاروتھ۔۔۔ بلیک" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے۔ تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں نکل آیا۔ پھر عبداللہ کی کوٹھی پر۔ وہیں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جب تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زوروکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دو دوستوں کے درمیان آکر ابھی دوبارہ ہو رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی۔ ہمیں خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دو دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ گھر کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آگیا مگر شہلا نکل گئی۔ ہم اس گھر سے نکل کر مانسہرہ کی طرف بڑھتے گئے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی شہلا تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زوروکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زوروکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجا تھا اسے ائرپورٹ سے پک اپ کر کے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی فوزیہ کی تھی جس نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ نیلی کا چہرہ جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کر کے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوا لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی تو بانو رہا ہو جائے گی۔ میں نے راشن پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر قابو پا چکا کہ شنی ول آگیا اور اس نے راشن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نیک اور راشن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پا لیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔۔۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہاتھ مارا بھاری پستول نکال کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے نیلی کا چہرہ لانے کو کہا۔ سرکاری جب نیلی کا چہرہ واپس لا رہا تھا کہ میزائل پھٹ گیا اور ہمارا ذہن تاریک ہو گیا۔ دھماکے سے نیلی کا چہرہ پانی پر گرا تھا مگر ہم سب محفوظ رہے۔ میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہو کر چلا تو بی ایس ایف کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کو ٹھکانے لگا کر ہم آگے بڑھے اور ایک طیارہ کرایہ پر لے کر سفر پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکا بندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں جو سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھا دی تھیں۔ گاڑی نزدیک

پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو جیتو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدیہ کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدیہ اتری اور اندر چلی گئی۔ میں جیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے مجھے امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سیا کا شوہر اروِن اسے ہراساں کر رہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی لڑکی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل کی آواز سنائی دی "شاہی شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا۔ ہوش آیا تو رامن سامنے تھا۔ وہ تفتیش کر رہا تھا کہ دھماکے سے میرے ہوش وحواس گم ہو گئے جب ہوش آیا تو نانک کو الیکٹرک شاک لگا کر ٹھکانے لگایا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ جیتو بھی مل گیا پتا چلا سادی بڑے کنور کے ساتھ ہے۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیٹونیٹر لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" سادی کو لے کر جیسے....." مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ پر منشی جن غنڈوں کو لے کر آیا تھا انہوں نے بغاوت کر دی۔ ان سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آ کر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کر دیا اور جیتو کی طرف لپکا۔ جیتو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ کچھ ہی دور چلا تھا کہ میرا پیر ایک بارودی سرنگ پر پڑ گیا۔ وسیم نے آ کر اسے ناکارہ کیا پھر ہم کمال۔۔۔ ٹھوکر کی حویلی میں پہنچے وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آ گئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی ہم اس مکان کو چھوڑ کر دوسرے مکان میں آ گئے تو وہاں پہلے سے ایک لڑکا اور لڑکی چھپے ہوئے تھے اسے اتفاق نہیں کہا مرشد کی بیٹی اور بھتیجا تھے۔ ان کو قید کر کے میں رات میں چھت پر ٹہل رہا تھا کہ ایک پک اپ آ کر گیٹ سے ٹکرائی۔ دھماکا ہوا اور پک اپ اندر آ گئی۔ خاور فائر کرتا ہوا اندر آیا۔

اب آگے پڑھیں

میں نے پستول نکال لیا۔ خاور تو بچ کر کوٹھی کی عمارت تک پہنچ گیا تھا مگر اس کا ساتھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ احسان اور اشفاق اوپر کمرے میں تھے۔ وسیم اور سفیر بھی یقیناً سو چکے تھے۔ مانی جاگ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دشمن اندر آ چکا تھا اور ابھی اسے کوٹھی میں گھسنے سے روکنا تھا۔ میں نے مزدا پک اپ کی ونڈ اسکرین کا نشانہ لے کر تین فائر کیے اور اسکرین بکھر گئی۔ اس کے ساتھ ہی پیچھے آنے والی ذرا عجیب ساخت کی بکتر بند نما گاڑی کی چھت سے مشین گن گولیاں برسانے لگی تھیں۔ اس کا نشانہ میں تھا۔ مشین گن اتنی طاقتور تھی کہ گولیوں نے دیوار کو بھی پار کر لیا تھا اور میں بال بال بچا اگر جھکنے سے پیچھے نہ کرتا تو یقیناً میں بھی نشانہ بن جاتا۔ مشین گن کی آواز بہت زیادہ نہیں تھی مگر مجھے اُمید تھی کہ اندر تک پہنچی ہو گی۔ عبداللہ مسلح ہو کر کوٹھری کے سامنے پہرہ دے رہا تھا۔ مگر اس کے پاس بھی پستول تھا۔ بھاری اسلحہ اندر تھا۔ میں نے عجلت میں وسیم کو کال کی اور اس نے فوراً ریسیو کی۔ میں نے اسے خبردار کیا۔

"دو گاڑیاں اندر گھس آئی ہیں۔ پیچھے والی پر بھاری مشین گن ہے۔ کوئی کوٹھی کے سامنے والے حصے میں نہ آئے۔ مشین گن کی گولیاں دیواروں سے گزر رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وسیم نے کہا۔ "آپ کہاں ہیں؟"

"چھت پر۔" میں نے جواب دیا۔ "سفیر کہاں ہے؟"

"اٹھ گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "ہم سامنے والی سمت آ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن بہت احتیاط سے۔" میں نے کہا اور موبائل جیب میں رکھ لیا البتہ کال نہیں کاٹی تھی۔ بکتر بند نما گاڑی سے اس پہلے برسٹ کے بعد دوسرا فائر نہیں ہوا۔ میں نے ایک کونے سے سر نکال کر دیکھا تو مجھے مزدا خالی نظر آئی۔ اس کی ڈرائیونگ یا فرنٹ سیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ یہ سنگل کیبن تھی اور اس کے سامنے بہت بھاری فولادی جنگلا لگا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے یہ گیٹ تباہ کر کے آرام سے اندر آ گئی تھی۔ شاید اسے اسی کام کے لیے آگے رکھا گیا تھا اور اس میں موجود افراد کام کے بعد اتر کر بکتر بند میں چلے گئے تھے۔ اچانک نیچے سے کسی نے بکتر بند پر برسٹ مارا مگر گولیاں اس کی سطح سے اچٹ کر نکل گئیں۔ اس کا رنگ بھی عجیب سا یا مائل نیلا تھا۔ اس برسٹ کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔

اس کا مطلب تھا کہ اس کا میٹل بہت ہی سخت تھا۔ ورنہ عام بکتر بند گولیاں روک لیتی ہے مگر گولیاں اس کی سطح

میں ضرور دھنس جاتی ہیں۔ خاص طور سے رائفل کی گولیاں۔ جب کہ اس پر تو اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ آنے والے فاضلی کے لیے آئے تھے اور یقیناً یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے فاضلی کے اغوا کے وقت ہمارا پیچھا کیا تھا وہ بھی ایسی ہی بلٹ پروف گاڑی میں تھے جس پر گولیاں اچٹ رہی تھیں۔ اب مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ میں نے عبداللہ کو کال کی اس نے بھی فوری کال ریسیو کی۔ ''تم کہاں ہو؟''

''پیچھے ہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''فاضلی کو بھی دیکھ رہا ہوں۔''

میں نے اسے مختصراً آگے کا احوال بتایا۔ اس دوران میں احسان اور اشفاق بھی اٹھ کر آگئے تھے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔ میں نے انہیں چھت پر ہی دو جگہ لگا دیا مگر ساتھ ہی خبردار کیا کہ بکتر بند سے مشین گن فائر ہونے کی صورت میں فوری پیچھے ہو جائیں کیونکہ گولیاں دیوار پار کر رہی تھیں۔ میں انہیں لگا کر سیڑھیوں کی طرف آیا تھا کہ ایک گونجتی ہوئی آواز آئی۔ ''شہباز ملک..... تم میری آواز سن رہے ہو؟''

بولنے والا اردو بول رہا تھا صاف لگ رہا تھا کہ یہ اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ وہ لہجے سے انگریز یا کسی مغربی ملک کا لگ رہا تھا۔ میں نیچے آیا۔ لاؤنج میں سفیر اور وسیم موجود تھے۔ وسیم نے میرے خدشے کی تصدیق کی۔ ''یہ مجھے وہی لگ رہے ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے کہا۔

''شہباز ملک۔'' باہر سے پھر آواز آئی۔ ''میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد فائر کھول دوں گا۔ یہ دیواریں ان گولیوں کو نہیں روک سکتی ہیں۔ میں صرف فاضلی کو لینے آیا ہوں اور اسے لے کر خاموشی سے چلا جاؤں گا دوسری صورت میں......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''مجھے ان سے بات کرنی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں کہیں وہ تمہاری آواز سنتے ہی فائر نہ کھول دیں۔'' سفیر نے تشویش سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے وہ تمہاری یہاں موجودگی کی تصدیق چاہتے ہوں۔''

''میرے دشمن اتنے اچھے نہیں ہیں کہ صرف تصدیق کے لیے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔'' میں نے کہا اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف لپکا کیونکہ اس نے گنتی گننا شروع کر دی تھی میں نے دروازہ کھولا مگر آڑ میں رہتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔ ''رکو میں ہوں بات کرو۔''

وہ رک گیا پھر اس نے کہا۔ ''شہباز..... ہمیں فاضلی چاہیے۔''

''اگر میں انکار کردوں تو؟''

جواب میں بکتر بند اندر آگئی اور اس نے مجرا کو دھکیل کر ایک طرف کر دیا۔ ''اس صورت میں یہاں کوئی فرد زندہ نہیں بچے گا۔''

''ٹھیک ہے ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا لیکن فاضلی بھی مارا جائے گا پھر تم کسے لے جاؤ گے۔''

''ہم اس کی لاش لے جائیں گے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں حکم ہے کہ اسے زندہ یا پھر مردہ ہر حالت میں لے کر آئیں۔''

''مجھے سوچنے کی مہلت دو۔'' میں نے کہا اور پھر عبداللہ کو کال کی۔ وہ بھی یہ گفتگو سن رہا تھا کیونکہ بولنے والا میگا فون استعمال کر رہا تھا اور میں اپنے حلق سے میگا فون کا کام لے رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟''

''پیچھے سے نکل سکتے ہیں مگر ساوی بی بی کے لیے بہت مشکل ہوگا۔''

میں گہری سانس لے کر رہ گیا اسی وجہ سے میں ساوی یا کسی بھی عورت کو جو ہماری کمزوری بن جائے ساتھ رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ دشمن سے ہمیشہ غیر متوقع طور پر سامنا ہوتا تھا۔ ایسے میں کوئی عورت یا جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتا تھا وہ ہمارے لیے مسئلہ بن جاتا۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا مگر فی الحال کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہماری گاڑیاں سامنے کی طرف تھیں اور بغیر گاڑیوں کے ہم فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ ساوی اسٹڈی سے جھانک رہا تھا۔ البتہ راشد اور وردہ بانو اپنے کمرے میں رہے تھے۔ انہوں نے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بکتر بند سے مجھے خبردار کیا گیا۔ ''شہباز ملک وقت تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ اب تم ایک منٹ کے اندر فیصلہ کر لو۔''

''تمہیں زیوڈ شا نے بھیجا ہے میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں کسی زیوڈ شا کو نہیں جانتا۔'' اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''تب تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

''ہمیں نام سے نہیں کام سے مطلب ہے۔'' اس نے چالاکی سے جواب دیا۔ ''ایک منٹ ہو گیا اب تمہارا جواب چاہیے ہاں یا ناں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ "ارے.... لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم فاضلی کو لے کر خاموشی سے چلے جاؤ گے؟ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم فاضلی کو حاصل کرکے فائر کھول دو۔"

"کوئی ضمانت نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "تمہاری تسلی کے لیے اتنا کرسکتا ہوں کہ ہم بکتر بند فارم ہاؤس کے گیٹ سے باہر لے جاتے ہیں۔ لیکن اس خیال میں مت رہنا کہ پیچھے سے نکل جاؤ گے۔ اس وقت تم چاروں طرف سے گھیرے میں ہو یقین نہیں ہے تو آزما کر دیکھ لو مگر اس صورت میں اپنے نقصان کے خود ذمے دار ہو گے میں نے پہلے ہی خبردار کردیا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم پہلے بکتر بند باہر لے جاؤ۔" میں نے کہا اور عبداللہ کو کال کی۔ "فاضلی کو کوٹھری سے نکال لاؤ۔"

بکتر بند واپس گئی اور گیٹ سے باہر نکل کر رک گئی تھی۔ وقت کم تھا اس لیے مجھے فوری فیصلہ کرنا پڑا۔ میرا ہر ساتھی فاضلی سے لاکھوں گنا زیادہ قیمتی تھا۔ اس لیے مجھے فیصلہ کرنے اور اپنی ناک نیچی کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایک منٹ بعد عبداللہ عقبی راہداری کے دروازے سے فاضلی کو لے کر آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھے ہوئے تھے مگر اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

میں نے کہا۔ "مبارک ہو تمہارے دوسرے والد گرامی کی طرف سے بلاوا آیا ہے انہوں نے بہ نفس نفیس اپنا کمانڈو دستہ بھیجا ہے تمہیں لینے کے لیے۔"

"شہباز میں ایک بار پھر کہوں گا کہ تم بلاوجہ مجھ سے الجھ رہے ہو۔ میں تمہارا ہی کام کررہا ہوں۔"

"اچھا؟" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "تب مرشد کا کام تمام کرو۔ میری تمہاری دشمنی ختم ہوجائے گی۔"

"بالآخر یہی ہوگا۔" اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ "میں اپنے ہاتھوں سے اسے جہنم رسید کروں گا مگر اس سے پہلے وہ اپنی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔"

"زیادہ بازی مت کر۔" سفیر نے اسے جھڑکا۔ "تم دونوں باپ بیٹے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔"

"تم مجھے گندی زبان گالی دے لو۔" فاضلی نے ناگواری سے کہا۔ "لیکن مرشد کو میرا باپ مت کہو۔"

"کیا یہ حقیقت نہیں ہے۔" سفیر نے اسے ٹہوکا۔ "بے شک اس نے تمہاری ماں سے زیادتی کی لیکن بہر حال تم اسی ابلیس کا نطفہ ہو۔"

فاضلی کا چہرہ تاریک ہوگیا تھا اور وہ خاموش رہا جیسے خون کے گھونٹ پی رہا ہو۔ باہر سے آواز آئی۔ "فاضلی کہاں ہے؟"

"یہاں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اسے باہر بھیج رہا ہوں۔"

فاضلی دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔ "یہ لوگ یہاں تک کیسے آئے؟"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "مجھے کیا پتا.... میں تو خود نہیں جانتا کہ میں کہاں ہوں؟"

"مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس کوئی چیز ہے جس کی مدد سے یہ لوگ یہاں آئے ہیں۔"

"میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"میں نے چیک کیا تھا۔" وسیم نے کہا۔

میں نے کہا۔ "تم نے سگنل پکڑنے والے آلے سے چیک کیا ہوگا۔ لیکن آج کل ایسی جدید ترین چپ آگئی ہیں جو نارمل حالت میں کوئی سگنل نہیں دیتی ہیں اس لیے ان کو پکڑا نہیں جاسکتا ہے لیکن جب انہیں باہر سے سگنل دیا جاتا ہے وہ بھی جوابی سگنل دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے اس کے جسم میں ایسی ہی کوئی چپ لگی ہے۔"

"تب ہم نے دیر کردی ہے۔" وسیم نے کہا۔ "ورنہ اس کے جسم میں آپریشن کا نشان تلاش کرنا کون سا مشکل کام تھا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ انجیکٹ کی جاتی ہیں بہت مختصر ہوتی ہیں۔"

"فاضلی۔" باہر سے للکارنے کے انداز میں کہا۔

"مجھے ان کے عزائم اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔" میں نے فاضلی سے کہا۔ "یہ تمہیں زندہ یا مردہ بہر صورت لینے آئے ہیں۔"

"تم نے اچھا کیا جو مجھے زندہ جانے دے رہے ہو اسی وجہ سے تم بھی زندہ ہو ورنہ۔ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ مجھے مردہ بھی لے جانے کے لیے تیار ہوکر آئے ہوں گے۔"

"فاضلی میں ایک سوال کررہا ہوں اگر تم نے ٹھیک جواب دیا تو ہوسکتا ہے ہماری دشمنی اسی جگہ ختم ہوجائے۔"

"پوچھو؟"

"تم زوبو شا کے لیے کام کررہے ہو۔"

"میں انکار کروں گا تو تم یقین نہیں کروگے اور میں ہاں کہوں گا تو یہ سچ نہیں ہوگا۔" اس نے مکاری سے جواب دیا۔ "اس لیے تم اپنے طور پر سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔"

"ٹھیک ہے تم نے جواب نہیں دیا اس لیے پیشکش ختم ہو گئی اب تم جا سکتے ہو۔"

فاضلی باہر نکلا اور متوازن قدموں سے گیٹ کی طرف جانے لگا۔ اس کی چال سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ جو ہیں گھنٹے سے بھوکا اور تھکا ماندہ ہے۔ وہ گیٹ سے نکلا تو بکتر بند کا سائیڈ کا دروازہ کھلا اور اس کے اندر جاتے ہی بند ہو گیا۔ پھر بکتر بند کے اوپر لگی مشین گن سے گولیاں برسنے لگیں۔ مگر ان کا نشانہ ہم نہیں بلکہ پورچ میں موجود گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کے ٹائر تھے۔ ایک بھرپور برسٹ نے سب کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ اس وقت ہم افراتفری میں اندر کی طرف بھاگے تھے اور اوپر موجود احسان اور اشفاق نے اسے حملہ سمجھ کر جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ظاہر ہے ان کی جوابی کارروائی کا بکتر بند پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اپنا کام کر کے بکتر بند ریورس ہوئی اور پھر گھوم کر سڑک کی طرف جانے لگی۔ مزدا پک اپ یہیں رہ گئی تھی۔ فائرنگ رکتے ہی ہم باہر نکلے تھے۔ خاور برآمدے کے ستون کی آڑ میں دبکا ہوا تھا۔ احسان اور اشفاق اوپر سے آ گئے تھے۔ احسان نے کہا۔ "وہ اسلام آباد کی طرف گئے ہیں۔"

وسیم اندر چلا گیا تھا کہ ساوی کو تسلی دے اور یہاں سے روانگی کی تیاری کی جائے۔ ظاہر ہے اب ہم یہاں نہیں رک سکتے تھے۔ فاضلی کا بھروسا نہ معلوم تھا مگر خود فاضلی یہ جگہ دیکھ گیا تھا۔ میں اور سفیر گاڑیوں کا معائنہ کر رہے تھے جب کہ عبداللہ یانی ٹمن کے ساتھ چوتھے گارڈ کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کا نام شفیق تھا اور وہ ٹوٹے گیٹ کے نیچے دبا ہوا ملا تھا۔ گیٹ وزنی تھا مگر اس کی موت اصل میں مزدا پک اپ کے گرے گیٹ پر چڑھنے سے ہوئی تھی۔ وہ بے چارہ کچل کر رہ گیا تھا۔ اس کی لاش سامنے آتے ہی ماحول جو پہلے ہی ابتر تھا اب دکھی بھی ہو گیا تھا۔ وہ ہمارا ملازم ہی نہیں ساتھی بھی تھا اور اس نے مرتے دم تک ساتھ دیا تھا۔ لاش کی حالت خراب تھی۔ اسے ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔ اتنے ہنگامے کے بعد پولیس کا یہاں آنا عین قرین قیاس تھا۔ اس لیے جلد از جلد یہاں سے چلے جانا ہی مناسب تھا۔ میں نے ایاز کو کال کی اور اسے فوری کسی بڑی گاڑی کے ساتھ اس طرف آنے کو کہا۔

"ہم نکل رہے ہیں تم راستے میں ملنا۔"

خوش قسمتی سے لینڈ کروزر کا صرف ایک ٹائر برسٹ ہوا تھا البتہ راشدہ اور روبانہ کی نازک اندام گاڑی کا حشر ہو گیا تھا اس کے نہ صرف ٹائر برسٹ تھے بلکہ انجن بھی تباہ ہو گیا تھا۔ چار میں سے دو موٹر سائیکلیں استعمال کے قابل تھیں۔ دو کو یہیں چھوڑ کر جانا تھا۔ ان کی نمبر پلیٹیں جعلی تھیں اور ان کی مدد سے ہمارا سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ احسان اور اشفاق نے پچھلی سے لینڈ کروزر کا ٹائر بدلا۔ اس دوران میں اندر سے سامان لا کر لینڈ کروزر میں بار کیا گیا۔ میں نے مزدا پک اپ کا معائنہ کیا تو اس کے اسٹیئرنگ اور بریک ایکسی لیٹر، کلچ اور گیئرز کے ساتھ ایک ڈیوائس منسلک نظر آئی ایسا لگ رہا تھا کہ اسے ریموٹ کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ تبھی انہوں نے اسے بے دریغ دروازے سے ٹکرا دیا تھا۔ اس کا مقصد ہی دروازہ توڑنا تھا۔ ہانی کا موڈ خراب تھا۔ اس نے مجھ سے شکوہ کیا۔ "کس قدر گھٹیا لوگ ہیں ہمیں آئے ایک دن ہی تو ہوا ہے۔"

"بس بھائی ایسے ہی لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "میرا تو مشورہ ہے تم بوریا بستر سمیٹو اور لاہور کی طرف نکل جاؤ۔"

وہ دنگ رہ گیا۔ "ابھی؟"

"ہاں ابھی.... تمہیں کسی ٹیکسی اسٹینڈ پر اتار دیں گے وہاں سے کوئی پرائیویٹ کار لے لینا اور لاہور چلے جانا۔"

ہانی اپنا سامان سمیٹنے کے لیے بھاگا تھا۔ میں نے کہہ دیا کر جو نقصان ہو گیا ہے اس کی فکر مت کرے بس اپنا کمپیوٹر والا سامان لے اور یہاں سے نکلے۔ وسیم اور سفیر اسلحہ لا کر گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ عبداللہ، راشدہ اور روبانہ کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہانی اندر سے برآمد ہوا اور تیزی سے میرے پاس آیا۔ "شوبی یہ آپ نے مصیبت یہاں رکھی ہوئی ہے؟"

"کون سی مصیبت.... سفیر کی بات کر رہے ہو؟"

اندر سے آتے سفیر نے سن لیا اور بھنا کر بولا۔ "میں نے کیا کیا ہے۔"

"میں سفیر بھائی کی بات نہیں کر رہا۔" ہانی جلدی سے بولا۔ "وہ لڑکی جو اندر ہے۔"

"اندر دو لڑکیاں ہیں بلکہ ان میں سے ایک خاتون ہے۔"

ہانی زچ ہو گیا۔ "آپ مذاق کے موڈ میں ہیں۔"

"یار مذاق تم کر رہے ہو اندر موجود دو تمام افراد کے نام تمہیں معلوم ہیں تو نام لو نا۔"

"میں اس لڑکی روبانہ کی بات کر رہا ہوں۔"

"تکنیکی طور پر وہ بھی لڑکی نہیں ہے۔"

ہانی مجھ سے زچ ہونے لگا۔ "اب آپ سفیر بھائی بن

رہے ہیں۔"

اس پر سفیر نے اسلحے کی آخری کھیپ گاڑی میں ٹھونس دی اور غرا کر بولا۔ "ہاں سارے زمانے کے کرتوت سفیر بھائی کے سر ڈال دو۔"

"آپ میری بات کیوں نہیں سن رہے؟" مانی نے تقریباً ناچتے ہوئے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"یار تم سناؤ گے تو میں سنوں گا نا۔"

"یہ میرے بارے میں ہی کچھ سنائے گا۔" سفیر نے اندر جاتے ہوئے کہا تو مانی نے بال نوچتے ہوئے چلا کر کہا۔

"وہ مرشد کی بیٹی ہے۔"

میں دم بہ خود رہ گیا تھا اور اندر جاتا سفیر یوں واپس آیا جیسے اسے کسی اسپرنگ نے کھینچ لیا ہو۔ وسیم کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ گیا تھا۔ میں نے مانی کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور سرگوشی میں پوچھا۔ "تمہارا مطلب ہے روبانہ مرشد کی بیٹی ہے؟"

"تو اتنی دیر سے آپ کو اور کیا بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔" اس نے خفگی سے کہا اور اندر چلا گیا۔ اب تک میں نے سوچا نہیں تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے ان کا کیا کرنا ہے۔ مگر امکان یہی تھا کہ ہم انہیں بھی آزاد کرتے اور خود روانہ ہو جاتے مگر مرشد کی بیٹی کو کیسے چھوڑ کر جا سکتے تھے۔ سفیر نے کہا۔

"یہ مانی بدمعاشی کر رہا ہے۔"

"وہ ایسا آدمی نہیں ہے جو اس موقع پر مذاق کرے۔" وسیم نے نفی میں سر ہلایا تو مجھے ہوش آیا اور میں سفیر اور وسیم کو کام جاری رکھنے کا کہہ کر اندر کی طرف لپکا۔ روبانہ اور راشد صوفے پر بیٹھے تھے ان کا سامان بھی ساتھ تھا۔ میں نے جاتے ہی بلاتمہید روبانہ سے پوچھا۔

"تم مرشد علی کی بیٹی ہو؟"

وہ چونکی اور ہراساں ہو کر مجھے دیکھا۔ "آپ... آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"میری بات کا جواب دو۔" میرے لہجے میں ایک اجنبی سی غراہٹ آ گئی۔ اب اس کے ساتھ راشد بھی سہم گیا تھا۔ روبانہ نے سر ہلایا۔

"مرشد علی میرے فادر ہیں۔"

میں نے تسلی کے لیے مرشد علی کے مزید حوالے دیئے اور مکمل اطمینان کر لیا کہ یہ اسی مرشد علی کا ذکر ہے۔ پھر میں نے راشد کی طرف دیکھا۔ "تم اس کے بھائی ارشد علی کے بیٹے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "جی وہ میرے پاپا ہیں۔"

عبداللہ بھی دم بہ خود تھا۔ اس لیے جب میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "تم دونوں ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔"

تو عبداللہ نے فوراً اپنی گن ان پر تان لی۔ "بالکل۔"

"انہیں باہر گاڑی میں لے آؤ۔"

بکتر بند کی واپسی کے مشکل سے آدھے گھنٹے بعد ہم بھی وہاں سے نکل آئے تھے۔ اب پولیس آتی اور اس اسٹیٹ ایجنٹ سے تفتیش جس نے ہمیں فارم کرائے پر دیا تھا۔ اس کے پاس ہمارے نام اور آئی ڈی کارڈز کی کاپیاں تھیں مگر ان سے ہمیں تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فارم سفیر نے لیا تھا مگر جب میں نے اس سے راستے میں پوچھا تو اس نے وضاحت نکال کر کہا۔

"میں نے اس کے ریکارڈ سے اپنی آئی ڈی کی کاپی ایسی صفائی سے نکالی تھی کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی بعد میں کہہ رہا تھا کہ کہیں گر گئی میں پھر دے دوں۔"

"یہ تو نے عقل مندی کا کام کیا۔"

"میں ہمیشہ عقل سے کام لیتا ہوں۔"

"جب موقع آس پاس نہیں ہوتی ہے۔" وسیم نے لقمہ دیا۔ وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ ساوی اور روبانہ فرنٹ سیٹ پر ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

"جب ہی تو غلطی سے بھی کوئی عقل کی بات نہیں کرتا۔" سفیر نے جواب دیا۔ میں، سفیر اور راشد درمیان والی نشست پر تھے۔ عبداللہ ایک بائیک پر تھا۔ باقی تینوں ظاہر ہے اپنی بائیک پر تھے۔ ابھی ہم نے جی ٹی روڈ کراس کی تھی کہ ایاز کی کال آ گئی۔

"آپ کہاں ہیں۔"

"جی ٹی روڈ پر آ گئے ہیں۔"

"وہ کشمیر ہائی وے پر مت جائیے گا۔ پنڈی کی طرف آئیں میں ویسٹ رج کے پاس ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور وسیم کو پنڈی کی طرف چلنے کو کہا۔

"میں اپنی جیپ لا رہا ہوں۔" ایاز نے کہا۔ "لیکن ہوا کیا ہے؟"

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ کیا ہوا تھا۔ فاضل کے نکل جانے کا سن کر اسے مایوسی ہوئی تھی لیکن جب میں نے اسے مرشد کی بیٹی کے بارے میں بتایا تو وہ دنگ رہ گیا۔ "مرشد

زارنی۔" اس نے کہا۔ "وہ کہاں سے آپ کے ہاتھ لگی۔"

"یہ اندھیرے میں اندھے کے ہاتھ میں بٹیر آ جانے سے بھی بڑا کیس ہے۔ بالکل اتفاقیہ ہاتھ آ گئے ہیں وزراں.... تیرے مرشد کے سن ان لا بھی ہیں جو پہلے ہی بھتیجے کے عہدے پر فائز ہیں۔"

دس منٹ بعد ہم ویسٹ رج کی طرف مڑ گئے۔ ایاز مستقل رابطے میں تھا اور ہمیں بتا رہا تھا کہ وہ کہاں ملے گا۔ اس سے پہلے اس کی جیپ نظر آ گئی۔ وسیم نے لینڈ کروزر اس کی جیپ سے ذرا آگے روکی کیونکہ یہاں سڑک تنگ تھی اور دو گاڑیاں ساتھ کھڑی ہو جاتیں تو تیسری کے گزرنے کی جگہ باقی نہ رہتی۔ ویسے رات کے ایک بجے یہاں سناٹا تھا۔ باقاعدہ ملاقات کا وقت نہیں تھا اس لیے صرف سلام دعا ہوئی۔

ساوی، وسیم، راشد اور روبانہ کو معہ کچھ اسلحے کے ایاز کی جیپ میں منتقل کیا گیا۔ اگرچہ میں نے وسیم سے کہا نہیں تھا کہ وہ سمجھ گیا کہ ساوی اور اسے کیوں بھگوال والی حویلی بھیج رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے بغل گیر ہو کر کہا۔ "میں کل ہی اسے حویلی چھوڑ کر آتا ہوں۔"

ساوی بھی سنجیدہ تھی اس لیے میرے بازو پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ "میں آپ کے لیے بہت دعا کروں گی۔"

"مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "اپنا بہت خیال رکھنا۔"

"مجھے افسوس ہے میں نے آپ کو تنگ کیا۔"

"بالکل بھی نہیں۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

وہ سب ایاز کی جیپ پر سوار ہوئے اور ایاز انہیں لے کر روانہ ہو گیا۔ باڈی گارڈز بھی ان کے ساتھ چلے گئے تھے۔ میں، مانی، صنوبر اور عبداللہ اسی سڑک سے فیض آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ رات کا وقت تھا اور کسی ٹیکسی کا ملنا مشکل تھا اس لیے مانی کی لاہور روانگی صبح تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم لاہور جاتے ہی بینک اکاؤنٹ کھلوا لینا۔ عبداللہ اس میں رقم ٹرانسفر کر دے گا۔ ابھی تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟"

"میرے پاس رقم ہے آپ فکر نہ کریں۔ وہاں لاہور میں میرے کئی دوست ہیں۔ میں آرام سے ایڈجسٹ ہو جاؤں گا۔ ویسے میرا بینک اکاؤنٹ ہے میں کہیں سے بھی آپریٹ کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم رابطہ نہیں کرو گے۔ اگر کوئی اہم بات ہوگی تو نیٹ کی مدد سے کال کرو گے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" اس نے کہا

ہم فیض آباد والی کوٹھی پہنچے اور کال بیل کے جواب میں شاہ جی سوتے سے اٹھ کر آیا تھا۔ اس نے گیٹ کھولا تھا۔ یہاں آتے ہوئے میں نے آس پاس کا جائزہ لیا تھا۔ اگر یہاں کی نگرانی ہو رہی تھی تب بھی میں کسی کو دیکھ نہیں سکا تھا۔

صنوبر کسی قدر رقت طاری ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "یار وہ گھنٹے پہلے ہم کتنے خوش اور مطمئن تھے۔ رشتوں سے ہماری خوشی رہی نہیں جاتی۔ کیسے منٹوں میں سب تتر بتر ہو گئے۔"

"یہی زندگی ہے۔ نارمل لوگوں کی زندگی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے ذرا دیر کو سکون ملتا ہے اور پھر بھاگ دوڑ کی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔"

"اب کیا کرنا ہے؟" صنوبر نے جمائی لی۔

"مجھے ذرا وزیر شاہ سے بات کرنی ہے۔" میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ "میں اسی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔"

عبداللہ گاڑی سے اسلحہ نکال رہا تھا۔ مانی نے صبح چلے جانا تھا اس لیے اس نے اپنا سامان گاڑی میں رہنے دیا۔ شاہ جی کافی بنانے جا رہا تھا۔ فرمائش صنوبر نے کی تھی مگر وہ سب کے لیے بنا کر میرے کمرے میں ہی لے آیا۔ شاہ جی کے جانے کے بعد صنوبر نے کہا۔ "اس سارے چکر میں ایک ہی اچھی بات ہوئی ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "مرشد کی بیٹی اور داماد کا ہاتھ آنا بڑی کامیابی ہے لیکن ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے فائدہ کس طرح اٹھا سکتے ہیں۔"

صنوبر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "اس میں نہ سمجھ میں آنے والی بات کون سی ہے؟.... مرشد کو اطلاع دو کہ اس کی لاڈلی ہمارے پاس ہے۔ اس کے بعد وہ ہمارے اشاروں پر ناچے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کیا تم مرشد کو نہیں جانتے ہو۔ وہ صرف اپنی ذات کو اہمیت دینے والا شخص ہے۔ پھر روبانہ نے گھر سے بھاگ کر اس سے بغاوت کی ہے۔ تم نے اس کا خوف نہیں دیکھا جو اسے اپنے باپ سے ہے۔ ایسے میں روبانہ کے حوالے سے کوئی دھمکی مرشد پر کتنا اثر کر سکتی ہے؟"

صنوبر نے نفرت سے کہا۔ "اس بے غیرت کو اپنی عزت کی پروا بھی نہیں ہوگی؟"

"یار یہ اللہ کا کرم ہے کہ ہمارے جیسے بدترین دشمن بھی اس حوالے سے ہم پر شک نہیں کر سکتے۔ مرشد بھی یقین نہیں کرے گا کہ اس کی بیٹی کی عزت کو ہم سے کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔ ہاں ہم اسے قتل کر سکتے ہیں اور غالباً مرشد بھی یہی سوچ

رہا ہوگا۔''

سفیر نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''اس لیے اس معاملے میں ٹھنڈا رہ... دو دونوں ابھی ہمارے پاس ہیں۔ ہم آرام سے فیصلہ کریں گے کہ انہیں کیسے استعمال کرنا ہے۔''

''چل ٹھیک ہے۔'' سفیر نے چائے کا خالی مگ رکھا اور کھڑا ہوگیا۔ ''میں سونے جا رہا ہوں۔''

''میں بھی سونے کی سوچ رہا ہوں لیکن اگر تو نے اب مجھے سونے والے اسٹائل میں اٹھایا تو تیری خیر نہیں ہوگی۔''

''نہیں اٹھاؤں گا۔'' سفیر ہنسا۔ ''لیکن طریقہ مزے کا ہے۔''

''تب میں تجھ پر آزماؤں گا۔''

''میں عادی ہوگیا ہوں۔'' سفیر نے جاتے ہوئے کہا۔

میں نے غسل کیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔ گرمی کی وجہ سے لوڈ شیڈنگ عروج پر تھی اور ہر ایک گھنٹے بعد ایک گھنٹے کے لیے لائٹ جارہی تھی مگر کوٹھی میں موجود آٹومیٹک جنریٹر اس کا ازالہ کر رہا تھا۔ لائٹ جاتے ہی وہ خود بخود اسٹارٹ ہوجاتا تھا اور لائٹ آنے پر خود بخود بند ہوجاتا تھا۔ اس کی وجہ سے اے سی مسلسل کام کر رہے تھے۔ اس لیے ہم سکون سے سوتے رہے۔ صبح سفیر نے مجھے جگایا لیکن شرافت سے اور مہذب انداز میں بیڈ ٹی پیش کرکے۔ آٹھ بج رہے تھے۔ ہم دو بجے سوئے تھے۔ نیند پوری ہوئی تھی مگر جسم میں کسل مندی تھی۔ میں نے جمائی لی۔ ''اتنی جلدی اٹھا دیا۔''

''کیونکہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔'' سفیر نے منطقی انداز میں کہا اور مجھے چائے کا مگ تھما دیا۔

''یار سوتے سوتے چائے پی تھی اور اٹھتے ہی پھر چائے۔''

''بیٹے ابھی کافی ہوتی تو تو خوشی خوشی نوش فرماتا۔''

''کیونکہ کافی شافی ہوتی ہے۔'' میں نے اٹھ کر غسل خانے کا رخ کیا۔ تازہ دم ہوکر واپس آیا۔ چائے نوشی کے دوران سفیر نے آگاہ کیا کہ زبیدہ خانم کیا سریلے پراٹھے پکا رہی ہیں۔ میں حیران ہوا۔ ''سریلے پراٹھے؟''

''ایسے سمجھ نہیں آئے گا کھا کر دیکھے گا تو پتا چلے گا۔''

''تو نے ناشتا کرلیا؟''

''ہاں بھی تو بتا رہا ہوں۔''

ہم نیچے آئے جہاں عبداللہ ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھا۔ پراٹھوں کے ساتھ رات کا بنا ہوا آلو قیمہ تھا اور کیا خوب تھا۔

اگرچہ میں ہاتھ کے ذائقے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر آپ میں کھانا بنانے کا فن ہے تو باقی کام محنت کا رہ جاتا ہے۔ مگر زبیدہ ان عورتوں میں سے تھی جن کے ہاتھ میں حقیقتاً ذائقہ ہوتا ہے وہ جو بھی بناتی تھی خوب بناتی تھی۔ سادہ روٹی پراٹھے تھے لیکن ہونے کے باوجود ان کی کئی تہیں تھیں۔ سفیر کا لقب درست تھا جو اس نے ان پراٹھوں کو دیا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم اوپر والے لاؤنج میں آئے۔ زبیدہ کو تازہ چائے وہیں لانے کو کہا۔ مالی سو رہا تھا وہ جب اٹھتا تو ناشتا کرتا اور اس کے بعد عبداللہ اسے کسی ٹیکسی میں بٹھا آتا۔ میں نے عبداللہ کو بتایا کہ میں اب خود زیبوز شا کو کال کرنا چاہتا ہوں۔ وہ متفکر ہوگیا سفیر نے بھی اعتراض کیا۔ ''یہ رسکی ہوگا۔''

''رسک تو ہے لیکن زیبوز شا پہلے ہی اس لوکیشن سے واقف ہے۔ اس سے فرق نہیں پڑے گا۔ کل رات بھی اس کے آدمیوں نے ثابت کیا کہ وہ ہمارے درپے نہیں ہے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ وہ زیبوز شا کے آدمی تھے؟''

''سو فیصد یقین ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا بات کرے گا؟'' سفیر نے پوچھا۔ ''جب کہ تو جانتا ہے کہ اس کا کیا مطالبہ ہوگا۔''

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے فاضلی کو کیوں ساتھ ملایا ہے؟''

''آسان سی بات ہے اب مرشد اس کے کام کا نہیں رہا ہے۔''

''نہیں زیبوز شا نے فاضلی کو اس لیے ساتھ ملایا ہے کہ وہ مرشد کے گھر کا بھیدی ہے اور اس سے چھپی نفرت کرتا ہے زیبوز شا نے اسی نفرت کا فائدہ اٹھا کر اسے ساتھ ملایا ہے۔ مرشد نے اس کی دی ہوئی ضمانت کو جوتے کی نوک پر رکھا اور یہ زیبوز شا جیسے شخص کی بہت بڑی توہین تھی۔ اب وہ اس سے مرشد کو سزا دینے کا کام لے رہا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ اس کا احسان میرے سر رکھنا چاہے گا۔ جیسا کہ فاضلی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرا ہی کام کر رہا ہے اور مجھ سے دشمنی کا باب بند کرچکا ہے۔''

''سانپ ڈسنا اور بچھو ڈنک مارنا کبھی نہیں بھولتا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے سفیر کی بات پر سر ہلایا۔ ''کل رات کے واقعے کی کوئی اطلاع آئی؟''

سفیر نے بتایا۔ ''ہاں پولیس نے موقع پر پہنچ کر لاش قبضے میں لے لی ہے۔ عبداللہ نے اس کے گھر والوں کو اطلاع کردی ہے وہ لاش لینے آ رہے ہیں۔ انہیں پچیس لاکھ

رہے بھی رہیں گے۔"

"جان کا تو کوئی بدل نہیں ہے۔ لیکن اس کے لواحقین کے لیے یہ رقم بڑا سہارا بن جائے گی۔" میں نے کہا اور وہ سم نکال کر موبائل میں لگائی جس پر زیوز شا کی کال آئی تھی جس نمبر سے کال آئی تھی وہ میں نے اسی سم میں محفوظ کر لیا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر محفوظ کیا تھا کہ بعد میں بھی زیوز شا سے رابطہ کرنا ہو تو میرے پاس کوئی ذریعہ ہو۔ میں نے نمبر ملایا۔ بیل جانے لگی اور چند لمحے بعد کسی نے کال ریسیو کی اور درشت لہجے میں بولا۔ "یس ہوازدیئر؟"

"شہباز ملک..... زیوز شا سے بات کراؤ۔"

اس نے شاید زیوز شا سے پوچھا اور پھر مجھ سے بولا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"لگتا ہے زیوز شا کو بات نہیں کرنی ہے۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ سفیر اور عبداللہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں زیوز شا کے گرگے سے ہونے والی مختصر گفتگو کا احوال سنایا۔ سفیر نے سر ہلایا۔

"تو نے ٹھیک کیا۔ اس کا دماغ کچھ خراب ہو رہا ہے فاضلی کو واپس حاصل کر کے۔"

"کاش آپ نے پہلے ہی دن اس پر اکرم چشتی والا ٹریٹ منٹ کر رہا ہوتا۔" عبداللہ نے مایوسی سے کہا۔ "یہ تو زہریلا سانپ دانتوں سمیت آزاد ہو جانے والی بات ہوئی ہے۔"

"وہ پھر ہاتھ آئے گا۔" میں نے اسے تسلی دی اسی لمحے موبائل کی بیل بجی۔ میں نے ایک بار مکمل بیل بجنے دی اور جب کال کٹ جانے پر اس نے دوبارہ ملائی تو میں نے کال ریسیو کی اور رکھائی سے بولا۔ "یس ہوازدیئر؟"

"میں بات کر رہا ہوں۔" زیوز شا نے نام لیے بغیر کہا۔

"زیوز شا۔" میں نے جان بوجھ کر اس کا نام لیا۔ "تم غالباً بہت معروف تھے۔"

"میں دوسری کال پر تھا۔ کہو تم نے کیوں کال کی تھی؟"

میں نے اس کے انداز میں رکھائی محسوس کی تھی۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ فاضلی تمہارے پاس پہنچ گیا ہے؟"

"کون فاضلی.....؟"

"زیوز شا تمہارے جیسے رتبے کے آدمی کو زیب نہیں دیتا اس طرح جھوٹ بولنا یا پھر میں نے تمہاری حیثیت کا اندازہ ہی غلط لگایا ہے۔ کیا میں وہ تفصیل پیش کروں جن میں تم اپنی کوٹھی کے اوپری لاؤنج میں فاضلی کے ساتھ موجود تھے۔"

وہ ایک لمحے کو چپ ہوا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "شہباز تم بلاوجہ الجھ رہے ہو۔ فاضلی سے دور رہو۔ میں اس سے کام لے رہا ہوں۔"

"اب تم مجھ پر احسان جتاؤ گے کہ تم میرا ہی کام کر رہے ہو۔" میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ "لیکن زیوز شا تم صرف اپنے ایک معتوب کو سزا دے رہے ہو۔ دوسری بات یہ کہ فاضلی پر میرے کچھ حساب نکلتے ہیں۔ وہ صرف مرشد کی ناجائز اولاد نہیں ہے اس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو ذاتی نقصانات پہنچائے ہیں جن میں سے بعض ناقابل تلافی ہیں۔ میں اسے معاف نہیں کر سکتا اس لیے بہتر ہو گا تم اسے چھوڑ دو۔ اس وقت بھی میں نے اپنے ساتھیوں کی خاطر اسے چھوڑا لیکن اب وہ میرے ہاتھ آیا تو وہی اس کی زندگی کا شاید آخری لمحہ ہو۔"

میں نے آخری جملہ کہتے ہی کال کاٹ دی اور فوراً موبائل بند کر کے سم نکال لی تھی۔ سفیر نے میرے شانے پر ہاتھ مارا۔ "تو نے ٹھیک کیا جو اسے جتا دیا کہ ہم بے خبر نہیں ہیں اور ہمارے پاس بھی ذرائع ہیں۔"

"آپ نے کہا ہے کہ اب فاضلی ہاتھ آیا تو اس کا کام تمام کر دیں گے تو کیا.....؟"

"اب سچ میں بھی کرنا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم نے معلومات کے چکر میں وقت ضائع کیا۔"

"ہم نے نہیں، تو نے۔" سفیر نے تصحیح کی۔ "میں اور وسیم تو پہلے ہی اس کے قائل تھے۔"

"چل یار میں نے..... پر اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ زندگی میں پہلی بار احساس ہو رہا ہے کہ دشمن کا نہ ہونا بھی کتنے سکون کی بات ہے۔ اب مجھے معلوم ہے کہ سرحد پار میرا کوئی دشمن باقی نہیں ہے۔ اس طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"بھارتی ایجنسیوں کو تیری تلاش ہے۔"

"وہ دوسری بات ہے ان سے میری ذاتی دشمنی تو نہیں ہے۔"

"پھر بھی آپ کو اس حوالے سے محتاط رہنا چاہیے۔" عبداللہ نے کہا۔ "پچھلے کچھ سالوں میں بھارتیوں نے علاقائی حوالے سے بہت پر پرزے نکال لیے ہیں اور وہ اب برتری کے ساتھ اپنا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔"

"وہ بزدل نہیں ہو گئے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "ہم ہی جھک گئے ہیں۔ جب بھی ہمارے حکمران کرپٹ ہوں گے تو وہ قوم کی ترجمانی کیسے کریں گے؟ وہ سمجھیں گے کہ بین الاقوامی طاقتوں کو خوش کر کے ہی اقتدار میں رہ سکتے ہیں۔"

عبداللہ نے سر ہلایا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میری گزارش پر بھی غور کریں۔ اگر آپ کا کیس بین الاقوامی سطح پر گیا تو آپ کے لیے مشکل ہو جائے گی۔"

"تب میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"اب اگر زاہد شاہ آپ سے بات کرے اور مدد مانگے تو آپ اس کے سامنے بھارتیوں سے جان چھڑانے کی شرط بھی رکھ دیجیے گا۔"

"میں اب اسے اتنا قابل نہیں سمجھتا کہ وہ بھارتیوں سے میری جان چھڑا دے۔ وہ مرشد کا مسئلہ حل کر دے یہی بڑی بات ہوگی میرے لیے۔"

"لیکن آپ اس سے بات ضرور کریں۔" عبداللہ نے اصرار کیا۔ "اس صورت میں بھارتیوں سے نہ سہی اس سے آپ کی جان ضرور چھوٹ جائے گی۔"

عبداللہ کی بات قابلِ غور تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں سوچوں گا۔"

"آپ میاں ممتاز کو بھی بھول رہے ہیں اس کے کنور خاندان سے کاروباری تعلق تھا اور اسے بھی نقصان ہوا ہوگا۔"

"فی الحال اسے بھول جاؤ وہ سیاستداں ہے اور اس سے الجھنا ہمارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔"

مانی نیچے سے آیا۔ اس نے ناشتا کر لیا تھا اور اب جانے کے لیے تیار تھا۔ ہم سب اسے چھوڑنے کو جا رہے تھے مگر اس نے منع کر دیا۔ "نہیں میں عبداللہ بھائی کے ساتھ چلا جاؤں گا۔"

میں نے اسے گلے سے لگایا۔ "تم دور جا رہے ہو لیکن یہ مت سمجھنا کہ اکیلے ہو گے، کوئی بھی مسئلہ ہو ہمیں فوراً بتانا۔"

"کیوں نہیں جی۔" اس نے جذباتی ہو کر کہا۔ "اب آپ ہی تو میرے بڑے ہو۔"

"مجھے اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ کیوں بڑا بنایا جا رہا ہے۔" سفیر نے معنی خیز انداز میں کہا تو مانی جھینپ گیا۔

"آپ کا ذہن تو ہمیشہ ٹیڑھی سوچتا ہے۔"

"اور درست سوچتا ہے۔" سفیر نے سر ہلایا۔ "لیکن تم فکر مت کرو شاہ زیب سے تمہاری شادی ضرور ہوگی۔"

"بالکل جب میاں بیوی راضی تو پھر قاضی بھی راضی۔" عبداللہ نے محاورے کا حشر کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ مانی کو لے کر چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے رحیم کو کال کی۔

"کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

"نہیں جناب بہت آرام سے پہنچ گئے تھے۔" رحیم نے کہا۔ "بس نئے بچھیوں نے تھوڑا ہنگامہ کیا تھا۔ مگر اب سکون سے ہیں۔"

"ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا۔" میں نے کہا۔ "بانی پروگرام کب کا ہے؟"

وسیم سمجھ گیا کہ میں اس پر کھل کر بات نہیں کر رہا اس لیے اس نے جواب دیا۔ "انشاء اللہ آج ہی نمٹانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"آپ کی طرف سب سکون ہے؟"

"ہاں باہر والے سے بات ہوئی ہے۔ اس کا موڈ تھوڑا اکھڑا ہوا لگ رہا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں کچھ دن بعد جم جائے گا آج کل گرمی زیادہ ہے تا تو اکھڑ گیا ہوگا۔" رحیم نے ہنس کر کہا۔ "لوٹ کر بدھو نے گھر ہی آنا ہوتا ہے۔"

"لیکن وہ بدھو نہیں ہے۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ عبداللہ آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تھا اس نے مانی کو ایک پرائیویٹ کار میں بٹھایا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہی روانہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہم گپ شپ کرتے رہے۔ راشد اور روہانہ کے بارے میں سوچتے رہے۔ پھر ندیم نے رابطہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے پیون کے ہاتھ کاغذات بھیج رہا ہے میں متعلقہ جگہوں پر سائن کر دوں۔ ایک گھنٹے بعد اس کا پیون آ کر سائن کرا کے لے گیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سفیر حسبِ معمول خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگا۔ کچھ عرصے سے آرام کرنے سے اس کی ہڈی جو توند نکل آئی تھی۔ خوش خوراک وہ ہمیشہ سے تھا۔ اس لیے توند کی وجہ آرام طلبی ہی ہو سکتی تھی۔

عبداللہ کچھ گاڑیوں کے لیے نکلا تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ کھولا۔ یہ وائی فائی کی مدد سے پی ٹی سی ایل براڈ بینڈ سے منسلک تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مرشد کی درگاہ پر ہونے والی کارروائی کی رپورٹس تو دیکھوں۔ جب میں نے سرچ کیا تو انٹرنیٹ پر مختلف اخبارات اور نیوز سائٹس پر اس کے بارے میں بہت سا مواد نکل آیا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ چند رپورٹرز نے

خاصے چشم کشا انکشافات کیے تھے۔ خاص طور سے ظفر شار نامی ایک رپورٹر نے بتایا کہ درگاہ میں موجود بارود تجزیے کے بعد کئی بڑی وارداتوں میں ہونے والے بارود کا خیز مواد سے مشابہ پایا گیا۔ خاص طور سے ایک فوجی تنصیب پر حملے کا حوالہ تھا۔ اس میں ہمارے فوجی اہلکاروں کو خاصا بڑا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی اس انکشاف کے باوجود مرشد کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اسے گرفتار کیا گیا تھا۔

پھر ایک چھوٹی سی خبر نے متوجہ کیا۔ یہ آج کے ایک اخبار میں آئی تھی۔ ارشد علی نامی شخص کسی جھگڑے میں زخمی ہونے کے بعد اسپتال لایا گیا تھا۔ اسے ریڑھ کی ہڈی میں گولی لگی تھی اور اس کی حالت تشویشناک تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ مرشد علی کا چچا زاد ارشد علی تو نہیں تھا۔ راشد اسی کا بیٹا تھا اور رومانہ یعنی دختر مرشد کو لے کر فرار ہوا تھا۔ یقیناً مرشد اور ارشد کے درمیان جھگڑا ہوا تھا اور اسی کا نتیجہ ہو سکتا تھا کہ ارشد علی اسپتال پہنچ گیا تھا مگر پہلے اس کی تصدیق ضروری تھی۔ انڈیا لے جائے جانے سے پہلے میری ارشد علی سے بات ہوئی تھی مگر اب اس کا نمبر میرے پاس نہیں تھا البتہ مرشد ہاؤس کے نمبرز تھے میں نے سوچا اور دوبارہ بنا سے گفتگو والی سم لگا کر مرشد ہاؤس کال کی۔ مرشد کے متعلقین سکر یٹری نے کال ریسیو کی۔

”بولو کس سے بات کرنی ہے۔“

”تمہارے اور بے شمار دوسرے حرامیوں کے ناجائز باپ مرشد سے۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ”مجھے پہچان تو لیا ہوگا۔ میں بھی تمہاری ولدیت میں شامل ہوں لیکن معنوی لحاظ سے۔“

”تم شہباز ملک ہو۔“

”یہ بھی تمہارے کسی باپ کا نام ہے لیکن فی الحال مجھے صرف مرشد سے دل چسپی ہے۔“

”وہ مصروف ہیں۔“ اس نے بدمزہ ہو کر کہا۔

”ہاں رشتے داروں کا صفایا کرنے میں مصروف ہے۔ داماد کو مار چکا ہے اور اب چچا زاد کو اسپتال پہنچا رہا۔“

”اسے غلطی سے چل جانے والی گولی لگی ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں تصدیق کر دی۔

”ایک آدھ دن میں اس کی بھی موت واقع ہو جائے گی۔ ایسا لگتا ہے آخر میں یہ خاندان صرف مرشد سے چلے گا مگر کیا اسے یقین ہے کہ وہ جسے اپنی اولاد سمجھتا ہے وہ اسی کی اولاد ہے؟“

”تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔“ سیکریٹری نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

”چلو تم کوئی کام کی بات بتاؤ۔ سنا ہے مرشد کی ناجائز اولاد نمبر دو یعنی فاضلی نے بغاوت کر دی ہے۔“

”یہ بھی فضول بکواس ہے۔“

میں اس سے کچھ دیر اور فضول بکواس کرتا رہا اور اس نے تنگ آ کر فون بند کر دیا۔ لیکن مجھے وہ بات معلوم ہو گئی تھی جس کے لیے میں نے کال کی تھی۔ میں نے انٹرنیٹ پر ایک بار پھر خبر پڑھی۔ اس میں اسپتال کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ میں نے اس اخبار کا نمبر ویب سائٹ سے لیا اور کال کی۔ دوسری طرف سے آپریٹر نے اٹھایا تو میں نے اسے سٹی ایڈیٹر سے ملانے کو کہا۔ اس قسم کی خبریں سٹی ایڈیٹر ہی دیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد سٹی ایڈیٹر لائن پر تھا اور مجھ سے بات کرنے کی بجائے کسی ماتحت پر چلا رہا تھا۔ ”یہ تم نے کیا لکھا ہے مجھے نوکری سے نکلواؤ گے..... ہاں جی فرمائیے۔“

میں نے خبر کا حوالہ دیا اور پوچھا۔ ”مجھے اسپتال کا معلوم کرنا ہے جہاں ارشد علی داخل ہے۔“

”یہ تو رپورٹر ہی بتا سکتا ہے۔“ اس نے کہا اور چلا کر بولا۔ ”خرم ادھر آؤ تمہاری کال ہے۔“

چند لمحے بعد رپورٹر خرم لائن پر تھا میں نے اس سے وہی سوال کیا تو اس نے آگے سے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں ارشد علی کا کلاس فیلو رہا ہوں کچھ عرصے سے اس سے رابطہ نہیں تھا آج اخبار میں یہ خبر دیکھی تو پتا چلا۔“

”آپ ان کے گھر سے بھی معلوم کر سکتے تھے۔“

”مجھے اس کے گھر کا نمبر نہیں معلوم، میں نے کہا۔ رابطہ ہوئے زمانہ ہو گیا ہے۔“

اس بار اس نے مجھے اسپتال کا نام بتا دیا اور ساتھ ہی اطلاع دی۔ ”کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔“

میں نے اب عبداللہ کو کال کی۔ ڈیوڈ سنا والی سم میں مرشد ہاؤس کال کرتے ہی نکال چکا تھا اور اب اپنی نارمل سم پر بات کر رہا تھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”ایاز کے ساتھ ایک گاڑی دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ کام ایاز پر چھوڑو اور نجف آباد کے پارک تک آجاؤ میں وہیں ملوں گا۔“

”خیریت؟“

”خیریت ہے، ایک اسپتال تک جانا ہے۔“ میں نے اسے اسپتال کا بتایا۔ ”وہاں مرشد کا چچا زاد بھائی

ارشد زیر علاج ہے اسے گولی لگی ہے۔ یہ راشد کا باپ ہے۔"

"میں سمجھ گیا میں بیس منٹ میں آجاؤں گا۔"

تین بجے گرمی شدت کی تھی اور گلیاں وردر تک سنسان تھیں۔ ایسے میں صرف وہی گھر سے باہر تھے جن کی مجبوری تھی۔ میں نے دھوپ سے بچنے کے لیے پی کیپ اور بڑا سن گلاس لگایا تھا اس سے میری صورت چھپ گئی تھی۔ کسی قدر ڈھیلی ٹی شرٹ تلے ایک اعشاریہ اڑتیس کا پستول تھا اور ایک چھوٹا کولٹ تھا۔ سفیر سو رہا تھا میں شاہ جی کو بتا کر نکلا اور ٹہلتا ہوا پارک کی طرف بڑھا۔ اس طرف جانے کا مقصد یہ اندازہ لگانا تھا کہ کوٹھی کی نگرانی تو نہیں ہو رہی تھی اور فوراً گلی کے کونے پر قلفی کی ریڑھی لگائے شخص نے مجھے متوجہ کیا وہ کہیں سے بھی قلفی بیچنے والا نہیں لگ رہا تھا۔ کسی قدر ہٹا کٹا اور صاف رنگت والا شخص تھا۔ جب میں مخالف سمت میں روانہ ہوا تو اس نے فوراً ریڑھی میرے پیچھے لگا دی۔ پھر کسی گھر سے اسے قلفی کے لیے آواز دی گئی تھی مگر وہ ان سنی کر کے میرے پیچھے آتا رہا۔ میرا شک پختہ ہو گیا کہ وہ میرے ہی پیچھے ہے۔

میں نے اپنی رفتار مزید سست کر لی۔ میں چاہتا تھا کہ جب پارک پہنچوں تو عبداللہ آ گیا ہو اور ہم فوری روانہ ہو جائیں اور نگرانی کرنے والے ناچتے رہ جائیں۔ مگر سست رفتاری کے باوجود پارک جلد آ گیا اور عبداللہ نہیں آیا تھا۔ میں ایک درخت کے سائے میں بینچ پر جا بیٹھا۔ عبداللہ کی منی پجیرو چند منٹ بعد نمودار ہوئی اور میں اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کے رکتے ہی میں سوار ہو گیا اور اس سے کہا۔ "جلدی نکلو ہماری نگرانی ہو رہی ہے۔"

عبداللہ نے وہیں سے جیپ گھمائی تو میں نے دیکھا قلفی والا شاید موبائل یا ریڈیو پر کسی سے بات کر رہا تھا یقیناً ہمارے بارے میں بتا رہا ہوں گا۔ اس کی کال کا نتیجہ ایک گلی سے سفید کار کی صورت میں نکلا اور وہ ہمارے پیچھے لگ گئی۔ قلفی والا سادہ تھا اور کار میں بیٹھے دو افراد بھی سپاہی لگ رہے تھے۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ "ان سے پیچھا چھڑانا ہو گا تب ہی ہم اسپتال کی طرف جا سکتے ہیں۔"

"کوشش کرتے ہیں۔" اس نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ لیکن منی پجیرو کا انجن زیادہ طاقتور نہیں ہوتا ہے۔ نئے ماڈلز میں یہ پھر بھی بہتر ہے پرانے ماڈلز میں تو چھوٹی سی انجن ہوتا تھا۔ اس کی رفتار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ پیچھے آنے والی کار زخیبر تھی اور اس کے مقابلے میں زیادہ طاقتور انجن اور پک اپ رکھتی تھی۔ اب عبداللہ سے کچھ کہنا بیکار تھا اسے یہ گاڑی رکھنی ہی نہیں چاہیے تھی۔

ہم فیض آباد سے نکل کر مری روڈ پر آئے اور راولپنڈی کی طرف بڑھے۔ پھر عبداللہ نے اچانک ہی جیپ بلال کالونی میں گھما دی۔ یہ متوسط درجے کی لیکن اچھی کالونی تھی جو لوگ اسلام آباد اور فیض آباد جیسی مہنگی جگہوں پر نہیں رہ سکتے تھے وہ بلال کالونی میں رہائش اختیار کرنا پسند کرتے تھے۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ "یہاں کہاں گھس رہے ہو یہاں گلیوں میں ان سے پیچھا چھڑا لیں گے کیا؟"

"آپ دیکھیں جناب میں کیا کرتا ہوں۔" عبداللہ نے کہا اور جیپ گھما کر کالونی کے پارک کے پاس لایا۔ اس نے پارک کا ایک چکر لگایا جیسے موقع دیکھ رہا ہو۔ پھر اس نے ایک تنگ گلی میں گاڑی گھسا دی۔ یہ تین مرلے والے گھر تھے اور یہاں گلیاں بہت تنگ تھیں۔ ایک گاڑی کھڑی کر دی جاتی تو اس کے بعد جگہ ملنی مشکل تھی۔ اب میں سمجھ گیا کہ عبداللہ کیا چاہ رہا تھا۔ آخر ایک گاڑی یوں کھڑی ملی کہ اس کے برابر سے جیپ بہ مشکل گزر سکتی تھی عبداللہ نے کسی نہ کسی طرح رگڑ کھا کر جیپ گزار لی۔ یہی نہیں اس نے آگے جا کر جیپ روکی اور ریورس میں لا کر اس پرانی ٹویوٹا کار کو یوں ٹکر ماری کہ وہ ترچھی ہو کر رہ گئی۔ جیپ کو نقصان ہوا تھا مگر دھماکے نے اندر تک اطلاع پہنچا دی تھی۔ جب تک ہم گلی کے کونے پر پہنچے اور خیبر آئی تب تک اہل خانہ اندر سے نکل آئے تھے۔ خیبر والا چاہ رہا تھا کہ انہیں راستہ دیا جائے مگر وہ اپنی گاڑی کے نقصان کا جائزہ لے رہے تھے۔

"کیسا رہا؟" عبداللہ نے وہاں سے نکل کر پوچھا۔

"شاندار لیکن جیپ کا بیڑا غرق ہو گیا۔"

"اس کی خیر ہے۔" وہ مری روڈ پر آتے ہوئے بولا۔ "اصل کام ہو گیا ہے۔"

کچھ آگے جا کر اس نے اسٹیڈیم روڈ سے جیپ اسلام آباد کی طرف موڑ لی کیونکہ اسپتال اسلام آباد میں تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ "اگر ارشد علی مر گیا تو مرشد کے راستے کا ایک کانٹا اور صاف ہو جائے گا۔"

"مرشد نے دشمنی کو پکا کر لیا ہے۔ ارشد کے تین بھائی اور ہیں اور پھر اس کے بیٹے بھی ہیں۔"

"گویا اسے بہت سے رشتے داروں سے لڑنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے امید ہے اس کے برے دن آ گئے ہیں۔"

"جناب برے دنوں سے کوئی فرق نہیں پڑے

گا۔" عبداللہ نے دبی زبان میں کہا۔" جب تک اس برائی کا خاتمہ نہیں کیا جائے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے مرشد جیسے لوگ جیتے جی اپنی فطرت نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن ہم اسے براہ راست نشانہ نہیں بنا سکتے۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور مارا جائے گا۔"

عبداللہ خاموش ہو گیا۔ بیس منٹ بعد ہم اسپتال میں تھے۔ یہاں شعبہ حادثات سے پتا چلا کہ ارشد علی کا آپریشن کر دیا گیا اور گولی نکال لی گئی مگر وہ آئی سی یو میں تھا۔ آئی سی یو میں جانے کی اجازت ویسے ہی نہیں تھی۔ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔" یہاں ڈاکٹروں اور خاص طور سے سرجنوں والا لباس کہاں ہوتا ہوگا۔"

"ابھی معلوم کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور قریب سے گزرتی ایک کیوٹ سی ڈھمر نرس کو روکا۔

"مس ایکسکیوز نی۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ سرجن انتظار حسین کہاں ہوں گے؟"

"سرجن انتظار ....." اس نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔" سوری میں نہیں جانتی۔"

"انہوں نے کہا تھا کہ وہ لباس تبدیل کرنے والے حصے میں ہوں گے سرجن لباس کہاں بدلتے ہیں؟"

"آپ اس راہداری میں چلے جائیں اس کے آخر میں آپریشن ایریا ہے وہیں چینج روم ہے۔"

ہم اس کا شکریہ ادا کر کے اس طرف روانہ ہوئے۔ آئی سی یو کے مقابلے میں آپریشن ایریا میں جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ لباس کی تبدیلی کی جگہ بھی آرام سے مل گئی۔ کمرے کے دروازے پر لکھا تھا۔ میں اور عبداللہ بے تکلفی سے اندر داخل ہوئے۔ وہاں صرف ایک سرجن تھا جو سرجری کا لباس اتار کر اپنا پہن رہا تھا۔ وہاں اسکرینیں لگی تھیں جن کے پیچھے لباس تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے اپنے سائز کے لباس منتخب کیے اور انہیں کپڑوں پر ہی پہن کر آئے۔ میں نے چہروں پر نقاب بھی لگا لیے۔ میں نے ٹی کیپ کمر میں اٹکالی تھی اور سن گلاس سر پر تھے۔ اسی ہیئت کذائی میں ہم آئی سی یو کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ کام توقع سے زیادہ آسان ہوا تھا۔ کسی نے نہ تو چیک کیا اور نہ روکا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔" تم کہیں وقت گزارو، جب تک میں ارشد علی سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔"

اس نے سر ہلایا۔" کسی خطرے کی صورت میں آپ کو خبردار کروں گا۔"

آئی سی یو پر تعینات گارڈ نے ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا اور آرام سے دروازہ کھول دیا۔ کسی سے ارشد علی کے بارے میں پوچھنے کا مطلب تھا کہ میں اپنا بھانڈا آپ پھوڑ دوں۔ اس لیے میں ایسے ہی مختلف کمروں میں جھانک کر دیکھنے لگا اگر مریض کے علاوہ کوئی اور نظر آتا تو میں سوری کر لیتا تھا۔ میں نے آج تک ارشد علی کو نہیں دیکھا تھا مگر مجھے امید تھی کہ اس کے نقوش میں مرشد کی جھلک دکھائی دے گی۔ بالآخر مجھے ایک مریض پر شبہ ہوا۔ وہ سرخ و سفید رنگ کا تقریباً پچیس برس کا شخص تھا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز تھا اور اس کی نتھنوں سے آکسیجن کی نلکی لگی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے اندر آیا اور اس کے سرہانے رکھا چارٹ اٹھا کر دیکھا اس پر ارشد علی لکھا تھا۔ میں نے مطمئن ہو کر اسے آہستہ سے آواز دی۔" ارشد ..... آنکھیں کھولو..... تم میری آواز سن رہے ہو۔"

اس نے کوئی ردعمل نہیں دیا مگر میں مستقل مزاجی سے اپنی بات دھیمی آواز میں دہراتا رہا۔ مجھے بارہا تجربہ ہوا تھا کہ بالکل بے ہوش آدمی کا لاشعور بھی بیدار ہوتا ہے اور وہ آوازیں سنتا ہے۔ اگر آوازیں مسلسل آئیں تو وہ شعور کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس بار بھی میرا تجربہ کامیاب رہا۔ چند منٹ بعد ارشد علی کی آنکھیں ہلنے لگیں اور پھر اس نے چونکنا شروع کیا۔ بالآخر وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں ہلکی سی دھندلاہٹ تھی۔ وہ مسکن دوا کے زیر اثر تھا اس لیے ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا اس لیے مجھے مزید پانچ دس منٹ کوشش کرنا پڑی تھی تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوا کہ میری بات سمجھ سکے۔ میں نے اس سے کہا۔" ارشد علی میں شہباز ملک ہوں.... مرشد کا دشمن .... جس نے تمہیں مروانے کی کوشش کی.... اب وہ تمہارے بیٹے راشد کو مروانا چاہتا ہے۔"

میرا یہ حربہ بھی کامیاب رہا۔ بیٹے کے نام نے اسے تڑپا دیا تھا اور وہ تیزی سے ہوش میں آ گیا۔ اس نے لڑکھڑائی آواز میں پوچھا۔" تم..... تم میں شہباز ملک ہو۔"

"یاد کرو میں نے ایک بار تم سے فون پر بات کی تھی۔" میں نے کہا اور اسے کچھ باتوں کا حوالہ دیا جو میں نے اس سے کی تھیں۔ اسے یاد آ گیا اور اس نے سر ہلایا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"ارشد میں بہت خطرہ مول لے کر یہاں آیا ہوں۔ صرف یہ بتانے کہ تمہارا بیٹا ارشد اور بہو رومانہ میرے پاس ہیں اور محفوظ ہیں۔ وہ مرشد سے بچے ہوئے ہیں،

تھے۔"

"شکر ہے میرے مالک... شکر ہے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ "ورنہ ہم نے تو اپنے طور پر اسے بچھڑا ہوا سمجھ لیا تھا۔"

"ایک اتفاق کے تحت وہ میرے پاس آیا اور اب میں اس کی حفاظت کروں گا۔ لیکن ارشد تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔"

"کیسا تعاون؟" وہ کسمسایا۔ وہ جس طرح بات کر رہا تھا اب لگ رہا تھا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر آ گئی تھی یا ڈاکٹروں نے اسے مسکن دوا پر رکھا ہوا تھا تکلیف سے بچانے کے لیے۔ دوسری بات کچھ دیر بعد درست ثابت ہونے لگی۔

"تمہیں کس نے گولی ماری ہے؟"

"مرشد نے۔" اس نے انکشاف کیا۔ "وہ اپنے بدمعاشوں کے ساتھ ہمارے گھر گھس آیا تھا۔ وہ دو ماتہ کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میری اس سے تلخ کلامی ہوئی اور اس نے اچانک پستول نکال کر گولی چلا دی۔"

"تمہارے ساتھ بھی محافظ ہوں گے انہوں نے کچھ نہیں کیا؟"

"مرشد کے آدمیوں نے انہیں پہلے ہی بے بس کر دیا تھا۔"

"صرف یہی ایک معاملہ تھا؟"

"نہیں اس کا کہنا ہے کہ دوگا میں ہونے والی تباہی اور اسلحہ پکڑے جانے میں ہمارا ہاتھ ہے۔"

"تم لوگ اب دوگا کے معاملات میں شامل ہو؟"

"بالکل نہیں، شدو کے مرنے کے بعد مرشد نے ہمیں بے دخل کر دیا ہے۔ اب ہم وہاں قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔ ہم بھائیوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہاں سے کوئی تعلق بھی نہیں رکھیں گے۔ مگر راشد نے دو ماتہ کو بھگا کر معاملہ خراب کر دیا۔"

"اب مرشد کا کیا ردعمل ہوگا؟"

"تم دیکھ نہیں رہے ہو۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "مجھے گولی مارنے کے بعد اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر دو دن کے اندر دو ماتہ واپس نہیں آئی تو ہم چاروں بھائیوں کو پورے خاندان سمیت نیست و نابود کر دے گا۔"

"وہ ایسا ہی شخص ہے۔" میں نے کہا۔ "ارشد وقت آ گیا ہے کہ تم میرا ساتھ دو.... ہم اس موذی سانپ کا سر ہمیشہ کے لیے کچل سکتے ہیں۔"

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ "تم اصغر سے بات کرو۔ یہ مجھ سے چھوٹا بھائی ہے۔ وہ سب سے زیادہ جرأت مند بھی ہے۔"

ارشد نے مجھے بھائی کا نمبر دیا۔ اس دوران میں وہ بے چین ہو رہا تھا پھر اس نے کراہنا شروع کر دیا۔ جب وہ نمبر بتا رہا تھا تو اس کی کراہیں خاصی بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ میں نے جلدی سے اس کے سرہانے لگا ایمرجنسی کال کا بٹن دبایا اور باہر نکل آیا۔ چند لمحے بعد ایک ڈاکٹر اور ایک نرس نمودار ہوئی اور تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ عبداللہ ایک طرف موجود تھا۔ اس نے اشارہ کیا اور ہم دونوں تیزی سے باہر نکل آئے۔ آپریشن ایریا کی طرف جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ پرائیویٹ وارڈ کے ایک خالی کمرے میں ہم نے سرجنوں والا لباس اور نقاب اتار کر وہیں ڈالا اور اپنے اصل حلیے میں ٹہلتے ہوئے آرام سے باہر نکل آئے۔ عبداللہ نے باہر آ کر پوچھا۔ "کیا بات ہوئی؟"

میں نے اسے خلاصہ سنایا۔ وہ خوش ہو گیا۔ "یہ اچھا ہوا کہ ہمارے پاس ایک موقع آیا۔ ہم مرشد کے شریکوں کو پوری طرح اکسائیں گے اور انہیں اپنی مدد کا یقین دلائیں گے۔"

"بالکل تصادم جتنا زوردار ہوگا ہمارے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اب ذرا بھگوال کی طرف چلا جائے۔"

"وسیم ساری پی پی کو لے کر جا چکا ہوگا۔"

"ہاں اس نے کہا تھا کہ یہ کام آج ہی نمٹا دے گا۔ ہم ذرا راشد سے بات کر لیں گے۔"

مری ہائی وے پر شمال کی طرف جانے والوں کا رش تھا۔ خاص طور سے بہارہ کہو میں تو ٹریفک جام ہو رہا تھا۔ بہ مشکل ہم وہاں سے نکلے اور سملی ڈیم روڈ سے ہوتے ہوئے بھگوال پہنچے۔ موسم یہاں بھی گرم تھا مگر کسی قدر بلندی کی وجہ سے اس کی شدت کم تھی۔ حویلی جنگل کنارے تھی اس لیے وہاں ٹھنڈک کا تاثر تھا۔ وسیم کے کم سے کم نصف درجن آدمی جنگل میں غوطے لگا رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی گیٹ پر موجود محافظوں نے گیٹ کھول دیا۔ میں ایک بار پہلے بھی یہاں آیا تھا مگر بہت تھوڑے وقت کے لیے۔ آج مجھے تفصیل سے حویلی دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ پرانے طرز تعمیر کی لیکن خاصی عالی شان حویلی تھی۔ اس میں نچلے حصے میں دس بارہ بڑے کمرے تھے جن میں سے دو تو ہال نما تھے۔ اوپر بھی چھ سات

کمرے تھے۔ بظاہر تہ خانہ تھا اور قیدی اسی میں رکھے جاتے تھے مگر رومانہ کی وجہ سے ان دونوں کو اوپری حصے کے ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔

یہ بات مجھے اچھی لگی۔ رومانہ بے شک مرشد جیسے شیطان کی بیٹی تھی لیکن وہ عورت ہونے کے ناطے لائق احترام تھی۔ میں اور میرے ساتھی اس کے ساتھ کوئی غلط سلوک کرنا تو ایک طرف رہا اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وسیم ساوتی کو لے کر جا چکا تھا۔ اس نے چار آدمی ساتھ لیے تھے اور باقی سب یہاں موجود تھے۔ چھانٹی کے بعد اس نے مشکوک افراد کو نکال کر نئے آدمی رکھے تھے۔ ان کی تعداد دو درجن تھی اور یہ سب لڑنے مرنے والے تربیت یافتہ لوگ تھے۔ وسیم کی عدم موجودگی میں رئیس الدین نامی شخص ان کا انچارج تھا۔ وہ تقریباً تیس برس کا خوش شکل اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اس نے نئے آنے والوں کا تعارف کرایا۔ سب مجھ سے ملنے کے مشتاق تھے اور بعض تو عقیدت مندانہ طور پر ملے۔ ملاقات کے مرحلے سے گزر کر ہم اندر آئے۔

یہاں بجلی تھی مگر لوڈ شیڈنگ کا سلسلہ جاری تھا جس کے تدارک کے لیے ایک طاقتور جنریٹر موجود تھا۔ اس لیے اندر اے سی چل رہے تھے۔ ہماری خاطر تواضع لسی اور پیڑوں سے کی گئی۔ پھر جامن اور شہتوت پیش کیے گئے جو حویلی کی پیداوار تھے۔ یہاں انجیر اور بیر کے پیڑوں کا ایک باغ بھی تھا۔ رئیس نے کھانے کا پوچھا لیکن میں نے فی الحال منع کر دیا اور رئیس سے پوچھا۔ ”ان دونوں کو کہاں رکھا ہے؟“

”اوپر جناب ایک بیڈ روم دیا ہے۔ پورا خیال رکھ رہے ہیں۔“

”یہ اچھی بات ہے میں راشد سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ابھی بلواتا ہوں۔“ اس نے کہا اور ایک آدمی کو اشارہ کیا جو وہیں موجود تھا۔ ”اوپر جا کر راشد کو لے آؤ۔“

وہ دس منٹ بعد راشد کو لے آیا۔ رئیس عقل مند آدمی تھا راشد کے آنے کے بعد وہ اپنے آدمیوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔ مجھے کہنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ راشد متفکر لگ رہا تھا۔ میں نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”پہلے تو مجھے تم کو ایک افسوسناک خبر سنانی ہے۔ تمہارے پاپا ارشد علی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور وہ شدید زخمی حالت میں اسپتال میں داخل ہیں۔“

”نہیں۔“ وہ بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ ”کب ...... کیسے؟“

”یہ تو مجھے بھی علم نہیں ہے لیکن یہ واقعہ گزشتہ چوبیس گھنٹے کے دوران میں ہوا ہے۔ ارشد علی سے میں خود مل کر آ رہا ہوں۔ اس کا آپریشن ہو گیا ہے اور وہ آئی سی یو میں ہے۔“

راشد کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ ”یہ یقیناً مرشد کا کام ہے۔“

”جو تمہارا چچا اور سسر بھی ہے۔“ عبداللہ نے لقمہ دیا۔

”مت کہیں اسے میرا رشتے دار۔“ اس نے بھڑک کر کہا۔ ”اگر پاپا کو کچھ ہوا تو میں......“

”تم بھول رہے ہو وہ رومانہ کا باپ ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”کیا تم اس کی پروا بھی نہیں کرو گے؟“

راشد کا لہجہ مدھم ہوا تھا مگر اس میں نفرت موجود تھی۔ ”وہ اپنے باپ سے نفرت کرتی ہے۔“

”کوئی لڑکی اپنے باپ سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کرے بہر حال وہ اس کی موت گوارا نہیں کرے گی۔“ میں راشد کو ٹیسٹ کر رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اگر اسے مرشد کے خلاف موقع ملے تو وہ کس حد تک جا سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے سسر کا کام تمام کر سکتا تھا تو یہ بھی اچھی بات تھی۔

”اس صورت میں، میں رومانہ کو چھوڑ دوں گا۔“ اس نے حتمی انداز میں کہا اور پھر مجھ سے ملتجی لہجے میں بولا۔ ”آپ نے پاپا کو دیکھا وہ کیسے تھے آپ کی بات ہوئی ان سے؟“

”ہاں بات ہوئی اور ارشد نے بتایا کہ اس پر گولی مرشد نے چلائی تھی۔ وہ اپنے گرگوں سمیت تمہارے گھر میں گھسا تھا اور رومانہ کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اسی دوران میں دونوں طرف سے گرما گرمی ہوئی اور مرشد نے گولی چلا دی جو تمہارے پاپا ارشد علی کی ریڑھ کی ہڈی میں لگی۔ اس کا آپریشن ہو گیا ہے مگر اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں اس کمینے کو چھوڑوں گا نہیں۔“

”لیکن ایک حقیقت ہے جسے تم نظر انداز کر رہے ہو۔ مرشد بہت طاقتور ہے۔ اس کے پاس بے شمار عقل کے اندھے مرید اور خطرناک اشتہاری مجرم ہیں جو اس کے اشارے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ کیا تم لوگوں کے پاس اتنی قوت ہے کہ اس سے لڑ سکو۔“

راشد مرجھا گیا تھا۔ ”نہیں...... پہلے ہم بھی گدی کے معاملات میں شامل تھے تو ہماری بھی چلتی تھی لیکن جب مرشد

نے ہمیں بے دخل کیا تو ہماری طاقت بہت کم ہو گئی۔"

میں اس کی بات سمجھ رہا تھا، پہلے بے لگام اندھے مریدوں کی طاقت میں ان کا بھی شیئر تھا۔ اسی طرح گدی کی بے محابا آمدنی میں بھی انہیں ملتا تھا مگر اب وہ ان دونوں چیزوں سے محروم ہو گئے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی گئے گزرے تھے۔ دولت کی ان کے پاس بھی کمی نہیں تھی مگر ان کے پاس وہ ذہن نہیں تھا جو مرشد کے پاس تھا اور جسے صرف اپنا مفاد عزیز تھا۔ اس پر وہ بھائی کو بھی قربان کر سکتا ہے اور بیٹی کو بھی، ورنہ اس کی بیٹی کے لیے اس کے چچا کے گھر سے اچھا گھر اور کون سا ہو سکتا تھا۔ میں راشد کی بات پر چونکا وہ کہہ رہا تھا۔ "پلیز مجھے جانے دیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم قطعی محفوظ نہیں ہو مرشد کے ہزاروں مرید تمہیں تلاش کر رہے ہیں اور مرید یہ تمہارے پورے خاندان کو یعنی بچاؤں سمیت پورے خاندان کو مرشد نے برے انجام کی دھمکی دے دی ہے۔"

"خود اس کے برے دن قریب آ رہے ہیں۔" راشد نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ سمجھتا ہے کہ خاندان کو کاٹ کر خود اکیلے حکومت کرے گا۔ یہ خاندان کی قوت تھی جو وہ اس مقام پر پہنچا۔"

"میں تم سے متفق ہوں لیکن فی الحال طاقت کا توازن اس کے حق میں ہے اور تم لوگوں کی بچت اسی میں ہے کہ اس سے دور رہو۔ ابھی تم لوگوں کو خود کو مضبوط بنانا ہے اور ایسے اتحادی تلاش کرنے ہیں جو مرشد کے خلاف تمہاری مدد کر سکیں۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "آپ بھی تو مرشد کے دشمن ہیں۔"

"ہاں لیکن فی الحال میں تم لوگوں کا اتحادی بھی نہیں ہوں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "ہمارے درمیان دشمنی نہیں ہے لیکن فی الحال دوستی بھی نہیں ہے۔"

"دوستی ہو تو سکتی ہے۔"

"تم ابھی بچے ہو.... ان معنوں میں نہیں.... کیونکہ تم اپنی مرضی سے شادی تک کر چکے ہو۔ مگر اپنے بڑوں کے آگے بچے ہی ہو۔ اس لیے تمہاری بات کی اہمیت نہیں ہو گی۔"

"آپ میرے بڑوں سے بات کر سکتے ہیں۔"

"ارشد علی نے اپنے چھوٹے بھائی اصغر کا نمبر دیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے بعد اسی کی اہمیت ہے؟"

راشد نے تائید کی۔ "بالکل اہم میں اصغر چچا ہی بابا کے بعد اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ شروع دن سے مرشد کے خلاف تھے اور ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے گدی میں اپنا حصہ برقرار نہ رکھا تو مرشد ایک دن ہمیں نکال باہر کرے گا اور ایسا ہی ہوا۔"

"میں اصغر سے بات کرنے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کا نمبر دہرایا۔ "کیا یہ اس کا پرانا نمبر ہے؟"

راشد نے سر ہلایا۔ "خاصا پرانا.... میرا خیال ہے ان کے پاس شروع سے یہی نمبر ہے۔"

میں نے اصغر کا نمبر ملایا۔ چند بیل کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی۔ میں نے بلا تمہید کہا۔ "اصغر میں شہباز ملک بات کر رہا ہوں تمہارا یہ نمبر محفوظ نہیں ہے۔ میں جس نمبر سے کال کر رہا ہوں اس پر کوئی ایسا نمبر ایس ایم ایس کرو جو محفوظ ہو یعنی تمہاری استعمال میں نہ ہو۔"

"شہباز ملک۔" اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "تم بھائی جان سے ملنے گئے تھے۔"

"ہاں انہی نے مجھے تمہارا نمبر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "نمبر بھیجو مگر اسی محفوظ نمبر سے بھیجنا اپنے نمبر سے نہیں۔"

میں نے کال کاٹ دی اور راشد کی طرف دیکھا۔ "اس تک اطلاع پہنچ گئی ہے کہ میں ارشد سے ملا ہوں۔"

"یہ تو موبائل نمبر ہے یہ کیسے غیر محفوظ ہو سکتا ہے؟" راشد نے تعجب سے پوچھا۔

"تم نہیں سمجھو گے اس کی آبزرویشن تو اور آسان ہے خاص طور سے مرشد جیسے لوگوں کے لیے۔" میں نے کہا۔ ایک منٹ بعد ہی ایک اجنبی نمبر سے کال آنے لگی۔ میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف اصغر ہی تھا۔

"بہت برا ہوا ہے۔" اس نے بھرائے لہجے میں کہا۔ "تمہارے جانے کے بعد بھائی جان کی حالت بگڑ گئی اور وہ...." اصغر رونے لگا تھا

میں نے بے ساختہ انا اللہ پڑھی تو راشد کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اضطراری انداز میں میرے پاس آ گیا۔ میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے پاس بٹھا لیا اور اصغر سے کہا۔ "مجھے سچ مچ افسوس ہو رہا ہے۔"

اصغر نے خود پر قابو پاتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا۔ "ہم اتنی مشکل میں ہیں کہ اپنے بھائی کی لاش بھی لینے خود نہیں جا سکتے۔ کوٹھی سے باہر جانے والوں کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی ہے۔ دور کے کچھ رشتے دار لاش لینے

گئے ہیں۔"

"تم نے پولیس سے تحفظ مانگا ہے۔"

"اس علاقے کی پولیس تو مرشد کی غلام ہے یوں سمجھو کہ وہ اس کے وردی والے مرید ہیں۔ تم نے ایک واقف کار ایس پی سے بات کی ہے ممکن ہے ہمیں جنازے کے لیے پولیس گارڈ مل جائے۔"

"تم نے مجھے بری خبر سنائی ہے لیکن میرے پاس ایک اچھی خبر ہے۔ تمہارا بھتیجا راشد میرے پاس ہے اور بالکل محفوظ ہے۔"

"راشد تمہارے پاس ہے۔" اس نے بے یقینی سے کہا۔ "کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟"

"بالکل تو بات کرو۔" میں نے موبائل راشد کو تھما دیا اور اس نے اصغر سے بات کرنے کے بجائے رونا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ میں وہیں رہا لیکن اس کی دھاڑوں میں مداخلت نہیں کی۔ اسے اپنے باپ کا سوگ منانے کا حق تھا۔ عبداللہ خاموش بیٹھا تھا آوازیں سن کر رحیمن نے اندر جھانکا تھا مگر سب معمول کے مطابق پا کر واپس چلا گیا۔ یعنی ہم آرام سے بیٹھے تھے۔ اس لیے راشد کا رونا دھاڑنا اس کے لیے بے معنی تھا۔ چند منٹ بعد راشد کا رونا سسکیوں میں بدل گیا۔ پھر اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔

"چچا اصغر کچھ کہہ رہے ہیں۔"

اصغر نے مجھ سے کہا۔ "یہ نادان لڑکا گھر آنے کی بات کر رہا ہے جو ان حالات میں بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ مرشد کے کتے پاگلوں کی طرح اس کی اور روما کی تلاش میں ہیں۔"

"میں تم سے متفق ہوں۔ اس کا جنازے میں جانا بالکل مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا اور کال کاٹ کر موبائل بند کر دیا۔

"نہیں میں اپنے باپ کے جنازے میں جاؤں گا۔" راشد نے زور سے کہا اس کی آنکھیں اور ناک ذرا سی دیر میں سرخ ہو گئی تھیں۔ "میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"یہ تمہارے بڑوں کا فیصلہ ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "ارشد کے بعد اب اصغر اور دوسرے ہی تمہارے بزرگ ہیں۔ کیا تم ان کا فیصلہ ماننے سے انکار کر رہے ہو۔"

اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ "میں کتنا بدبخت بیٹا ہوں جو باپ کے جنازے کو کندھا بھی نہیں دے سکے گا۔"

"دنیا میں ایسے بہت واقعات ہوتے ہیں اور کندھا نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ تمہیں اپنے باپ سے محبت نہیں ہے۔ مرشد تمہاری جان کا دشمن ہو رہا ہے اسے معلوم ہے کہ تم جنازے میں شریک ہونے کی پوری کوشش کرو گے اس لیے اس کے قاتل وہاں موجود ہوں گے۔ اگر تم مارے گئے تو یہ مرشد کی ایک اور فتح ہوگی جب کہ تمہیں ابھی اس سے اپنے باپ کا انتقام لینا ہے۔"

"میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے دانت پر دانت جما کر کہا۔

"اس کے لیے ضروری ہے تم خود بھی زندہ رہو۔ مرشد میرے بھائی کا قاتل ہے۔ اگر میں تمہاری طرح جذباتی ہو کر اسے قتل کرنے کی کوشش کرتا تو اب تک خود قبر میں ہوتا۔ میں بھی اپنے بھائی کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔"

"پر میں کیا کروں میرے اندر ایک آگ سی لگ گئی ہے۔"

"اسے سنبھال کر رکھو یہی آگے تمہارے کام آئے گی۔" میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ "اب تم آرام کرو اور ہاں مجھے امید ہے کہ روما سے تمہارا رویہ تبدیل نہیں ہوگا۔ اس کا سوائے اس کے اور کوئی قصور نہیں ہے کہ وہ مرشد کی اولاد ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں اور میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اگر نہیں کرتا تب بھی اتنا گھٹیا پن نہیں کر سکتا کہ اس کے باپ کا بدلہ اس سے لوں۔"

میں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ "فی الحال تم یہیں رہو باہر جانے سے گریز کرو۔ جن لوگوں کا سیٹ اپ ہے وہ اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ تم یہاں کی لوکیشن سے واقف ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔"

"سمجھ رہا ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔ "میں اور روما کمرے تک رہیں گے۔"

"گڈ یہاں تم کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اگر مرشد کی طرف سے سراغ لگانے کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہیں رابطے کے لیے کوئی موبائل بھی دے دیتا مگر یہ بہت رسکی ہے۔ کئی بار مجھے بھی اسی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا کہ موبائل ٹریس ہو گیا یا کال پکڑی گئی تھی۔ یہ وقت صبر سے گزارو اللہ نے چاہا تو تمہیں اس کا اچھا ہی صلہ ملے گا۔"

میں اور عبداللہ باہر آئے اور واپس شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔ "تم نے مزید کوئی بندوبست کیا ہے۔ میری مراد کسی اور رہائش سے ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ ”ادھر آبپارہ میں ایک فلیٹ لیا تھا مگر اسے استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ ویسے ہی پڑا ہوا ہے۔ فرنشڈ ہے مگر چھوٹا ہے۔“

”کتنا بڑا ہے؟“

”دو بیڈ روم ہیں اور ایک لاؤنج ہے۔“

”ہم تین کے لیے کافی ہیں۔“ میں نے کہا اور سفیر کو کال کی۔ ”وہاں سے نکل آؤ مگر خیال سے نگرانی ہو رہی ہے۔ ڈاج دے کر آنا۔“

”کہاں آنا ہے؟“

”آبپارہ کی طرف آجاؤ۔“

”اور یہ جو سامان ہے یہاں۔“ سفیر نے کہا اس کا اشارہ اسلحے کی طرف تھا۔

”ہلکا پھلکا ساتھ رکھ لو باقی شاہ جی کے حوالے کر کے آجاؤ۔“

شام کا وقت تھا۔ عبداللہ نے جناح سپر مارکیٹ کے پاس گاڑی روکی۔ دن کی گرمی کے بعد اب موسم بہتر تھا اور اسی وجہ سے مارکیٹ کے کھانے پینے والے حصوں میں رش شروع ہو گیا تھا۔ عبداللہ میرے اور اپنے لیے آئسکریم فالودہ لے آیا۔ اس وقت مجھے ایسی کسی ٹھنڈی چیز کی طلب ہو رہی تھی۔ ہم گاڑی میں ہی اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔ عبداللہ نے پوچھا۔ ”کیا خیال ہے ان لوگوں کی مدد کی جائے؟“

”فی الحال صرف زبانی کلامی۔“ میں نے کہا۔ ”کہنے سے یہ ہمارے حلیف نہیں بن جائیں گے اور مسئلہ ہے گدی کے دشمنوں کا۔ مرشد نے اپنے عقیدت مندوں میں ہمیں گدی کا دشمن بنا دیا ہے اس لیے جو بھی آئے گا وہ ہم سے دشمنی نبھانے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لیے ہم ان پر بھی بھروسا نہیں کر سکتے ہیں۔“

”میں سمجھ گیا۔“ عبداللہ بولا۔ ”ہمیں جو کر رہا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر اور اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر کرنا ہے۔“

”بالکل، مرشد کا خاندان اعتبار کے لائق نہیں ہے۔ ابھی ان پر مشکل آئی ہے تو یہ مظلوم بن رہے ہیں ورنہ ان کی فطرت بھی مرشد سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہو گی۔ جب گدی ان کے ہاتھ میں آئے گی تو یہ بھی وہی سب کریں گے جو مرشد کرتا آیا ہے۔“

”میرا خیال ہے ہمارے لیے ایک موقع ہو گا۔ مرشد کے گرگے جنازے کے موقع پر موجود ہوں گے اور ہم ان کو تاڑ سکتے ہیں۔“

میں نے عبداللہ کی بات پر غور کیا۔ ”تمہارا مطلب ہے ہمیں وہاں موجود ہونا چاہیے۔“

”ہمیں نہیں کیونکہ ہم جانے پہچانے لوگ ہیں۔ ہاں ہمارے آدمی ان کے لیے اجنبی ہوں گے وہ عام لوگوں کی طرح جنازے میں شریک ہو سکتے ہیں۔“

”ایسا ممکن ہے لیکن کسی گڑبڑ یا مار دھاڑ کی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔“

”صرف اپنا بچاؤ۔“ عبداللہ نے تجویز کیا۔ ”الجھنے سے ان کے پکڑے جانے اور شناخت سامنے آنے کا مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

”گڈ یہ تجویز قابلِ غور ہے۔“ میں نے کہا اور موبائل نکال کر اصغر علی کو کال کی۔ اس کی بجائے کسی اور نے کال ریسیو کی۔ ”اصغر سے بات کراؤ۔“

”آپ کون ہیں جی؟“ بولنے والے نے دیہاتی لہجے میں کہا۔

”الیاس ملک۔“ میں نے جواب دیا اصغر سمجھ جاتا کہ الیاس سے مراد شہباز ہے۔ وہ ایک منٹ بعد کال پر تھا میں نے پوچھا۔ ”جنازہ کب ہو گا؟“

”پرسوں جمعے کے بعد دوپہر میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیا تم آؤ گے۔“

”مرشد کا ہر آدمی مجھے پہچانتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا راشد سے بات ہو سکتی ہے اس کی ماں تڑپ رہی ہے۔“

”مجھے اس کے دکھ کا احساس ہے مگر یہ بہت رسکی ہو گا۔ مرشد اس کی تلاش میں ہے اور ہماری ذرا سی بے احتیاطی سے وہ اس کا سراغ لگا لے گا۔ دوسری بات یہ کہ اب میں اس جگہ نہیں ہوں، جب جاؤں گا تو راشد سے بات کرا دوں گا۔“

”میں سمجھتا ہوں مگر بھابی یہ بات سمجھنے کو تیار نہیں ہے۔“

”اسے بہلاتے رہو۔ راشد اور رومانہ جہاں ہیں وہ بالکل محفوظ ہیں۔“

”رومانہ۔“ وہ غرایا۔ ”یہ سارا عذاب اس لڑکی کی وجہ سے آیا ہے۔“

”اس معاملے میں راشد برابر کا فریق ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”وہ نادان لڑکا ہے۔ اسے اس لڑکی نے پھنسایا ہے۔ ہم نے راشد کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس پر

رومانہ کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔" اصغر کے لہجے کا بغض بتا رہا تھا کہ وہ اور بانی خاندان رومانہ کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتا ہے۔

"بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔"

"نہیں جواب ہو گا وہ دنیا دیکھے گی۔" اصغر کا لہجہ خطرناک ہو گیا۔ "ہم بھائی جان کی قبر کی مٹی سوکھنے نہیں دیں گے۔"

خواہش تو میری بھی یہی تھی کہ مرشد خاندان آپس میں لڑ مرے۔ لیکن زبانی کلامی میں نے اسے ٹھنڈا رہنے کو کہا۔ بہر حال وہ بجھنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ جب وہ کہے تو ہم راشد کو اس کے حوالے کر دیں۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "ظاہر ہے وہ اب قید میں نہیں ہے لیکن میں پھر کہوں گا وہ محفوظ جگہ ہے۔"

"میں بھی تب ہی سمجھوں گا جب اس کی حفاظت خود کر سکوں۔" اصغر نے جواب دیا۔ "شہباز ہم تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"فی الحال یہ مشکل ہے کیونکہ میں خود چھپتا پھر رہا ہوں صرف مرشد نہیں میرے اور دشمن بھی ہیں۔"

"تم موقع نکال سکتے ہو۔" اس نے اصرار کیا۔ "مرشد کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔ تمہارے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی۔"

"یہ تو ہے لیکن میں عجلت میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔" میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "مجھے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے تم مشورہ کر لو پھر بات کرتے ہیں۔" اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اسی لمحے موبائل نے بیل دی یہ سفیر تھا اور اس نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔

"کہاں مصروف تھا میں دس منٹ سے کال کر رہا ہوں۔"

"بتاؤں گا تو کہاں ہے؟"

"آبپارہ پہنچ گیا ہوں، ایک ٹیکسی میں ہوں۔"

"بس تو اسی کے ساتھ جناح سپر آجا۔ ہم یہیں ہیں۔ عبداللہ کی گاڑی میں۔"

"آرہا ہوں۔" سفیر نے کہا اور کال کاٹ دی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ وہ بھی وہاں سے نکل آیا تھا۔ دس منٹ بعد وہ ایک ٹیکسی سے اترا اور سڑک پار کر کے پارک میں کھڑی ایک منی پجیرو کی طرف بڑھا۔ یہ عبداللہ جیسی تھی مگر ہم تو مخالف سمت سے میں سفیر کو کال کرنے جا رہا تھا کہ میری نظر ٹیکسی والے پر گئی اور میں چونکا۔ یہ وہی ٹیکسی والا تھا جو میرے پیچھے آیا تھا۔ میں نے جلدی سے سفیر کو کال کی اور اس نے ریسیو کی کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ جیپ خالی ہے اور اب اسے ہماری تلاش تھی۔ سفیر نے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کہاں ہو؟"

"احمق آس پاس مت دیکھ... تو نگرانی کرنے والے کو ساتھ لگا لایا ہے۔"

سفیر چونکا۔ "کیا مطلب؟"

"یہی ٹیکسی والا تو نگرانی کر رہا تھا۔ پہلے قلفی بیچ رہا تھا اور اب ٹیکسی والا بن گیا۔"

"تب ہی تو میں حیران ہوا کہ میں اتنی آسانی سے کیسے نکل آیا اور ٹیکسی والے کو ویران سڑکوں پر گھماتا رہا۔" سفیر نے خفت سے کہا۔ "مجھے کیا پتا تھا کہ میں نگرانی کرنے والے کو ہی ساتھ لے آیا ہوں۔"

"وہ بھی دل میں ہنس رہا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "بہر حال واپس جا اور اسے کسی بہانے پر لے کر یہاں سے نکل۔"

"کہاں جاؤں....؟"

"باہر نکل بار پھر اسے جیپ میں منتقل کر لیں گے ہم تیرے پیچھے ہیں۔"

سفیر نے سر ہلایا اور دوبارہ ٹیکسی والے کی طرف بڑھا جو بہ ظاہر تو کسی گاہک کا انتظار کر رہا تھا مگر درحقیقت وہ سفیر کی نگرانی کر رہا تھا۔ سفیر نے اس سے کچھ بات کی اور دروازہ کھول کر پیچھے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی حرکت میں آئی اور عبداللہ نے جیپ اسٹارٹ کی۔ ہم اس کے پیچھے روانہ ہوئے تھے۔ عبداللہ نے مجھ سے پوچھا۔ "اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟"

میں نے سر ہلایا۔ "اسے بھگوال پہنچانا ہے۔"

عبداللہ مسکرایا۔ "آج کے دن ہی دوسرا ٹرپ ہو گا۔"

"جگہ بری نہیں ہے یہاں تو بہت گرمی ہے۔"

کچھ دیر بعد ٹیکسی اسلام آباد کے جی سکس سیکٹر سے کشمیر ہائی وے اور مری ہائی وے کو ملانے والے لنک پر مڑ گئی۔ اس سڑک پر کچھ آگے راول ٹاؤن تھا۔ سفیر عقل مندی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ہائی وے پر رش ہوتا ہے اور کسی بھی ہنگامی صورت حال میں فوراً پولیس آجاتی ہے۔ اس لیے وہ کوئی عام علاقہ ہی مناسب تھا۔ ٹیکسی راول ٹاؤن کے پاس سے

ہوتی لکھوال کی طرف مڑ گئی اور پھر ایک مناسب جگہ رک گئی۔ مناسب یوں کہ وہاں سڑک کے دونوں طرف جھاڑیاں تھیں اور سڑک سنسان تھی۔ شام کے جھٹ پٹے میں منظر دھندلا رہا تھا۔ میں اور عبداللہ اتر کر ٹیکسی تک آئے جہاں ڈرائیور دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے بیٹھا تھا میں نے اسے دروازہ کھول کر نیچے کھینچ لیا۔ "بیٹے اب آئے ہو نا چکر میں۔"

سفیر نے اسے پہلے ہی ہینڈز اپ کیا ہوا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی اس کے پاس سے ایک عدد پستول، ایک موبائل اور ایک چھوٹا سا وائرلیس نما آلہ نکلا تھا۔ میں نے موبائل اور وائرلیس کی دونوں کی بیٹریاں نکال لیں۔ اس کے علاوہ بھی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ اس کے پاس سے مزید کچھ نہیں نکلا تھا مگر مجھے خدشہ تھا کہ اس کے جسم میں بھی فاضلی کی طرح کوئی نشان دہی کرنے والا آلہ نہ چھپا ہو۔ ٹیکسی اس کی اپنی تھی کیونکہ بک میں اسی کا نام تھا اور اس کے پاس آئی ڈی کارڈ اور شناختی کارڈ بھی تھا۔ مجھے ذرا تعجب ہوا کیونکہ اس قسم کے کام کرنے والے شناختی کاغذات لے کر نہیں پھرتے ہیں۔ اس کا نام سبحان شار تھا۔ نقوش سے وہ کشمیری لگ رہا تھا۔ ہم نے اسے جیپ کے پچھلے حصے میں بٹھایا۔ اس کی ٹیکسی لاک کر کے وہیں چھوڑ دی گئی۔ سفیر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہمارا رخ ایک بار پھر ہجگوال کی طرف تھا۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں جانتا ہوں تم کن کے لیے کام کرتے ہو۔ کیا تمہیں کسی قسم کا کوئی انجکشن لگایا گیا تھا؟"

اس کے چہرے پر ایک لمحے کو حیرت نظر آئی مگر اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ میں نے گہری سانس لے کر رئیس الدین کو کال کی۔ "ایک بندہ لا رہے ہیں اسے چیک کرنا ہے اس کے جسم میں کوئی بگ نہ ہو۔"

"کوئی بھی بگ ہوا تو اسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ اسے لے آئیں۔"

مگر مجھے یہ کام رسکی لگا تھا۔ اگر اس کے جسم میں موجود بگ ایکٹو تھا تو اس کی مدد سے آخری لوکیشن کا پتا کیا جا سکتا تھا میں نے رئیس سے کہا۔ "تم بندہ سامان سمیت پیچھے سڑک پر بھیج دو ہم آ رہے ہیں۔"

"جیسا آپ کہیں جناب..... بندہ ابھی دو منٹ میں نکلتا ہے۔"

سورج ڈوبنے کے بعد اندھیرا چھا رہا تھا۔ ہم کچی ذیم سڑک پر کچھ دیر بعد مخالف سمت سے ایک گاڑی نمودار ہوئی۔

واقدی

نامور مورخ، محدث حدیث، فقہ اور احکام۔

نام محمد بن عمر واقدی کنیت عبداللہ۔ 130ھ بمطابق 745ء میں مدینے میں پیدا ہوئے۔ ذاتی کتب خانہ کھول رکھا تھا اور کتابوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے دو ملازم مستقل رکھے ہوئے تھے۔ دو ہزار کتابیں انہوں نے مرنے سے قبل ہی بیچ دیں۔ باقی چھ سو صندوقوں میں بھری تھیں۔ کتابوں کی کل تعداد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر صندوق کو کم از کم دو آدمی اٹھا سکتے تھے۔ اٹھتر برس کی عمر میں 11 ذوالحج 207ھ اپریل 823ء میں انتقال فرمایا اور قبرستان خیزران میں دفن ہوئے۔ مورخ کی حیثیت سے آپ کی کتاب مستند نہیں مانی جاتیں۔ تاہم مغازی پر خاصی معلومات مہیا کی ہیں۔ آپ کی کتب میں کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، فتوح الشام، فتوح المصر، کتاب الازواج النبی وغیرہ ہیں۔

مرسلہ: سلطان فتح سرائے عالمگیر

ہرقل

شاہان روم کا لقب تھا۔ نیز زمانہ قدیم میں اسی نام کا ایک معبد بھی تھا۔ اس کے ایک بادشاہ کو سرور کائنات نے 4ھ میں خط لکھا تھا کہ اسلام لے آؤ۔ یہ دل سے چاہتا تھا مگر عیسائی پادریوں نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ ہرقلہ کا شہر اسی نے آباد کیا تھا۔ ایک زمانے میں عرب کے عیسائیوں نے اس سے کہا کہ آپ کا وصال ہو گیا ہے چنانچہ مدینہ منورہ پر فوج کشی کرے۔ یہ چالیس ہزار کی فوج لے کر آیا اور خود حمص کے مقام پر ٹھہرا۔ معرکہ تبوک و یرموک اسی سے لڑی گئیں۔ یرموک میں شکست کھا کر انطاکیہ چھوڑ گیا۔

مرسلہ: احمد سلیم سلیمی، گلگت

عبداللہ نے جیپ سڑک کے کنارے روک لی تھی۔ آنے والی گاڑی سے دو جسیم کے دو آدمی اترے۔ ان میں سے ایک نے ایک بریف کیس تھام رکھا تھا۔ ہاتھ ملانے کے بعد اس نے کہا۔ ”مجھے شمس کہتے ہیں جناب، کسے چیک کرنا ہے؟“

”اسے۔“ میں نے کرمان کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاید اسے انجکشن سے بگ لگایا گیا ہے۔“

”اگر وہ سگنل دے رہا ہے تو ایک منٹ میں پتا چل جائے گا۔“ شمس نے کہا اور بریف کیس کھولا جو اصل میں ایک قسم کا کمپیوٹر تھا۔ اسے آن کر کے اس نے ایک مائک نما آلہ نکالا اور ہم سے کہا۔ ”سب اپنے موبائل اور دوسرے وائرلیس آلات بند کر دیں۔“

سب نے اپنے موبائل بند کر دیے۔ شمس کرمان کو سڑک پر گاڑیوں سے ذرا دور لے گیا۔ وہ آلہ پھیر کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ جسم کے جس حصے پر آلہ پھیر رہا تھا اس کا گراف کمپیوٹر کی اسکرین پر آتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے آلہ کرمان کے بائیں ہاتھ پر کیا اس کی کہنی سے ذرا نیچے ایک سرخ دھبا روشن ہو گیا۔ شمس نے کہا۔ ”دِس اِز اٹ.... بگ ہے۔“

عبداللہ نے کرمان کا بازو کھینچ کر سیدھا کیا اور شمس کے ساتھ آنے والے نے ایک چھوٹا لیکن نوکیلا چاقو نکال لیا۔ ”کہاں ہے؟“

شمس نے انگلی سے دکھا کر بتایا۔ ”یہاں ہے۔“

اس کے ساتھی نے عبداللہ اور سنجر سے کہا۔ ”اسے مضبوطی سے پکڑیں۔“

کرمان دہشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی چاقو کی نوک اس کی کھال میں اتری اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے کہ آواز نکلتی میرا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا تھا۔ وہ مچل رہا تھا مگر تین افراد کی گرفت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چاقو والے نے ایک منٹ میں بگ تلاش کر کے نکال لیا۔ شمس ٹارچ سے روشنی دکھا رہا تھا۔ خون آلود بگ سڑک پر گرا اور بہ مشکل سے کلونجی کے دانے جتنا بڑا تھا۔ شمس نے اسے آلے سے چیک کیا۔ میں نے اسے کہا۔ ”مزید چیک کرو ہو سکتا ہے اس کے جسم میں مزید بگ چھپائے گئے ہوں۔“

”میں چیک کرتا ہوں۔“ شمس نے ایک چھوٹے سے پتھر سے بگ کو کچل دیا اور فوراً ہی کمپیوٹر کی اسکرین سے اس کے سگنل غائب ہو گئے۔ اس کے بعد شمس نے اسے دوبارہ مکمل طور پر چیک کیا مگر اس کے جسم میں مزید کوئی بگ نہیں تھا۔ سنجر نے اپنا رومال کرمان کے بازو پر باندھ دیا۔ زخم معمولی سا تھا دو تین دن میں بھر جاتا۔ شمس اور اس کا ساتھی اپنا سامان سمیٹ کر اپنی گاڑی میں چلے گئے اور ہم نے کرمان کو دوبارہ جیپ میں بٹھایا اور حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ رئیس ہماری اتنی جلدی پھر آمد پر خوش تھا اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کرمان کا استقبال کیا اور ہم سے کہا۔ ”بہت دن سے فارغ بیٹھے تھے اب ذرا مصروفیت رہے گی۔“

”بالکل اسے خاص پروٹوکول دو۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”پوچھ گچھ ذرا دیر بعد کریں گے۔“

رئیس سمجھ گیا۔ ”ایسا تیار کروں گا کہ آپ سوال بعد میں کریں گے یہ جواب پہلے دے گا۔“

کرمان کو تہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ رئیس نے کھانے پر رکنے کا اصرار کیا اور ہم مان گئے کیونکہ وہ لوگ قبائلی انداز میں بکرے کی سجی بنا رہے تھے۔ بکرا بکنگ سے خریدا گیا تھا اور اس کی کھال اتار کر اندر سے سب نکال کر اس میں ابلے چاول بھر کر اسے زمین میں دبا کر اوپر انگارے دہکا دیے گئے تھے۔ عام طور سے یہ ڈش رات میں پکتی ہے مگر انہوں نے دن میں بنائی تھی اور رات کے کھانے تک یہ تیار ہو گئی تھی۔ سجی کے ساتھ اسی مرحوم بکرے کی باقیات کا کٹا کٹ بھی بنایا گیا تھا جو تندوری نان کے ساتھ پیش کیا گیا۔ کھانے کے بعد قہوے سے شغل کرنے کے بعد میں نے رئیس سے پوچھا۔ ”گرفتار شدہ کا کیا کیا ہے؟“

”تہ خانے میں اس طرح الٹا لٹکا ہوا ہے اس کے چاروں ہاتھوں پاؤں زنجیروں سے بندھے ہیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر بار بار زور آ رہا ہے۔ یقیناً اب تک اس کا حشر ہو گیا ہوگا۔“

مجھے اس پوز کا ذاتی تجربہ تھا اور یہ بنا کسی تشدد کے اذیت دینے کا بہت ہی خوفناک طریقہ تھا۔ آدمی کو ایسی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ مرنے کی آرزو کرنے لگتا۔ میں سوچ سکتا تھا کہ کرمان کا کیا حشر ہوگا کیونکہ خاصی دیر ہو گئی تھی۔ قہوے نوشی کے بعد میں اور عبداللہ نیچے پہنچے۔ سنجر نے ایک پرتکلف ڈنر کے بعد کسی ہنگامہ آرائی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ ”اتنے اچھے ڈنر کا مزہ خراب ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے تب تم رکو ہم زرا ہل کر آتے ہیں۔“

دن میں تہ خانہ یقیناً ٹھنڈا ہوتا ہوگا مگر رات کے وقت وہاں موسم ذرا گرم تھا۔ پھر رئیس نے اس کے ایگزاسٹ فین بھی بند کرا دیے تھے۔ الٹے لٹکے کرمان کو یہ گرمی یقیناً بہت زیادہ لگ رہی تھی کیونکہ اس کا پورا جسم پسینے

میں شرابور تھا اور اس کی ناک سے پسینہ ٹپ ٹپ گر رہا تھا ہمیں دیکھ کر وہ بلبلایا۔ "خدا کے لیے میں مر رہا ہوں.... مجھے اتار دو۔"

"اتنی جلدی نہیں مرو گے تم۔" عبداللہ نے کہا۔ "اتارنے پر غور کیا جاسکتا ہے۔"

میں نے تائید کی۔ "بہ شرط کہ کچھ سوالوں کے جوابات بالکل درست دو۔"

"پوچھیں جی میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

"تم کس کے لیے ہماری جاسوسی کر رہے تھے؟"

"مجھے زاہد نے اس کام پر لگایا ہے۔"

"اور یہ زاہد کون ہے۔"

اس نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ "آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کس نے بھیجا ہے۔"

"ہم اس شخص کو جانتے ہیں اس کے چھوٹے موٹے کارکنوں کو نہیں۔ تمہارے جسم میں یہ چپ کس نے لگائی تھی۔"

"چپ کیا جی؟"

"وہ جو انجکشن لگایا تھا اس کی بات کر رہا ہوں۔"

"پتا نہیں جی وہ آدمی زاہد کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے مجھے انجکشن لگایا تھا۔"

"وجہ کیا بتائی؟"

"کوئی وجہ نہیں بتائی جی۔" اس نے جواب دیا۔

"زاہد کون ہے؟"

"ادھر راجا بازار میں اس کا ڈیرہ ہے۔ بدمعاش ہے دوکان والوں سے بھتا لیتا ہے۔ ڈاکے بھی مارتا ہے۔"

میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ "یہ تو معمولی سا کوئی لفنگا ہے۔"

"اسے ماریں گولی ہم جانتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اسے بھی مار کر یہیں دفن کرتے ہیں۔"

"ہاں اسے پکڑواتا جاتا تو بے نہیں۔" میں نے سر ہلایا۔

"بیکار بندہ ہے اسے ٹھکانے لگاؤ۔"

وہ پھر بلبلایا۔ "میرا قصور جی میں تو معمولی سا آدمی ہوں۔"

"نہیں بیکار رہو اگر کچھ جانتے تو ہم چھوڑنے کا سوچتے بھی۔"

عبداللہ نے پستول نکالا تو اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "ایک خاص بات ہے جی.... میں نے بتائی نہیں تھی۔"

"کیا خاص بات ہے؟"

"وہ جی انجکشن لگانے کے لیے مجھے ایک جگہ لے گئے تھے۔"

عبداللہ نے اس کے سر پر پستول کی نال ماری۔ اس نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا مگر یقیناً اسے تارے نظر آگئے ہوں گے۔ وہ سر جھٹک رہا تھا۔ جب اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تو عبداللہ نے کہا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔"

"میں کیسے بتاتا جی بہت ظالم لوگ ہیں، زاہد نے کہا تھا کہ میں نے اس بارے میں زبان کھولی تو مجھے تو کچھ نہیں کہیں گے لیکن میرے بیوی بچوں کو ضرور کاٹ کر رکھ دیں گے۔"

"ہم بیوی بچوں کو تو کچھ نہیں کہیں گے مگر تمہیں ضرور مار کر گاڑ دیں گے۔" عبداللہ نے پستول لہرایا۔ اس کی پرفارمنس قابل داد تھی۔ وہ کرمان کو اچھا خاصا دہشت زدہ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

"وہ تمہیں اسلام آباد لے گئے تھے۔"

وہ چونکا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا۔"

"میں نے کہا نا ان کے بارے میں جانتے ہیں۔" میں نے کہا اور اسے ڈیوڈ شا والی کوٹھی کی لوکیشن بتائی۔ اس نے سر ہلایا۔

"بالکل مجھے یہیں لے گئے تھے۔"

"وہاں تم نے انجکشن لگانے والے کے علاوہ اور کس کو دیکھا تھا؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "میں نے وہاں ایک عجیب آدمی دیکھا۔"

"عجیب سے مراد؟"

"ویسے تو وہ لمبا تڑنگا اور باڈی بلڈر ٹائپ کا تھا جی لیکن اس کے دونوں ہاتھ بہت لمبے اور کسی درخت کی شاخ کی طرح تھے۔"

میں چونکا۔ "تمہارا مطلب ہے وہ ایب نارمل جسم کا شخص تھا۔"

"نہیں جی بالکل نارمل تھا۔ جب تک میں وہاں رہا وہ نگرانی کرتا رہا تھا جی.... اس کا انداز ہی بڑا خوفناک تھا۔ بولتا بھی تو لگتا ابھی پھاڑ کھائے گا۔"

وہ شاید ڈیوڈ شا کا کوئی محافظ تھا۔ میں نے سوچا اور اس سے مزید سوال کیے مگر اسے اس سے زیادہ علم نہیں تھا۔ میں نے کرمان کو بلوا کر اس کی آنکھیں کھلوا دیں لیکن ہاتھ بدستور زنجیر سے بندھے تھے۔ وہ زچ ہو گیا تھا کیونکہ

اتنی دیر تک الٹا لٹکے رہنے کے بعد اس کی ریڑھ کی ہڈی عارضی طور پر مفلوج ہو گئی تھی۔ اسے کھانا پانی دینے کی ہدایت کر کے ہم اوپر آ گئے۔ عبداللہ مایوس تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔“

”ہو گا بار اتنی تکلف کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے کہا۔ ہم اوپر آئے اور باہر باغ میں نکل آئے۔ یہاں شام اور رات ٹھنڈی تھی۔ آسمان سے اوس گر رہی تھی اور یہ بھی اچھی لگ رہی تھی۔ رحمیں خدمت گزاری پر آمادہ تھا اس نے پھر ہمارے لیے لسی بنوائی۔ سفیر اندر فون لے رہا تھا۔ میں اور عبداللہ رحمیں کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں حویلی کا گیٹ کھلا اور دو گاڑیاں اندر آئیں۔ ایک سے وسیم اترا دوسرے میں اس کے ساتھ جانے والے تھے۔ مجھ سے سلام دعا کر کے وہ اندر چلے گئے۔ وہ آج ہی واپس آ گیا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے بتایا کہ وہ شام تک میانوالی پہنچ گئے تھے۔

”بڑے ملک صاحب نے بہت اصرار کیا کہ میں رات کو رک جاؤں مگر مجھے یہاں کے معاملات کا خیال تھا اس لیے ان سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔“

”رک جاتے یار یہاں کا ہم دیکھ رہے ہیں نا۔“ میں نے کہا۔ ”اور حویلی میں سب امن ہے۔“

”اماں جی سادی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ انہیں اس کی بہت فکر تھی۔“

”ماں جی ایسی ہی ہیں، سب کی فکر کرنے والی اور سب سے پیار کرنے والی۔“

”کچھ چیزیں بھی لایا ہوں میں آپ کے لیے۔“ وسیم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”خاص لوگوں نے بھجوائی ہیں۔“

میں نے اپنے دلی تاثرات کو چہرے پر آنے سے روکا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سویرا نے کچھ بھیجا ہو گا۔ جب تک میں حویلی میں تھا ہر مہینے اس کی جانب سے کوئی نہ کوئی سوغات ملتی تھی۔ کبھی کڑھا ہوا کرتہ اور کبھی ہاتھ سے بنا ہوا سوئٹر۔ میرے کمبل اور تکیوں کے کنارے وہی بنتی تھی۔ وسیم گاڑی سے ایک بیگ نکال لایا۔ ”اس میں ہے سب کچھ“ میں نے کھول کر نہیں دیکھا۔

”دیکھ بھی لیجے تو کیا ہم میں کوئی پردہ تھوڑی ہے۔“ میں نے کہا اور بے پروائی سے لے کر بیگ گود میں رکھ لیا لیکن یہ سوچ کر میرا جسم سنسنا گیا کہ سویرا نے اسے اپنے ہاتھوں سے چھوا ہو گا اس میں سامان رکھا ہو گا اب میں اسے چھو رہا تھا۔ وسیم اور عبداللہ بیک وقت ہنسے تو میں چونکا۔ تب مجھے پتا چلا کہ میں بے خیالی میں بیگ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میں جھینپ گیا۔ ”ہنس کیوں رہے ہو؟“

”ایسے ہی جناب۔“ وسیم نے شرارت سے کہا۔ ”سنا ہے مجنوں کو لیلیٰ کا اونٹ بھی پیارا تھا۔“

”غلط۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”اونٹ مجنوں کا تھا۔ اس لیے لیلیٰ کو پیارا ہو گا۔“

وہ کچھ دیر مجھے چھیڑتے رہے اور سچی بات ہے میں خود چھڑنا چاہتا تھا۔ محبوب کا ذکر کسی طور بھی ہو آدمی کو برا نہیں لگتا چاہے وہ محبت کے معاملے میں مجھ جیسا انتہائی ریزرو رہنے والا بندہ کیوں نہ ہو۔ پھر میں نے کرمان کا بتایا تو ماحول بوجھل ہو گیا۔ وسیم نے کہا۔ ”مجھے اس لمبے بازوؤں والے کا سن کر تشویش ہو رہی ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”میرا خیال ہے ڈبو شاہ کا کوئی خاص محافظ ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”ان رتبے کے لوگ ذرا خبطی بھی ہوتے ہیں۔ اپنی حیثیت جتانے کے لیے ایسی چیزیں رکھتے ہیں۔“

”آپ کا مطلب ہے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔“

”ہاں میرے نزدیک باڈی گارڈ وہ اچھا ہوتا ہے جو حلیے سے باڈی گارڈ نظر نہ آئے۔“

”جیسے امریکی صدر کے ہوتے ہیں، بالکل عام سے لیکن بہت چوکس اور ہوشیار رہنے والے۔“ عبداللہ نے کہا تو وسیم نے اس کی طرف دیکھا۔

”تم نے کہاں سے دیکھ لیے؟“

”فلموں میں۔“ عبداللہ نے سادگی سے جواب دیا۔

”وہ حقیقت میں بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”امریکی صدر کا خاص باڈی گارڈ اسٹاف اٹھائیس افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور ہمارے ہاں شاید اٹھائیس سو افراد کا ہوتا ہے۔“

”اس کے باوجود امریکی صدر کی حفاظت کے لیے عوام کو تکلیف نہیں دی جاتی ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔

”ہمارے ہاں ہر قسم کے سرکاری کاموں کے لیے صرف عوام کو تکلیف دی جاتی ہے۔“ میں نے دوسری صورت حال پیش کی۔

ہماری اس گفتگو کے دوران وسیم کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے اسے ہلایا۔ ”کس کی سوچ میں گم ہو؟“

”جو دل کے پاس ہوتے ہیں مگر دور دور چلے جاتے ہیں۔“ اس بار عبداللہ نے اس کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی۔ مگر وسیم سنجیدہ رہا۔ اس نے کہا۔

''شہباز صاحب ہم ذوبوز شاہ کی یہاں موجودگی کو بہت ہلکا لے رہے ہیں۔''

''میرے خیال میں تو ہم پوری طرح محتاط ہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ہم محتاط تو ہیں لیکن ہم نے اس پر باقاعدہ غور نہیں کیا کہ ذوبوز شاہ آپ کے آتے ہی یا آپ سے بھی پہلے یہاں کیوں آیا اور اب یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''مرشد کا بیڑا غرق۔'' عبداللہ نے کہا۔

''نہیں وہ اگر اس کا بیڑا غرق کرنا چاہے تو اس میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ ذوبوز شاہ جیسے سازشی عناصر فضول کی انتقامی کارروائیوں کے چکر میں نہیں پڑتے ہیں۔ وہ مسئلے کی جڑ یعنی دشمن کو سنا... دیتے پر یقین رکھتے ہیں۔''

وسیم کی بات نے مجھے چونکا رہا تھا۔''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''مجھے یقین ہے وہ آپ کے چکر میں آیا ہے۔ مرشد کو سزا دینے کی بات وہ صرف آپ کو متوجہ کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ مرشد بہت زیادہ پھنس گیا ہے اور یوں سمجھ لیں کہ وہ دلدل میں دھنس جانے والا شخص ہے۔ اس پر توجہ دینا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے مرشد اب اتنا خطرناک نہیں رہا ہے؟''

''بالکل... اب وہ صرف ایک گولی کی مار رہ گیا ہے۔ یقین کریں اسے رونے والا بھی کوئی مشکل سے ملے گا۔''

''اس کے جو حامی مرید ہیں؟''

''وہ سب منتشر ہو جائیں گے۔''

''تم مرشد کے چچازادوں کو بھول رہے ہو جو گدی کے دعوے دار ہیں اور وہ بھی وہی کریں گے جو مرشد کرتا آیا ہے ہم سے دشمنی انہیں وراثت میں ملے گی اور وہ اسے نبھانے پر مجبور ہوں گے۔''

''تب تم نے کچھ سوچا ہے؟''

''ہاں میں سفر کے دوران یہی کام کرتا رہا۔ ایک تو میں نے سوچا ہے کہ مرشد کے خلاف اس کے چچازادوں کو پوری حمایت کا یقین دلایا جائے اور معاملے کو تصادم تک لایا جائے۔''

میں حیران رہ گیا۔''خدا کی قسم ہم نے بھی یہی سوچا ہے۔''

وسیم مسکرایا۔''ہم سب ایک ہیں نا اس لیے بالکل یکساں سوچتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ حمایت صرف زبانی کلامی ہو اور عملی مدد کی بھی جائے تو اس طرح کہ ہمارا نقصان نہ ہو۔ ہم جنگ میں یوں شامل ہوں کہ کنارے کنارے رہیں۔''

''یہ بھی سوچا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''ہمارے پاس راشد کی صورت میں ایک مہرا ہے ہمیں اس پر عمل درآمد شروع کر دینا چاہیے۔''

میں نے وسیم کو تفصیل سے اصغر علی سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ وہ یہ جان کر پرجوش ہو گیا کہ ارشد علی مرشد کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔''بس تو جنگ کا اسٹیج تیار ہے صرف طبل بجانے کی ضرورت ہے۔''

''جمعے کے دن یعنی پرسوں عذفین ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اس میں ہمارے آدمی شامل ہوں گے اور مرشد کے آدمیوں کو تاؤ دینے کی کوشش کریں گے۔''

''جنگ کا پہلا میدان تو یہی موقع ہو سکتا ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''لیکن وہاں بہت سے عام لوگ بھی ہوں گے۔'' عبداللہ نے خدشہ ظاہر کیا۔''اگر اندھا دھند گولیاں چلیں تو نہ جانے کتنے لوگ مارے جائیں گے۔''

''کام ہوشیاری سے کیا جائے تو ایسا نہیں ہوگا۔'' وسیم نے کہا۔''میرا خیال ہے ارشد کے بھائیوں نے مرشد کے خلاف ایف آئی آر درج کرادی ہوگی۔''

''ابھی تک تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تب آپ ایسا کریں اگر پولیس ایف آئی آر درج نہیں کر رہی تو وہ لوگ کورٹ میں جائیں۔'' وسیم نے کہا۔''ایف آئی آر کٹ گئی تو مرشد کے گرد گھیرا تنگ ہو جائے گا۔''

وسیم درست کہہ رہا تھا۔ میں نے اسی وقت اصغر کو کال کی اور اس سے ایف آئی آر کا پوچھا۔''تم نے ارشد علی کے قتل کی ایف آئی آر درج کرائی ہے؟''

''مقامی پولیس اسٹیشن میں کوشش کی تھی مگر ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ میں نے بتایا تھا ہم گھر سے نہیں نکل رہے، باہر مرشد کے آدمی گھات لگائے بیٹھے ہیں۔''

''تم لوگوں کو ہمت کرنا ہوگی اور پولیس کے بجائے تم کل کورٹ میں جاؤ وہاں سے ایف آئی آر کے آرڈر لو۔ اس سے کیس مضبوط ہو جائے گا۔''

''ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

"سو پوست کر گزرو۔" میں نے اکسایا۔ "ایک بار مرشد کے خلاف ایف آئی آر کٹ گئی تو پھر اس کی طرف سے تم لوگوں کے خلاف کچھ کرنا آسان نہیں رہے گا۔"

"میں بھائیوں سے مشورہ کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اگر تمہیں کورٹ تک جانے کے لیے سیکیورٹی درکار ہے تو میرے آدمی حاضر ہیں۔"

"مجھے فیصلہ کرنے کے لیے وقت دو۔" اصغر نے کہا تو اس کا لہجہ کمزور تھا۔ اس وقت مجھے لگا کہ اس پر کوئی دباؤ آیا ہے۔ شاید دوسرے بھائی دشمنی کے اس سلسلے کو دراز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ جب چند گھنٹے پہلے میری اس سے بات ہوئی تھی وہ بہت جارحانہ موڈ میں تھا۔ میں نے اسپیکر فون آن کیا ہوا تھا اس لیے وسیم اور عبداللہ سن رہے تھے۔ کال ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

"ایسا لگ رہا ہے یہ لوگ ڈر رہے ہیں۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" وسیم نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "کیا خیال ہے کیوں نہ انہیں بھی اور ڈرایا جائے۔"

"مطلب؟"

"یہ چاروں بھائی درگاہ سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے احاطے میں الگ الگ کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔" وسیم نے کہا اور لوکیشن واضح کی۔ "آس پاس زرعی زمین ہے وہ بھی ان کی ملکیت ہے۔ شمال میں تقریباً تین سو میٹر کے فاصلے پر پہاڑیاں ہیں۔"

"وہاں سے کارروائی کی جا سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل میں اسی کا ذکر کر رہا ہوں ہمارے پاس بہترین اسنائپر رائفل ہیں۔"

"نشانہ کون ہوگا؟"

"اطراف میں چھپے ہوئے مرشد کے کرگے۔" وسیم نے کہا۔ "ہم ان کے خلاف کارروائی کریں گے اور وہ ان لوگوں کے خلاف۔"

"تب یہ کام آج ہی ہونا چاہیے۔" عبداللہ نے کہا۔ "بہت دن ہو گئے ہیں کچھ کیا نہیں ہے۔"

"خدا کا خوف کرو یار ابھی تم نے ایک بندے کو اچھا خاصا بہشت روانہ کیا ہے اور اس کا سر بھی بجایا تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میرا اشارہ اس طرف ہے۔" عبداللہ نے ہاتھ سے پستول کا اشارہ کیا۔

"تب تیاری کرو۔" وسیم نے کہا۔

"تم تھکے ہوئے آئے ہو آرام کرو میں اور عبداللہ دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"شہباز صاحب ابھی تو اپنا آرام ہے۔" وسیم مسکرایا۔ "ساری کی وجہ سے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے آرام ہی آرام تھا۔ اب ذرا کھولوں گا۔"

"ویگن ایاز کے گیراج میں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بڑے کام کی گاڑی ہے۔"

"اس کے بغیر بھی ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" وسیم نے کہا اور اندر جاتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے آدمیوں کو تیار کرتا ہوں۔"

عبداللہ اور رئیس اس کے ساتھ چلے گئے ان کے جانے کے بعد میں نے بیگ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک تیار سلا ہوا سفید کرتا شلوار تھا۔ کرتا ہاتھ سے کڑھا ہوا تھا۔ ہاتھ سے کڑھے ہوئے رومال تھے۔ گڑ اور گندم سے بنی ٹکیاں تھیں۔ مکئی کے گڑ میں بھنے دانے تھے۔ یہ سب مجھے پسند تھے۔ میں نے ایک رومال نکال کر جیب میں رکھ لیا۔ یہ سب سویرا کی پسندیدہ خس کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ میں یہ سب یہاں نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے بیگ ستی کی تجوری میں رکھوا دیا۔ میرا دل بے اختیار مچلا کہ سویرا سے بات کروں مگر میں نے دل کو تھپکا کہ موقع نہیں ہے۔ یہاں سے کال کرنے کا مطلب تھا کہ زیوژنا کو اس جگہ کا علم بھی ہو جائے گا۔ جیسے اسے فیض آباد والی کوٹھی کا پتا چل گیا تھا اس لیے میں دل مار کر رہ گیا۔

وسیم کے آدمی اتنے منظم تھے کہ دس منٹ میں سات افراد پوری تیاری کے ساتھ حویلی کے پورچ میں موجود تھے۔ ان سب نے ٹی شرٹس کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ فی الحال اسلحہ کسی کے پاس نہیں تھا مگر وہ گاڑیوں میں موجود تھا۔ میں نے اور عبداللہ نے بھی بلٹ پروف پہنا۔ گرمی میں یہ خاصا چبھتا لیکن گولی کے زخم کے مقابلے میں یہ چبھن کچھ بھی نہیں تھی۔ اسلحے کے علاوہ وسیم اس مہم کے لیے خصوصی سامان الگ سے ایک بڑے سوٹ کیس میں لایا تھا۔ ہم سب دو گاڑیوں میں سوار ہوئے۔ ایک پرانے ماڈل کی ملٹری جیپ تھی جس کا پچھلا حصہ جو عام طور سے کینوس سے بنا ہوتا ہے اس میں فولادی تھا۔ اندر نشستیں لگی ہوئی تھیں۔ دوسری پوٹھوہار جیپ تھی۔ یہاں ایک ٹویوٹا ڈبل کیبن اور ایک جاپانی ڈاٹسن... پک اپ بھی تھی۔ مگر ان کی ضرورت نہیں تھی۔ اس میں ہم تینوں آ گئے جب کہ وسیم کے

آدمی فنٹری جیپ میں تھے۔ دونوں گاڑیاں کچے اور ناہموار راستوں پر چلنے میں بے مثال تھیں۔ وسیم نے ایک نقشہ نکالا اور اسے سامنے پھیلا لیا۔ اس نے اندر کی روشنی آن کر رکھی تھی۔

"اس طرف سے ایک راستہ مرشد کے اڈے کی طرف جاتا ہے۔ کچا ہے مگر برا نہیں ہے، ہاں بارش ہو جائے تو بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ دو کلومیٹر کے بعد ہمیں پکی سڑک مل جائے گی لیکن اس کی وجہ سے ہمیں مری بائی وے کا چکر نہیں کاٹنا پڑے گا۔ ہم براہ راست اس کے علاقے میں نکلیں گے۔ وہیں ان چچازادوں کی رہائش ہے۔"

"بس تو پھر چلو۔" میں نے کہا۔ ڈرائیو وسیم کرتا اس نے اسٹارٹ کی اور آگے بڑھائی۔ گیٹ پر موجود گارڈز نے پھاٹک کھولے اور دونوں گاڑیاں باہر آگئیں۔ ہم مری بائی روڈ سے مخالف سمت روانہ ہوئے۔ پانچ منٹ بعد وسیم نے جیپ سڑک سے کچے راستے پر موڑ لی۔ یہ کچی سڑک اونچے نیچے ٹیلوں اور چھوٹے پہاڑوں کے بیچ سے بل کھاتی گزر رہی تھی۔ رات کی وجہ سے رفتار نہایت سست تھی اور عملاً دونوں گاڑیاں پیدل کی رفتار سے چل رہی تھیں۔ عبداللہ نے خود کو لڑھکنے سے بچاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح تو ہم صبح پہنچیں گے۔"

"صرف بیس منٹ کا راستہ ہے۔" وسیم نے کہا اور اس کا کہنا درست ثابت ہوا۔ بیس منٹ سے بھی پہلے وہ پکی سڑک پر نکلے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ تھکن اور نیند کا خمار اس راستے نے اتار دیا تھا اور اب جسم کے ساتھ ذہن بھی چاق و چوبند ہو گیا تھا۔ سب نے سڑک آنے کے بعد سکون کا سانس لیا تھا مگر ابھی عشق کے امتحان ختم نہیں ہوئے تھے۔ مخالف سمت میں چند منٹ کے سفر کے بعد وسیم نے دوبارہ گاڑی کچے میں اتار دی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں راستہ ناہموار تھا مگر میدان سے گزر رہا تھا۔ کہیں کہیں گھنے درختوں کے جھنڈ تھے اور اکثر جگہوں پر جھاڑیاں تھیں۔ لوگ یہاں اپنے مویشی چراتے تھے۔ کہیں کہیں اکا دکا زرعی زمین بھی تھی۔ پھر روشنیاں نظر آئیں تو ہم چوکنا ہو گئے کیونکہ یہ روشنیاں مرشد کے اڈے جتنی نام نہاد درگاہ کی تھیں۔ مگر وہ ہم سے بہت دور اور جنوب مشرق میں واقع تھیں۔ ہم ان سے کترا کر گاؤں کی طرف بڑھے۔

"بس ایک کلومیٹر دور ہے اب۔" وسیم نے کہا تو میں حیران ہوا۔ یہ راستہ تو واقعی بہت مختصر ثابت ہوا تھا ورنہ اسلام آباد ایکسپریس وے سے گزر کر آنے میں اس سے تین گنا زیادہ وقت اور پانچ گنا فاصلہ لگ جاتا۔ درمیان میں ایک خشک پہاڑی نالہ آیا مگر اس میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہم آرام سے دوسری طرف نکل آئے۔ پھر ایک احاطہ دکھائی دیا۔ وسیم نے اس سے بھی دوری رکھی۔ "یہ ہے ان چاروں بھائیوں کی رہائش گاہ۔"

"جو اب تین رہ گئے ہیں۔" عبداللہ نے صحیح کی۔ "مگر ان کی آل اولاد کی تعداد خاصی ہے۔ میرے علم کے مطابق... چاروں بھائیوں کے ملا کر کوئی چودہ بیٹے اور شاید اتنی ہی بیٹیاں ہیں۔"

"مگر مرشد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میری اطلاع کے مطابق اس کے تین بیویوں سے کوئی چھ سات بیٹے اور دس کے قریب بیٹیاں ہیں۔ ناجائز اولادوں کا خود اسے بھی پتا نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مگر اس کے سارے بچے چھوٹے ہیں شاید سب سے بڑا چودہ برس کا ہوگا۔"

وسیم نے جیپ روک دی اس نے روشنیاں پہلے ہی بند کر دی تھیں اور پچھلی جیپ والوں نے بھی اس کا اتباع کیا تھا۔ مجھے خیال نہیں آیا کہ وہ خاصی تاریکی میں کیسے ڈرائیو کر رہا ہے جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں پر نائٹ ویژن نظر آئی۔ وہ اس کی مدد سے سب صاف دیکھ رہا تھا۔ جیپ رکتے ہی اس نے ہمارے لیے نائٹ ویژن نکالیں۔ انہیں پہن کر ہم بھی سب صاف دیکھ سکتے تھے۔ بس ماحول ہرا ہرا ہو رہا تھا۔ دوسری جیپ سے بھی سب اتر آئے تھے اور انہوں نے بھی نائٹ ویژن پہن لی تھیں۔ وسیم نے جیپ کے پچھلے حصے میں موجود اسلحہ سب میں تقسیم کیا۔ ہر آدمی کو ایک خودکار رائفل، اس کے تین میگزین، ایک پستول اور اس کے دو میگزین ملے تھے۔ منتخب افراد کو چند گرینیڈ بھی دیے۔ پھر دوسری جیپ سے تین عدد خاصی بڑی نال والی تین عدد اسنائپر رائفلیں اتاری گئیں۔ ان پر اعلیٰ جدید دوربین نصب تھی جو رات کی تاریکی میں بھی دکھاتی تھی۔ آخر میں وسیم نے سب کو جدید قسم کے ریڈیو دیے جن کا یونٹ سامنے بلٹ پروف پر لگ جاتا اور مائک کان پر آجاتا۔ اس کی مدد سے ہم سب آپس میں رابطے میں رہتے۔

وسیم کے چار آدمی مع عبداللہ کے جیپوں کے آس پاس رک گئے۔ ان کا کام جیپوں کی حفاظت کرنا اور اس طرف آنے والوں سے نمٹنا تھا۔ میں، وسیم اور تین افراد جنہوں نے اسنائپر رائفلیں اٹھا رکھی تھیں ہمارے ہمراہ پہاڑی کی طرف بڑھے۔ وسیم نے ایک بیگ اضافی اٹھا رکھا

شباب نامہ

ایک ایسی کتاب جس کے بارے میں عرصہ دراز سے متنوع آرا سننے میں آتی رہی تھیں۔ عوام اور خواص کی اکثریت اسے اپنی پسندیدہ کتاب گردانتی رہی ہے۔ یہ صورت حال میرے اندر ایک نامعلوم تجسس سا پیدا کرتی تھی۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ کیا واقعی یہ ایک شاہکار کتاب ہے یا محض بھیڑ چال کے طور پر اس کا ذکر خیر کیا جاتا ہے۔ اسے پڑھنے کا ارادہ تب پختہ ہوا جب میرے ایک بے حد عزیز اسٹوڈنٹ نے قدرے حیرانی سے مجھ سے استفسار کیا۔ آپ نے شباب نامہ نہیں پڑھی؟ حیرت ہے۔ ضرور پڑھیے گا۔ آپ کی سوچ تبدیل ہو جائے گی۔ کافی تلاش بسیار کے بعد یہ نادر کتاب مستعار لی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ سب مصروفیات بالائے طاق رکھ کر اس کا مطالعہ شروع کیا۔ میرا قلیل علم اور محدود معلومات اس کتاب کی گوناگوں خصوصیات کا احاطہ کرنے سے قطعی قاصر ہیں۔ تاہم دوران مطالعہ جو کچھ محسوس ہوا وہ من وعن بیان ہے۔

آج تک قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد، انگریزی سامراج، مسلم زوال، بے بسی اور ہندوانہ مکاری نصابی کتب اور اردو ڈائجسٹ کی تاریخی کہانیوں میں پڑھی تھیں مگر ان سب عناصر کو ایک ایسے شخص کی نظر سے دیکھنا جو اس سارے نظام کا بذات خود حصہ تھا، ایک انوکھا تجربہ تھا۔ راوی جموں و کشمیر میں قدرت اللہ شباب کے ساتھ پھرا، خالصہ تحریک کی ریشہ دوانیاں، انگریزوں کا مسلم نوجوان آفیسرز کے ساتھ متعصبانہ رویہ، ہندو مسلم فسادات، چندراوتی کے ساتھ شباب صاحب کا ایک معصوم سا تعلق، اس کے مرنے پر ان کے احساسات...... ایسے الفاظ اور ایسا خوب صورت اظہار میں نے آج تک کہیں نہیں پڑھا۔ پیدائش سے آج تک ہر جگہ یہی سنا پڑھا تھا۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔

مگر قدرت اللہ شباب نے پاکستان کو جو مطالب دیے ہیں وہ اگر کسی پاکستانی کی نظر سے اوجھل رہیں تو میں اسے مریض ظلم گردانوں گی۔ قیام پاکستان کے بعد انتظامی و انصرامی مشکلات کو نصابی کتب کے چند الفاظ میں پڑھنا اور شباب صاحب کی زبانی ان واقعات کو محسوس کرنا ایسے ہی تھا جیسے پانی کے ایک چھوٹے سے برتن سے کسی وسیع سمندر میں جانا! بطور ڈپٹی کمشنر ان کی ذاتی ڈائری اور روزمرہ عوام الناس سے تعلق کے چھوٹے چھوٹے واقعات نے مجھے ایک اور قدرت

تھا۔ نائٹ ویژن کی وجہ سے بہت آسانی ہو رہی تھی کیونکہ ہم تقریباً تاریکی میں بغیر ٹھوکر کھائے آرام سے چل رہے تھے۔ دس منٹ بعد ہم پہاڑی پر تھے جو نیم دائرے کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ رسیم نے ایک آدمی کو اسنائپر رائفل سمیت ایک جگہ مورچہ بنانے کو کہا۔ باقی دو آدمیوں کو ایک اور جگہ مورچہ بنانے کے لیے چھوڑا اور ہم پہاڑی کے سب سے بلند حصے میں آ گئے۔ یہاں سے احاطہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اندر روشنیاں تھیں اور ان روشنیوں میں وہاں ٹہلتے مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔ مگر فاصلہ پانچ سو گز سے زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ واضح نہیں تھے۔ رسیم نے اسنائپر رائفل لگانے سے پہلے بیگ سے ایک ذرا بڑی دوربین نکال کر میرے حوالے کی۔

"ذرا جائزہ لیں۔ عینک ہٹا دیں یہ بھی نائٹ ویژن موڈ رکھتی ہے۔"

میں نے دوربین کو نائٹ ویژن موڈ پر کیا تو سارا منظر کھنچ کر آنکھوں میں آ گیا۔ میں نے احاطے کا جائزہ لیا۔ وہاں چار مختلف کوٹھیوں کے گرد سات یا آٹھ مسلح افراد تھے لیکن مجھے شبہ ہوا کہ وہ کرائے پر ملنے والے سیکیورٹی گارڈز تھے۔ انہوں نے وردیاں کچھ ایسی ہی پہنی ہوئی تھیں۔ کوٹھیاں تاریک تھیں، وہاں اکا دکا روشنیاں تھیں مگر احاطہ اچھا خاصا روشن تھا۔ اس کی چار دیواری تقریباً دس فٹ اونچی تھی اور اس پر کوئی تین فٹ کی خاردار باڑ لگی ہوئی تھی۔ احاطے سے باہر آنے جانے کے لیے ایک ہی گیٹ تھا۔ یہ بند تھا اور اس پر دو افراد تھے لیکن وہ اندر تھے۔ اتنی دیر میں رسیم نے رائفل سیٹ کر لی تھی۔ اس کا ٹرائی پوڈ تھا کیونکہ اسے خالی ہاتھوں سے چلانا مشکل تھا۔ اس کا جھٹکا زوردار ہوتا۔ میں نے کہا۔ "ان لوگوں نے عام قسم کی سیکیورٹی رکھی ہے۔ یہ مرشد کے بدمعاشوں کا مقابلہ نہیں کر

اللہ شہاب سے متعارف کروایا جو اپنی خوبیوں کی طرح اپنی خامیاں بھی کھلے الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ پاکستان کا سیاسی نظام جن اتار چڑھاؤ کا شکار رہا ہے سب ہی جانتے ہیں لیکن آمریت کے دور میں اس قدر گھٹن اور پراگندگی تھی یہ مجھے شہاب صاحب کے گورنر جنرل غلام محمد، میجر جنرل اسکندر مرزا اور فیلڈ مارشل ایوب خان کے ساتھ گزارے گئے بطور سیکریٹری حالات پڑھ کر اندازہ ہوا۔ غلام محمد کی فرعونیت، اسکندر مرزا کی عیاشی اور ایوب خان کی سیاسی عاقبت نااندیشی پڑھ کر میں کافی دیر سکتے میں رہی۔ واللہ! پاکستان کو بس تیرا ہی سہارا رہا ہے 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران میں لاہور پر بھارتی قبضے کی افواہ سن کر شہاب صاحب اور ان کی اہلیہ کا رد عمل پڑھ کر آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔

شہاب نامہ پاکستانی تاریخ، سیاست، جمہوریت، آمریت کا ایک مکمل آئینہ ہے جس میں ہر شخص کا ظاہر باطن بالکل واضح نظر آتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود کئی پہلو تشنہ رہے۔ پاک بھارت جنگیں، مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بھٹو کا دور حکومت ایسے ادوار ہیں جنہیں قدرت اللہ شہاب کا انداز بیان امر کر دیتا۔ والدہ اور اہلیہ کی رفات اور جنرل یحییٰ کے دور میں مستعفی ہونے کے بعد ان کی کسمپرسی دل گداز کر دیتی ہے۔ سفر حجاز اور تصوف کے بارے میں ان کے خیالات ان کی حب الوطنی اور یونیسکو میں ملازمت کے دوران میں مکمل کیا جانے والا ایک پرخطر مشن۔ ان تمام عوامل نے قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کو ایک بے نام سحر بنا دیا ہے۔ اس سحر میں، میں پوری کتاب کے مطالعے کے دوران میں خود کو جکڑا ہوا محسوس کرتی رہی۔

آخر میں صرف اتنا کہوں گی کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد میری سوچ میں ایک نہیں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ شہاب صاحب سے ایک بے عنوان عقیدت کا رشتہ استوار ہو گیا۔ ہم جیسے لوگ جنہیں ادب سے متعارف ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں چند نگلشن نگاری پڑھ کر خود کو بہت توپ چیز سمجھتے ہیں۔ ادب کیا ہے؟ حق قلم کیا ہے؟ یہ ہمیں قدرت اللہ شہاب جیسے ادیب واضح کرتے ہیں۔ میں نے آج تک برصغیر پاک و ہند کے تاریخی واقعات، قیام پاکستان اور بعد از تقسیم حالات جابجا پڑھے تھے لیکن آج شہاب نامہ پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ میں نے تو کچھ بھی نہیں پڑھا تھا۔ اور اب سوچتی ہوں مستعار لی گئی یہ اعلیٰ شاہکار کتاب کس حوصلے سے واپس کروں؟

تحریر: زربا اعجاز۔ لاہور

سکتے تھے۔"

وسیم نے اپنی دوربین سے دیکھا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ ایجنسی سیکیورٹی گارڈز ہیں۔ بالکل بیکار اور نااہل۔"

ہم ابھی تک احاطے کا معائنہ کر رہے تھے اور آس پاس دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے ذرا دوربین گھمائی تو میری توجہ احاطے کے عقبی حصے میں موجود چند افراد کی طرف گئی جو دیوار کے پاس جمع تھے۔ میں نے دوربین ایڈجسٹ کی تو وہ واضح ہو گئی۔ وہ اس طرح سے تھے کہ یہاں سے واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اگر وہ دیوار سے چپکے ہوتے تو شاید بالکل دکھائی نہ دیتے مگر وہ بے پروائی سے دیوار سے ذرا الگ چل رہے تھے اس لیے میری نظروں میں آ گئے۔ میں نے گنا تو ان کی تعداد چھ نکلی۔ وہ سب مسلح تھے۔ پھر ان میں سے ایک شخص آگے آیا جس نے کوئی بھاری چیز اٹھا رکھی تھی اور وہ دیوار کے قریب بیٹھ کر کچھ کرنے لگا۔ میں نے وسیم کو متوجہ کیا۔ "دیکھنا یہاں کچھ لوگ ہیں۔"

"یہ تو گڑبڑ ہے۔" اس نے دیکھنے کے بعد کہا۔ "میرا خیال ہے یہ حملہ کرنے آئے ہیں۔"

"صرف چھ بندے؟"

"نہیں اور ہوں گے۔ آپ آس پاس دیکھیں میں ان کو چیک کرتا ہوں۔" وسیم نے اپنی رائفل ان کی طرف گھمائی اور میں احاطے کے آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ جلد انکشاف ہوا کہ احاطے کے تقریباً چاروں طرف ہی کم و بیش دو دو چار افراد موجود تھے ممکن ہے ان کی تعداد اس سے زیادہ ہو اور وہ سب پوری طرح مسلح مگر چھپے ہوئے تھے۔ اچانک وسیم بولا۔ "میرے خدا یہ کوئی بہت بڑا بم لگا رہے ہیں۔ یہ تو دیوار کے ساتھ موجود کوٹھی کو بھی تباہ کر دے گا۔"

"نہیں روکو۔" میں نے اضطراری لہجے میں

کہا۔ ''ورنہ نہ جانے کتنے بے گناہ مارے جائیں گے۔''

وسیم نے کان پر لگے ہیڈ سیٹ پر انگلی رکھی اور اپنے اسنائپرز بردار وں کو حکم دیا۔ ''احاطے کے آس پاس دیکھو اور جو مسلح شخص نظر آئے اسے اڑا دو۔'' حکم دیتے ہوئے وسیم خود بھی نشانہ لے رہا تھا اور پھر اس نے سانس روک کر ٹریگر دبا دیا۔ میرا خیال تھا کہ گولی چلنے کا دھماکا بہت زیادہ ہوگا مگر کوئی دھماکا نہیں ہوا اس کی بجائے شخص کی ہلکی سی آواز آئی۔ رائفل سائلنسر زدہ تھی۔ میں نے دوربین گھما کر دیکھی۔ وسیم نے جس کو نشانہ لیا تھا وہ گر گیا تھا اور رسی بم لگ رہا تھا۔ اس کے ساتھی بدحواس ہو کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے کسی سمت اندھا دھند فائرنگ کی۔ پورا علاقہ اس کے چائنے برسٹ سے گونج اٹھا۔ وسیم نے فوراً اس کے پاس والے کو نشانہ بنایا۔ میں دوربین گھما کر دیکھ رہا تھا۔ وسیم کے آدمیوں نے نشانے لگانا شروع کر دیئے تھے۔ میں نے ایک منٹ میں کم سے کم تین افراد کو گرتے دیکھا تھا۔ دوسری طرف سے بدحواس مسلح افراد نے یہ جانے بغیر کہ ہم کہاں ہیں اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔

اس بار ایسا لگا جیسے میدان جنگ سج گیا ہو۔ گولیوں کے شعلے بلندی سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ احاطے میں موجود افراد فائرنگ کی آوازوں سے پریشان ہو کر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ گیٹ کی طرف آئے اور کچھ عقبی سمت گئے جہاں سے سب سے پہلے فائر کی آواز آئی تھی۔ کوٹھیوں کی روشنیاں جلنے لگی تھیں۔ وسیم نے تیسرے آدمی کو نشانہ بنایا تھا کہ اچانک ہی احاطے کی طرف سے بے پناہ تیز اور چکاچوند کرنے والی روشنی نمودار ہوئی اور دھماکے کی آواز ہم تک کچھ دیر سے پہنچی تھی۔ وسیم نے بم لگانے والے کو مار گرایا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ بم کسی اور نے اڑا دیا تھا۔ بم اتنا طاقتور تھا کہ اس کی شاک ویو اتنی دور سے بھی محسوس ہوئی تھی۔ جہاں دھماکہ ہوا تھا وہاں اتنا بڑا شعلہ لگا جو دس بارہ سیکنڈ تک برقرار رہا تھا اور اس دوران میں ہمارے لیے اس طرف دیکھنا مشکل ہو رہا تھا میں نے دوربین کا نائٹ ویژن موڈ ختم کیا اور پھر آنکھوں سے لگایا تو ایک خوفناک منظر سامنے آیا۔

اس طرف نہ صرف احاطے کی دیوار بارہ تیرہ گز تک صاف ہو گئی تھی بلکہ اس کوٹھی کا بڑا حصہ بھی منہدم ہو گیا تھا جس کے ساتھ بم لگا تھا۔ اس ملبے سے دھڑا دھڑ شعلے اٹھ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جو لوگ باہر موجود تھے وہ بھی اس بم کا شکار ہو گئے تھے۔ وسیم کا بھی یہی خیال تھا کیونکہ وہ سب پاس ہی تھے۔ میں نے کہا۔ ''یہ تو سچ مچ کا محاذ چھڑ گیا ہے۔''

''مگر یک طرفہ ہے جناب، یہ لوگ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے اب یہ کام ہمیں ہی کرنا ہوگا۔'' وسیم نے کہا اور ایک فائر کیا۔ ''یہ چوتھا گیا۔''

''اتنے ہی تمہارے آدمیوں نے بھی مار گرائے ہیں۔''

''یعنی دشمن کی نصف نفری صاف ہو گئی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کم سے کم چار، بم کا نشانہ بنے ہیں۔''

میں نے دوربین سے احاطے کے آس پاس کا جائزہ لیا۔ کھیتوں میں مکئی کی فصل تھی مگر وہ زیادہ بلند نہیں تھی اس میں کھڑا آدمی فوراً نظر میں آتا اس لیے وہاں موجود لوگ لیٹے ہوئے تھے اور اب اس پہاڑی کی سمت گولیاں برسا رہے تھے مگر ہم ان کی رینج سے باہر تھے۔ البتہ مجھے عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کی فکر تھی۔ میں نے دوربین سے ان کے آس پاس کا جائزہ لیا اور فوراً ہی مجھے تین افراد اس طرف رینگتے دکھائی دیئے وہ ان سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھے میں نے ریڈیو پر کہا۔ ''عبداللہ تین افراد تمہاری طرف آ رہے ہیں۔ دو سو گز کی دوری پر شمال مشرق کی طرف سے۔''

''ہم ان سے نمٹتے ہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

اب میں نے رہنمائی کا کام سنبھال لیا۔ میں افراد کو تلاش کرتا اور اسنائپرز کو بتاتا۔ رائفل دوربین کو ایک حد سے زیادہ حرکت دینا مشکل تھا اور اس کا کینوس بھی وسیع نہیں تھا بہت صاف دکھائی دیتی تھی لیکن محدود جگہ دکھاتی تھی۔ اسی دوران میں درگاہ مرشدیہ کی طرف سے گاڑیوں کی روشنیاں نمودار ہوئیں اور وہ تیزی سے اس طرف آ رہی تھیں۔ میں نے وسیم کو خبردار کیا اور اس نے اس طرف موجود اسنائپر کو حکم دیا کہ ان گاڑیوں کو ناکارہ کر دے۔ اسنائپر اپنے کام میں لگ گیا۔ میں نے دوربین گاڑیوں کی طرف کی آگے والی ایک کھلی جیپ تھی جس میں بدمعاشوں کے سے انداز میں کوئی درجن بھر اسلحہ بند سوار تھے اور وہ خاصی رفتار سے آ رہی تھی۔ اچانک اس کا اگلا دایاں ٹائر برسٹ ہوا۔ وہ گھوم کر مڑی اور سڑک پر قلابازیاں کھانے لگی۔ کچھ افراد اچھل کر باہر گرے اور ان کی بچت ہو گئی کیونکہ جو جیپ میں تھے ان کا حشر ہو گیا تھا میں نے ایک سرکٹ کر باہر گرتے دیکھا تھا۔ دوسری گاڑی جو ایک لگژری

فوراً نکلی تھی اس نے رفتار کم کی اور اسی وجہ سے الٹنے سے بچ گئی۔ اسنائپر نے اس کا ٹائر بھی اڑا دیا۔ ابھی وہ احاطے سے ایک کلومیٹر دور تھیں۔

بیشتر افراد کے مارے جانے کے بعد اب بچے کھچے بھاگ رہے تھے اس لیے وسیم نے فائرنگ روک دینے کا حکم دیا۔ میری توجہ احاطے کی طرف تھی۔ وہاں اب زیادہ مسلح افراد نظر آ رہے تھے۔ یقیناً کچھ گارڈز کوٹھیوں کے اندر بھی ہوں گے وہ باہر نکل آئے تھے اور عمر اصغر، اس کے بھائی بھتیجے بھی مسلح ہو کر باہر آ گئے تھے۔ ان کو بالکل علم نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے؟ وہ ٹوٹی دیوار کے پاس تھے اور تباہ شدہ کوٹھی میں لگی آگ بجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر آگ نہایت شدید تھی۔ یقیناً کوٹھی میں بچ جانے والے افراد نکال لیے گئے تھے اور وہ نہیں آ سکے تھے ان کے بچنے کا امکان مشکل نظر آ رہا تھا۔ اتنا بڑا دھماکا، فائرنگ اور پھر آتش زنی سب سے زیادہ جن افراد کی ہلاکت معمولی واقعہ نہیں تھی جلد یا بدیر یہاں پولیس کی آمد یقینی تھی اور اس سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا تھا۔

درگاہ مرشد کی طرف سے مسلح افراد کی بھرپور کمک آمد ثابت کر لی تھی کہ احاطے پر حملہ مرشد کے آدمیوں نے کیا تھا۔ وہ بم اڑانے میں کامیاب رہے تھے لیکن اس کے بعد یہ حملہ مکمل طور پر ناکام رہا تھا۔ حملہ آوروں کو بھاری جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا تھا۔ پہلے آنے والے افراد میں سے نصف مارے گئے تھے اور کئی شدید زخمی تھے۔ کمک کے لیے آنے والی ایک گاڑی تباہ اور اس میں موجود افراد مارے گئے تھے یا شدید زخمی تھے۔ دوسری گاڑی والے بچ گئے تھے مگر انہوں نے الٹے قدموں درگاہ کا رخ کیا تھا۔ پھر احاطے والے بھی اب ہوشیار اور مسلح تھے اس لیے امکان کم تھا کہ ان پر پھر حملہ ہو سکے گا۔ اب ہمارا یہاں سے نکل جانا ہی مناسب تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”پیک اپ کرو۔“

وسیم نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور اسنائپر رائفل فولڈ کرنے لگا۔ اسے سمیٹ کر ہم نیچے اترنے لگے۔ دس منٹ بعد سب گاڑیوں کے پاس پہنچ گئے اور روانگی اختیار کر رہے تھے۔ ہم اسی راستے سے واپس جانے۔ اس بار بھی احتیاطاً دونوں جیپوں کی روشنیاں بند رکھی تھیں۔ جب تک ہم جھاڑیوں تک پہنچ گئے اور پھر روشنیاں آن کر کے آگے بڑھنے لگے۔ یہاں سے دیکھ لیے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ ویسے دیکھ لیتا تو کوئی ہمارے پیچھے نہ آتا مگر اس سے یہ پتا چل جاتا کہ ہم اس طرف سے آئے تھے۔ میں نے موبائل

> ## واصل بن عطا
>
> نام واصل بن عطا، لقب الغزال۔ مدینہ میں 80ھ۔ 70-699ء میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے بصرہ چلے گئے اور حسن البصری کے اصحاب میں شامل ہوئے۔ ان کی زوجہ عمر بن عبید ابو عثمان کی بہن تھیں۔ آپ نے کہا کہ جو مسلمان گناہ کرتا ہے وہ مسلمان نہیں رہتا بلکہ کفر کے قریب تر چلا جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں کسی صحابی کا قتل بھی کفر ہے۔ احکام شرعیہ کی تقسیم کی اور کہا کہ جن برحق کے ثبوت کے چار طریقے ہیں۔ قرآن ناطق، حدیث متفق علیہ، اجماع امت اور قیاس۔
>
> مرسلہ: سلطان شیخ، سرائے عالمگیر

نکال کر چیک کیا مگر اس پر سگنل نہیں تھے۔ سگنل ہمیں آگے سڑک پر ملے اور میں نے وہ نمبر ملایا جس پر اصغر سے بات ہوئی تھی۔ کال خاصی دیر بعد گئی اور کسی نے ریسیو کی اور دہشت زدہ لہجے میں بولا۔ ”کون ہے کس سے بات کرنی ہے۔“

”الیاس ملک..... اصغر سے بات کراؤ۔“

”ادھر آگ لگی ہے تجھے بات کی پڑی ہے۔“ اس نے چلا کر کہا لہجے سے وہ کوئی ملازم لگ رہا تھا۔

”بکواس بند کرو..... میں اسی سلسلے میں اصغر سے بات کرنا چاہتا ہوں اگر تم نے ایک منٹ میں بات نہ کرائی تو تباہی کے خود ذمے دار ہو۔“

دھمکی سے زیادہ وہ میرے لہجے سے ڈر گیا تھا۔ ”اچھا جی کراتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد اصغر لائن پر تھا۔ ”شہباز ملک تم.....“

”ہم سب لٹ گئے۔“

”یہاں قیامت گزر گئی ہے۔“ وہ بھی دہشت زدہ تھا۔ ”اصغر اپنی بیوی اور دو بیٹوں کے ساتھ مارا گیا ہے۔“

”اصغر کون ہے؟“

”میرا چھوٹا بھائی۔“ وہ رونے لگا تھا۔ ”مرشد نے ہمارا خاندان تباہ کر دیا ہے۔“

یہ خاندان جس طرح بنا تھا اور اس مقام تک پہنچا تھا اس کا مقدر یہی تباہی تھا۔ مگر میں نے رسمی ہمدردی کی۔ ”مجھے افسوس ہے ہم ذرا دیر سے آئے اور مرشد کے آدمی اس وقت تک بم لگا چکے تھے۔“

اصغر چونکا۔ "تم؟.....کب آئے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے باہر حملہ آوروں کو تمہارے ان گارڈز نے روکا ہے جو کسی کام کے نہیں ہیں۔ باہر مرشد کے آدمیوں کی کم سے کم ڈیڑھ درجن لاشیں موجود ہیں۔ اگر تم لوگ ہمت کرو تو انہیں دیکھ سکتے ہو۔ مرشد ان لاشوں کو واپس حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گا کیونکہ یہ اس کے خلاف ثبوت ہوں گی۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب رہا تو اس کے بعد اس کے لیے اپنی گردن بچانا بہت آسان ہو جائے گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"ہاں سمجھ رہا ہوں۔"

"مرشد کا منصوبہ بری طرح ناکام رہا۔ میرا خیال ہے وہ آج ہی تم سب کا خاتمہ چاہتا ہوگا۔ اس کی حالت زخمی سانپ کی سی ہے جو واپس بل میں گھس گیا ہے۔ اسے یہ ڈر بھی کھائے جا رہا ہوگا کہ دور و نزدیک جو خفیہ درگاہیں ہیں ان کے سجادہ نشین اس از راہ شدید درگاہ کا پول کھول سکتے ہیں۔ اس کا اثر اس کی سیاست پر بھی پڑے گا۔ اب اسے مہلت دی تو وہ صحت یاب ہو کر پھر حملہ کرے گا۔"

"تب ہم کیا کریں؟"

"ہمت کرو اور باہر نکل کر اپنے علاقے کا کنٹرول سنبھالو۔ لاشوں کو اپنی تحویل میں لے لو اور ان کی تصویریں اور ویڈیو بھی بنالو۔ یہ کام پولیس کی آمد سے پہلے کرلو کیونکہ پولیس بھی مرشد کی غلام ہے ان کا بھروسا نہیں ہے کہ وہ سرے سے لاشیں ہی غائب کردے۔"

"باہر خطرہ ہے۔"

"پہلے بھی تم یہ سوچ کر اندر بیٹھے رہے اور کیا ہوا۔ یقین کرو اگر ہم صرف دس منٹ کی تاخیر سے آتے تو وہ تم سب کو مار چکے ہوتے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ مرشد کے آدمی یہاں آ رہے ہیں۔"

"اس کے آدمیوں میں ہمارے جاسوس شامل ہیں ان سے ہمیں اطلاعات ملتی ہیں۔"

"تب تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "اتنا بڑا نقصان ہوا ہے ہمارا۔"

"جیسے تم ابھی حجت کر رہے ہو اسی طرح اس وقت بھی یقین نہیں کرتے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ وقت ضائع کیے بغیر یہاں آجاؤں۔ میرے آنے سے تم سب بچ گئے ورنہ افسوس کرنے کے لیے زندہ نہ ہوتے۔ اب ہم وہاں سے نکل آئے ہیں اس لیے اب جو کرنا ہے تم نے کرنا ہے اور اس کا فیصلہ بھی تمہیں ہی کرنا ہے۔"

میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔

"یہ بزدل آدمی ہے۔" وسیم نے کہا۔

"اور ارشد اسے سب سے جذباتی قرار دے رہا تھا۔" میں ہنسا۔ "اگر یہ ایف آئی آر ہی درج کرا دے تو اسے بہت سمجھوں گا۔"

"یہ کسی صورت مرشد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"اگر مقابلہ کر سکتے تو گدی سے یوں بے دخل نہ ہوتے۔" عبداللہ بولا۔ "شاید اس نے آپ کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔"

"اس جیسے لوگ کسی کا شکریہ ادا کرنا نہیں جانتے ہیں۔"

"بہرحال ہم نے مرشد کو ایک جھٹکا اور دیا ہے۔" وسیم خوش تھا۔

"اس کے پاس لڑنے مرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔" عبداللہ نے مایوسی سے کہا۔ "کل اس کے پاس درجنوں اور آجائیں گے۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ایک لاش دس لوگوں کو ڈرا دیتی ہے اور مرشد کے آدمی کون سے جانثار ہیں۔ جو سچ مچ کے عقیدت مند ہیں وہ تربیت یافتہ نہیں ہیں۔ انہیں محدود طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن ان پر انحصار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے مرشد کے پاس جو بدمعاش ٹولہ بچا ہے وہ اب اپنے بارے میں ضرور سوچے گا۔"

"یہی میں بھی کہہ رہا ہوں پچھلے چند مہینوں میں ہم ان میں سے پچاس ساٹھ کو ٹھکانے لگا چکے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمارے چند آدمی مارے گئے۔ یقیناً اس فرق کو محسوس کیا ہوگا۔"

"تربیت یافتہ افراد کی آسانی سے پوری نہیں ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس معاملے میں مرشد کو اچھی خاصی زک پہنچی ہے اگر اس کے خلاف ایف آئی آر بھی آ جائے تو اس پر مزید دباؤ آ سکتا ہے۔"

"بالکل۔" وسیم نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "ایک بار مرشد کی اپنے شریکوں سے کھل کر جنگ ہو جائے تو اس کی آڑ میں اس کا صفایا کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔"

ہم نے کوئی حکمت عملی بہت زیادہ بحث مباحثے کے بعد نہیں بنائی تھی مگر حالات، واقعات اور پھر ہماری ذہنی ہم آہنگی سے ایک حکمت عملی جیسے خود بخود طے ہوتی چلی گئی۔ مرشد کو درندے کی طرح ہنکا کر اس طرف لایا جائے جہاں اس کا شکار آسان اور محفوظ ہو۔ یہ حکمت عملی کام کر رہی تھی۔ حالات ہمارے لیے موافق تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم

واپس حویلی پہنچ گئے تھے۔ مشن پوری طرح کامیاب رہا تھا اور ہم نے صرف چند سو گولیاں خرچ کر کے دشمن کو بھاری نقصان پہنچایا تھا۔ آج کی رات یقیناً مرشد کے لیے بہت بھاری تھی۔ راستے میں اس پر بھی بحث ہوئی تھی کہ افراد اور اس کے خاندان والوں کو ہم اپنی سیکیورٹی دیں مگر میں نے مخالفت کی اور یہ تجویز مسترد ہو گئی۔ میرا موقف تھا کہ ہم براہ راست کسی بھی معاملے میں ملوث نہیں ہوں گے۔ ہاں پس پردہ رہ کر اس آگ کو بھڑکانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ رحیم کا زوادی درگاہ میں تھا وہ بہت کم رابطہ کرتا تھا کیونکہ اس میں خطرہ بہت زیادہ تھا اگر وہ پکڑا جاتا تو اس کی موت بہت عبرتناک ہوتی۔ اس لیے وہ محتاط تھا۔

ہم واپس آئے تو رئیس الدین بے تابی سے ہمارا منتظر تھا اس نے گیٹ کھلتے ہی ہماری جیپ کے پاس آکر کہا۔ ”شباب کا پیغام آیا ہے میں نے ریکارڈ کر لیا ہے۔“

ہم اندر حویلی کے کنٹرول روم میں آئے جہاں جدید کمپیوٹرز کی مدد سے نہ صرف مواصلاتی سسٹم بلکہ سیکیورٹی سسٹم کو بھی کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ یہاں ہمہ وقت ایک فرد موجود رہتا تھا۔ رئیس کے اشارے پر آپریٹر نے ریکارڈر چلایا۔ شباب نے عجلت میں یہ پیغام ریکارڈ کرایا تھا اور وہ رکے بغیر بول رہا تھا۔ ”یہاں شام سے ہلچل مچی ہے۔ مسلح افراد تیاری کر رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے وہ کہیں قتل و غارت گری کا بہت بڑا منصوبہ بنا کر بیٹھے ہیں۔ مسلح افراد کی تعداد سو کے قریب ہے۔ ان کے پاس بھاری ہتھیار ہیں اور ایک بیرل تھا بہت بڑا بم ہے۔ اس وقت درگاہ سے تمام غیر متعلقہ لوگوں کو ہٹا دیا گیا ہے اور عام ملازمین کو بھی ان کی رہائش گاہوں تک محدود کر دیا ہے کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں بھی اپنے کمرے میں ہوں لیکن میں نے چوری چھپے یہ سب دیکھ لیا ہے۔ میں براہ راست رابطہ نہیں کر سکتا کیونکہ میرے ساتھ ایک آدمی اور رہتا ہے اس لیے موقع پا کر وائس ایس ایم ایس کر رہا ہوں۔“

”یہ تو پرانی رپورٹ ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایک پیغام اور بھی ہے۔“ رئیس نے جواب دیا اور آپریٹر کو دوسرا پیغام پلے کرنے کو کہا۔ شباب کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

”ابھی دس منٹ پہلے درگاہ میں ہنگامی حالات نافذ کر دیے گئے ہیں۔ آدھا گھنٹا پہلے فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں آئی تھیں اس کے بعد درگاہ سے دو گاڑیاں مزید سولہ سترہ افراد کو لے کر گئی تھیں۔ مگر دونوں گاڑیاں واپس

جبائی

(235ھ/849ئ۔303ھ/916ئ)

ابو علی محمد بن عبدالوہاب۔ ایک معتزلی عالم۔ خوزستان کے شہر جبا میں پیدا ہوئے۔ تعلیم بصرے میں ابو یعقوب الشحام کے مدرسے میں حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر اپنے استاد کا جانشین بنے۔ آپ نے اپنے اساتذہ کی روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اسے ترقی بھی دی۔ جبائی کا شمار معتزلہ کے مشہور ترین افراد میں ہوتا ہے۔ عقیدہ کے لحاظ سے انہیں بغدادی معتزلہ سے اختلاف تھا۔ وہ بصرے میں بھی نظام اور جاحظ سے اختلاف رکھتے تھے۔ نہ ہی اصم اور عباد کے نظریات سے اتفاق تھا۔ تمام معتزلہ بصرہ میں سے جنہیں خاص طور پر افعال انسانی کے مسئلے میں بغدادی معتزلہ سے اختلاف ہے۔ جبائی کے دو شاگرد ایسے تھے جنہوں نے اس کے بعد کافی شہرت حاصل کی۔ ایک تو بیٹا ابو ہاشم تھا اور دوسرے ابوالحسن اشعری تھے جو ایک مسئلے کے بارے میں جبائی کے جوابات سے مطمئن نہ ہو کر ایک الگ جماعت کے بانی بنے اور معتزلی عقائد کے رد میں مشغول ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق جس مکالمے کی بنا پر امام اشعری اور ان کے استاد جبائی کے درمیان اختلاف ہوا وہ مکالمہ تین بھائیوں کے انجام سے متعلق تھا جن میں سے ایک متقی تھا، دوسرا غیر متقی اور تیسرا ایسا تھا جو بچپن ہی میں انتقال کر گیا تھا۔ اس مسئلے میں قضائے الٰہی کی عقلی تصدیق و تصویب کا معاملہ درپیش تھا اور جب جبائی سے اشعری کے سوالات کا کوئی شافی جواب نہ بن پڑا تو اشعری اپنے استاد سے علیحدہ ہو گئے۔ جبائی کی تصانیف میں سے آج کوئی تصنیف بھی باقی نہیں ہے۔ ان کی ایک تصنیف ”کتاب الاصول“ کا پتا چلتا ہے جس کے رد میں امام اشعری نے کئی رسائل لکھے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی اور تصانیف بھی تھیں۔

مرسلہ: زاہد جمال۔ نوشہرہ

نہیں ہوسکیں صرف سات افراد واپس آئے ہیں اور یہاں بہت شدید خوف و ہراس پایا جارہا ہے۔ درگاہ کے تمام دروازے بند کردیے گئے ہیں۔ ہر طرف مسلح افراد لگے ہیں مگر پہلے جانے والوں میں سے بھی چند ہی افراد واپس آئے ہیں۔ سنا ہے کہ کوئی تین درجن لوگ مارے گئے ہیں یا شدید زخمی ہیں۔ ان کا کچھ نہیں پتا کہ وہ کہاں ہیں۔"

وسیم نے سر ہلایا۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ مرشد کی... گئی ہے۔"

عبداللہ نے کہا۔ "ایک خیال ہے کیوں نہ میڈیا کو اس معاملے میں شامل کردیا جائے۔"

"وہ کیسے؟"

"میرے پاس تقریباً سارے چینلوں کے نمبر ہیں۔ میں کال کرتا ہوں۔"

"تجویز اچھی ہے میڈیا کے آنے سے حقائق چھپانا مشکل ہوجائے گا۔" وسیم نے تائید کی۔

"فٹافٹ کرو، وقت گزر رہا ہے۔"

عبداللہ چینلوں پر کال کرکے یہ اطلاع دینے لگا۔ پھر اس نے ایک واقف کار صحافی کو بھی کال کرکے بتایا۔ وہ اس کے اعتماد کا آدمی تھا اور عبداللہ کا نام کسی صورت سامنے نہیں لاتا۔ اس بھاگ دوڑ نے تھکایا تو نہیں تھا مگر مجھے اب غسل کی خواہش ہورہی تھی۔ رئیس نے مجھے ایک کمرا دکھایا۔ اس کے ساتھ اٹیچ باتھ بھی تھا۔ سیفر برابر والے کمرے میں تھا۔ جب تک میں نہا دھو کر تازہ دم ہوکر آیا۔ مختلف چینلوں پر بریکنگ نیوز آنا شروع ہوگئی تھی۔ مگر فی الحال کوئی نیوز ٹیم جائے وقوع پر نہیں پہنچی تھی۔ چینل والے پولیس انتظامیہ سے بھی رابطہ کرکے واقعے کے بارے میں پوچھ رہے تھے مگر ان کی طرف سے فی الحال کسی بیان سے انکار کیا جارہا تھا۔ پولیس ترجمان کا کہنا تھا کہ ابھی تصدیق کی جارہی ہے اور پولیس کی ٹیمیں جائے وقوع پر روانہ کردی گئی ہیں۔

عبداللہ نے اپنے واقف کار صحافی کو بریف کردیا تھا کہ یہ اصل میں مرشد خاندان کی گدی کے پیچھے آپس میں لڑائی کا شاخسانہ تھا۔ اس لیے کئی چینلوں پر اس کا ذکر بھی آرہا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہورہی تھی مرشد اور اس کے خاندان کا نام یوں اچھلنے پر۔ آدھے گھنٹے بعد میڈیا ٹیمیں بھی علاقے میں پہنچ چکی تھیں۔ پولیس نے اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ کر عام لوگوں اور میڈیا ٹیموں کو آگے جانے سے روک دیا مگر ان کے کیمرا مین اپنا کام کررہے تھے۔ تباہ شدہ گاڑی بھی دکھائی جارہی تھی اور کئی لاشیں بھی ٹی وی اسکرین پر نظر آچکی تھیں۔ پھر اصغر اور اس کے خاندان والوں کو پتا چلا کہ میڈیا آگیا ہے تو انہوں نے باقاعدہ پریس کانفرنس کا اعلان کردیا۔ پولیس نے میڈیا اور صحافیوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔

اصغر، اس کا بچنے والا بھائی اکبر اور چند دوسرے افراد بھی باہر میڈیا کے سامنے آئے اور انہوں نے نہایت جذباتی انداز میں بتایا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ انہوں نے مرشد پر ارشد علی کے قتل اور اس حملے کا واضح الزام لگاتے ہوئے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کو کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر پولیس نے ایف آئی آر درج نہیں کی تو وہ عدالت میں جائیں گے۔ اس پریس کانفرنس نے وہ کام کیا جو میرے خیال میں دس ایف آئی آر بھی نہیں کرسکتی تھیں۔ اصغر نے الزام لگایا کہ آس پاس مرشد کے مسلح بدمعاشوں کی لاشیں موجود تھیں اور اسے خدشہ تھا کہ پولیس ان لاشوں کی شناخت بدل دے گی۔ نیز یہاں درگاہ سے آنے والی دو تباہ شدہ گاڑیاں بھی تھیں۔ اصغر نے میڈیا کو ان کی نمبر پلیٹ اور لاشوں کی تصاویر بھی دیں جو انہوں نے پولیس کی آمد سے پہلے لے لی تھیں۔ ساتھ ہی اس نے مرشد جیسے سفاک اور قاتل شخص کے خلاف حکومت سے سیکیورٹی طلب کی تھی۔ اس نے جذباتی انداز میں کہا۔

"ہم کب سے سیکیورٹی مانگ رہے تھے۔ اگر حکومت پہلے ہماری بات سن لیتی تو ہمارے خاندان کو یہ میتیں نہ اٹھانی پڑتیں۔"

آدھے گھنٹے کی اس پریس کانفرنس نے مرشد کو اچھا خاصا بے نقاب کردیا تھا۔ اب اس کے لیے اپنے جرائم سے انکار آسان نہیں ہوتا۔ اس پریس کانفرنس نے پولیس کو بھی مشکل میں ڈال دیا تھا اب وہ چاہنے کے باوجود حقائق نہیں چھپا سکتی تھی۔ جب میڈیا اور پریس نے پولیس افسران کو گھیرنا شروع کیا اور ان سے سوالات کیے تو ان کو جواب دینا مشکل ہوگیا۔ انہوں نے ہر سوال کا جواب گول کرکے جان چھڑائی تھی۔ وسیم نے کہا۔ "یہ تو لگ رہا ہے کہ پولیس مرشد کو بچانے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہے۔"

"کیونکہ وہ ان کا مائی باپ جو ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "حکومت انہیں اتنی تنخواہ نہیں دیتی ہے جتنی خیرات مرشد دے دیتا ہے۔ مگر مرشد کے لیے جان چھڑانا آسان نہیں ہوگا۔ میری بھی خواہش ہے کہ پولیس ایف آئی آر درج نہ کرے اور اصغر اینڈ پارٹی عدالت چلی جائے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وسیم نے جماہی

لی۔" دیکھتے ہیں کہ اب کیا ہوتا ہے۔"

کچھ دیر بعد سب آرام کے لیے اٹھ گئے تھے۔ وسیم نے آج طویل سفر کیا تھا اور میں بھی تھک گیا تھا۔ حویلی نئی آباد ہوئی کوٹھی کی طرح آراستہ اور پُرتعیش نہیں تھی۔ یہاں صرف نشست گاہ اور چند کمروں میں فرنیچر تھا۔ رہائش کے لیے مخصوص کمروں میں ریتی آسمانی رنگ کی تھی کہ فرش پر اندر لے کے ساتھ قالین ڈال لیے تھے۔ اسی پر سوتے، اٹھتے بیٹھتے اور کھانے پیتے تھے۔ کمروں میں اے سی فٹ تھے اور ہم رات کھول کر ان کا استعمال کر رہے تھے۔ میں تکیہ لے کر لیٹ گیا۔ اب تک جو ہوا تھا میں اس سے خاصا مطمئن تھا اس لیے خنکی نے ذرا دیر میں تھپک کر مجھے سلا دیا۔ صبح ذرا جلدی آنکھ کھلی تو تازہ دم تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ منہ پر پانی مار کر میں باہر لان میں نکل آیا۔ موسم کسی قدر خنک تھا اور ہوا چل رہی تھی۔ مگر سورج نکلتے ہی موسم گرم ہو جاتا۔ جون کا مہینہ ختم ہونے کو تھا اور ابھی تک صحیح معنوں میں مون سون کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

کچن کے ساتھ ہی ڈائننگ روم تھا اور ناشتا چل رہا تھا۔ سفیر اٹھ گیا تھا۔ عبداللہ اس کے ساتھ تھا اور اسے رات کی روداد سنا رہا تھا۔ سفیر نے مجھے دیکھ کر سر ہلایا۔ "میری تو ذرا سی نیند میں تم لوگوں نے اتنا کچھ کر دیا۔"

"کیونکہ تو سو رہا تھا۔" میں نے سر ہلایا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میز پر خالص لاہوری ناشتا تھا لیکن صبح کے صرف پانچ بجے۔ رات کا کھایا پیا ہضم ہو گیا تھا۔ سفیر نے کہا۔

"رات ماہی کا میسج آیا تھا۔ وہ خیریت سے ہے اور تمہاری خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہے۔"

"میں سوچ رہا ہوں آج اس کے اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر کر دوں۔" عبداللہ بولا۔

"یہ اچھا ہے اسے کہنا نہ پڑے۔" میں نے تائید کی۔ "ٹی وی پر کوئی تازہ اپ ڈیٹ آئی ہے۔"

"پولیس نے مرشد کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" وسیم نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "میری ابھی اصغر سے بات ہوئی ہے اور وہ اب عدالت جا رہے ہیں۔"

"گزری رات کے واقعے کی کیا خبر ہے؟"

"پولیس کے مطابق اس واقعے میں چوبیس افراد مارے گئے جن میں سے سات کا تعلق اصغر سے تھا۔ سترہ افراد نامعلوم ہیں۔ زخمیوں کی تعداد انیس ہے۔ سات افراد اصغر کے ہیں اور باقی...."

"نامعلوم۔" میں ہنسا۔ "پولیس مردوں سے اقبال کرا لیتی ہے اور یہاں زخمی بھی نامعلوم ہیں۔"

"ٹی وی اور اخبارات نے بڑے پیمانے پر کوریج کی ہے لاشوں اور زخمیوں کی تصاویر بھی دی ہیں جو اصغر نے انہیں مہیا کی تھیں۔"

"یا پھر مارے جانے والوں کے بارے میں اصغر اینڈ پارٹی نے کیا بیان دیا ہے؟"

"ان کا کہنا ہے کہ وہ اس بارے میں نہیں جانتے رہا ہے اور فائرنگ کے بعد ان کی طرف سے بھی فائرنگ ہوئی تھی۔ اس لیے ہو سکتا ہے مارے جانے والے اس فائرنگ کا نشانہ بنے ہوں۔"

"عقل مندانہ بیان ہے۔"

"مرشد اس پر یقین نہیں کرے گا۔" وسیم نے کہا۔ "پولیس بھی تسلیم نہیں کرے گی کیونکہ ایک درجن سے زیادہ افراد اسنائپرز کا شکار ہوئے ہیں اور اصغر کے لوگوں کے پاس اس قسم کے ہتھیار نہیں ہیں۔"

"تو کریں تفتیش، وہ ہم پر الزام نہیں لگا سکتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اب ذرا اصغر سے بات کرلی جائے۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے اصغر کو کال کی۔ وہ کورٹ میں موجود تھا اور اپنے وکیلوں کے ہمراہ ہائی کورٹ میں درخواست دائر کرنے جا رہا تھا۔ میں نے اسے بڑھاوا دیا۔ "یہ ضروری ہے۔ مرشد حد سے گزر گیا ہے اور اسے لگام ڈالنا ضروری ہے۔"

"ایک بار اس کے خلاف ایف آئی آر درج ہو جائے تو میں دیکھتا ہوں وہ کیسے بچتا ہے۔" اصغر نے پھر بڑک ماری۔

"بالکل ایک بار ایف آئی آر درج ہو جائے۔" میں نے کہا۔ حالانکہ مجھے اندازہ تھا کہ مرشد جیسا آدمی قتل کر کے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے اور اس کا کیس سالوں عدالت میں چلتا رہے گا مگر اسے سزا نہیں ہو گی۔ ہمارا نظام انصاف کرپٹ، کمزور اور سست ہے۔ دولت مند مجرم اس سے فائدہ اٹھا کر بچ نکلتے ہیں۔ میں نے اس سے بات کر کے موبائل رکھا تھا کہ اس کی بیل بجی اور اجنبی نمبر دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے فوری بیل کاٹ کر موبائل آف کر دیا۔ وسیم نے پوچھا۔ "کس کی کال تھی؟"

"اجنبی نمبر تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے شبہ ہے کہ زیبونشا کی کال تھی۔"

وسیم کے ساتھ سفیر بھی چونک گیا۔ ہم نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ سفیر نے کہا۔ "زیبونشا کو یہ نمبر کیسے ملا ہوگا؟"

''کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔''اس نے اصغر اور اس کے گھر کے نمبر زٹیپ کرا لیے ہوں گے، میں نے اصغر کو کال کی اور اسے میرا نمبر مل گیا۔'' میں کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔''اب میرا یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''کہاں جائیں گے؟'' رسم نے پوچھا۔

''عبداللہ نے آبپارہ میں ایک فلیٹ لیا ہے وہاں جائیں گے۔ عبداللہ اور سفیر میرے ساتھ ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے آپ راستے میں اس سے بات کر سکتے ہیں۔''

ہم وہاں سے نکل آئے اس بار مری روڈ کا رخ کیا اور عبداللہ راول چوک پر اتر گیا۔ اس نے مجھے ایک چابی تھمائی اور فلیٹ کا پتا بتایا۔''میں ذرا بابی والا کام نمٹا کر آتا ہوں۔''

''کوٹھی کی طرف مت جانا۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔''اس کی نگرانی ہو رہی ہوگی۔''

''نہیں مجھے بس بینک سے کام ہے۔'' عبداللہ اتر کر ایک طرف کھڑی ٹیکسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سفیر نے ڈرائیونگ سنبھال لی تھی اور ہم آبپارہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سورج نکلتے ہی دن شدید گرم ہو گیا تھا اور گاڑی کا اے سی آن تھا ورنہ ہمارا حشر ہو رہا ہوتا۔ سفیر نے سرد آہ بھری۔

''کیا در بدری ہے، کہیں سکون سے چند گھنٹے گزارنا نصیب نہیں ہوتا ہے۔''

''شکر کر زمین کے اوپر پھر رہے ہیں ایسے خبیث دشمنوں کے ہوتے ہوئے زمین کے نیچے نہیں ہیں۔''

''یہ بھی ہے۔'' سفیر نے سر ہلایا۔''زیبوز شا کو کال کر۔''

''گاڑی کہیں روک لے۔ اگر وہ ٹریکنگ کر رہا ہوگا تو سمت سے بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔''

سفیر نے جیپ ایک کنارے درختوں کے سائے میں روک لی۔ اس نے انجن آن رہنے دیا تھا تاکہ اے سی کام کرتا رہے۔ میں نے موبائل آن کیا اور اسی نمبر کو ملایا جس سے کال آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک گورے نے کال ریسیو کی۔ اس کا لہجہ گوارہ سے مدہم تھا۔ میں نے کہا۔''زیبوز شا سے بات کراؤ۔''

''تم کون ہو؟'' وہ غرایا۔

''وہی جسے زیبوز شا کال کر رہا تھا۔ جلدی کرو میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

اس بار اس نے توقف کیا اور چند لمحے بعد بولا۔''پانچ منٹ بعد کال کرو۔'' اس نے کہتے ہی لائن کاٹ دی۔ میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور سفیر کی طرف دیکھا۔

''زیبوز شا ہوشیاری دکھا رہا ہے۔ اس نے پانچ منٹ بعد کال کرنے کو کہا ہے۔''

سفیر نے سر ہلایا۔''تاکہ سگنل سے لوکیشن پتا چلا سکے۔ شہباز مجھے تشویش ہو رہی ہے زیبوز شا کچھ زیادہ ہی پیچھے پڑ رہا ہے۔''

''یہاں سے چل۔''

سفیر نے سگنل منتقل کی اور گاڑی مخالف سمت میں موڑ دی۔ پانچ منٹ میں ہم تین کلومیٹرز دور آ گئے اور میں نے پھر زیبوز شا کو کال کی۔ اس بار بھی اسی گورے نے ریسیو کی اور تقریباً دو منٹ کی تاخیر سے لائن پر آیا۔ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔''لائن فون کے لیے آپریٹر ہوتے ہیں تم نے موبائل فون کے لیے بھی آپریٹر رکھا ہوا ہے۔''

اس نے میری بات نظر انداز کر کے بلا تمہید کہا۔''شہباز تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔''

''میں نے کیا اچھا نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔ ویسے میں سمجھ گیا تھا اس کا اشارہ گزشتہ رات والے واقعے کی طرف تھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ فاضلی اور اس کے معاملات سے الگ رہو۔''

''میں نے اس دن کے بعد سے فاضلی کی صورت نہیں دیکھی اس کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''میرا اشارہ مرشد اور اس کے کزنز کے درمیان لڑائی کی طرف ہے۔''

''میں اس میں ملوث نہیں ہوں۔''

''تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔'' اس نے تیزی سے کہا۔''تم نے اصغر علی کو کال کی تھی۔''

''بالکل کی تھی کیونکہ وہ بھی مرشد کا دشمن ہے میں نے خیریت معلوم کرنے کے لیے کال کی تھی۔''

''غلط تم اسے اکسا رہے تھے کہ وہ مرشد کے خلاف کیس کرے۔''

''زیبوز شا۔'' اس بار میرا لہجہ بھی سرد ہو گیا۔''آخر تم مرشد کے لیے اتنا پریشان کیوں ہو؟''

''شہباز میں اس سے اپنے انداز میں نمٹ رہا ہوں۔''

''تو تمہیں کس نے روکا ہے اور تم کس خوشی میں میرے معاملات میں مداخلت کر رہے ہو؟''

وہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔''شہباز میں نہیں چاہتا کہ تم کسی قانونی مسئلے میں پڑو

اور تمہاری آزادی متاثر ہو۔"

"میرے مسائل اور آزادی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ کیا تعلق ہے؟"

"زیوذشا مجھے لگ رہا ہے تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو اور میں مزید بے وقوف بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ جہاں تک مرشد کا تعلق ہے تم اس سے نمٹتے رہو لیکن میرے معاملے میں مداخلت مت کرو میں اس سے اپنے انداز میں نمٹنا چاہتا ہوں۔"

"شہباز اس سے میرا پلان خراب ہوگا اور ہو سکتا ہے تم بھی مشکل میں پڑ جاؤ۔"

"اگر یہ مشکل ہے تو میرے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اگر تم اطلاع دے رہے ہو تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے کبھی مشکلات کو اہمیت نہیں دی۔"

اچانک سفیر نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا۔ وہ گھڑی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں کوئی دس منٹ سے زیوذشا سے گفتگو تھا اور یہ مدت خاصی زیادہ تھی۔ میں نے کہا۔ "زیوذشا میں تمہیں پانچ منٹ بعد کال کرتا ہوں۔"

میرے کال کاٹتے ہی سفیر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے برہمی سے کہا۔ "آپ بلاوجہ کی احمقانہ گفتگو فرما رہے تھے۔"

"بس یار اتنے عرصے بعد زیوذشا کی حسین آواز سنی تو خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔" میں نے جھینپ کر کہا۔

ہم اسلام آباد کی حدود میں تھے۔ "یہ اسلام آباد ہے یہاں آدمی دس منٹ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتا ہے۔ زیوذشا کے ریڈ بائی کے بنا رنی تو سوگھ رہے ہوں گے۔"

پانچ منٹ بعد سفیر نے پانچ کلو میٹر دور ایک اور جگہ گاڑی روکی۔ میں نے موبائل نکالا اور زیوذشا کو کال کی اس بار اس نے فوراً ریسیو کی اور بولا۔ "شہباز میری درخواست ہے تم صرف دو دن اس معاملے سے دور رہو۔ رات بھی تم نے بہت نقصان کیا ہے۔"

"میرا سوال وہی ہے کہ مرشد کے نقصان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟" وہ میرا سوال نظر انداز کر کے بولا۔

"سوری زیوذشا تمہارا مجھ پر کوئی قرض نہیں ہے جو میں اس طرح چکاؤں اور نہ ہمارے درمیان دوستی یا رشتے کا ایسا تعلق ہے کہ میں وضعداری دکھاؤں اس لیے میں تمہاری درخواست رد کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور کال کاٹ کر موبائل بند کر دیا۔ سفیر نے مجھے داد دی۔

"بالکل ٹھیک جواب دیا تو نے۔ یہ بندر کے منہ والا خود کو کچھ سمجھتا ہے۔"

"وہ بچ بچ طاقتور شخص ہے لیکن ساتھ ہی بہت ٹھنڈے دماغ کا اور نہایت کینہ پرور بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے لگ رہا ہے وہ کسی چکر میں ہے خاص طور سے اس نے مرشد کے آدمیوں نے میرے کو نقصان قرار دیا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے وہ ڈراما کر رہا ہے؟"

"نہیں مرشد کے خلاف تو وہ بچ بچ سرگرم ہوگا۔ میرا خیال ہے وہ صرف اسے تباہ کرنا چاہتا ہے اس کے سیٹ اپ کو نہیں۔"

سفیر چونکا۔ "تیرا مطلب ہے وہ اس سیٹ اپ پر قابض ہونا چاہتا ہے۔"

"بالکل اور اسی لیے وہ مرشد کے آدمیوں کے مارے جانے پر روگی ہے کیونکہ یہ سب بالآخر اسے ملتے۔"

"مگر کیسے؟"

"مجھے ابھی خیال آیا ہے کہ فاضلی مرشد کا بہترین متبادل ہو سکتا ہے۔ وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ مرشد کی اولاد ہے۔"

"ہونے کو تو وہ اربابہ کا فرزند ارجمند ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔ مگر اسے مانے گا کون جب کہ وہاں کا ایک ایک بچہ فاضلی کے ماں باپ کو جانتا ہے۔"

"یار کہانی بنانا کون سا مشکل کام ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ناجائز اولاد کے طور پر پیدا ہوا اور کسی بھی اشارے پر مرشد نے اسے پرورش کے لیے اس غریب جوڑے کے سپرد کر دیا تاکہ وہ غریبوں میں پرورش پائے اور غریب پروری سیکھے۔ یار جاہل عوام تو ایسی باتوں پر لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے رہی سہی کسر پوری کرنے اور قانون کو مطمئن کرنے کے لیے فاضلی کی ڈی این اے رپورٹ پیش کر دی جائے گی۔"

"لیکن مرشد اور اس کی بیویاں بچے....."

"اب مجھے لگ رہا ہے کہ ان سب کو ورنہ بیشتر کو اچانک دنیا سے رخصت کر دیا جائے گا اور جو بچے گا وہ فاضلی سے ٹکر لے نہیں سکے گا۔ ارشد علی اینڈ برادران کا دم پہلے ہی توڑ دیا گیا ہے اور وہ مرشد سے مقابلہ نہیں کر سکے تو فاضلی تو اس کا بھی باپ ہے۔"

"پیر و مرشد۔" سفیر نے عقیدت سے میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور بہ ظاہر میرے ہاتھ کو لیکن درحقیقت اپنے ہاتھ چومتے ہوئے بولا۔ "مان گیا آپ کو زیوز شا اور فاضلی جائیں جہنم میں...... یہ گدی تو آپ کو حق ہے۔"

"بکواس نہ کر۔" میں نے ہاتھ کھینچا۔ "یہاں سے نکل ایسا نہ ہو کہ عبداللہ کام نمٹا کر پہنچ جائے اور چابی ہمارے پاس ہے۔"

"کوئی بات نہیں وہ ذرا انتظار کر لے گا۔" سفیر نے آرام سے کہا اور ایک فوڈ اسپاٹ پر گاڑی روک دی۔ "یہاں سے کھانے پینے کو کچھ لیتے ہیں وہاں تو کچھ نہیں ہوگا۔"

یہ خاصا جدید قسم کا فوڈ اسپاٹ تھا جہاں دیسی سے لے کر ولایتی ہر طرح کے کھانے تیار کیے جاتے تھے اور پارسل ہوتے تھے۔ سفیر نے دل کھول کر اپنی پسند کی چیزیں لیں اس دوران میں، میں پینے کے سامان کی خریداری کرتا رہا۔ اس میں مختلف طرح کے پیک جوس، کولڈ ڈرنک اور منرل واٹر کی بوتلیں شامل تھیں۔ پھر میں نے سفیر کے موبائل سے عبداللہ کو کال کی اور اس سے جانے کا پوچھا۔ اس نے کہا۔ "وہاں سب ہے آپ فکر نہ کریں کھانے کو بھی پاس سے سب ملتا ہے اور اسے وہاں ملتا ہے۔"

"سفیر اچھا خاصا خریداری میں لگ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کب تک پہنچ رہے ہو؟"

"کچھ وقت لگے گا۔" عبداللہ نے بتایا۔ "میں چیک میں ہوں مالی سے پوچھ کر کام کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر ہم جا رہے ہیں۔" میں نے سفیر کو ادائیگی کرتے دیکھ کر کہا اور کال کاٹ دی۔ سفیر نے خاصا کچھ جمع کر لیا تھا جو کئی شاپروں میں تھا لیکن میں نے اس سے زیادہ وزن اٹھایا ہوا تھا اس لیے کوئی بھی شاپر اٹھانے سے صاف انکار کر دیا۔ "اپنا اپنا بوجھ سب اٹھاؤ۔"

"وہ تو میدانِ حشر میں ہوگا۔" سفیر نے باہر آ کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"بچے میں دیکھ رہا ہوں گناہوں کے ساتھ تیرا ذاتی بوجھ بھی اس دھرتی پر بڑھتا جا رہا ہے۔ تو توند نکل آئی کھا کھا کر آرام کرنے سے۔"

"آرام کہاں کرتا ہوں۔" سفیر نے احتجاج کیا۔ "جب کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو......"

"تو آدمی ایکسرسائز کر لیتا ہے۔ کہاں تو مجھ سے زیادہ فٹ تھا اور کہاں اب تجھ سے یہ چار شاپرز نہیں اٹھائے جا رہے۔" میں نے افسوس سے کہا۔

"بس یار زندگی کے اس چکر کو آرام آ جائے تو پھر سے روٹین لائف میں ایکسرسائز شروع کریں گے۔"

"انشاءاللہ۔" میں نے جیپ اسٹارٹ کی۔ دس منٹ بعد ہم آبپارہ کے اس فلیٹ کے سامنے تھے۔ یہ ذرا پرانے لیکن بہت اچھے اور صاف ستھرے فلیٹس تھے۔ کل چار منزلہ تھے اور نیچے دکانیں تھیں۔ ہم گارڈ سے پوچھ کر دوسری منزل پر آئے۔ فلیٹ کھلا کھلا تھا۔ سامنے بڑا سا لاؤنج تھا۔ اسی میں کچن تھا۔ اس کے بعد برابر دو بیڈ روم تھے ان کے ساتھ اٹیچ باتھ روم تھے اور باتھ رومز کے درمیان کشادہ بالکونی تھی۔ اس سے سامنے سرکاری ملازمین کے لیے مخصوص کوارٹرز کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سفیر آمد کے دس منٹ کے اندر سارا جائزہ لے آیا تھا۔ اس نے اطلاع دی۔

"یار بالکل سامنے ایک بیر بہوٹی جیسی خاتون دھلے کپڑے ٹانگ رہی ہیں۔"

"بیر بہوٹی سے کیا مراد ہے یہ تو برسات میں نکلتی ہیں۔"

"یار خود بھی سرخ سرخ سی ہیں اور لباس بھی اسی رنگ کا پہنا ہوا ہے۔ بہت عرصے بعد کوئی اچھا چہرہ دیکھنے کو ملا ہے۔"

"لگتا ہے مدت سے دوری رنگ لا رہی ہے، تجھے ہر خاتون خوب صورت لگنے لگی ہے۔"

"نہیں یار خدا کی قسم سچ کہہ رہا ہوں تو ایک نظر دیکھ تو سہی۔" سفیر اصرار کر کے مجھے بالکونی میں لایا اور آگے دھکیل کر خود پیچھے رہا۔ سڑک کے فوراً پار موجود گھر کی چھت پر سچ مچ ایک ایسی ہی خاتون تھیں۔ شدید گرمی میں انہوں نے سرخ لباس پہنا ہوا تھا اور خود بھی تپش سے سرخ ہو رہی تھیں۔ رنگ و روپ کے بارے میں سفیر کا بیان درست تھا۔ لیکن جب میں گیا تو وہ اپنا کام کر چکی تھیں اور اب واپس جا رہی تھیں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ سفیر مجھے ورغلا کر یہاں لے آیا میں پلٹا تو وہ ہنسا۔ "بیٹھے ہوئے پارسا بنتے ہو لیکن اندر سے......"

"کون کمبخت پارسا بن رہا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی اور اندر آیا۔ "بس کم گناہگار بننے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"اچھا زیادہ لاگ نہ مار میرا شکریہ ادا کر کہ میری وجہ سے تجھے اچھی شکل دیکھنے کو مل گئی۔"

"ہاں آج تک جتنی اچھی شکلیں دیکھی ہیں وہ تیری وجہ سے ہی دیکھی ہیں۔" میں نے سر ہلایا۔ سفیر فریج سے برف نکال لایا اور ایک کولڈ ڈرنک کی بوتل کھولی۔ یہ گرم تھی

لیکن برف نے اسے سرد کر دیا۔ سفیر نے گلاس آئس کیوبس سے بھر دیا تھا اس لیے مزہ آ گیا۔ گلاس میں برف زیادہ اور کولڈ ڈرنک کم تھی۔ اس لیے ہم نے کئی بار ڈال کر پی۔ میں نے موبائل نکال کر چیک کیا مجھے فکر تھی کہ وہ آن نہ رہ جائے۔ اس صورت میں ہمارا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ حفظ تقدم میں نے سرے سے سم ہی نکال کر رکھ لی۔ سفیر کچھ دیر سرخ پوش خاتون کے حوالے سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے بعد سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "یار اگر یہ بات سچ ہے تو ہمارے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔ فاضلی خصلت میں اپنے ناجائز باپ سے کم نہیں ہے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ذیوذ شا فاضلی کی صورت میں یہاں اپنا ایک قابلِ اعتماد اور مضبوط حلیف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ البادہ اپنے مفاد کے لیے کر رہا ہے ہمارے مفاد کے لیے نہیں۔"

"فاضلی سانپ کی اولاد ہے وہ ڈسنا ہی سیکھے گا۔ اس لیے اس سے پہلے کہ وہ طاقتور بنے اس کا سر بھی کچلنا پڑے گا۔"

"یہ کام اس کے گدی نشین ہونے سے پہلے کرنا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "ایک بار وہ گدی پر متمکن ہو گیا تو ذیوذ شا کے قابو میں بھی مشکل سے رہے گا۔"

یہاں اے سی نہیں تھا مگر روم کولر تھا۔ سفیر نے اسے چلایا تو کمرا ٹھنڈا ہونے لگا۔ "ذیوذ شا بہت شاطر سیاست دان ہے تو نے اسے جواب دے کر ٹھیک کیا۔ مرشد بنیادی طور پر ہمارا مسئلہ ہے اور اس سے کیسے نمٹنا ہے یہ بھی ہمارا مسئلہ ہے۔ وہ ہمیں ڈکٹیٹ نہیں کرا سکتا کہ اس سے کیسے نمٹا جائے اور کیسے نہیں۔"

"مگر اب ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ذیوذ شا جس طرح میرا موبائل ٹریس کرا رہا ہے اس سے لگتا ہے کہ اس کے ذہن میں میرے یا ہمارے حوالے سے کچھ ہے۔"

"سامنے کی بات ہے تجھے قابو کرنا تو اس کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے۔" سفیر نے سر ہلایا۔ "تیرے ساتھ اگر کوئی اور بھی ہاتھ آ جائے تو اس کے لیے مزید آسانی ہوگی تجھ پر دباؤ ڈالنے میں۔"

سفیر درست کہہ رہا تھا۔ "اس لیے ہمیں اب موبائل کا استعمال کم سے کم کر دینا چاہیے۔"

"میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔" سفیر نے کہا۔ "اگر ہم کوئی طاقتور ریڈیو سیٹ لے لیں۔ جو میں پیغام سیل تک ٹرانسمٹ کر سکے تو یہ موبائل کا بہترین متبادل ہوگا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "یار میں نے بچوں کے کھلونوں کی شاپس میں ایسے واکی ٹاکی سیٹ دیکھے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے کہ وہ ایک کلومیٹر تک کام کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ پروفیشنل واکی ٹاکی اس سے زیادہ رینج کے مل سکتے ہیں۔"

"اچھا ہم اس معاملے میں پتا ہے اس سے کہتے ہیں۔" سفیر نے سر ہلایا۔ اسی اثنا میں کال بیل بجی اور اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ عبداللہ پسینے میں شرابور اندر آیا اور اس نے آتے ہی سب سے پہلے فریج سے منرل واٹر کی بوتل نکال کر ایک ہی سانس میں آدھی صاف کر دی اور پھر روم کولر کے سامنے آ بیٹھا۔

"آج تو گرمی نے مار ہی ڈالا۔ اوپر سے ٹیکسی بھی ایسی ملی کہ اس کا سائیڈ والا شیشہ کھل ہی نہیں رہا تھا۔ آپ لوگ کیا کر رہے تھے؟"

"بیر بہوٹیاں تاڑ رہے ہیں۔" میں ہنسا۔

عبداللہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو سفیر نے اسے تشریح کر کے بیر بہوٹیوں کی وضاحت کی۔ عبداللہ اس کے ساتھ چپت ہو گیا۔ ان دونوں کی واپسی خاصی دیر بعد ہوئی۔ پتا چلا کہ سرخ پوش خاتون کپڑے ڈالنے کے دوسرے راؤنڈ کے سلسلے میں چھت پر تھیں۔ اس بار سفیر کا بیان تھا کہ وہ خود بھی خاصی بھیگ گئی تھیں۔ میں نے کہا۔ "یار یہ اچھی بات نہیں ہے شریف عورتوں کو اس طرح جان بوجھ کر دیکھنا۔"

سفیر نے عبداللہ کی طرف دیکھا اور ہنسا تو عبداللہ کھسیا گیا۔ میں نے غور کیا۔ "یہ کیا چکر ہے؟"

"خاتون بدو نمبر ہیں۔" سفیر نے کہا۔

"نہیں۔" میں بے یقینی سے بولا۔

"عبداللہ نے بتایا ہے اس سے پوچھو۔"

اس نے سر ہلایا۔ "یہ سچ ہے یہ چالو قسم کی عورت ہے۔ یہاں شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہے لیکن اس کے گھر مردوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے خود بھی شام کو اجنبی افراد کے ساتھ گاڑی میں جاتی ہے اور اکثر رات گئے یا صبح واپس آتی ہے۔"

میں حیران ہوا۔ "تب محلے والے برداشت کیسے کر رہے تھے۔"

"کچھ لوگوں نے تھانے میں رپورٹ کرانے کی کوشش کی جس کے نتائج ان کی اپنی صحت کے حق میں مضر نکلے۔ ایک آدھ دفعہ جھگڑا بھی ہوا اور پولیس آ کر احتجاج

کرنے والوں کو سیٹ کر لے گی۔ وہ تین دن بعد واپس آئے تو ان کی حالت دیکھ کر باقیوں نے عبرت پکڑی اور اب کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا ہے۔ یہ بھی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ایک وقت تھا جب شرفا کے درمیان ایسی چیزوں کا وجود قطعی ناقابلِ برداشت ہوتا تھا۔ مگر اب لوگ مجبور ہو گئے ہیں۔"

سفیر نے سر ہلایا۔ "روشن خیالی نے ہر جگہ تسلط جما لیا ہے اب ایسی باتوں کو عام لیا جاتا ہے۔"

کچھ دیر اسی موضوع پر بات کرنے کے بعد مجھے خیال آیا اور میں نے عبداللہ سے کہا۔ "یار کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ ہم زیوز شا یا مرشد کی طرف سے ٹریس کیے جانے کا خطرہ مول لیے بغیر آپس میں رابطہ کر سکیں۔"

عبداللہ ہنسا اور اس نے جیب سے ایک چھوٹا سا پرانے زمانے کے موبائل جیسا سیٹ میرے سامنے رکھ دیا۔ "کیا بات ہے شہباز صاحب ایک ہی بات سب کے دماغوں میں ایک ساتھ ہی آتی ہے۔"

"اسے ہی ذہنی ہم آہنگی کہتے ہیں۔" میں نے کہا اور اٹھا کر دیکھا تو یہ ایک معروف بین الاقوامی کمپنی کا سیٹلائٹ فون تھا۔ میں حیران ہوا۔ "یہ تو بہت مختصر ہے۔"

"ابھی لانچ ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے سیٹلائٹ فون نارمل لائن فون سیٹ سے بھی بڑے ہوتے تھے۔ اس کے چارجز زیادہ ہیں مگر یہ محفوظ ہے۔ میں نے معلوم کیا کہ اگر ہم گروپ بھیج لیں تو وہ ہمیں سستا پڑے گا۔"

"گروپ بھیج سے کیا مراد ہے؟"

"اس میں صرف آپس میں بات ہو سکتی ہے۔"

"نہیں ایسا فون لو جو ہر جگہ کال کے لیے استعمال ہو سکے۔ مہنگے کی پروا مت کرو۔ حفاظت زیادہ ضروری ہے۔"

عبداللہ نے سر ہلایا۔ "ٹینک میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں ایک پراپرٹی کا رئیل گیارہ آج کل اس کی مارکیٹنگ کر رہا ہے۔"

"بس تو اس سے بات کرلو کم سے کم پانچ چھ سیٹ ہوں ہمارے پاس۔" سفیر نے کہا۔ "ان سے ہمیں ایک دوسرے سے رابطے میں آسانی رہے گی۔"

"میں نے بھی اس سے یہی کہا ہے اس نے اپنی شاپ پر بلایا ہے شام کو جاؤں گا۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" سفیر نے اعلان کیا۔ "کسی نے پزا کھانا ہے۔"

"میں نے۔" عبداللہ نے ہاتھ اوپر کیا۔

"میرا موڈ نہیں ہے۔" میں نے انکار کیا تو سفیر لاؤنج کی طرف چلا گیا۔ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔

"مانی کو رقم ٹرانسفر کر دی؟"

"ہاں اور وہ بہت تیز ہے آج ہی اس نے دفتر کے لیے جگہ بھی تلاش کر لی۔ کہہ رہا تھا کہ ایک ہفتے میں فرنشڈ کر کے کام بھی شروع کر دے گا۔ میں نے اسے پچیس لاکھ ٹرانسفر کیے ہیں وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی دس کر دیں لیکن مجھے آپ کی بات یاد تھی اس لیے میں نے پچیس ہی کیے۔"

"یہ اچھا کیا۔ وہ بار بار کہتا یا ہم مصروف یا پھنسے ہوتے تو اس کا کام رک جاتا اب وہ سب طرف سے بے فکر ہو کر بزنس سیٹ کرنے میں لگ جائے گا۔"

اچانک لاؤنج کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بوری گری ہو۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا اور ہم دونوں اٹھ کر تیز رفتاری سے لاؤنج کی طرف بڑھے۔ میں نے سفیر کو آواز دی مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ خطرے کا احساس کرتے ہی ہم دونوں نے بیک وقت پستول نکال لیے تھے۔ پھر عبداللہ نے لاؤنج میں جھانکا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہم باہر آئے۔ سفیر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچن اوپن اور ایک طرف سے کاؤنٹر والا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے کاؤنٹر کے دوسری طرف جھانکا۔ سفیر کروٹ کے بل پڑا ہوا تھا۔ وہ بے سدھ تھا۔ میں نے بے ساختہ جھک کر اسے چیک کرنا چاہا کہ میرا سر زور سے چکرایا۔ اسی لمحے دوسری آواز آئی جیسے پھر آنے کی بوری گری ہو اور اس بار یہ بوری عبداللہ ثابت ہوا۔ وہ لاؤنج کے وسط میں گرا ہوا تھا۔ پھر تیسری بوری گرنے کی آواز آئی جو میں تھا۔

یہاں کوئی چیز تھی شاید کوئی گیس جو ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ میرا سر چکرا رہا تھا مگر میں بے ہوش نہیں ہوا تھا البتہ جسم سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ میرے کانوں نے چرچرانے جیسی آواز سنی اور پھر باہر کا دروازہ یوں کھلا جیسے کسی نے بے جا دباؤ ڈال کر اس کے لاک کو ناکارہ کر دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک شخص اندر آیا جس نے اس گرمی میں بھی بڑی سی چادر سے خود کو چھپایا ہوا تھا۔ پھر اس نے چادر اتاری تو میرے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے تھے۔ وہ چھوٹے قد کا جسیم آدمی تھا مگر اس کے بہت موٹے بازو اس کے گھٹنوں تک آ رہے تھے۔ وہ زیوز شا کا گرگا تھا۔ اس کے پیچھے دو سفید فام اندر آئے تھے۔ وہ یہاں تک کیسے پہنچے؛ میں اس سوال پر غور کرتے کرتے بے ہوش ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)

(سید محمد رضا شاد کاظمی کا جواب)

ایاز حسین بھٹ .... میرپور آزاد کشمیر

یوں نہ کلیاں کھلیں گی تجھ پہ اے شاخ چمن
ور کہاں جو گل بن کھلے بہار جاں فزا بنا گیا

ناہید یاسمین .... شادی پور

یہ انتظام گردش دوراں تو دیکھیے
چھوٹے قفس سے ہم کو ملا آشیانہ بند

(مظفر علی خان لاہور کا جواب)

فراست زیدی .... ملتان

اوروں کے چاک قسمت ہم نے رفو کیے تھے
اور سی سکے نہ اپنا افسوس چاک تقدیر

احمد توصیفی .... اوکاڑہ

یہ احساس جوانی کو چھپانے کی حسین کوشش
کوئی اپنے سے شرماتا ہوا محسوس ہوتا ہے

(ماہ رخ حیدرآباد کا جواب)

شبنم اطہر چنیوٹی .... العین یو اے ای

آج سے ہم دوست ہی سمجھیں گے ہر اک طوفان کو
دور رہتا ہے تو ہم سے دور ہی ساحل رہے

صنم صدیقی .... کراچی

اک اشارہ اک زخم اک نگاہ
حسن اندر حسن راز زندگی

نیاز کھوسو .... کوئٹہ

اس وطن کے غازیوں کو اور شہیدوں کو سلام
سرزمین پاک کی روشن امیدوں کو سلام

سلطانہ جبین .... چنیوٹ

اے میری بزم کو چھوڑ کے جانے والے
تیرے قدموں میں کوئی شہ ہے ذرا دیکھ کے چل

برجیس فاطمہ .... لاہور

اور کیا ہوگا بجز اس کے مر جائیں گے ہم
ایک تم نقش بنا اور مٹا ڈالو گے

(زرین بھکر کا جواب)

سعید احمد چاند .... کراچی

اچھے ہوتے ہیں سب برے لوگ
اچھا ہونے کا دکھاوا تو نہیں کرتے

رعنا شبا .... سجاول

اجنبیت کا وہاں اور ہی عالم دیکھا
شہر میں آئے تو بدلا ہوا موسم دیکھا

عرفان کھوسو .... کوئٹہ

اب تو کہنے لگے ہیں ہنرمند بھی ہمیں
اس شہر کے چراغ بھی اب سنگ راہ ہیں

عزیز احمد مدنی .... ملتان

اٹھے اے حزیں لاکھ شور قیامت
آواز محبت کے گیتوں کی بجیں

مظہر ہاشمی .... کراچی

آپ کے وہ مسکرانے کی ادا
اک سزا تھی جو سب کو لٹا گئی

(مرزا ہادی بیگ حیدرآباد کا جواب)

حسن اظہر نیازی .... منڈی بہاؤالدین

یہ حوادث کا تلاطم ہے زمانہ ظالم
تم سے ٹھہرے ہوئے شعلوں کو بجا رہتا ہے

خورشید خان .... لطیف آباد

یوں تو ہر سمت تیرے شہر میں ہنگامہ ہے
اور پھر بھی ہے ہر اک شخص اکیلا جیسے

نائلہ فرحت شازی .... کراچی

یاد محبوب اک عبادت ہے
ذکر بھی بندگی میں شامل ہے

ابرار احمد .... ملتان

آدمی جو ذہین ہوتے ہیں
راز حق کے امین ہوتے ہیں

نوشین اختر.........فیصل آباد
اس جہاں میں بےبسی کا نام نصیب
ساری خوشیاں شموں کے سامنے ہیں
(منشی محمد عزیز مٹے لندن کا جواب)

فرحت رحمٰن.........خیرپور میرس
یہ پچھلے پہر کس نے ترانہ چھیڑا
عالم ہمہ تن درد ہوا جاتا ہے

حجاز نکالی.........لاہور
یاد ایام کہ جب بیٹھتے مل کر احباب
جمع ہو جاتے تھے اک جشن طرب کے اسباب
(محمد عقیل حافظ آباد کا جواب)

واصل احمد واصلی.........ملتان
اپنے جنوں کی داستاں سنتی رہوں تبسم
دامان تار تار پہ کہتی رہوں غزل

زرنہ طفیل.........شکارپور
اپنا ایمان ہوں تو کامل ہے
تجھ پہ ہو اعتبار ناممکن

اختر علی.........لاہور
اپنی آنکھوں میں نہ آنے دیں کسی کی صورت
اپنی مژگاں کو نگاہوں کا نگہباں رکھیے

ارباب خان.........پشاور
اک وہ کہ بات بات پہ کرتے رہے گلہ
اک ہم کہ خاک ہوگئے کس خامشی کے ساتھ
(رانا حبیب الرحمٰن کا جواب)

محمد عمران جونانی.........کراچی
نہ تھی اپنے حال کی جب ہمیں خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی جب اپنے حال پہ نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
(انجم انعام لاہور کا جواب)

قاضی شرف معروف حیدری.........
ان راستوں جن پہ ہم گامزن تھے روزاں
مجھے روک روک پوچھا تیرا ہم سفر کہاں ہے
(منشی محمد عزیز مٹے لندن وہاڑی کا جواب)

منشی خورشید احمد کنول لندن.........وہاڑی
یہ جلوہ یہ لب یہ رخسار یہ فسوں یہ درد
متاع حسن نظر ہے کہ دل قرینِ شب

(آفتاب احمد نصیر اشرفی کا جواب)

منشی محمد عزیز مٹے لندن.........وہاڑی
نگاہوں کے تصادم سے یہ کیسا انقلاب آیا
ادھر آنکھوں نے جرأت کی اُدھر رخ پہ نقاب آیا
(اکرام علی بھٹو میرپور خاص کا جواب)

مرزا ہادی بیگ.........لطیف آباد، حیدرآباد
تم آسماں کی بجلی ہو اے کس پیکر
مری زمیں پہ کس مصلحت سے اتری ہو
(نور بن اسلم کا جواب)

محمد عمران جونانی.........کراچی
یک لخت جو گرا تو جڑیں تک نکل آئیں
وہ پیڑ جسے زندگی نے کبھی جھکنے نہیں دیا
(نوشین اکرم لاہور کا جواب)

شاہد جہانگیر شاہد.........پشاور
یہ کوچہ جاناں ہے، سنبھلنا نہیں اچھا
آتی ہے بہت کام یہاں لغزش پا بھی
(زرین تبسم سکھر کا جواب)

منشی محمد عزیز مٹے ii.........وہاڑی
آنکھوں کے دریچوں سے ذرا جھانک کے دیکھو
دروازہ دل پہ کوئی مہمان کھڑا ہے
(اکرام علی بھٹو میرپور خاص کا جواب)

سعید احمد چوہان لندن.........وہاڑی
تجھ کو کہاں چھپائیں کہ دل پہ گرفت ہو
آنکھوں کو کیا کریں کہ رہی خواب دیکھنا
(محسن خان پشاور کا جواب)

عبدالغفور خان ساغری خٹک.........اٹک
میرے آنسو میری پلکوں سے چرانے کے لیے
بس اب ساتھ چاہیے تمہارا زندگی بتانے کے لیے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام:

پتا:

انعام اقتدار ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اکتوبر 2014ء تک علمی آزمائش 107 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 ارسال کریں

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)

67

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

علمی آزمائش۔ 107

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر بار اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوانا ہے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان سے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 ستمبر 2014 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

خلیج عقبہ کے شمال میں زمین کے ایک بڑے حصے پر غاصبانہ قبضہ کرکے بسایا گیا ملک جہاں دنیا کی سب سے سازشی قوم آباد ہے۔ اس نے پہلے سازش سے ایک بڑا رقبہ حاصل کیا پھر 1967 میں پڑوس کے کئی ممالک پر ایک ساتھ حملہ کرکے ان ممالک کی زمینوں پر قبضہ کرلیا اور آج بھی وہ اپنے تمام پڑوسی ممالک کو آنکھیں دکھاتا رہتا ہے۔ اس ملک کا نام بتائیں۔

علمی آزمائش 104 کا جواب

خواجہ غلام فرید چاچڑاں میں 1261 ہجری میں پیدا ہوئے۔ صوفی شاعر اور عالم تھے۔ اولیا کرام کے مزاروں کی زیارت کا خاص شوق تھا۔ پورے برصغیر میں پھرا کرتے تھے۔ فریضہ حج کے لیے مکہ بھی گئے۔ چولستان کا علاقہ بہت پسند تھا۔ اپنی تصانیف میں اس خطے پر بہت کچھ لکھا۔ اردو، فارسی، پنجابی، سندھی، ہندی اور عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے شاعری میں نئی بحر اور اوزان ایجاد کیے۔ امیر بہاولپور کا پورا خاندان ان سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔

انعام یافتگان

1۔ ارشاد خان، مظفر گڑھ　　2۔ حیات خان نیازی، سیالکوٹ　　3۔ فرحین توحید، حیدرآباد

4۔ ذیشان علی، پشاور　　5۔ عباس حسن، کوہاٹ کینٹ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

خوشاب سے مطیع اللہ ساجد۔ مظفر گڑھ سے رانا سجاد (شاہ جمال) کھاناں سے شبنم کو مرید۔ مظفر آباد سے اسرار احمد، حیدرآباد سے مرزا ہادی بیگ۔ وہاڑی لندن سے منشی محمد عزیز سے محمد عدنان عزیز سے۔ لاہور سے مظہر علی خان۔ نعمان شہزاد، بشریٰ خالق، نیاز چوہان، نواز کبیرہ چودھری، سب نواز، کائنات مرزا، عنبرین اختر، احمد علی بٹ، یاسمین فرحت، عبدالحق چوہان، زینت جبیں، توصیف بارہوی، ملتان سے رخسانہ یاسمین۔ گل باز خان، فوزیہ اختر، خالد آفریدی، الطاف گوہر،

خالد حسن، ذکیہ حسن، احمد یار، نفیسہ جمال، نصیر احمد قیام الدین، بہاولپور سے زاہد خان۔ نواز کھوکھر، نعیم بٹ، مہوش خان، نواز علی، بلقیس فرحت، مہوش خان، ضیغم عابدی، جعفر افتخار، ماہ جبیں سلطانہ، علی نواز، بہاول نگر سے عنایت علی، امتیاز شاہین، صفراں بیگم، قلیم الدین احمد، اطہر احمد لاشاری، ارباب خان، افضل ابڑو، نیاز احمد، فرید عباسی، ذکیہ امتیاز، انعام الحسن، غفار احمد، کوئٹہ سے۔ اکبر خان، عبدالقادر، ذیشان فتح اللہ، فصیح الدین، کلیم اختر، نواز بلوچ، عنایت اللہ، نواز بلوچ، افتخار الدین، فخر الدین لاشاری، فاطمہ خالق، سید محمد رضا کاظمی، خاقان خان، احتساب حسین، قمر الدین خواجہ، محمد فیضان، کلیم الدین احمد، نعیم خان، کوہاٹ سے ابرار اچکزئی، نعت خان، فدا حسین طوری، خان ارشاد کوہائی، جامشورو سے انیس بھٹو۔ نیاز سلطانی، زیب حسن، کلیم اختر، مجاہد علی، زینت، ڈی جی خان سے ارشد علی، فتح محمد خان، غالب حسن، نیاز خان۔ عطیہ نورین، فرید الدین بلوچ، نہال قیوم، شکیل اطہر، اشرف سائیں، حمید اختر، ساجد اختر، وجاہت مرزا، اسد غنی، عبدل رؤف کھتری، دانش قریشی، عثمان عثمانی، نشاط خان، میر جاوید مہر، ظفر انجم، بلقیس عظمانی، سعید حیدر، انجم پرویز، افتخار علی، رابعہ اشرف، پروین بھٹو، نعمان اشرف، ملک محمد اعجاز، ملتان سے محمد محسن چشتی، گل باز خان، خالد آفریدی، ذکیہ حسین، نفیسہ جمال، علی آفاق، رخسانہ یاسمین، فوزیہ اختر، الطاف گبر، حسن محمود، نصیر احمد، امیر الدین، میرپور خاص سے منور یز اختر (سیٹلائٹ ٹاؤن) نعیم الحسن، بشارت جرکھیو، عباس قائم خان، میرپور آزاد کشمیر سے محمد ہارون، نیاز بھٹ، فرحین مرتضیٰ، محسن کاظمی، خیرپور میرس، سید تقی زیدی، گل لیاقت، عباس زیدی، توقیر فاطمہ، کائنات، سکھر سے ارشد ولی محمد، بشریٰ اصغر، مسکان علی، سلمان منگریو، شیخوپورہ سے چودھری القدرت، کائنات علی، صغیر احمد، سید ساحل، گجرات سے نعمان سعید، سلطان بشیر، علی قلی خان، فہد مصطفیٰ، نیاز کھوسو، ملک سرفراز، جہلم سے محمد تنویر، کمال الدین خان، کاشف خان، وردہ بتول، سعید احمد، اسلام آباد سے انور یوسف زئی، محمد ہارون، اسما حیدر، فیروز رحمانی سوئی، وزیرا ایجنسی سے خاقان احمد، عنایت گجر، انعام الہ اچکزئی، علی کرد، زرین سلطانہ، کوٹ ادو سے طیب احمد، صالح احمد، کامل اصفہانی، قیام الدین قیام، ارشد نیاز، راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، جویریہ حلیم احمد، محمد سعید اقبال، مصباح الرضا، صوفی بشیر، ہارون الرشید، نسیم خاکوانی، تمریز احمد، بشیر الدین، محمد ہادی، اظہر الدین، ثاقب الدین تاجر، سید محمد تقی شیرازی، زینت جہاں شیرازی، مظفر گڑھ؟ رانا محمد سجاد (نواں شہر) ارباب رضا، عندلیب احمد، فاخرہ یاسین، سرگودھا سے ظفر اقبال جاوید (سلوانوالی) اقرا سلطان، شمائلہ سلطان، ساہیوال سے محمد افضل، مظہر حسین قادری، طاہر علی، انعام الدین، سبطین آغا، سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، اشرف خان، درو خان، جھنگ سے عطا المصطفیٰ، فہد علی، عدنان رفیع، کاظم علی سید، میانوالی سے ندا خالق (عیسیٰ خیل) حکیم سید محمد رضا شاہ (نور گر روکھڑی) ٹنڈو جان محمد سے قمری اموکلی، حاجی اٹک سے تنویر حسین، فصاحت عثمان، شادی پور سے ممتاز ملک، شجاع آباد سے نیاز احمد قریشی، غلام حسین زیدی، آصف احمد۔ سید عباس رضا رضوی تنویر (کھوکھرا پار) ناصر تحریم، امیر السلام، جمیل عثمانی، اختر بلقیس کوکب، شاہ بخاری، آفتاب منصور، اقبال احمد چشتی، اختر حسین، نوشین ملک، احسن خان اچکزئی، اقبال احمد چشتی، انوار علی شاہ، اختر عباس، طارق حبیب، نعیم اختر، اقبال قریشی، فرقان حمیدی، نعمت مرزا، جاوید اقبال، منظر خان، فیضان انصاری، فیض سیج، ذوالفقار، بھیکولی، شاہ بخشی، حنا اختر۔ لاہور سے رانا حبیب الرحمن، کمال حسن، مسز نادر شاہ، سلمان زیدی، سنیم درانی، شاہینہ بتول، چودھری نیاز مسلم خان، زینت انصاری، نذیر مرزا، ماسٹر فیض محمد، انور کلیم شاہ، فلک شیر، شاہ بخاری، کوکب گردیزی، فیض ملک، بہادر خان، شہباز خان، ثاقب خان، انوار شاہ، یوسف خان، ابراہیم شاہ، محمد پہلوان اختر، نگار ملک، بیگم زوار شاہ، نوشین ملک، فیض الحسن، مرزا یوسف بیگ۔ ملتان سے طالب حسین طلحہ، محمد نجیب چشتی، (نشیمن ولاز) عقیل احسن، حبیب الرحمن، شیروز، اصغر خان۔ پشاور سے شیر خان، مولانا ریاض محسن، بشیر فاروقی، قاسم جان، احمد مجاہد، مرتضیٰ زیدی، نعیم عباس، مصیب بٹ۔ شیخوپورہ سے ندا ممتاز، ثریا فاطمہ، ممتاز خان، عقیل فیضان۔ ڈیرہ غازی خان سے ارشاد حسین، ناصر حسن، محمود نیاز، خان محمد خان، فہیم الدین۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے زوریز عالم خان، ارشد آفاق۔ ملتان سے زینت خان، عتیق الرحمن، نفیس الحسن، قیام خان، شیریں عدنان، زوہیب سلطان، نور خان ترمذی، شہباز خان، ملک فیروز، پروین سلطان، نعمان الحسن، عبادت حسن، قیام الدین خان۔ جہلم سے نعمت اللہ، ابرار شیخ، جاوید محمد حسن، تقی عثمان، نیاز حسن۔

ممالک غیر سے اشفاق کیانی (جرمنی) انعام اللہ، فصاحت خان (العین)۔

آئینہ

مکرمی عمران رسول
سلام مسنون
یہ صرف میری آپ بیتی نہیں، یہ ہر گھر کی کہانی ہے اسی لیے میں نے اپنی آپ بیتی کو آئینہ کہا ہے۔ اس آئینے میں جائزہ لے کر دیکھیں آپ کو صاف نظر آئے گا کہ ایسا کھیل ہر گھر میں کھیلا جارہا ہے۔ میرا خیال ہے اور آپ بھی میرے خیال سے متفق ہوں گے کہ اس کھیل کا اختتام ہونا چاہیے۔ قارئین اگر متفق نہ ہوں تو بلا جھجک مجھے ٹوک دیں کہ میں نے غلط کہا ہے۔
رضیہ رمیز
(کراچی)

اسے عام بچی یا الی یا داشت سمجھیے گا۔ اسے ہمارے معاشرے کا رویہ اور رجحان سمجھ کر پڑھیں۔ یہ میری آپ بیتی ہے لیکن مجھے لگتا ہے جیسے یہ ہر گھر کی آپ بیتی ہے۔ میرا خاندان کچھ عجیب سا تھا۔ اس عجیب کی وضاحت کہانی کے ساتھ ساتھ خود ہو جائے گی۔ اس لیے میں کہانی بیان کرتی ہوں۔ جب میں نے دنیا میں قدم رکھا تو مجھ سے پہلے چھ بہن بھائی اس دنیا میں آچکے تھے۔ ان میں تین بھائی اور تین ہی بہنیں تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب سات آٹھ بچے عام سی بات سمجھے جاتے تھے اور دو تین بچے والوں کو لوگ تقریباً بے اولاد سمجھتے تھے۔ وہ جس بھر بچے پیدا کرتی اور ان میں سے تین چار کا قبل از ہوش دنیا سے گزر جانا معمول کی بات سمجھی جاتی تھی۔ زمانہ سادہ تھا۔ کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا سادہ تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب شروع شروع میں پرنٹ شدہ کپڑے آنے تھے تو لوگ کتنی حیرت سے دیکھا کرتے تھے۔ ہمارے ہاں تو یہ بھی خاصی دیر سے آئے ورنہ سب بھائیوں اور بہنوں کے لیے سنگل کلر میں تھان آجاتے تھے۔ امی ان میں سے کپڑا کاٹ کاٹ کر سب کے سوٹ سلنے دیا کرتی تھیں۔

پھر بہنیں بڑی ہوگئیں تو گھر کے دوسرے کاموں سے قطع نظر کپڑے سینے کا کام بھی انہوں نے سنبھال لیا تھا۔ یہ واحد کام تھا جو انہی ڈھنگ سے نہیں کر پاتی تھیں۔ شکر ہے جب میں نے ہوش سنبھالا تو کپڑے بہنیں ہی سی رہی تھیں۔ بھائیوں کے خاص کپڑے یعنی عیدوں کے کپڑے درزی سے سل کر آتے تھے لیکن ویسے کرتہ پاجامہ گھر میں ہی سی لیے جاتے تھے۔ جینز شرٹ اس زمانے میں پہلے سلائے ہی لیے جاتے تھے۔ یہی حال کھانے پینے کا تھا صبح ناشتا چائے پراٹھے سے کیا جاتا تھا۔ اس وقت فارمی مرغی اور انڈے نہیں ہوتے تھے۔ دوپہر میں عام طور سے دال چاول بن جاتے تھے اور رات کے کھانے میں سالن روٹی ہوتا تھا۔ ہفتے میں دو بار گوشت آتا تھا۔ بکرے کی گوشت کی استطاعت اس وقت بھی نہیں تھی اس لیے گائے کا ہی گوشت پکتا تھا۔ پانچ دن سبزی اور دوسری چیزیں پکتی تھیں۔ بریانی، قورمہ، پلاؤ اور بھنا گوشت امرا کی غذا سمجھی جاتی تھیں۔

امی ابا پاکستان بننے کے فوراً بعد یہیں آگئے تھے۔ لکھنؤ کے پاس ایک چھوٹے شہر میں آباد یہ خاندان ایک نسل پہلے

تک جاہل زمیندار تھا۔ مگر ابا کی نسل سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابا اور ان کے بھائی علی گڑھ سے گریجویٹ تھے۔ اسی طرح خاندان کے دوسرے لوگ بھی پڑھ لکھ گئے تھے۔ ابا ملٹری اکاؤنٹس میں تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی یعنی ہمارے چچا نے محکمہ ٹیکس کا انتخاب کیا تھا اور وہ پاکستان بنتے ہی یہاں آ گئے تھے۔ لیکن انہوں نے رہائش کے لیے لاہور کا انتخاب کیا بعد میں جب اسلام آباد دارالخلافہ بنا تو ان کی پوسٹنگ وہاں ہو گئی تھی۔ اس کے چند سال بعد ابا اور امی بھی پاکستان آ گئے۔ مجھے بڑے ہونے کے بعد پتا چلا کہ ابا کے اپنی امی سے شدید اختلافات تھے۔ میری دادی بہت دبنگ خاتون تھیں اور زمیندار دادا بھی ان سے ڈرتے تھے۔ ایک بار دادی نے انگریز کپتان کو ایک ہندوستانی سپاہی کو سزا دینے پر سرعام پوربی زبان کی دو کلاسیکل گالیاں دی تھیں جو مرد بھی بہت زیادہ ہی غصے میں دیتے تھے۔ خوش قسمتی سے انگریز کپتان پوربی کیا اردو سے بھی نابلد تھا اور دادی کے غصے کو ہنس کر جنٹل مین کی طرح ٹال گیا ورنہ دادی نہ سہی دادا خاصی مشکل میں پڑ جاتے۔ یہ زمین ان کے والد کو انگریز سرکار نے ہی تو عطا کی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دادی کس مزاج کی خاتون تھیں۔

ابا پڑھے لکھے اور حلیم طبع شخص تھے، انہیں لڑنا جھگڑنا اور جہالت کا مظاہرہ کرنا سخت ناپسند تھا۔ اس لیے ایک دن دادی نے کسی بات پر خفا ہو کر انہیں سنائیں تو انہوں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا۔ اپنی بڑی سی حویلی اور زمین (جس کے اب وہ اکیلے وارث تھے) چھوڑ چھاڑ کر پاکستان کا رخ کیا۔ اس وقت امی کی گود میں رئیس بھائی اور نفیس بھائی تھے۔ اس ہجرت سے اگر کوئی خوش تھا تو وہ امی تھیں کہ اب انہیں سسرال میں نہیں رہنا پڑے گا۔ حالانکہ وہ دادی کی پسند تھیں۔ اس زمانے میں اولاد کی پسند کی ایک فیصد اہمیت بھی نہیں ہوتی تھی اور اگر ماں باپ کو شبہ بھی ہو جاتا کہ ان کا بیٹا فلاں جگہ شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے ساری عمر کنوارہ رکھ سکتے تھے مگر اس کی پسند کی شادی نہیں کرتے تھے۔ لڑکی کا ذکر یوں نہیں کیا کہ اس صورت میں لڑکی اچانک اپنڈکس کے درد یا ہارٹ اٹیک سے انتقال کر جاتی تھی اور اسے خاموشی سے دفنا دیا جاتا تھا۔ تیسری صورت یہ تھی کہ وہ گھر سے بھاگ جائے اور ساری عمر لاپتا رہے۔ اپنی پسند کی بہو لانے کے باوجود دادی نے امی کے ساتھ وہ سلوک کیا جو آج کل صرف اسٹار پلس کی ظالم ساسیں کرتی ہیں۔ اف کرنے کا بھی رواج نہیں تھا اور ابا سے شکایت بیکار تھی۔ اول تو وہ سنتے ہی نہیں اور سنتے بھی تو دادی کو روک نہیں سکتے تھے۔

اس وقت امی کو لگا کہ ان کی لاٹری کھل آئی ہے اور انہیں جنت کا پروانہ مل گیا ہے۔ یہاں آ کر ابا نے راولپنڈی کا رخ کیا کیونکہ فوجی ہیڈ کوارٹر وہیں تھا اور انہیں اب یہاں ملٹری اکاؤنٹس میں جاب مل گئی تھی۔ ایک طرح سے ابا نے اپنا تبادلہ کرا لیا تھا۔ پنڈی میں انہیں راجا بازار میں ایک بلڈنگ میں دو کمرے مل گئے تھے۔ بھری پری حویلی کے مقابلے میں یہ دو کمرے ایسے ہی تھے جیسے ڈیفنس کی کوٹھی کے مقابلے میں کورنگی کا کوئی سرکاری کوارٹر۔ امی چند دن میں گھبرا گئیں۔ اوپر سے اب انہیں ابا کی محدود تنخواہ میں گزارا

کرنا پڑتا تھا۔ دو وقت بکرے کا گوشت کھانے والوں کو اب گائے کا گوشت بھی ہفتے میں دو بار ملتا تھا۔ ایک مہینے بعد امی نے گھبرا کر ابا سے واپس چلنے کو کہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور امی سے کہا۔ ”تمہیں بھیج دیتا ہوں۔ میں اب یہیں رہوں گا۔“

امی بہت روئی دھوئیں مگر ابا اٹل رہے۔ امی کا تعلق بھی کھاتے پیتے خاندان سے تھا مگر وہ لوگ دادا کی طرح رئیس نہیں تھے۔ ابا نے تو ہوش سنبھالتے ہی ہر چیز دیکھی تھی۔ جب وہ علی گڑھ میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس ذاتی گھوڑا تھا اور چچا اپنی جیپ میں یونیورسٹی آتے جاتے تھے۔ اعلیٰ لباس پہنتے اور بہترین خوراک کھاتے تھے مگر جب یہاں آئے تو یوں سادہ زندگی گزارنے لگے جیسے ہمیشہ سے ایسے ہی رہتے آئے تھے۔ میں نے ابا کو چٹنی روٹی بھی بہت شوق سے کھاتے دیکھا۔ آخر عمر میں تو تیز مرچوں اور نمک والی چٹنی کے بغیر ان کا کھانا مکمل ہی نہیں ہوتا تھا اور شاید اسی وجہ سے وہ فالج کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اب وہ کھدر اور کاٹن کا بنا ہوا سادہ کرتا پاجامہ پہنتے تھے۔ دفتر آنے جانے کے لیے ایک پمپ شوز ہوتا تھا اور گھر میں ربر کی بنی اسفنج کی چپل۔ دفتر جاتے اور وہاں سے آ کر شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھ جاتے اور خود سے کھیلتے رہتے تھے۔

کچھ عرصے بعد ابا کی بہن اور ہماری پھپو بھی پاکستان آ گئیں۔ اس کی وجہ بھی دادی تھیں۔ انہوں نے اپنے شریف داماد کو بیٹی کے حوالے سے اتنا تنگ کیا اور اتنا دباؤ ڈالا کہ وہ ان سے بچنے کے لیے پاکستان آنے پر مجبور ہو گئے۔ پھپا پھپی سے بہت محبت کرتے تھے مگر وہ بھی سرکاری ملازم تھے اور ہماری پھپی کو ان کی تنخواہ میں ہی گزارا کرنا پڑتا تھا۔ دادی دنیا میں اگر کسی سے محبت کرتی تھیں تو وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھیں اور ان سے برداشت نہیں ہوتا تھا کہ پھپی تنگ دستی میں رہیں۔ اگرچہ پھپا انہیں بہت اچھا رکھتے تھے۔ ہمیشہ اچھا پہنایا اور کھلایا مگر دادی کے نزدیک یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک بار پھپی میکے آئیں تو اتفاق سے ان کا ہاتھ زیور سے خالی تھا۔ اس پر دادی نے پھپا کو بے بھاؤ کی سنائیں اور ان کا حوصلہ جواب دے گیا۔ انہوں نے پھپی سے کہا۔ ”سلطانہ میں تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتا اور تمہاری ماں کے ہوتے ہوئے میں تمہیں ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ ہم پاکستان چلے جائیں جہاں تمہاری ماں نہ ہوں۔“

پھپی کو بھی شوہر سے محبت تھی اس لیے وہ مان گئیں اور یوں وہ بھی پاکستان آ گئے۔ پھپا فیڈرل گورنمنٹ میں ملازم تھے اور ان دنوں کراچی دارالحکومت تھا۔ اس لیے پھپا کی پوسٹنگ بھی وہیں ہوگئی۔ پھپی بھرا پرا سسرال چھوڑ کر آئی تھیں۔ امی کی طرح وہ بھی گھبرا گئیں اور انہوں نے بھائیوں کو خط لکھنا شروع کر دیے کہ وہ کراچی آ جائیں۔ چچا نے تو ان خطوط پر توجہ نہیں دی لیکن ابا کا دل پسیج گیا۔ انہیں بہن سے محبت بھی بہت تھی۔ اس لیے انہوں نے خاموشی سے اپنے تبادلے کی کوشش شروع کر دی۔ امی کو بتایا نہیں تھا ورنہ شاید وہ ضرور مخالفت کرتیں۔ دادی کے بعد اگر امی کسی سے تنگ تھیں تو وہ پھپی تھیں۔ امی کا کہنا تھا کہ انہیں تنگ کرنے میں وہ اپنی ماں سے کم نہیں تھیں۔ اگرچہ ان کی شادی ابا کی شادی سے چند مہینے پہلے ہوئی تھی مگر پھپی اکثر میکے میں پائی جاتی تھیں۔ انہوں نے امی کے ساتھ جو کیا وہ امی بھولی نہیں تھیں۔

امی زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ شاید پانچویں کلاس تک پڑھا تھا اور اس زمانے میں لڑکیوں کے لیے یہ بھی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ بارہ سال تک وہ اسکول میں پڑھتی رہیں اور پھر نانی نے گھر بیٹھنے اور گھر گرہستی سیکھنے کا حکم دیا۔ صرف دو سال بعد چودہ سال کی عمر میں ان کی شادی ابا کے ساتھ کر دی گئی۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ ماں بن گئی تھیں۔ جب وہ پاکستان آئیں تو ان کی عمر شاید اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ پنڈی میں قیام کے دوران میں میری دو بڑی بہنیں پیدا ہوئیں۔ پھر ابا کا کراچی تبادلہ ہو گیا اور آبادی میں باقی اضافہ یہیں آ کر ہوا تھا۔ انڈیا میں ایک بھائی اور پیدا ہوا تھا مگر وہ بچپن میں انتقال کر گیا۔ پھر پاکستان میں جو اولادیں ہوئیں ان میں سے بھی تین نے ہوش کی عمر نہیں دیکھی تھی۔ مگر مجھ سمیت نو بہن بھائیوں نے بڑی عمر پائی۔

کراچی آ کر امی کو پتا چلا کہ اصل میں ابا بہن کی محبت میں یہاں دوڑے آئے تھے اور ان کو یہ خیال تک نہیں تھا کہ رہیں گے کہاں؟ مکان کا بندوبست نہیں تھا اس لیے شروع کے چند مہینے بہن کے گھر رہے پھر انہیں ائرپورٹ کے پاس پرانی بیرک میں ایک حصہ مل گیا۔ یہ کسی زمانے میں انگریز فوج کے زیر استعمال تھیں۔ یہاں نہ پانی تھا نہ بجلی اور گیس تو اس زمانے میں کہیں بھی نہیں تھی۔ مٹی کے تیل کا چولہا جلتا تھا اور مٹی کے تیل سے ہی لالٹین روشن ہوتی تھی۔ پانی نصف میل دور سے سائیکل پر کنستر میں لانا پڑتا تھا کہ اس وقت کہیں بھی نہیں ہوتا تھا۔ آس پاس جنگل اور ویرانہ تھا اور کراچی کا نیا ائرپورٹ زیر تعمیر تھا۔ پی ای سی ایچ ایس سے پہلے

بنا پکی سڑک ختم ہو جاتی تھی اور ابا روز سائیکل پر صدر اپنے دفتر جاتے اور آتے تھے کیونکہ بس بھی نہیں چلتی تھی۔

سانپ اور بچھوؤں کو اندر آنے سے روکنے کے لیے بیرک کی دیواروں اور دروازوں کے سوراخ کپڑے کی دھجیاں ٹھونس کر بند کیے جاتے تھے۔ رات میں کوئی باہر نہیں نکلتا تھا کیونکہ سانپ بہت تھے اور ان میں سے اکثر زہریلے ہوتے تھے۔ یہاں آنے کے بعد امی اس پاس جن موتوں میں شریک ہوئیں ان میں سے اکثر سانپ کے کاٹنے سے ہوئی تھیں۔ یہ حالات تھے جن میں امی کو کراچی آکر رہنا پڑا اور وہ اس کے لیے مرتے دم تک ابا کو معاف نہیں کر سکی تھیں۔ اب انہیں چندی میں وہ دو کمرے کسی محل سے کم نہیں لگتے تھے۔ جیسے ان دو کمروں کے مقابلے میں لکھنؤ کی حویلی کسی محل سے کم نہیں تھی۔ وہاں بجلی تھی اور پانی بھی صحن کے کنوئیں سے مل جاتا تھا۔ نہانے دھونے کے لیے جھیلوں تو سنا نہیں پڑتا تھا۔ خود بھی ایک اچھی آبادی میں آرام دہ گھر میں رہ رہی تھیں۔ پھر ابا سرکاری افسر تھے اچھی تنخواہ تھی اور ان کی پی آر بھی اچھی تھی اس لیے وہ ہمیشہ فائدے میں رہے۔

ابا میں قابلیت بے انتہا تھی مگر پی آر نام کی کسی چیز سے واقف ہی نہیں تھے۔ پاکستان آکر وہ خود جیسے درویش صفت ہو گئے تھے۔ شاید انہوں نے فرض کر لیا تھا کہ ان کی بیوی اور بچے بھی ان ہی کی طرح درویش ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہ صبر کرتے تھے کہ تنخواہ ملتے ہی وہ پوری کی پوری لاکر امی کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ صبح اپنا خرچا پانی بھی امی سے لے کر جاتے تھے۔ اس وقت ان کی تنخواہ سوا سو یا ایک سو تیس روپے تھی۔ آج سے ساٹھ سال پہلے یہ خاصی رقم ہوا کرتی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ بچوں کے ساتھ پورا گھر چلایا جاسکے۔ اس پر آبادی میں اضافہ جاری رہا لیکن تنخواہ میں اتنا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ امی جیسے تیسے کرلی تھیں۔ اس کے دو اثر ہوئے۔

ایک تو ابا گھر کے مالی مسائل سے بے نیاز ہو گئے۔ انہیں پروا نہیں تھی کہ گھر کیسے چل رہا ہے بچے کیسے پڑھ رہے ہیں۔ ان کی ضروریات کیسے پوری ہوتی ہیں؟ یہ سب امی کے مسائل تھے۔ دوسرا اثر یہ ہوا کہ امی آل ان ون ہو گئیں۔ خرچ ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے تمام امور ان کی نگرانی میں اور ان کی مرضی سے طے پانے لگے۔

ایک تیسرا اثر یہ ہوا کہ ابا اور امی میں دوری آنے لگی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے لگے۔ اس زمانے میں میاں بیوی میں ویسے ہی بہت کم بے تکلفی ہوتی تھی اور وہ دوسروں کے سامنے ایک دوسرے سے کم ہی بات کرتے تھے خاص طور سے جب گھر میں بڑے ہوں تو۔ لیکن یہاں تو ابا امی ہی بڑے تھے اور ہم سب بچے تھے مگر اس کے باوجود وہ ایک دوسرے سے بہت کم بات کرتے تھے۔ بلکہ سوائے کام کے اور کوئی بات کرتے ہی نہیں تھے۔ میں پیدا ہوئی اور ہوش سنبھالا تو ابا امی ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔ حد یہ کہ ایک دوسرے کی تکلیفوں اور بیماری آزاری سے بھی بے نیاز ہو گئے تھے۔

خوش قسمتی سے میری پیدائش تک ہمارا گھر ائیرپورٹ کے پاس آباد ہونے والی نئی بستی میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہاں پکا مکان تھا، پانی اور بجلی کی سہولت بھی تھی۔ اس لیے میں نے وہ مشکلات نہیں دیکھیں جو میرے بڑے بہن بھائیوں نے دیکھی تھیں۔ اگرچہ یہ بھی دو کمروں اور چھوٹے سے صحن والا گھر تھا مگر اس بیرک سے بدرجہ بہتر تھا جس میں میرے گھر والوں نے کئی سال گزارے تھے۔ حیرت کی بات ہے وہ بیرک آج بھی تقریباً اسی حالت میں موجود ہے بس اتنا فرق پڑا ہے کہ وہاں پانی بجلی اور گیس آگئی ہے۔ وہاں اب سول ایوی ایشن کے ملازمین رہائش رکھتے ہیں۔ جس وقت میں اسکول میں آئی میرے سب سے بڑے بھائی یعنی رئیس بھائی میٹرک کا امتحان دے رہے تھے۔ وہ مجھ سے پورے دس سال بڑے تھے۔ اس دوران میں میرے تین بہن بھائی کم عمری میں وفات پا چکے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو امی ابا نے بچے پیدا کرنے میں کسی تساہل سے کام نہیں لیا تھا۔ یہ اوسطاً ہر سال ایک بچہ بنتی ہے۔

میں آج سوچتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ امی نے یہ سب کیسے کر لیا۔ پورا گھر، بچے تھیں۔ کھانا پکانے سے لے کر صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے سے لے کر استری کرنے تک سارے کام وہ خود کرتی تھیں۔ پھر باہر جا کر سودا سلف لانا، چھوٹے بچوں کے کام کرنا اور اس دوران میں ایک بچہ پیٹ میں بھی رکھنا۔ وہ کوئی بہت صحت مند خاتون نہیں تھیں۔ چھوٹا قد اور کمزور جسم تھا لیکن ان کے اندر بڑی توانائی تھی۔ بیماریاں بھی بہت آئیں مگر وہ انہیں خاطر میں لائے بغیر اپنی توانائیاں لٹاتی رہیں۔ جب صبح ہماری آنکھ کھلتی تو امی باورچی خانے میں ہوتی تھیں اور وہ خاصی پہلے بیدار ہو چکی ہوتی تھیں اور رات جب ہم بستر پر جاتے تو وہ صبح کے لیے بھائیوں اور ابا کے کپڑے استری کر رہی ہوتی تھیں۔ وہ زمانہ ریڈیو کا تھا۔ ٹی وی نیا نیا آیا تھا مگر چند

ایک گھروں میں تھا۔ ہماری تو پوری کالونی میں کہیں ٹی وی نہیں تھا۔ ریڈیو بھی بس چند ایک گھروں میں ہوتا تھا۔ سرشام سناٹا چھا جاتا اور رات آٹھ نو بجے تک لوگ سو جاتے تھے۔

امی رات کو بس چھ گھنٹے سوتی تھیں۔ کیونکہ پانچ وقت نماز پڑھتی تھیں اس لیے گرمیوں میں سونے کا وقت اور کم ملتا تھا فجر کے لیے ایک بار اٹھ جاتیں تو پھر جاگتی رہتی تھیں۔ ان کے مقابلے میں ابا صرف دفتر جاتے تھے اور وہاں سے آکر وہ صحن میں بچھی اپنی چارپائی پر جو دراز ہوتے تو بہ مشکل ہی اس سے اٹھتے تھے۔ پہلے وہ سگریٹ پیتے تھے پھر حقہ پینا شروع کر دیا۔ اب دفتر سے آتے ہی وہ نہا دھو کر چارپائی پر آتے تو سب سے بڑی بہن انیسہ آپا ان کے سامنے حقہ لا کر رکھ دیتی تھیں۔ اس کے بعد ابا ایک ایک کر کے تمام بچوں کو بلاتے اور ان کی تعلیمی پروگریس پوچھتے۔ وہ خود سوالات کرتے تھے اور ہمیں ان کے جواب دینا ہوتے تھے۔ اسکول میں پڑھائی جانے والی چیز کے بارے میں وہ پوچھتے ہی نہیں تھے۔ ان کے پوچھنے کا انداز بھی نرالا تھا۔ بھائی چارپائی کے کنارے بیٹھ جاتے تھے اور جواب دیتے یا کاپی پر سوال حل کر کے دکھاتے تھے۔ جواب غلط ہونے کی صورت میں ابا پاؤں سے انہیں پیچھے دھکیل دیا کرتے تھے۔ البتہ ہم بہنوں کو انہوں نے کبھی نہیں مارا۔ بلکہ ڈانٹتے بھی بہت کم تھے۔

ابا علی گڑھ سے گریجویٹ تھے اور ان کا معیار اتنا اعلیٰ تھا کہ یہاں ایم اے کرنے والے ابا کے پاس امتحان کے دنوں میں ٹیوشن پڑھنے آتے تھے۔ گھر میں جگہ نہیں تھی اس لیے ابا انہیں لالٹین لے کر قریبی میدان چلے جاتے اور وہاں پڑھاتے تھے۔ یہ واحد کام تھا جو میں نے ڈیوٹی کے بعد ابا کو کرتے دیکھا۔ ابا ہر ایک کو نہیں پڑھاتے تھے بلکہ جس سے مطمئن ہوتے بس اسی کو پڑھایا کرتے تھے۔ ٹیوشن کا وہ ایک پیسا نہیں لیتے تھے اور میں نے انہیں سیکڑوں روپے کی پیشکشیں ٹھکراتے دیکھا تھا۔ یہ رقم انہیں صرف چند راتوں کی ٹیوشن کے عوض مل سکتی تھی مگر انہوں نے کبھی کسی سے ٹیوشن کی فیس نہیں لی۔ امی اس بات پر بہت کڑھتی اور زیرِ لب بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ ”کیا ہے اگر لے لیں گھر کے کتنے مسائل ہو جائیں گے مگر ان کو تو پروا ہی نہیں ہے۔“

یہ سچ ہے ابا کو پروا نہیں تھی اپنے لیے تو بالکل نہیں تھی اولاد کی بھی نہیں تھی۔ میں کسی قدر بڑی تھی جب سعود آباد کی اسکیم بن رہی تھی۔ یہ علاقہ غریب افراد کے لیے سعودی حکومت کے تعاون سے بنا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مکانات تھے جو عام افراد کو تقریباً مفت میں دیے جا رہے تھے۔ ہم پاس ہی رہتے تھے۔ ان مکانوں میں پانی بجلی کے علاوہ گیس اور سیوریج کی سہولت بھی تھی۔ گیس پہلی بار یہاں آئی تھی۔ رئیس اور نفیس بھائی نے ابا سے کہا کہ ہم بھی ایک دو مکانات لے لیتے ہیں۔ مگر ابا نے کوئی توجہ نہیں دی۔ رئیس بھائی نے ہمت کی اور جا کر ایک مکان پر قبضہ کر لیا۔ کیونکہ وہاں ایسا بھی ہو رہا تھا کہ جو آکر بیٹھ جائے مکان اسی کا ہو جائے گا۔ اس کے باوجود ابا وہاں نہیں گئے۔ رئیس بھائی ایک ہفتہ دس دن وہاں رہے۔ اکیلے تھے اور پھر ایک دن انہیں بچھو نے کاٹ لیا۔ طبیعت خراب ہوگئی۔ تو وہ وہاں سے چلے آئے اور ان کے جاتے ہی مکان پر کوئی دوسرا قابض ہو گیا۔ یوں یہ موقع جو اپنے گھر کا ہو سکتا تھا ہاتھ سے نکل گیا۔

دوسری طرف ہم دیکھتے کہ چچا نے ایک نئی آباد ہونے والی وی آئی پی اسکیم میں پلاٹ لے کر شاندار گھر بنوا لیا ہے تو ہمیں شدت سے احساسِ محرومی ہوتا تھا۔ چچی کے آٹھ بچے تھے مگر وہ اس بڑے اور نصف درجن کمروں والے گھر میں مزے سے رہتے تھے۔ ہم دو کمروں کے مکان میں دھکے کھا رہے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ ابا کی قناعت پسندی تھی۔ حالانکہ اس زمانے میں اپنا مکان بنوا لینا مسئلہ نہیں تھا۔ لوگوں نے تو مفت میں مکان حاصل کیے تھے اور ہم کرائے کے مکانوں میں رلتے رہ گئے۔ اس وقت یہ علاقہ شہر اور سہولتوں سے دور تھا۔ یہاں نہ اسپتال تھے اور نہ اسکول۔ نہ ہی پکی سڑکیں تھیں۔ ہمیں جو پہلا اسکول ملا وہ پرانے ائرپورٹ کے پاس تھا اور ہمیں بس سے اتر کر بھی خاصا پیدل چل کر وہاں تک جانا پڑتا تھا۔ یہاں آکر بہت سے بہن بھائی ہونے کا فائدہ ہوا کہ ہم بلا جھجکے ویران جگہوں سے گزر کر اسکول چلے جاتے تھے پھر وہ زمانہ اچھا تھا۔ آج تو وین بچوں کو گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر لاتی لے جاتی ہے اس کے باوجود ماں باپ کا دل دہلتا رہتا ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ مجھ سے بڑے بہن بھائی خاصے بڑے ہو گئے تھے۔ جب میں پانچویں میں تھی تو انیسہ آپا کی شادی ہوئی۔ وہ سترہ سال کی تھیں۔ اس وقت لڑکیوں کی شادی اتنی ہی عمر میں کر دی جاتی تھی۔ ان کے بعد نفیسہ باجی تھیں جو ان سے تین سال چھوٹی تھیں کیونکہ ان سے بڑے ایک بھائی اور تھے۔ ابا کا خیال تھا کہ اب رئیس بھائی کی شادی کر دی جائے۔ وہ میٹرک کے بعد ایک سرکاری

ادارے میں ملازم ہو گئے تھے اور وہاں انہوں نے کچھ کورس کیے تھے۔ اسی کی بنیاد پر انہیں ایسوسی ایٹ انجینئر کا درجہ مل گیا تھا۔ ان کی پہلی تنخواہ ابا سے خاصی زیادہ تھی اور وہ بھی اپنی ساری تنخواہ لا کر امی کے ہاتھ پر رکھتے تھے۔ کچھ عرصے بعد نفیس بھائی بھی اسی ادارے میں ملازمت پر لگ گئے تھے۔ مگر وہ ساری نہیں بلکہ آدھی تنخواہ امی کو دیتے تھے۔ امی نے اسی سے جوڑ جاڑ کر انیسہ آپا کی شادی کی تھی ورنہ ابا کی تنخواہ سے تو بچت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایک بہن کی شادی کے بعد بھائیوں کا خیال تھا کہ اب ان کی باری آئے گی کیونکہ رضیہ باجی تو ابھی چھوٹی تھیں۔ مگر امی نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ بھائیوں کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہیں۔ ابا کہتے بھی تو وہ نظر انداز کر دیتی تھیں۔ ابا خود ہی انہیں مختارِ کل بنا چکے تھے۔ اس لیے وہ اب انہیں اہم ترین معاملات میں بھی نظر انداز کر جاتی تھیں۔ انیسہ آپا کا رشتہ انہوں نے خود کیا تھا۔ حالانکہ ابا اور بھائیوں کو اس رشتے پر اختلاف تھا۔ مگر امی نے کسی کی نہیں سنی۔ بعد میں جھگڑے ہوئے اور انیسہ باجی سسرال والوں سے الگ ہو گئیں۔ اس میں امی کی کوششوں کا دخل بھی تھا کیونکہ وہ روزِ اول سے انیسہ آپا کو کہہ رہی تھیں کہ وہ الگ ہو جائیں۔ ان کے سسرال والے بھی تیز مزاج کے تھے اس لیے بات خراب ہو کر رہی اور وہ الگ ہو گئیں۔ امی نے انہیں نزدیک ہی کرائے کا گھر دلوا دیا۔

ہم ابھی دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں رہ رہے تھے۔ انیسہ آپا کی شادی کے بعد بھی افراد کی تعداد دس تھی۔ پتا نہیں ہم کیسے رہتے تھے۔ ایک کمرا امی اور ہم بہنوں کا تھا اور دوسرا بھائیوں کا۔ ابا تو سردی ہو یا گرمی باہر صحن میں چارپائی پر سوتے تھے۔ ہم امی سے کہتے کہ اب دو بھائی کمانے لگے ہیں وہ کوئی بڑا گھر دیکھ لیں جس میں کم سے کم یوں گھچڑی تو نہ پکے۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ کوئی مہمان آ جاتا تو اسے بٹھانے کی جگہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر امی ہمیں جھڑک دیتیں کہ اسی میں گزارا کرو۔ بھائیوں نے بھی دو تین بار امی سے دبے لفظوں میں کہا کہ اب وہ بڑا مکان دیکھیں ہم بڑے ہو رہے ہیں۔ مگر امی نے سنی ان سنی کر دی۔ تیسرے نمبر کے انیس بھائی نے میٹرک کر کے کالج میں داخلہ لیا۔ وہ ہمارے گھر کے پہلے فرد تھے جنہوں نے کالج میں پڑھا تھا۔ ساتھ ہی وہ پارٹ ٹائم جاب بھی کرنے لگے تھے۔ اس سے ان کے اخراجات پورے ہو جاتے تھے اور

کچھ بچتا تو وہ امی کو دے دیتے تھے۔ اسکول کا خرچ معمولی تھا عام طور سے ایک بار کتاب لی جاتی اور تین چار بچے اس وقت تک اسے پڑھتے جب تک وہ بالکل ہی چیتھڑا نہیں ہو جاتی تھی۔ اسی طرح ایک یونیفارم دو تین سال چلتا تھا۔ ایک کو چھوٹا ہوتا تو دوسرا پہنتا تھا۔ اسکول بیگ تک ہم ہوم میڈ لے کر جاتے تھے۔ اسکول بیگ اور ہر سال نیا یونیفارم صرف مجھ سے چھوٹے معاذ اور ریاض کو ملے تھے۔

بھائیوں نے دیکھا کہ جب امی نہیں مان رہی ہیں تو انہوں نے خود مکان کی تلاش شروع کر دی۔ اس وقت مکان آسانی سے مل جاتے تھے اور کرائے بھی واجبی سے ہوتے تھے پھر مالک مکان برسوں خالی نہیں کراتے تھے جب تک اشد ضرورت نہ ہو۔ یہ تو اب ہوا ہے کہ کرائے بڑھانے کے لیے ہر سال مکان خالی کرائے جاتے ہیں۔ آدمی دو تین سال سے زیادہ کسی مکان میں ٹک جائے تو اسے بڑی بات سمجھا جاتا ہے۔ رئیس بھائی نے ایک مکان تلاش کر لیا۔ یہ خاصا بڑا تھا اور اس میں چار کمروں کے ساتھ بڑا سا دالان اور صحن بھی تھا۔ آگے پیچھے گلیاں تھیں۔ رئیس بھائی نے امی سے کہا مگر جب وہ نہیں مانیں تو ابا کو لے گئے اور ابا نے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے۔ گھر کے بڑے بہرحال ابا تھے اس لیے جب انہوں نے ہاں کر دی تو بھائیوں اور ہم نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ امی اس پر ناراض ہو گئیں اور سب سے بات چیت بند کر دی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ اس گھر میں کوئی کام امی کی مرضی کے خلاف ہو رہا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ نئے گھر کا کرایہ دوگنا ہے اور ان کے پاس گنجائش نہیں ہو گی۔ رئیس بھائی نے ان سے کہا بھی کہ وہ کما رہے ہیں امی اس سے کرایہ دیں وہ ساری تنخواہ ان کے ہاتھ پر ہی تو رکھتے ہیں۔ ہم بہنیں خوش تھیں مگر انیسہ آپا نے امی کی حمایت کی انہوں نے ہم سے کہا۔ ”ابھی تم لوگ بہت خوش ہو رہی ہو تا کچھ عرصے بعد سر پکڑ کر روؤ گی بڑے گھر جانے پر۔“

رضیہ باجی ذرا ہوشیار تھیں لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ میں اور دو کیہ باجی تو چھوٹے تھے ہم کیا سمجھتے مگر سنے اور بڑے گھر میں آنے پر بہت خوش تھے۔ یہاں چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں بھی تھیں۔ شام کو یا رات کو اگر گرمی ہوتی تو ہم اوپر چلے جاتے تھے۔ اس سے پہلے والے گھر میں دم گھٹتا تھا، صحن میں بھی ہوا نہیں آتی تھی۔ صحن بڑا اور کشادہ والا تھا۔ اس وقت امریکن کچن کا رواج نہیں تھا

مگر ہمارے لیے تو یہ بھی بہت تھا۔ یہاں ہم بہنوں کو الگ کمرا مل گیا۔ اس پر بھی ہم بہت خوش تھے کہ اب رات کو دیر تک روشنی کر کے پڑھ سکتے تھے ورنہ امی تو نو بجے ہی لائٹ بند کروا دیتی تھیں۔ اس وقت میں اور زکیہ باجی دونوں ساتویں میں تھے۔ رخسانہ باجی میٹرک کر رہی تھیں اور امی نے ان کے لیے ابھی سے رشتے کی تلاش شروع کر دی تھی یعنی آنے جانے والیوں اور جان پہچان کی خواتین سے کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس پر رخسانہ باجی بہت خوش تھیں حالانکہ وہ ابھی صرف چندرہ سال کی تھیں۔ مگر امی کو بہت جلدی تھی۔ ایک بار زکیہ باجی نے امی سے کہا۔

"رخسانہ باجی تو ابھی چھوٹی ہیں آپ رئیس بھائی اور نفیس بھائی کے لیے لڑکیاں تلاش کریں۔"

اتفاق سے اس دن انیسہ باجی بھی آئی ہوئی تھیں۔ گھر دور ہونے کے باوجود وہ ہر دوسرے دن آتی تھیں اور صبح سے لے کر شام تک رہتی تھیں۔ ہمیں اچھا لگتا تھا کیونکہ ان کے بچے ہم سب کی جان تھے۔ حد یہ کہ ابا جو بیٹوں کو زیادہ وقت نہیں لگانے تھے دفتر سے آتے ہی شاہد کا پوچھتے تھے کہ وہ آج ماں کے ساتھ آیا یا نہیں۔ رات کو انیسہ آپا کے شوہر آ جاتے یا کوئی بھائی ان کو گھر چھوڑ آتا تھا۔ جب زکیہ باجی نے یہ بات کی تو امی، انیسہ باجی اور رخسانہ باجی کا منہ بن گیا۔ انیسہ باجی نے کہا۔ "بے وقوف سوچ سمجھ کر بولا کر.... پہلے ہمیشہ بیٹیوں کی شادی کرلی چاہیے ورنہ بھابیاں آ کر بھائیوں کو الگ کر دیتی ہیں اور پھر بہنوں کی شادی میں مسئلہ ہو جاتا ہے۔"

میں زکیہ باجی سے بھی زیادہ سادہ تھی میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "جیسے آپ نے زاہد بھائی کو الگ کر دیا ہے۔"

"لعنت ہو تجھ پر۔" انیسہ آپا نے غصے سے کہا اور امی نے جوتی اٹھائی تو میں نے وہاں سے فرار میں عافیت سمجھی۔ مگر میں بہت دیر تک سوچتی رہی کہ جو بات انیسہ آپا اور ان کے شوہر کے لیے ٹھیک ہو سکتی ہے وہ بھائی اور بھابی کے لیے کیسے غلط ہو گی؟ پھر میں اپنے بھائیوں کو دیکھتی تھی تو مجھے ذرا بھی یقین نہیں آتا کہ وہ شادی کے بعد ہم سے دور ہو جائیں گے۔ خاص طور سے رئیس بھائی تو سب بہنوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ نفیس بھائی ذرا سخت مزاج تھے مگر وہ بھی ہم سے محبت کرتے تھے۔ ذرا سی تکلیف پر بے قرار ہو جاتے تھے۔ انیس بھائی بس گزارے لائق کماتے تھے مگر اس میں سے بھی وہ ہمارے لیے کچھ نہ کچھ لاتے رہتے تھے اور کچھ نہیں تو باہر سے کھانے پینے کو کچھ لے آتے تھے۔ میں

سوچتی کہ ابھی تو بھابی آئی نہیں ہے اور کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کیسی ہو گی تو پہلے سے اس کے بارے میں ایسا کیوں سوچ لیا گیا ہے۔

میں ابا کے قریب تھی ان سے ہر بات کر لیتی تھی۔ میں نے بتایا نا کہ ابا بیٹیوں کو بہت چاہتے تھے۔ انیسہ آپا اور رخسانہ باجی ابا کے زیادہ قریب نہیں تھیں۔ زکیہ باجی ذرا الا ابالی تھیں خود میں مگن رہنے والی مگر میں ابا کے پاس رہنا پسند کرتی تھی۔ جیسے ہی وہ دفتر سے آتے، میں اٹھ جاتی کیونکہ اسکول سے آ کر اور کھانا کھا کر مدہوشوں والی نیند آتی تھی۔ مگر ابا کی سائیکل کی گھنٹی بجتی اور میں پھرتی سے کھڑی ہو جاتی تھی۔ ابا ناشتا کر کے جاتے تھے اور پھر دوپہر کا کھانا آ کر کھاتے تھے۔ اس لیے وہ بہت بھوکے ہوتے تھے اور پھر میلوں دور تک سائیکل چلانا بھی آسان کام نہیں تھا۔ وہ نڈھال ہو جاتے تھے۔ جب ہم اس علاقے میں آئے تو ٹرانسپورٹ نہیں چلتی تھی۔ اس لیے ابا سائیکل پر آنے جانے لگے۔ مگر بعد میں جب بسیں چلنے لگی تھیں تب بھی ابا نے سائیکل پر آنا جانا نہیں چھوڑا۔ سب نے بہت اصرار کیا کہ وہ بس سے آئیں جائیں خود پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں۔ مگر سنتے اور ہنس کر خاموش ہو جاتے، ایک بار میں اور سجاد ابا سے یہی بات کر رہے تھے۔ امی تنک کر بولیں۔

"کبھی ماں کا خیال آیا نہیں جو صبح سے شام تک لگی رہتی ہے باپ کی فکر ہے کہ وہ سائیکل سے نہیں بس سے جائے۔ پتا ہے روز کا کرایہ کتنا لگے گا؟"

ابا کا چہرہ متغیر ہوا تھا مگر انہوں نے کہا۔ "تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ویسے بھی سائیکل سے آنا جانا کون سا مشکل ہے۔"

اس وقت ہمیں احساس نہیں تھا مگر آج میں سوچتی ہوں کہ کون شخص ہو گا جو روز دس بارہ کلو میٹرز سائیکل چلا کر دفتر جائے اور واپس آئے اور وہ بھی صرف چند آنوں کی بچت کے لیے۔ اس وقت کرایہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا تھا نزدیک آنے جانے کے لیے پیسوں میں ادائیگی کی جاتی تھی۔ ابا یہ قربانی اس لیے دیتے تھے کہ ان کی تنخواہ میں سے ان پر کم سے کم خرچ ہو۔ وہ فراوانی زندگی بسر کرنے آئے تھے اور اب مزدوروں سے بھی گئی گزری زندگی بسر کر رہے تھے۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ ابا نے ایسا کیوں کیا؟ وہ اتنے قناعت پسند کیوں تھے؟ حد یہ کہ انہوں نے ترقی کی کوشش بھی نہیں کی۔ ان کے دفتر کے ساتھی جو تجربے اور

قابلیت میں ان سے کہیں کم تھے وہ بہت آگے نکل گئے۔ افسروں کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے۔ جاوید اور بتالیں مگر ابا کلرک کی جس سیٹ پر بیٹھے تھے اسی سے ریٹائر ہوئے تھے۔

اس دن مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ امی اور ابا ایک دوسرے سے بالکل ہی بے نیاز ہو گئے تھے ورنہ کون بیوی ایسی ہوتی ہے کہ جسے شوہر سے ذرا بھی محبت ہو اور وہ اسے یوں تکلیف برداشت کرتا دیکھتی رہے۔ اس کے چند دن بعد میں نے موقع پا کر ابا سے پوچھ لیا۔ ''امی آپ کا خیال کیوں نہیں کرتی ہیں؟''

''نہیں بیٹا کرتی تو ہیں۔'' ابا نے جواب دیا۔

''نہیں کرتی ہیں جیسے چچی پاپا کا کرتی ہیں۔ جیسے چچی چچا کا کرتی ہیں۔ امی آپ کا ایسے کیوں نہیں کرتی ہیں۔''

''اس کا بھی قصور نہیں ہے۔'' ابا نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''تمہاری دادی نے اس سے جو سلوک کیا ہے وہ اس کے ذہن میں بیٹھ گیا ہے۔''

''سلوک دادی نے کیا ہے تو وہ آپ سے کیوں بدلا لے رہی ہیں۔ آپ کہتا ہے وہ بھائیوں کی شادی کے لیے تیار نہیں ہیں کہ بھابی آکر ان کو بدل دیں گی۔ ابا وہ ابھی سے ایسا کیوں سوچ رہی ہیں۔''

''بیٹا وہ اپنی ذات اور انا کے گنبد میں بند ہو گئی ہیں۔'' ابا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ ان کے نزدیک سوائے اپنے اور کسی کی اہمیت نہیں رہی ہے۔''

مجھے ابا کی بات پر حیرت ہوئی۔ ''پر ابا وہ ہمارے لیے اتنا کرتی ہیں صبح سے شام تک لگی رہتی ہیں۔''

''وہ خود پر ظلم کر رہی ہے۔ مگر ابا وہ خود کر رہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ دوسروں کی ضرورت بن جائے اور سب ہمیشہ اس کے محتاج رہیں۔ مگر بیٹا یہ ممکن نہیں ہے۔ ہر انسان کا اپنا کردار ہوتا ہے اور جب وہ اپنا کردار ادا کر لیتا ہے تو اسے اسٹیج چھوڑنا پڑتا ہے۔ تمہاری ماں زندگی کے اس اسٹیج سے ہمیشہ چمٹی رہنا چاہتی ہے۔ میں رہوں یا نہ رہوں یہ بات یاد رکھنا تمہاری ماں اور اس جیسی سوچ رکھنے والی عورتیں اکیلا رہ جاتی ہیں۔ وہ نہ آسانی سے جیتی ہیں اور نہ آسانی سے مرتی ہیں۔''

اس وقت میں ابا کی بات نہیں سمجھی تھی۔ مگر وقت نے اسے درست ثابت کر دیا۔ تین سال بعد میں میٹرک میں تھی اور ریحانہ باجی کی شادی ہونے والی تھی۔ تب میں نے رئیس بھائی کے بالوں میں تیل لگاتے ہوئے دیکھا کہ کچھ بال سفید ہو رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''ہائے بھیا آپ بوڑھے ہو گئے بال سفید ہو گئے ہیں۔''

''ہاں بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسے۔ ''شادی کے بغیر ہی۔''

اس وقت رئیس بھائی چھبیس سال کے تھے۔ آج کے لحاظ سے یہ عمر زیادہ نہیں ہے لیکن اس وقت لڑکوں کی شادیاں بھی جلد ہو جاتی تھیں۔ بھائی کے سارے دوست شادی شدہ اور بچوں والے ہو گئے تھے مگر بھائی ابھی تک اکیلے تھے۔ مجھے دکھ ہونے لگا اور میں نے امی سے کہا۔ ''آپ ریحانہ باجی کے ساتھ بھائی کی شادی بھی کر دیں۔''

''تو چپ کر بہت بولنے لگی ہے بڑوں کے معاملے میں۔''

ان دنوں میں امی سے نہیں ڈرتی تھی۔ ''امی آپ بھائی کے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔ وہ چھبیس کے ہو گئے ہیں اور ان کے سر کے بال سفید ہونے لگے ہیں۔ لوگ تو بیٹوں کے کمانے لائق ہوتے ہی شادی کر دیتے ہیں۔''

''وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔ پال پوس کر ہم بڑا کریں اور جب وہ کمانے لگے تو دوسری عورت کے حوالے کر دیں۔''

''امی کیسی بات کر رہی ہیں۔ یہ تو ہوتا ہی ہے کسی نے اپنا بیٹا بھی تو آپ کی بیٹی کے حوالے کیا ہے تب پھر آپ بھی کسی کی بیٹی لے آئیں نا۔''

''تو نہیں جانتی رضیہ کہ اب بیٹے شادی ہوتے ہی پرائے ہو جاتے ہیں۔''

''امی بہت سارے بیٹے شادی کے بعد بھی اپنے گھر والوں کے ہوتے ہیں، کچھ اگر ہو بھی جاتے ہیں تو سب ایک جیسے تو نہیں ہوتے ہیں نا؟''

''سب بیٹے ایک جیسے ہوتے ہیں اور سب بہوئیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔'' امی نے اتنے یقین سے کہا جیسے قرآن و حدیث کی کوئی بات بیان کر رہی ہوں۔

''تو کیا آپ ساری عمر بھائیوں کی شادی نہیں کریں گی۔''

''کر دیں گے ان کی کون سی عمریں نکلی جا رہی ہیں۔'' امی نے بے پروائی سے کہا۔ ''مرد تو ویسے بھی ساٹھا پاٹھا ہوتا ہے۔ جب چاہے شادی کر لے۔''

امی نے ماننا تھا اور نہ مانیں۔ ریحانہ باجی کی شادی ہو گئی اور مجھ سے بڑی ذکیہ باجی کے لیے رشتوں کی تلاش شروع ہو گئی۔ جب امی نے ابا سے ایک رشتے کا ذکر کیا تو وہ بولے۔ ''نالائقہ کیا بیٹے نہیں ہیں ان کی شادی نہیں کرنی ہے۔''

''ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے لڑکوں کی شادی تو تیس پینتیس سال میں ہی ہونی چاہیے۔''

''تب بنی کے لیے بھی اسی عمر کا لڑکا تلاش کرو۔''

''او ہے رادا.... ''امی بڑبڑا ئیں۔ ''کیوں ابھی زکیہ سترہ سال کی ہوئی ہے اپنی بچی کو دوگنی عمر کے مرد سے بیاہ دوں۔''

''تب بیٹوں کے لیے بڑی عمر کی عورت تلاش کرنا۔'' ابا مشورہ دے کر فارغ ہو گئے اور حقہ گڑگڑانے لگے۔ بیٹوں سے ان کو کبھی دل چسپی نہیں رہی اس دن بھی نہ جانے کیسے بول گئے ورنہ انہوں نے تو گھر کے معاملات میں بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت اپنی پسند سے شادی کا رواج ہی نہیں تھا۔ خاص طور سے ہمارے طبقے میں۔ اس لیے بھائی صبر سے انتظار کرنے لگے کہ امی کب ان کی شادی کا ارادہ کرتی ہیں۔ اب انیس بھائی بھی گریجویشن کر کے ایک سیمی گورنمنٹ کمپنی میں ملازم ہو گئے تھے۔ وہ بھی بائیس سال کے ہو چکے تھے۔ ایک دن میں نے انیسہ آپا اور امی کو بات کرتے سنا۔ انیسہ آپا کہہ رہی تھیں۔ ''آج کل رئیس بھائی اور نفیس بھائی اپنی شادی کے بارے میں بات کرنے لگے ہیں مگر امی آپ ثابت قدم رہیے گا زکیہ سے پہلے ہرگز کسی کی شادی مت کریے گا۔''

''تم فکر مت کرو میں تو سوچ رہی ہوں کہ رضیہ کے بعد....''

''نہیں امی اس میں ابھی وقت ہے اسے پڑھنے دیں اسے شوق بھی ہے اور پھر ایک رہ جانے کی تو اتنی مشکل بھی نہیں ہوگی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب آپ بہو لائیں گی تو اس کے سامنے آپ اور رضیہ دو ہوں گے۔''

''دونوں کی شادی کی ترکیبیں بھی تو رہی ہوں گی۔''

''ہو جائیں..... دو بہویں اور بھابیاں بھی ہوں تو ان میں اکا کھوڑی ہو جاتا ہے۔'' انیسہ آپا نے بے پروائی سے کہا۔ میں ان کے خیالات سن سن کر حیران ہوئی تھی۔ صرف وہی نہیں بلکہ رضیہ اور زکیہ باجی بھی اب اسی رنگ میں رنگی گئی تھیں۔ ان کے نزدیک صرف اپنی اہمیت تھی۔ جیسے امی کے نزدیک ابا کی کوئی اہمیت نہیں تھی اسی طرح بہنوں کے نزدیک بھائیوں کی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ پیچھے پیچھے وہ ان کو ذکر بھی کرتیں تو بڑی بے پروائی اور کسی قدر حقارت آمیز انداز میں کرتیں۔ جب میں سنتی تو مجھے غصہ آتا تھا اور میں بھائیوں اور ابا کے لیے ان سے لڑ جاتی تھی۔

اس پر مجھے بھی سننے کو ملتی تھی۔

''لیلی بی ذرا بھابیاں آنے دو پھر دیکھنا ان بھائیوں کو دو۔''

''ممکن ہے وہ بدل جائے لیکن بہن بھائیوں کی جو فطری محبت ہوتی ہے وہ تو ختم نہیں ہو سکتی۔''

''یوں ختم ہوتی ہے۔'' انیسہ آپا نے غرور سے چٹکی بجا کر کہا۔ ''میاں بیویوں کے نام کی مالا جپتے تھے اب مجال ہے جو کسی کا نام بھی لے لیں۔''

''اگر ایسا ہے تو آپ بھائیوں کو کیوں برا کہہ رہی ہیں۔''

''برا کون کہہ رہا ہے میں تو بات کو بتا رہی ہوں۔ بڑی تجھے ہی سب کر بھول جاتا ہے۔''

ان ہی دنوں زکیہ باجی کا رشتہ آیا تھا۔ لڑکا سعودی عرب میں کام کرتا تھا۔ اپنا گھر بنا لیا تھا اور صرف ایک ماں تھی اور بیٹیاں شادی کر کے اپنے گھر کی ہو گئی تھیں۔ امی نے ہاں کر دی اور ایک مہینے کے اندر زکیہ باجی بھی اپنے گھر کی ہو گئیں۔ یوں میں رہ گئی اور مجھ سے بڑے تین بھائی جن کی شادی ہو جانی چاہیے تھی مگر اب تک نہیں ہوئی تھی۔ رئیس بھائی جو پہلے اتنے ہنسی مذاق کرنے والے اور شور کرنے والے تھے اب بالکل چپ ہو گئے تھے۔ دفتر جانے اور وہاں سے واپسی پر باہر نکل جانے پھر سونے کے لیے ہی گھر آتے تھے۔ چھٹی کے دن بھی خاموش بیٹھے رہا کرتے تھے۔ نفیس بھائی شروع سے الگ فطرت کے آدمی تھے اور انیس بھائی بھی سنجیدہ تھے۔ مزاج اور باقی عمر کے لحاظ سے شوخ اور شرارتی تھے۔ مجھے رئیس بھائی کا دکھ ہوتا تھا۔ جوانی میں ہی وہ پکی عمر کے لگنے لگے تھے۔ ان ہی دنوں امی اور ابا کی ایک مشترکہ رشتے دار خاتون ہمارے ہاں آئی تھیں۔ انہوں نے امی سے کہا۔

''نائلہ بیٹوں کی شادی کب کرو گی جب سر کے بال بالکل سفید ہو جائیں گے پھر کچی عمر کی لڑکیاں ملیں گی۔''

''میں بھی سوچ رہی ہوں۔'' امی بولیں۔ میں حیرت سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی کیونکہ یہی بات ہم میں سے کوئی کہتا تو امی... اس کے لتے لے لیتیں۔ بیٹوں کی شادی کا سن کر ان کو پتنگے سے لگ جاتے تھے۔

''اسے بیٹوں کو بوڑھا کر رہا ہے اور ابھی بھی سوچ رہی ہو۔'' ان خاتون نے طنزیہ لہجے میں کہا تو امی کھسیا گئیں۔

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔''

''رئیس میاں اٹھائیس کے ہو رہے ہیں تو اب اور کتنی

نر میں کر دی گی۔"

ان خاتون کا طنز امی کو لگ گیا۔ ان میں اپنی ناک اونچی رکھنے کا جذبہ بھی تھا۔ اس لیے انہوں نے تنک کر ان ہی خاتون سے کہہ دیا۔ "ہم دیکھ رہے ہیں کوئی مناسب لڑکی نظر ہی نہیں آئی تم ہی بتاؤ اگر کوئی نظر میں ہے۔"

"ارے یہ کیوں نہیں رحیم بھائی کی بیٹی شازیہ ہے نا۔"

یہ ہمارے دور کے رشتے دار لگتے تھے۔ اس لیے امی کو بات آگے بڑھانا پڑی۔ دوسری طرف شازیہ بھابی کے گھر والے بھی تیار تھے۔ یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا کام ہوا تھا۔ دو مہینے میں بھابی ہمارے گھر آ چکی تھیں۔ مگر اس سے پہلے ہی امی اور بڑی بہنوں نے اپنی خدشات اور چہ میگوئیوں سے بھری گفتگو سے گھر میں ایک ماحول تیار کر دیا تھا جس میں رئیس بھائی کو وہ درس سنایا جاتا تھا کہ شادی کے بعد بدل مت جانا۔ بیوی کے غلام مت بننا۔ ماں بہنوں سے آنکھیں مت پھیر لینا۔ وہ بے چارے کھسیا جاتے اور وضاحتیں پیش کرتے تھے کہ وہ ایسا نہیں کریں گے وہ مردوں کی فلاں قسم سے نہیں ہیں۔ مگر ان کی وضاحت کوئی نہیں سنتا تھا۔ امی اور بہنوں کو یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا جیسے ہی رئیس بھائی کی بیوی آئے گی وہ سب سے آنکھیں پھیر لیں گے۔ اس ماحول میں یہ شادی ہوئی تھی۔

ہر مرد شادی کے بعد اپنی بیوی کا خیال رکھتا ہے۔ وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے اس کا خاندان بنتا ہے اور اس میں لازمی تبدیلی آتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں یہ تبدیلی خوشدلی سے قبول نہیں کی جاتی ہے بلکہ اسے مرد کا جرم اور آنے والی کا قصور بنا دیا جاتا ہے۔ شوہر بیوی کا خیال رکھے اور اس کے لیے خاص طور سے کچھ لے کر آئے، اسے کہیں گھمانے لے جائے یا گھر کے کچھ اختیارات اسے دینا چاہے تو اسے زن مریدی سمجھا جاتا ہے۔ ایسا ہی ہمارے ہاں بھی ہوا تھا۔ شادی کے بعد بھائی نے امی کو پوری تنخواہ کی بجائے نصف تنخواہ دی تو امی نے رونا شروع کیا اور یہ آدھی رقم لینے سے بھی انکار کر دیا۔ میں نے ان سے کہا۔ "امی اس میں رونے کی کیا بات ہے اب بھائی خاندان والے ہیں وہ اپنے لیے بھی رقم رکھیں گے۔"

"تو کیا مجھ سے نہیں لے سکتا۔" امی بولیں۔

شازیہ بھابی بھی اندر سے نکل آئیں۔ "آپ کی بہنوں نے پورا گھر الگ لے لیا اور آپ صرف آدھی تنخواہ رکھنے پر رو رہی ہیں۔"

"رئیس دیکھ رہا ہے اس کی زبان کیسے چل رہی ہے۔" امی نے بلبلا کر بھائی سے کہا۔

"ہر عورت کے منہ میں زبان ہوتی ہے اور میرے منہ میں بھی ہے۔" بھابی نے جواب دیا اور اندر چلی گئیں۔ رئیس بھائی ان کے پیچھے گئے تھے اور امی نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ وہ اپنی پیش گوئیاں دہرا رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بات غلط سمت جا رہی ہے لیکن میں چھوٹی ہونے کے ناطے کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ امی سے بھی ایک حد تک بات کر

سکتی تھی اور اس میں بھی مجھے گالیاں کھانے کو ملتیں۔ اگلے دن انیسہ آپا، رضیہ اور زینب باجی آئیں اور امی نے ان کے ساتھ میٹنگ کی جس میں میں خاموش تماشائی کے طور پر شریک تھی۔ اس میں دل کھول کر رئیس بھائی اور بھابی کے خلاف باتیں ہوئیں۔ مزے کی بات ہے یہ ساری گفتگو با آواز بلند ہو رہی تھی اور بھابی اپنے کمرے میں سن رہی تھیں سب سے کمزور آواز میری تھی اور وہ ان کی حمایت میں تھی مگر وہ انہوں نے سنی نہیں۔ اس سارا دن وہ کمرے میں بند رہیں۔ شام کو بھائی آئے تو بھابی نے ان سے بہت لڑائی کی۔ وہ پریشان ہو کر امی کے پاس آگئے۔

"امی یہ کیا ہے آج ہی ان بہنوں کو کیوں بلایا؟"

"وہ میری بیٹیاں ہیں اور یہ ان کے باپ کا گھر ہے وہ یہاں ضرور آئیں گی۔"

"ضرور آئیں مگر شازیہ کے خلاف محاذ بنانے کی کیا تک بنتی ہے۔ یہ ان کے گھر کا معاملہ تو نہیں ہے۔"

"ارے واہ کیوں نہیں ہے جب ان کی ماں کے ساتھ برا کیا جائے گا تو کیا وہ نہیں بولیں گی۔"

"آپ صرف ان کی ماں نہیں ہیں میری اور دوسروں کی ماں بھی ہیں اور اس گھر میں ابا بھی ہیں کیا سارے فیصلے آپ نے اور آپ کی بیٹیوں نے کرنے ہیں۔"

امی نے بھائی کی بات کا جواب دینے کی بجائے یہ جملہ پکڑ لیا کہ آپ کی بیٹیاں۔ انہوں نے رونا دھونا اور جذباتی ہونا شروع کر دیا۔ پھر ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ نیم بے ہوش ہوگئی تھیں۔ بھائی اور ہم سب بھول کر ان کو سنبھالنے میں لگ گئے۔ امی کی طبیعت تو کچھ دیر میں سنبھل گئی مگر حالات نہیں سنبھلے تھے۔ شازیہ بھابی چاہتی تھیں کہ انہیں کچن کے کام دیئے جائیں خاص طور سے کھانا بنانے کا۔ مگر امی نے انکار کر دیا۔ یہ عجیب بات تھی۔ امی نے تین بیٹیوں کی شادی کر دی تھی مگر کھانا وہ تینوں وقت آج بھی خود بناتی تھیں صرف روٹیاں پکانے اور برتن وغیرہ دھونے کا کام بہنیں کرتی تھیں۔ چھٹی والے دن یا شام کو کوئی مہمان آ رہا ہو تو وہ گھر صاف کر لیتی تھیں اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں کرتی تھیں۔ سارے گھر کے کپڑے امی دھوتی تھیں البتہ بھائیوں کو اگر جلدی کپڑے درکار ہوتے تو وہ خود دھو لیا کرتے تھے۔ اب بھابی اپنے اور رئیس بھائی کے ساتھ ابا کے کپڑے بھی دھو رہی تھیں مگر باقی گھر والوں کے امی ہی دھوتی تھیں۔ امی نے ان سے کہا۔

"بی بی تمہیں کام کرنے کا شوق ہے تو کپڑے دھو لیا کرو۔"

"میں اپنے اور رئیس کے ساتھ ابا کے کپڑے دھو لیتی ہوں اور مجھے کوئی ایک کام نہیں کرنا ہے ساری عمر۔"

مگر امی نے انہیں کچن کا کام نہیں دیا۔ تلخیاں رفتہ رفتہ اتنی بڑھیں کہ ابا نے بھائی سے کہا۔ "گھر میں ایسا ماحول بنانے سے بہتر ہے تم الگ گھر لے لو۔"

امی نے سنا تو ہنگامہ کیا۔ "میں اپنے بیٹے کو الگ ہونے نہیں دوں گی اس دن کے لیے تھوڑی پالا پوسا تھا۔"

"ہاں ساتھ رکھ کر سب کی زندگی ضرور حرام کرو گی۔" ابا نے کہا۔ "میں رئیس کو اجازت دے چکا ہوں۔"

یوں رئیس بھائی شادی کے چار مہینے بعد ہی بھابی کو لے کر الگ ہوگئے۔ میرے خیال میں بھابی کا بھی قصور تھا۔ وہ مزاج کی تیز تھیں اور انہیں مصلحت نہیں آتی تھی۔ مگر اصل قصور وار امی اور میری بڑی بہنیں تھیں جنہوں نے شادی سے پہلے ہی ایک طرح کا ماحول بنا دیا تھا اور اس کا فطری انجام یہی ہونا تھا۔ بظاہر یہ معاملہ ختم ہوگیا۔ مگر جب رئیس بھائی اور بھابی کا ذکر آتا تو برے الفاظ میں ہی آتا۔ رئیس بھائی کو زن مرید، احمق اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا۔ حالانکہ وہ ایسے نہیں تھے۔ اسی طرح شازیہ بھابی چالاک، چلتر اور میاں کو قابو کرنے والی بتائی جاتی تھیں۔ مزے کی بات ہے جب بہنیں اپنے شوہروں کا ذکر کرتیں تو بھی خامیاں خوبیوں میں بدل جاتی تھیں اور امی بھی دامادوں کے صدقے واری جاتیں کہ وہ ان کی بیٹیوں کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ ان کو پہناتے اوڑھاتے، کھلاتے پلاتے اور گھماتے تھے۔ ان کے لیے یہ درست تھا اور اگر رئیس بھائی اور بھابی کے حوالے سے ان چیزوں کا ذکر آتا تو اسے عیاشی قرار دیا جاتا تھا۔ مجھے اس دوہرے معیار سے بھی اختلاف تھا۔

میٹرک کے بعد میں نے کالج جانا شروع کیا تھا اور امی سے صاف کہہ دیا تھا کہ گریجویشن تک میری شادی کا نہ سوچیں بلکہ نفیس بھائی اور انیس بھائی کی شادی پہلے کریں اس کے بعد میری باری آئے گی۔ نفیس بھائی نے اس بات پر خوش ہو کر میری تعلیم کا سارا خرچ خود اٹھانے کا اعلان کیا تھا۔ اگرچہ نفیس بھائی اور انیس بھائی پہلے سے ہی آدھی تنخواہ دیتے تھے کیونکہ وہ مزاج کے تیز تھے۔

میں نے گریجویشن کر لیا پھر بھی امی نے ان دونوں کی شادی نہیں کی۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ کس طرح اپنے

بیٹوں کی جوان آرزوؤں کا گلا گھونٹ رہی ہیں اور بیٹے ان کے اس سلوک کو یاد رکھیں گے۔ اگر ان کی بیویاں چالاک ہوئیں تو انہیں بڑی آسانی سے بیٹوں سے برگشتہ کر دیں گی۔ مگر امی اور بہنیں اپنی انا کے زعم میں یہ بات سمجھنے کو تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے جو روز اوّل سے پالیسی تیار کی ہوئی تھی اسی پر عمل پیرا تھیں۔ میری شادی کے بعد امی نے مجھ پر زور دینا شروع کر دیا کہ میں رمیز کو لے کر الگ ہو جاؤں۔ میں حیران ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیوں الگ ہو جاؤں۔“

”تو نہ ہو۔“ امی نے تنک کر کہا۔ ”جب سسرال والے نکالیں گے تب ہو جانا۔“

”میرے سسرال والے اوّل تو ایسے ہیں نہیں اور اگر ایسی کوئی بات ہوئی تب دیکھا جائے گا۔ ابھی سے میں کس خوشی میں الگ ہو جاؤں۔ اچھی خاصی اپنے گھر میں بیٹھی ہوں آپ چاہتی ہیں کہ انیسہ آپا اور رخسانہ باجی کی طرح کرائے کے مکانوں میں دھکے کھاؤں۔“

”نہ مانو خود بھگتو گی۔“

”اللہ نہ کرے آپ دعا کی بجائے بددعا دے رہی ہیں۔“

”عقل درست کر رہی ہوں۔“

مجھے غصہ آ گیا۔ ”مجھے ایسی عقل کی ضرورت نہیں ہے۔ میری بہنوں نے اپنے سسرال والوں سے بنا کر نہیں رکھی حالانکہ رہنا انہیں کے ساتھ ہے۔ آپ اور ابا کب تک ہوں گے۔ آپ کی حد تک میکا ہے اس کے بعد کس سے ملیں گے ہم۔“

امی کو غصہ آ گیا تھا۔ وہ سمجھنے والی عورت نہیں تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ان سے زیادہ ضدی عورت اور کوئی نہیں دیکھی وہ اپنی ضد کے پیچھے بڑے سے بڑا نقصان برداشت کرنے کو تیار ہو جاتی تھیں مگر اپنی بات سے ایک بال برابر پیچھے نہیں ہٹتی تھیں۔ میں ان کی باتیں سنتی رہی پھر انہیں سمجھایا۔ ”امی آپ نے رہنا بھائیوں اور بھابیوں کے ساتھ ہے اس لیے ان کے بارے میں اچھا سوچیں۔“

”نہ بابا مجھے نہیں رہنا کسی کے ساتھ۔“

امی نے کہا تو مجھے ابا کی بات یاد آئی کہ امی جیسی عورتیں اکیلی رہ جاتی ہیں۔ اس کا آغاز بھی ہو گیا تھا وہی بہنیں جو کچھ عرصے پہلے تک آئے دن موجود رہا کرتی تھیں اب بچوں اور گھر میں الجھ کر مہینے میں ایک دو بار ہی آ پاتی تھیں۔ بیٹھ کر بیٹھنے کو زمانہ گزر جاتا تھا۔ میں روز میکے آنے کی قائل نہیں تھی اور نہ ہی رمیز کو یہ بات پسند تھی اس لیے میں قریب رہنے کے باوجود مہینے میں ایک دو بار ہی چکر لگاتی تھی۔ پھر نفیس پیدا ہوا تو اس کی مصروفیت میں آنا جانا اور کم ہو گیا تھا۔ ان ہی دنوں ابا کو فالج ہو گیا تھا۔ دفتر سے آ کر وہ کھانا کھا کر لیٹے اور پھر اٹھے نہیں۔ شام کو گھر والوں نے دیکھا تو وہ بے ہوش تھے۔ بھائی انہیں جلدی سے اسپتال لے کر گئے۔ وہاں فالج تشخیص ہوا تھا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ اس نے ایک طرف کا پورا حصہ ناکارہ کر دیا تھا۔ ابا اس کے بعد تین دن اور زندہ رہے۔ اسی حالت میں دوسرا حملہ ہوا اور وہ دنیا سے گزر گئے۔

ابا ساٹھ کے آس پاس تھے اور امی ابھی پچپن کی بھی نہیں ہوئی تھیں۔ معاذ اور ریاض ابھی چھوٹے تھے۔ معاذ میٹرک میں اور ریاض نائن کلاس میں تھا۔ ابا اور امی کے تعلقات کیسے ہی تھے مگر ابا ان کی ڈھال بھی تھے۔ جب وہ نہ رہے تو امی کو پتا چلا۔ نفیس بھائی نے ابا کے چالیسویں سے پہلے ہی کہہ دیا کہ اگر اسی سال میں ان کی شادی نہ کی گئی تو وہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ابا کے ہوتے ان کی جرأت نہیں تھی ایسی بات کرنے کی۔ یہ سن کر امی بدحواس ہو گئیں کیونکہ ابا کے بعد نفیس اور انیس بھائی کی تنخواہوں سے گھر چل رہا تھا۔ انہوں نے بادلِ ناخواستہ نفیس بھائی کے لیے لڑکی تلاش کرنا شروع کی۔ وہ چھبیس برس کے تھے جب ان کی شادی ہوئی۔ صبیحہ بھابی نارمل خاتون تھیں۔ ذرا سست تھیں مگر جو کام کرتیں اچھے طریقے سے کرتی تھیں۔ شادی کے دوسرے مہینے نفیس بھائی نے کچن الگ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد وہ جو آدھی تنخواہ امی کو دیتے تھے اس میں بھی کمی کر دی۔ انیس بھائی اپنی ساری تنخواہ امی کو دیتے تھے مگر مہینے کے آخر تک وہ روز سو پچاس روپے لے کر بڑا حصہ خود پر خرچ کر چکے ہوتے تھے۔ پھر ابا کی پنشن آتی تو اس سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ اس میں مکان کے کرائے اور بلوں کے ساتھ دونوں چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کا خرچ بھی شامل تھا۔ نفیس بھائی بھی اپنا حصہ ڈالتے تھے مگر وہ اس سے زیادہ دینے کو اب تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بہنوں کی شادیاں ہو گئی تھیں اور اب بھائی تھے۔ معاذ اور ریاض بھی جوان تھے۔ پارٹ ٹائم جاب کر کے اپنا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔

مگر امی چھوٹے بھائیوں کی نوکری کی مخالف تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ابھی پڑھ رہے ہیں۔ حالانکہ تینوں بڑے بھائیوں نے نوکری کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کی اور اسی وجہ

سے اپنے اداروں میں اچھے عہدوں پر تھے۔ اچھی تنخواہیں حاصل کر رہے تھے اور مزے کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ نفیس بھائی نے خاموشی سے فلیٹ بک کرایا اور شادی کے دو سال بعد اچانک ہی اپنا سامان اور بیوی بچوں سمیت گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ امی ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ اب ان کو پتا چل رہا تھا کہ بیٹوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور وہ ساتھ چھوڑ جائیں تو دل سے زیادہ گھر پر کیا گزرتی ہے۔ اب تک امی گھر میں رو رہے تھے۔ وقت کے ساتھ کرایہ بڑھتا رہا اور کمانے والے افراد کم ہونے لگے۔ اس لیے یہ مکان چھوڑ کر ایک چھوٹا مکان لیا۔ مگر کرایہ اس کا معقول سا ہی کم تھا۔ اب ابا کی پنشن کے ساتھ رئیس بھائی جو دیتے تھے اسی سے گزارا چل رہا تھا۔ نفیس بھائی نے گھر سے جانے کے بعد جو دیتے تھے وہ بھی دینا بند کر دیا تھا۔

میں امی اور گھر کی حالت دیکھ کر کڑھتی تھی۔ مجھ سے جو ہوتا وہ خاموشی سے کر دیا کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ باقی بہنیں بھی کچھ نہ کچھ کرتی ہوں گی مگر ایک دن امی کے منہ سے نکل گیا کہ جن بیٹیوں کے پیچھے جان کھپا دی اب وہ پلٹ کر پوچھتی بھی نہیں ہیں۔ تب مجھے معلوم ہوا اور دکھ پہنچا مگر ہمارے گھر میں ایسا ماحول بنایا گیا تھا جس میں رشتوں کی بجائے مفاد کو اہمیت دی گئی اور اصول کی بجائے اپنی سوچ پر عمل کیا گیا تھا اس کا ایک فطری نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ میں عورت ہوتے ہوئے بھی اس بات کی قائل ہوں کہ جس گھر میں عورتوں کی حکمرانی ہو اور وہاں اہم فیصلے عورتیں کریں اور مردوں کا عمل دخل کم ہو تو وہاں بالآخر تباہی آ کر رہتی ہے اور گھر بالآخر بکھر جاتے ہیں۔ یہ مرد ہی ہوتے ہیں جو گھر بناتے ہیں اور جوڑ کر رکھتے ہیں۔ ایسا ہی ہمارے گھر کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

اب اگر بھائی بے پروا یا بے حس ہو گئے تھے تو ان کا قصور کم تھا۔ ان کو شروع سے ہی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ وہ اس معاملے میں زیادتی کا شکار تھے اور جب بیویوں نے آ کر ان کو اہمیت اور احترام دیا تو وہ ان کے کیوں نہ ہوتے۔ مزے کی بات ہے کہ خرابی ہونے کے باوجود امی اور میری بہنیں اس بات کو ماننے کو تیار نہیں تھیں ان کے خیال میں سارا قصور بھائیوں اور بھابیوں کا تھا۔ انیس بھائی جو نہایت ہوشیاری سے تنخواہ خود پر خرچ کرنے لگے تھے وہ امی اور بہنوں کے نزدیک بہت اچھے تھے۔ حالانکہ میں نے کئی بار امی سے کہا بھی تھا کہ وہ انیس بھائی کو کنٹرول کریں کل کو

ان کی شادی کرنی ہے تو اتنی فضول خرچی اچھی نہیں ہوتی ہے۔ وہ جمع نہیں کریں گے تو شادی کیسے کریں گے۔ مگر امی ان کی سنتی اور مانتی تھیں۔ بہرحال اس سے بیٹوں کے بارے میں ان کے خیالات پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ ان کا انیس بھائی کی شادی کا ارادہ نہیں تھا حالانکہ وہ بھی پچپن کے ہونے والے تھے۔

اب کوئی بیٹی نہیں تھی جو ان کا ہاتھ بٹاتی اور بہوؤں سے انہوں نے کبھی کام لینے کا سوچا نہیں کہ یہ انہیں اپنے اختیارات میں مداخلت لگتی تھی اس لیے اس عمر میں بھی پورا گھر دیکھ رہی تھیں۔ تینوں وقت کھانا بنانے سے لے کر صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے کا کام خود ہی کرتی تھیں۔ مارکیٹ جا کر روز کا سودا روز لانا بھی ان کا معمول تھا۔ میں امی پر زور دیتی کہ انیس بھائی کی شادی کر دیں مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی تھیں۔ انیس بھائی کی شادی کرنے کی بجائے انہوں نے اچانک انڈیا جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جب سے امی پاکستان آئی تھیں تو پھر تیسرے چوتھے سال انڈیا جاتی رہی تھیں۔ ابا ایک بار بھی نہیں گئے۔ میری بڑی بہنیں بھی جا چکی تھیں اور سوائے رباض کے سارے بھائی بھی گئے تھے۔ بہنوں میں بس میں نہیں گئی تھی۔

اس بار انیس بھائی امی کے ساتھ چلے گئے۔ حالانکہ وہ نوکری پیشہ تھے اور ان کو اتنی لمبی چھٹی نہیں مل سکتی تھی مگر وہ ایک مہینے کی چھٹی لے کر چلے گئے۔ وہاں جا کر امی اپنی بہن سے ملیں اور انہوں نے امی سے کہا کہ وہ ان کی ایک بیٹی تو اپنے گھر بیاہ کر لے جائیں۔ میری خالہ کی چار بیٹیاں تھیں۔ دو کی شادی ہو گئی تھی اور دو باقی تھیں۔ امی کو بہن کی محبت آ گئی اور انہوں نے شاہجہاں کو مانگ لیا۔ صرف مانگا نہیں بلکہ وہیں ہاتھ کے ہاتھ ان کا نکاح انیس بھائی سے کرا کے وہیں رخصتی بھی کرا دی۔ امی نے یہ کام اتنی عجلت میں کیا کہ یہاں کسی کو اطلاع بھی نہیں دی۔ شادی کے بعد رئیس بھائی کے گھر ان کی مختصر سی کال آئی جس میں انہوں نے انیس بھائی کی شادی کی اطلاع دی تھی اور یہ بھی نہیں سنا کہ انیس بھائی کے دفتر سے وارننگ لیٹر آ گیا تھا جس میں انہیں کہا گیا تھا کہ انہوں نے چند دن میں جوائن نہیں کیا تو انہیں نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ وہ ایک بڑی گورنمنٹ کارپوریشن میں جاب کر رہے تھے اگر نجی کمپنی ہوتی تو کب سے فارغ کر دیے جاتے۔ ایک مہینے کی چھٹی پر وہ

ڈھائی مہینے سے غائب تھے۔

رئیس بھائی نے کال کی تو وہ ملی نہیں رہی تھی پھر انہوں نے تار بھیج دیا مگر اتفاق کی بات ہے جس دن تار وہاں پہنچا امی، انیس بھائی اور ثنا بھابھی کے ہمراہ ابا کے آبائی گاؤں روانہ ہو گئی تھیں۔ وہاں مزید ایک مہینا رہیں اور پاکستان واپس آئیں۔ یہاں آکر یہ علم ہوا کہ انیس بھائی کی نوکری نہیں رہی تھی۔ حالانکہ یہ خبر متوقع نہیں تھا۔ مگر امی اور انیس بھائی دونوں نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ نوکری چھوٹ گئی اور اب بیوی بھی تھی اس کا خرچ بھی اٹھانا تھا۔ انیس بھائی نے بھاگ دوڑ شروع کی اور رئیس بھائی کی کوشش سے تین مہینے بعد انہیں ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب مل گئی مگر تنخواہ کم تھی اور کام بہت زیادہ تھا۔ اس دوران میں گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔ چار مہینے سے کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ بل ادا نہ کرنے سے بجلی کٹ گئی تھی اور کنڈا ڈال کر کام چلا رہے تھے۔ اگر ثنا بھابی کے گولڈ کا کچھ حصہ بِکا تو بیچ فاقوں کی نوبت ہی آجاتی۔ باوجود اس کے کہ ثنا بھابی امی کی سگی بھانجی تھیں اور انہوں نے آکر پورا گھر سنبھال لیا تھا پھر اپنے زیور کا ایثار بھی کیا تھا۔ اس کے باوجود امی نے انہیں بہو ہی سمجھا اور وہ بھی اپنی سوچ کے مطابق۔ جب تک انیس بھائی کی جاب نہیں لگ گئی اور وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوئے تھے تب تک امی نے ان دونوں سے بہت خراب سلوک رکھا تھا۔ خاص طور سے ثنا بھابی سے ان کا رویہ بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔

خالہ زاد بہن ہونے کے ناطے مجھے اور باقی بہنوں کو ان سے ہمدردی تھی۔ وہ ہمارے سامنے روتی تھیں کہ ان کا کیا قصور ہے جو خالہ ان سے ایسا سلوک کر رہی ہیں۔ مگر ہم کیا کر سکتے تھے۔ میں ممکن حد تک امی کو سمجھاتی اور وہ نہیں سمجھتی تھیں بلکہ جب باقی بہنیں امی سے بات کرتیں تو وہ بھی ان کی زبان بولنے لگتی تھیں۔ الٹا ثنا بھابی کو مورد الزام ٹھہرائیں کہ وہ امی کی بات نہیں مانتیں۔ انیس بھائی کی جاب لگنے کے بعد مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں وہ بھی الگ نہ ہو جائیں۔ اس صورت میں امی معاذ اور ریاض کے ساتھ کہاں جاتیں اور کیسے گزارا کرتیں۔ مگر شکر ہے ثنا بھابی نے خیال کیا اور انہوں نے انیس بھائی کو الگ ہونے کو نہیں کہا۔ سارا گھر وہی چلا رہی تھیں۔ معاذ اور ریاض برائے نام ہی حصہ ڈالتے تھے۔ اس کے باوجود امی کا رویہ ان سے اچھا نہیں تھا۔

انیس بھائی امی کا خیال رکھتے تھے مگر اب انہیں دوسرے بیٹوں کی یاد زیادہ ستانے لگی تھی۔ اتفاق سے میرے سارے بھائی آس پاس ہی رہتے تھے اگرچہ ایک دوسرے سے ملنا جلنا کم تھا۔ اس لیے امی روز ہی کسی نہ کسی بھائی کے ہاں چلی جاتی تھیں۔ کچھ عرصے سے ان کے جوڑوں میں درد رہنے لگا تھا اور چلنے میں ذرا مشکل سے تھیں مگر پھر بھی چلی جاتی تھیں۔ بیٹیاں دور چلی گئی تھیں۔ انیسہ آپا محمود آباد میں رہتی ہیں۔ رشیدہ آپا کی رہائش گلشن میں ہے اور ذکیہ باجی ناظم آباد میں رہتی ہیں۔ سب کی اپنی مصروفیات اور بچے ہیں اس لیے ان کا آنا جانا کم ہوتا ہے۔ امی مہینے میں ایک بار سب کے ہاں ہو آتی تھیں۔ دو تین دن رکتی تھیں۔ مگر بیٹوں کے ہاں نہیں رکتی تھیں۔ بس جاتی اور آجاتی تھیں۔

ایک دن میں چھٹی والے دن امی کے پاس آئی۔ میرا ارادہ تھا کہ شام تک رکوں گی پھر گھر چلی جاؤں گی۔ بھائیوں اور بھابیوں پر ایک وقت سے زیادہ کا بوجھ ڈالنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا سب ہی متوسط طبقے کے تھے اور روز بارہ مہمان داری مشکل تھی۔ ثنا بھابی سے میری بنتی تھی۔ مجھے اور بچوں کو دیکھ کر وہ خوش ہو گئیں اور جلدی سے کھانے کی تیاری میں لگ گئیں۔ وہ کھانا بہت اچھا بناتی تھیں۔ جو چیز بناتیں اس کا ذائقہ ہی بتا دیتا تھا کہ اسے ثنا بھابی نے بنایا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ تمام ہی بھابیوں کو کھانے اچھے بنانے آتے تھے۔ ہم بہنوں کو بس روایتی کھانے اچھے آتے ہیں یا جو شوہر کے گھر جا کر جو سیکھ لیے وہی آتے ہیں ورنہ امی نے نہ تو ہم سے پکوایا اور نہ ہی سکھایا۔ مگر میں نے امی کو کبھی بہوؤں کے کھانے یا ان کے ذائقے کی تعریف کرتے نہیں سنا۔ اس کی بجائے وہ بیٹیوں کا ذکر کرتی تھیں کہ فلاں چیز انیسہ بہت اچھی بناتی ہے اور ذکیہ یہ ڈش سب سے اچھی بناتی ہے جبکہ انیسہ آپا کا بنایا کھانا بہ مشکل ہی اچھا ہوتا تھا۔ ان کے شوہر اور بچے روتے تھے کہ امی غلطی سے بھی اچھا نہیں بناتی ہیں۔

رشیدہ اور ذکیہ باجی خود گزارے لائق بناتی تھیں۔ مجھے بھی ہر چیز اچھی بنانی نہیں آتی ہے مگر شوہر اور بچوں کو جو پسند ہے وہ میں نے محنت کر کے اچھا بنانا سیکھ لیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے اگر لڑکیوں کو کم عمری سے اچھا کھانا بنانا نہ آئے تو بعد میں ان کے لیے بہت مشکل ہوتی ہے۔ پھر عورت کی فطرت ہے جس طرف سے اسے داد و صلہ نہ ملے وہ اس طرف جانے سے گریز کرتی ہے بیزار ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی خراب کھانا بنانے والی عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ

کچن سے بیزار ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ ان کا منفی پوائنٹ ہوتا ہے۔ سچی بات ہے مجھے بھی کچن میں جانا اچھا نہیں لگتا ہے کیونکہ شروع سے عادت نہیں ڈالی گئی۔ دوپہر کھانے کے بعد میں ثنا بھابی کے ساتھ برتن رکھواتے ہوئے گپ شپ کر رہی تھی کہ امی نے کہا۔ "چلو رئیس کے ہاں چلتے ہیں۔"

"امی میں یہاں آئی ہوں نا۔" میں نے کہا۔

"ارے تو وہ بھی بھائی ہے۔ کبھی اس کے گھر کا چکر بھی لگا لیا کرو۔"

"امی میں ہر مہینے کسی ایک بھائی کے گھر جاتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں آج بھی چلو۔" امی نے کہا اور مجھے مجبور کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ امی ثنا بھابی کو بھی کہیں گی مگر امی نے ان سے نہیں کہا۔ میں بڑے بیٹے گھر میں چھوڑ کر آئی تھی میرے ساتھ ایک بچی اور ایک بیٹا تھا۔ جب ہم نکلے تو امی کے ہاتھ میں ٹفن کا ایک حصہ تھا۔ اس میں شاید آج کی کوئی ڈش تھی۔ ہم رئیس بھائی کے گھر پہنچے۔ شازیہ بھی اچھے طریقے سے ملیں۔ امی سے ان کی چپقلش رہتی تھی مگر وہ رکھ رکھاؤ بہت کرتی تھیں۔ امی کا بہت خیال رکھتیں۔ ان کی سردی گرمی کے کپڑے لاتیں اور امی کا علاج اور دوائیاں بھی رئیس بھائی کے چینل پر تھیں۔ اس طرح رئیس بھائی اب بھی باقاعدگی سے امی کو رقم دیتے تھے جب کہ نفیس بھائی کی مرضی ہوتی تو دیتے ورنہ نہیں دیتے۔ رئیس بھائی کی تنخواہ اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ وہ کرائے کے گھر میں تھے مگر اسے بہت اچھا سجا کر رکھا تھا ان کے بیوی بچے بہتر زندگی گزار رہے تھے۔

مجھے خوشی ہوئی کہ میرے بھائیوں اور بہنوں کے بچوں کو وہ سخت حالات نہیں دیکھنے پڑے جو مجھے دیکھنا پڑے تھے۔ وہ بہتر سہولتوں میں رہ رہے تھے۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ امی نے ٹفن ساتھ ہی رکھا ہے۔ حالانکہ وہ بھابی کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے توجہ نہیں دی۔ شام کو رئیس بھائی گھر آئے۔ سلام دعا ہوئی تو امی نے اچانک ٹفن ان کی طرف بڑھا دیا۔ "رئیس یہ ہم تمہارے لیے لائے ہیں۔ آج کوفتے بنائے تھے۔"

میں حیران ہوئی اور بھائی و بھابی کا چہرہ عجیب سا ہو گیا۔ بھائی ٹفن نظر انداز کر کے اندر چلے گئے تو امی ان کے پیچھے گئیں۔ میں نے ہمت کر کے بھابی سے پوچھ لیا۔ "بھابی یہ کیا ہے؟"

"وہی جو بھجنہ کرتی ہیں۔" انہوں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "آتی ہیں اور جو چیز لاتی ہیں وہ دبا کر بیٹھی رہتی ہیں اور جب بیٹا آتا ہے تو اسے پیش کر دیتی ہیں۔ بہو پر اعتبار نہیں ہے کہ خود کھا جائے گی ان کے بیٹے کو نہیں کھلائے گی۔"

اگرچہ بچپن سے امی کی فطرت دیکھتی آ رہی تھی مگر میں دنگ رہ گئی۔ "امی ایسا کرتی ہیں۔"

"صرف میرے ساتھ نہیں صبیحہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔"

اس سے آگے پوچھنے کی میری ہمت نہیں ہوئی۔ واپسی میں میں نے امی سے کہا۔ "آپ ایسا کیوں کرتی ہیں اگر کوئی چیز لے کر جاتی ہیں اور بے شک وہ بھائی کے لیے ہو تب بھی بھابی کو کیوں نہیں دیتی ہیں۔"

"ہم اپنے بیٹے کے لیے لے کر جاتے ہیں اسے کیوں دیں۔" وہ غرور بھرے لہجے میں بولیں۔

"معاف کیجئے گا امی جن بیٹوں کو آپ نے ساری عمر اہمیت نہیں دی کیا وہ آپ کی ان باتوں سے آپ کے گرویدہ ہو جائیں گے۔ معذرت کے ساتھ آپ ساری عمر غلط کرتی آئی ہیں اور اب بھی غلط کر رہی ہیں۔"

وہ بھڑک گئیں۔ "ہم نے کیا غلط کیا؟"

"آپ بیٹے کو عزت نہیں دے رہی ہیں۔ اگر کوئی بیوی کو بے عزت کرے تو اصل میں یہ شوہر کی بے عزتی ہوتی ہے کیونکہ بیوی تو اس کی عزت ہوتی ہے۔ آپ بیٹے کو برا بھلا کہہ لیں اس کے ساتھ کوئی سلوک نہ کریں لیکن اس کی بیوی کو عزت دیں گی تو وہ آپ کا ہو گا۔ ورنہ ایسا ہی ہو گا جیسا ہو رہا ہے۔"

"تم بیٹی نہیں دشمن ہو۔" انہوں نے کہا اور پھر راستے بھر مجھ سے بات نہیں کی۔ بعد میں مجھے اور بھی بہت کچھ پتا چلا جو امی کرتی تھیں اور بالکل غلط کرتی تھیں۔ ثنا بھابی کی بنائی چیزیں اپنی کہہ کر رئیس بھائی اور نفیس بھائی کے ہاں دے آتی تھیں۔ حالانکہ سب کو معلوم تھا کہ امی یہ چیزیں اول تو بناتی ہی نہیں ہیں اور دوسرے ثنا بھابی کے ہاتھ کا ذائقہ الگ سے پہچانا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بھائی امی سے بیزار تھے۔ معاذ کے بعد ریاض بھی نوکری سے لگ گیا تو امی ایک بار پھر ثنا بھابی کو تنگ کرنے پر اتر آئیں اور اس بار انیس بھائی الگ ہو گئے۔ روز کی چخ چخ ان کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ سب اچھے خاصے گھر میں رہ رہے تھے۔ اس میں تین کمرے اور ایک ڈرائنگ روم تھا۔ مشکل حالات میں ثنا

بھائی نے ملازمت کر کے گھر کو سہارا دیا تھا پھر بچے ہو گئے اور انیس بھائی کو ایک اچھی جاب مل گئی تو وہ گھر بیٹھ گئیں۔ جاب کے دوران میں وہ گھر بھی دیکھتی رہی تھیں کیونکہ امی کے ہاتھ سے ایک بار کچن گیا تو انہوں نے پھر کچھ کرنے سے انکار کر دیا البتہ ان کا دل چاہتا تو خود کچھ پکا لیتی تھیں۔

اب امی، معاذ اور راباض دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں اٹھ آئے۔ یہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا اور پانی کا بڑا مسئلہ تھا۔ مگر کرایہ بہت کم تھا اس لیے امی نے یہ لے لیا۔ اس بار میں نے امی کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ بہت بار یہ کوشش کر کے میں سمجھ گئی تھی کہ وہ سمجھنے والی نہیں ہیں۔ یہاں ان کی حکمرانی ایک بار پھر قائم ہو گئی تھی۔ معاذ اور راباض کی آمدنی برابر ہی تھی اور اس میں سے بھی زیادہ تر ان پر خرچ ہو جاتی تھی۔ اس مکان کا کرایہ دونوں بھائی دیتے تھے اور کچھ رقم انیس بھائی دیتے تھے۔ پھر ابا کی پنشن آتی تھی جو بہت کم تھی مگر کچھ نہ کچھ ہو جاتا تھا۔ میں جب امی سے ملنے جاتی تو مجھے افسوس ہوتا تھا کہ ان کی ساری اولادیں اچھے اور آرام دہ گھروں میں رہ رہی ہیں اور وہ یہاں پڑی ہیں۔ گرمی میں لائٹ جاتی تو حبس سے برا حال ہو جاتا تھا۔ رئیس بھائی نے امی سے کہا کہ وہ چل کر ان کے ساتھ رہیں مگر انہوں نے معاذ اور راباض بھائی کا بہانہ بنا کر انکار کر دیا۔ میں امی کی فطرت سمجھتی تھی بلکہ ان کے سارے بچے سمجھتے تھے کہ وہ انتہائی تکلیف میں تو رہ سکتی تھیں مگر ان کے لیے مختار کل ہوتے بغیر رہنا بہت اذیت ناک تھا۔

یہ ٹھیک بھائیوں کی رہائش سے دور تھی مگر امی پھر بھی دو تین دن میں کسی نہ کسی کے ہاں کا چکر لگا لیتی تھیں۔ تمام بچوں کے پاس سواری تھی۔ رئیس بھائی نے تو ہائی روف بھی لے لی تھی مگر وہ پیدل رہنے کی عادی تھیں۔ بچے کہتے تھے کہ وہ اس طرح نہ گھوما کریں ان سے کہہ دیا کریں اور وہ ان سے ملنے آجایا کریں گے مگر وہ نہیں مانتی تھیں۔ بیٹوں سے کہنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ درحقیقت وہ انہیں اب بھی اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ فلیٹ میں شفٹ ہونے کے بعد امبر آپا، رقیہ اور رقیہ باجی نے امی کے پاس آنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کا یہاں دم گھٹتا تھا اور یہ بات بھی تھی کہ امی اب ان کی بڑی دلی سے ہی تواضع کر سکتی تھیں۔ یہ تو بھائیوں کے ساتھ تھیں جو ان کی دلجوئی ہوتی تھیں۔ بعض اوقات تو ایسا ہوتا کہ بہنیں آکر بھائیوں کے گھر سے ہو کر چلی جاتی تھیں اور امی کے پاس نہیں آتی تھیں۔ مجھے افسوس ہوتا یہ وہی بیٹیاں ہیں جن کی خاطر امی نے بیٹوں کو نظر انداز کیا۔ ان کی شادی کی عمریں گزار کر ان کی شادیاں کیں۔ انہیں اہمیت نہیں دی۔ ان کی بیویوں کو ہمیشہ ساس کی نظر سے دیکھا۔ اب وہ امی کو ذرا بھی وقعت نہیں دے رہی تھیں۔

امی کے بعد ان کی بیٹیاں بھی اسی ڈگر پر چل رہی تھیں۔ وہ اپنی بیٹیوں کو اہمیت دیتی تھیں اور بیٹوں کو لفٹ نہیں کراتی تھیں۔ امبر آپا کے ماشاءاللہ چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ رقیہ باجی کے تین بیٹے اور تین ہی بیٹیاں ہیں۔ رقیہ باجی کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ میرے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ میں نے شروع سے بیٹوں کو اہمیت دی اور اپنی بیٹیوں کو بھی یہی سکھایا کہ بھائیوں کی عزت کرنی ہے۔ ایک تو وہ بڑے تھے دوسرے اس گھر کے مرد وہی تھے۔ رمیز فطری طور پر بیٹیوں سے پیار کرتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ بیٹوں کو ان کا مقام دیتے تھے۔ فیض اور معیز کم عمری سے ان کے مشیر بن گئے تھے۔ وہ اہم فیصلے کرنے والے ان سے مشورہ کرتے تھے۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ درست مشورہ دے سکتے بلکہ رمیز انہیں عادی کر رہے تھے کہ فیصلہ کرنا مردوں کا کام ہے۔

تیسرے نمبر کا شبث ذرا لاابالی ہے مگر تابع اور آمنہ بڑے بھائیوں کی ایک جیسی عزت کرتی ہیں۔ میں نے کم عمری سے انہیں کام کی عادت ڈالی تھی۔ دس گیارہ سال کی عمر سے وہ کچن میں کام کرنے لگی تھیں۔ میری بہنیں آتیں اور انہیں کام کرتے دیکھ کر حیران ہوتی تھیں۔ مجھ سے کہتیں کہ بچیوں کو ابھی سے کام پر کیوں لگایا ہے تو میں ان کو یہی جواب دیتی کہ ابھی سے کام نہیں کریں گی تو عادت کیسے پڑے گی۔ اسی طرح میں بیٹوں کو اہمیت دیتی ہوں تو یہ بھی انہیں ہضم نہیں ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ جیسے انہوں نے اپنے بیٹوں کو دبا رکھا ہوا ہے اسی طرح میں بھی رکھوں مگر میں تو اس چیز کے سخت خلاف ہوں۔ بدقسمتی سے صرف میری بہنوں کے گھر ہی نہیں بلکہ میرے بھائیوں کے گھر بھی بیٹوں سے یہی سلوک ہو رہا ہے وہاں بھی بیٹیوں کو سر چڑھایا جاتا ہے اور انہیں بگاڑا جاتا ہے۔ شاید بھابیوں نے لاشعوری طور پر یہ چیز سیکھ لی۔

امی بہت بوڑھی ہو کر بھی کسی بیٹے کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ راباض اور معاذ کی شادی نہیں کر رہی

تھیں حالانکہ دونوں اب کمانے لگے تھے۔ پھر معاذ نے خود ہی پسند سے کورٹ میرج کرلی اور الگ رہنے لگا۔ اب امی اور دو باجی رہ گئے تھے۔ تو نفیس بھائی کو اچانک ہی خیال آیا اور وہ امی کو باجی سمیت اپنے مکان کے نچلے پورشن میں لے آئے۔ یہ ایک کمرے، باتھ روم اور کچن پر مشتمل تھا اس لیے امی خود مختار رہنے لگیں۔ مگر ان کی گھومنے پھرنے کی عادت ختم نہیں ہوئی تھی۔ جوڑوں کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی اور ان سے ٹھیک سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ ایک دن وہ رئیس بھائی کے ہاں جا رہی تھیں کہ پھسل کر گر گئیں اور ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ انہیں اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے ایکسرے کے بعد بتایا کہ ہڈی اس طرح ٹوٹی ہے کہ اسے جوڑنا یا بدلنا بھی ممکن نہیں ہے اور اب انہیں باقی عمر بستر پر گزارنا ہوگی۔

یوں امی کی زندگی کا مشکل ترین دور شروع ہوا جس میں انہیں نہ چاہنے کے باوجود مکمل طور پر کسی دوسرے پر انحصار کرنا پڑ رہا تھا۔ ان کے سارے کام دوسرے کر رہے تھے۔ بھائیوں نے طے کرلیا کہ وہ ایک ایک مہینا سب شادی شدہ بھائیوں کے ہاں رہیں گی۔ سوائے معاذ کے جس نے امی کی ذمے داری لینے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر سب ہی بہنوں نے اپنا دامن بچالیا ان کے پاس شوہر، سسرال اور بچوں کے بہانے تھے۔ میں نے بھائیوں سے کہا کہ میں امی کو ایک مہینے رکھا کروں گی مگر رئیس بھائی نے کہا۔

"یہ ہماری ذمے داری ہے اور ہم اسے پوری کریں گے۔"

مگر یہ ایک ایسی ذمے داری تھی جسے پورا کرنا آسان نہیں تھا۔ خاص طور سے ان لوگوں کے لیے جن سے امی نے کبھی اچھا تعلق بنانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود وہ امی کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ ان کے بچے بھی کر رہے تھے۔ امی کی صفائی ستھرائی تک وہ کرتے تھے۔ بھائیوں کے انکار کے بعد میں نے یہ کیا کہ ہر اتوار والے دن صبح سے آجاتی تھی کہ امی جس بھابی کے گھر ہیں انہیں اور ان کے بچوں کو کم سے کم ایک دن کے لیے آرام ملے یا انہوں نے کہیں جانا ہو تو وہ جا سکیں۔ امی کے لیے یہ سب تکلیف دہ تھا اس طرح بستر پر پڑ جانا اور اس سے بڑھ کر ان لوگوں سے خدمت کرانا جنہیں انہوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ شاید اسی لیے وہ صرف چار مہینے اور زندہ رہیں۔ مگر ان چار مہینوں میں ان کا جو حال ہوا تھا اسے دیکھ کر مجھے ابا پر بہت رشک آیا جو چند دنوں میں دنیا سے گزر گئے تھے۔ ساری عمر بیوی بچوں کو زحمت نہیں دی تھی اس لیے مرتے ہوئے بھی کوئی زحمت نہیں دی۔

ماں ماں ہوتی ہے یہ مجھے امی کے مرنے کے بعد پتا چلا۔ ان سے لاکھ اختلاف سہی اب بھی ہیں۔ میں کبھی ان کی سوچ سے متفق نہیں ہوتی۔ اس کا اندازہ آپ کو میری کہانی سے ہو گیا ہوگا میں نے بیٹی ہوتے ہوئے بھی پوری دیانت داری سے سب لکھ دیا ہے مگر ان کے لیے دل میں جو محبت تھی وہ آج بھی مجھے کسک دیتی ہے ان کا خیال آتا ہے تو ناممکن ہے کہ میری آنکھیں نہ بھیگیں اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ جب کسی دن مجھے ان کا خیال نہ آئے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا اور میں نے اس معاشرے کا جائزہ لیا تو مجھے تعجب ہوا کہ امی والی سوچ اب تقریباً ہر گھر میں موجود ہے۔ یہی شاید ہمارے معاشرے کی تباہی کی بنیاد ہے۔ ایک بیمار سوچ رکھنے والے گھرانے سے صحت مند سوچ رکھنے والے نوجوان کیسے آئیں گے۔ وہ اس دنیا اور اس کے چیلنجوں کا سامنا کیسے کریں گے جب کہ انہیں گھر کی عورتوں کا سامنا کرنے کے قابل نہیں چھوڑا جاتا ہے۔ ان کا اعتماد اور ان کی خودی جوانی سے پہلے چکنا چور کر دی جاتی ہے۔ کیا تعجب ہے کہ آج کل کی نوجوان مائیں بچوں کی پرورش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ کیونکہ انہیں سوائے اس کام کے اور ہر بات کی تربیت دی جاتی ہے۔ انہیں شادی سے پہلے سسرال والوں سے نمٹنے کے گر سکھائے جاتے ہیں۔ شوہر کو کیسے قابو کیا جاتا ہے اس کی ترکیبیں ذہن نشین کرائی جاتی ہیں۔ ہمارے گھروں میں اولاد کو کیا تربیت دی جا رہی ہے یہ بتانے کے لیے بگڑا ہوا معاشرہ بتانے کے لیے کافی ہے۔

کچھ عرصے پہلے میں نے نفیس کی شادی کی اور شادی کے دوسرے دن اپنی بہو کو ناشتے کی میز پر کہا۔ "بیٹا یہ آج سے ہمارا گھر نہیں ہے تمہارا گھر ہے۔ ہمارے پاس بس ایک کمرا اپنا ہے باقی سارا گھر تمہارا ہے جیسے چاہو رکھو۔"

جب میں نے یہ کہا تو میں نے دیکھا کہ بہو سے زیادہ میرے بیٹے کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ اور ایسا اعتماد آیا تھا جس نے میری روح کو سرشار کر دیا۔ مجھے لگا کہ میں نے ایک نئے رواج کا آغاز کیا ہے۔ بے شک یہ نیا رواج نہیں ہے بہت سے گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے لیکن میں چاہتی ہوں ہر گھر والے یہ سمجھ کر اس پر عمل کریں کہ یہ رواج انہوں نے شروع کیا ہے۔

شناخت

محترم و مکرم معراج رسول قبلہ
آداب و نیاز
میں نے گو کہ بہت کم تعلیم حاصل کی ہے لیکن ادب خوب پڑھا ہے۔ اسی وجہ سے سرگزشت کا قاری ہوں۔ اپنی زندگی کا ایک اہم باب لے کر قارئین کے سامنے آیا ہوں، اُمید ہے میری یہ دکھ بھری داستان جسے میں نے اپنی فطرت کے مطابق شوگر کوٹڈ کردیا ہے، قارئین کو بھی پسند آئے گی۔ تمام لوگوں سے التماس ہے اپنی رائے کا اظہار ضرور کریں۔

روشن جہانگیر
(سرگودھا)

جب میں شناختی کارڈ کا فارم بھروانے گیا تو کلرک نے فارم دیکھ کر پوچھا۔ ”میاں، تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟“
”آدم۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے فارم پر لکھ دیا ہے۔“
”اور ماں کا نام“
”حوا۔“ میں نے بتایا۔ ”یہ بھی لکھا ہوا ہے۔“
”عجیب نام ہیں۔ آدم اور حوا۔“ کلرک نے اپنا سر جھٹکا۔ ”ان دونوں کے شناختی کارڈز ہیں تمہارے پاس۔“

”نہیں۔ اس زمانے میں شناختی کارڈز کا رواج نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ان کی ایک ہی شناخت ہوتی تھی کہ وہ انسان ہیں بس۔“

”بھائی کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔“

”میں اب سے ہزاروں لاکھوں سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”ہم سب کے باپ آدم تھے اور ہم سب کی ماں حوا تھیں لیکن انہوں نے شناختی کارڈز نہیں بنوائے تھے۔“

”بھائی۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ تمہارے اپنے ماں باپ نہیں تھے کیا؟“ کلرک نے پوچھا۔

ہمارے آس پاس کچھ اور لوگ بھی کھڑے ہو کر اس دلچسپ مباحثہ کو سن رہے تھے۔ ان میں ایک بزرگ صورت معقول انسان بھی تھے۔

”بھائی۔ بتاؤ! تمہارے اپنے ماں باپ نہیں تھے کیا؟“ کلرک نے دوبارہ پوچھا۔

”نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ماں باپ تھے یا نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے لیے اہمیت اس بات کی ہے کہ میرا جنم اسی دھرتی پر ہوا ہے۔ یہ مٹی میری ماں ہے۔ یہ ملک میرا وطن ہے۔ تو کیا ایک وطن کا بیٹا اپنا شناختی کارڈ نہیں بنوا سکتا۔“

”وطن کے بچے۔ ہم میں سے ہر شخص وطن کا بیٹا ہے لیکن ہر ایک کے اپنے ماں باپ بھی ہوتے ہیں۔“

”اب میرے نہیں ہیں تو میں کیا کروں؟“

”نہیں بھائی۔ تمہارا شناختی کارڈ نہیں بن سکتا۔ تمہارا کیس اسپیشل معلوم ہوتا ہے۔“ کلرک نے میرا فارم واپس کرتے ہوئے کہا۔

اس وقت اس بزرگ صورت انسان نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”آؤ میاں۔ تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہارا کیس سمجھ رہا ہوں۔“

وہ مجھے شناختی کارڈز آفس سے باہر نکال لائے۔ ان کا رخ کونے کے ہوٹل کی طرف تھا۔ ”آؤ کچھ دیر یہاں بیٹھ کر تم سے باتیں کروں گا۔“

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا میں ان کے ساتھ ہو لیا۔

ہم نے کونے والی ایک ایسی میز منتخب کی جہاں کچھ سکون تھا اور ہم آرام سے باتیں کر سکتے تھے۔

”ہاں میاں۔ پہلے تو میرا نام سن لو۔“ انہوں نے کہا۔ ”میرا نام جہانگیر ہے۔“

”اور مجھے روشن کہا جاتا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”یہ نام میں نے خود رکھا ہے کیونکہ بدقسمتی سے میرا نام رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔“

”اور۔ یعنی تم۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”جی ہاں آپ شاید صحیح سمجھ رہے ہیں۔ میرا کوئی باپ نہیں ہے کوئی ماں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہوں لیکن میں نہیں جانتا اور نہ ہی وہ مجھے جانتے ہوں گے۔ بس برسوں پہلے پیدا کر کے مجھے فٹ پاتھ پر پھینک گئے تھے۔“

”سمجھ گیا ہوں میں۔“ جہانگیر صاحب نے اپنی گردن ہلائی۔ ”کچھ اسی قسم کا خیال میرے ذہن میں آ رہا تھا نہ جانے اس دنیا میں کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ بیٹا تم مجھے اپنا ہمدرد سمجھو۔ کیا تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے۔“

”کیوں نہیں۔ ضرور بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ مجھے ایک ہمدرد انسان معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو بتا رہا ہوں۔“

”ٹھہرو۔ پہلے کچھ آرڈر دے دیں۔ چائے کے دوران میں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“

☆☆☆

میں نے آنکھ بے سہارا بچوں کے کسی گھر میں کھولی تھی۔

اس وقت شاید میں چار یا پانچ سال کا تھا۔ جب مجھے احساس ہونا شروع ہوا کہ میری دنیا میں کچھ بچے ہیں، ساتھ آٹھ کرخت لہجے اور کرخت مزاجوں والے لوگ ہیں، ایک کھولی ہے، اس کمرے سے باہر ایک دالان ہے۔ اس کے بعد کچی مٹی کا ایک بڑا سا دالان ہے، دالان کے اختتام پر ایک پھاٹک ہے اور اس کے باہر کیا ہے۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔

میں دیکھتا تھا کہ اس جگہ مختلف قسم کے لوگوں کا آنا جانا رہتا ہے۔ مجھے تو آہستہ آہستہ بہت سی باتیں معلوم ہوتی گئی تھیں۔ یعنی جہاں میں رہتا تھا وہ بے سہارا بچوں کا گھر تھا۔ یعنی ایسے بچے جن کا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں تھا۔ جن کو کچرے کے ڈھیرے پر پھینک دیا گیا تھا یا کسی جھولے میں ڈال دیا گیا تھا۔

وہاں جو لوگ آتے تھے۔ وہ مختلف قسم کے حضرات تھے جو اس بے سہارا گھر کی کفالت کیا کرتے، چندے دیتے اور ان ہی کے چندوں سے ہم بچوں کی پرورش ہوا کرتی اور اس

گھر کے دیگر اخراجات پورے ہوتے۔

وہاں ایک بڑا سا باورچی خانہ بھی تھا۔ جہاں سب کے لیے کھانے تیار کیے جاتے۔ عام طور پر باہر سے بھی آیا کرتے۔ خیرات اور فاتحہ وغیرہ کے کھانے۔

یہ سب بعد میں معلوم ہوتا گیا تھا۔ یعنی شعور حاصل کرنے کے بعد۔

وہاں جو لوگ ہوا کرتے۔ وہ اس گھر کو چلانے والے منتظم تھے۔ سخت مزاج اور سخت لہجوں والے لوگ۔ جو ذرا ذرا سی بات پر بچوں کو دھنک کر رکھ دیا کرتے۔

خود میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا تھا۔

وہاں ایک منحوس صورت انسان تھا۔ جس کی ٹانگوں میں نہ جانے کیا بیماری تھی کہ وہ ہر وقت بچوں سے ٹانگیں دبوایا کرتا اور اگر کسی بچے سے سستی ہو جاتی یا وہ بے چارہ تھک جاتا تو وہ شخص تھپڑ مار مار کر اس کے گال سرخ کر دیتا۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ چار پانچ برس کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے۔ میں جب اس کی ٹانگ دباتے دباتے اونگھنے لگتا یا میرے ہاتھ رک رک کر چلنے لگتے تو وہ بری طرح مارتا۔

خدا جانے مجھے یا دوسرے بچوں کو کس جرم کی سزا دی جا رہی تھی۔

برسوں کے بعد میں یہ سوال کر رہا ہوں کہ آخر کیوں۔ ہمارا کیا قصور تھا۔ اگر کسی نے ہمیں پیدا کر کے کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا تو اس میں ہم کیا کر سکتے تھے۔

ہم کہاں اپنی مرضی کے مالک تھے۔ ہم تو مجبور تھے۔ پھر ہمارے ساتھ ایسی ناانصافی کیوں۔ معاف کیجیے گا۔ ہوسکتا ہے کہ لفظ ناانصافی نے آپ کے مذہبی جذبے کو ٹھیس پہنچائی ہو؟ لیکن میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"نہیں بیٹا۔" جہانگیر صاحب نے جلدی سے کہا۔ "میں تمہاری کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔"

"شکریہ۔" میں نے گہری سانس لی۔ "جناب۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ مجھے اچانک اس قید خانے سے رہائی مل گئی۔ کوئی بے اولاد جوڑا تھا۔ جس کو ایک بچہ اڈاپٹ کرنا تھا۔ اس نے اس گھر میں آ کر مجھے پسند کر لیا۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کو پیسے بھی دیے ہوں۔ بہرحال میں وہاں سے نئے گھر میں منتقل ہو گیا۔"

یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر تھا۔

"اس گھر میں بہت قیمتی سامان تھا۔ ٹی وی تھا، قالین تھیں، اور ایک گاڑی بھی تھی۔ یعنی وہ سب کچھ تھا جو میں نے بے سہاروں کے گھر میں نہیں دیکھا تھا۔ صرف دو میاں بیوی تھے اور ایک بوڑھا مفلوج انسان تھا۔ جس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ اس آدمی کا باپ تھا۔"

"اب میری تقدیر بدلنے والی تھی۔ میری عمر اس وقت چھ یا سات برس کی ہوگی لیکن حالات نے ایسا کر دیا تھا کہ میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ معلوم ہوتا تھا۔"

میرے چہرے پر تلخیاں اور حسرتیں گہری تراش دی گئی تھیں۔ آنکھوں سے بے بسی اور بے کسی کا اظہار ہوتا تھا۔

"بیٹے۔" جہانگیر صاحب نے مخاطب کیا۔ "تم نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے اور جن حالات سے گزرے ہو۔ ان حالات میں ایسی اچھی گفتگو کہاں سے سیکھ لی۔"

"محترم۔ اس کے بارے میں بھی آپ کو بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔ "تو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اب میری قسمت بدل جائے گی۔ مجھے ایک اچھا اور صاف ستھرا ماحول ملے گا لیکن یہ سب غلط تھا۔ وہ دونوں مجھے اپنی اولاد بنا کر نہیں بلکہ ملازم بنا کر لائے تھے۔" میرے لہجے میں بے پناہ تلخی تھی۔

"اوہ۔ یہ تو واقعی بہت برا ہوا تھا۔" جہانگیر نے افسوس کا اظہار کیا۔

"جی جناب۔ مجھے اس مفلوج بوڑھے کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہوگی۔ کیا تھی میری عمر۔ کچھ بھی نہیں۔ اور کام کیا تھا۔ ایک مفلوج انسان کی دیکھ بھال۔"

"وہ لوگ کسی نرس وغیرہ کو رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے یہ چکر چلایا تھا۔ ایک بے سہارا بچے کو اڈاپٹ کرنے کے بہانے اپنے گھر لے آئے اور اس سے کام لینا شروع کر دیا۔"

"میں اپنی داستان سنا رہا تھا اور جہانگیر صاحب حیرت اور افسوس کی تصویر بنے ہوئے یہ سب سن رہے تھے۔"

"جناب۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ میں نے کیسے دکھ اٹھائے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اسی زمانے میں میں نے اپنا نام روشن رکھ لیا تھا۔ تو بس۔ میں اس بوڑھے آدمی کی غلاظت صاف کیا کرتا۔ اس کے ہاتھ پیر دھلاتا۔ اس کے کپڑے دھوتا اور بھی نہ جانے کیا کیا کرنا پڑتا تھا۔ میری زندگی میں خوشی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان سب کاموں کے علاوہ میں بازار سے سودے بھی لایا کرتا اور پھر میری

ملاقات اختر خیال سے ہوگئی۔"

"یہ کون تھے؟" جہانگیر نے پوچھا۔

"اسی گلی میں رہنے والے ایک بہت پڑھے لکھے انسان۔ ایک شاعر۔ ایک ادیب۔ اور بہت ہی ہمدرد دل رکھنے والے۔ انہوں نے مجھے گلی میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھے راستے میں روک کر میرے بارے میں پوچھ لیا۔ میں تو اندر سے بھرا ہوا تھا ہی۔ میں نے رونا شروع کر دیا۔ اس پر انہوں نے مجھے دلاسہ دیا اور دیر بات کرتے رہے۔ پھر میں نے انہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔"

زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھ سے ہمدردی کی تھی اسی لیے دل بھر آیا تھا۔ جب میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا تو خود ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

"خدا کی پناہ۔ اتنی سی عمر میں تم نے اتنے دکھ اٹھا لیے ہیں، اور اب تک اٹھائے جا رہے ہو۔"

"جی جناب۔ میں کیا کروں۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟" انہوں نے پوچھا۔

"روشن۔" میں نے بتایا۔" میں نے اپنا یہ نام خود ہی رکھا ہے۔"

"تو روشن میاں۔ تمہاری قسمت میں ضرور روشنی ہوگی۔" اختر صاحب نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔" تمہارا مستقبل روشن ہوگا، ضرور ہوگا اور اس کو روشن کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔"

"وہ کیا ہے جناب۔"

"تم علم حاصل کرو۔" انہوں نے کہا۔" پڑھو۔"

"کیسے پڑھوں۔ کون مجھے پڑھائے گا۔"

"میں پڑھاؤں گا۔ اسکول میں نہ سہی گھر پر تعلیم دوں گا اور وہ بھی ایسی کہ تم دوسروں سے بہت بہتر ثابت ہو گے۔ یہ بتاؤ تم گھر سے تو نکل سکتے ہو نا۔"

"جی جناب۔ شام کے وقت ایک گھنٹے کی اجازت ملی ہے کہ میں کھیلنے چلا جایا کروں۔" میں نے بتایا۔

"بس۔ تم کھیلنے کی بجائے میرے پاس آ جایا کرو گے۔" اختر صاحب نے کہا۔

تو اس کے بعد میرا یہ معمول بن گیا۔ میں ہر شام کو ان کے پاس پہنچ جاتا اور وہ مجھے پڑھانا شروع کر دیتے۔ میں یہ کہوں کہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اختر صاحب ہی سے سیکھا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس بے رحم اور خود غرض معاشرے میں اختر صاحب جیسے لوگ بھی ہوا کرتے ہیں۔

"یہ کہا جائے کہ وہی میرے باپ تھے۔ وہی میرے استاد تھے۔ سب کچھ وہی تھے۔ انہوں نے اردو اور انگلش میں میری بنیادیں سیدھی کر دیں۔ انہوں نے مجھے اتنا سکھایا کہ میں آج آپ کے سامنے بیٹھا پوری روانی سے باتیں کر رہا ہوں اور یہ میرا خدا جانتا ہے کہ میں کس کس طرح بہانے بنا بنا کر ان کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کو اس بات کی فکر لگ گئی تھی کہ میں روز شام کو کہاں چلا جاتا ہوں۔ ان کے بوڑھے مفلوج باپ کے پاس ہر وقت کیوں نہیں گزارا رہتا۔ پھر جب انہیں یہ معلوم ہوا تو انہوں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ وہ بہت ناراض ہوئے اور اس وقت بھی اختر صاحب ہی میرے کام آئے۔ انہوں نے اس آدمی سے باقاعدہ اجازت لی۔ ان سے کہا کہ وہ تعلیم کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں۔"

"خدایا کیسے دن گزارے تھے میں نے۔ دن بھر اس بوڑھے کی خدمت میں رہتا۔ شام کو اختر صاحب کے پاس چلا جاتا اور رات کے وقت جب سونے کے لیے جاتا تو اختر صاحب کی دی ہوئی کتابیں پڑھا کرتا۔"

پھر یہ ہوا کہ ایک سال کے بعد اس بوڑھے کا جب انتقال ہوا تو اس وقت مجھے تھوڑی سی فراغت مل گئی لیکن کاموں سے جان نہیں چھوٹی تھی۔ میں اس گھر کا ملازم تو تھا ہی۔ دن بھر کام کرتا، سودا لاتا، فرش دھوتا، کپڑے دھوتا اور نہ جانے کیا کیا۔"

"جناب۔ یہ سلسلہ پورے پانچ برسوں تک چلتا رہا۔ میں اب بڑا ہو چکا تھا۔ میں آٹھ برس کی عمر میں اس گھر میں داخل ہوا تھا اور اب تیرہ برس کا ہو گیا تھا۔ اذیت اور کرب کے پانچ برس۔" میرا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں تھا۔ کوئی شناخت نہیں تھی، کہیں کوئی اندراج نہیں تھا، کوئی بھی فارم نہیں تھا، کوئی اسکول نہیں تھا اس کے باوجود میری تعلیم بہت اچھی تھی۔"

تعلیم اگر صرف ڈگریوں کا نام ہے تو بے شک میرے پاس ڈگری وغیرہ نہیں تھی لیکن علم تو تھا تیرہ برس کی عمر میں مجھے اس گھر سے نکلنا پڑ گیا۔"

"وہ کیوں؟" جہانگیر صاحب نے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ اس شخص کا بھی انتقال ہو گیا جو مجھے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کی بیوی

کے رشتے دار آگئے اور انہیں میں کسی طرح قبول نہیں ہو سکا۔ وہ اس گھر میں مجھے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھ پر الزامات لگانے شروع کر دیے۔ خاص طور پر چوریوں کے اور یہ صورتِ حال جب خطرناک ہو گئی تو میں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔"

"اور اختر صاحب۔" جہانگیر نے پوچھا۔ "وہ کہاں تھے۔"

"میں یہ بتانا بھول گیا کہ وہ بے چارے بھی اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ وہ اپنے غم کا بہت سا سرمایہ مجھ میں منتقل کر کے دنیا سے چلے گئے تھے۔"

"مجھے سب نے مل کر رات کو گھر سے نکال دیا تھا۔ میری بے بسی اور بے چارگی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ میرے پاس ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ جس میں میرے دو چار جوڑے کپڑے تھے۔ اور دو چار کتابیں تھیں۔ میں وہ لے کر اس گھر سے نکل پڑا تھا۔"

"اس کے بعد مجھے ایک ہوٹل والے نے پناہ دی۔" ان بے چارے کا ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ جو ہمارے ہی محلے میں تھا۔ وہ مجھے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس نے جب اس طرح جاتے ہوئے دیکھا تو آواز دے کر بلا لیا۔ "کیا بات ہے میاں۔ کہاں جا رہے ہو۔"

"بس جناب۔ جہاں قسمت لے جائے۔" میں نے بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ کیا گھر والوں سے ناراض ہو گئے ہو۔"

"اسی بات کا تو دکھ ہے کہ یہ میرے گھر والے نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"میں نے کچھ سوچ کر اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا رہا۔ اور جب کہانی ختم کی تو میں رونے لگا تھا۔ اپنی بے بسی، بے چارگی اور تنہائی کے احساس سے آنسو آ گئے تھے۔"

ہوٹل والا ایک شریف اور ہمدرد انسان تھا۔ وہ یہ سب سن کر تڑپ اٹھا تھا۔ "میرے خدا۔ کیسی دنیا ہے یہ بھی افسوس ہوا۔ تم ان گناہوں کی سزا برداشت کر رہے ہو جو تم نے کیے ہی نہیں ہیں۔"

"جی جناب۔ ایسا ہی ہے میرے ساتھ۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ ہمت کرو۔ حوصلے سے کام لو۔

جبریہ

وہ فرقہ جو انسان کو مجبورِ محض مانتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تقدیرِ الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے۔ انسان بذاتِ خود کچھ نہیں کر سکتا۔ اس عقیدے کے مطابق چونکہ ہر شے امرِ الٰہی کے تابع ہے اس لیے کوئی شے انسانی ارادے سے بدل نہیں سکتی۔ چنانچہ اس مذہب کی رو سے بندوں کے افعال ان کے اپنے ارادوں کے تابع نہیں بلکہ وہ طوعاً و کرہاً ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہیں۔ گویا بندوں سے صادر ہونے والے افعال درحقیقت افعالِ الٰہی ہیں۔ جبریہ مذہب قدریہ مذہب کی عین ضد ہے۔ اس فرقے کی بنیاد جہم بن صفوان (م 128ھ/745ئ) نے رکھی۔ ان کے مقابلے میں قدریہ یعنی معتزلہ انسان کو مختارِ مطلق مانتے ہیں۔ اشعریوں کے نزدیک انسان کچھ مختار ہے اور کچھ مجبور۔ معتزلہ اشاعرہ کو بھی جبریہ ہی کہتے ہیں۔ اہلِ سنت اس بات کے قائل ہیں کہ بندوں کے اختیاری اور غیر اختیاری سارے افعال اللہ کی طرف سے معرضِ وجود میں آتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے بھی قائل ہیں کہ وہ اللہ کے بخشے ہوئے ارادۂ جزئیہ کو ہر کام میں صرف کر سکتے ہیں۔ یہ بات جبریہ کے عقیدے کے خلاف ہے۔ جبریہ کا ایک فرقہ جو جبریہ خالصہ کے نام سے موسوم ہے۔ تمام تر جبر کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک انسان اور جمادات کے مابین کوئی فرق نہیں۔ دوسرا فرقہ جبریہ متوسط کہلاتا ہے جو اس بات کے تو قائل ہیں کہ بندے میں قدرت ہے مگر یہ نہیں مانتے کہ یہ قدرت فعل پر کوئی تصرف کر سکتی ہے۔ نجاریہ، ضراریہ اور کلابیہ بھی اسی زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ مغربی فلاسفروں کا ایک گروہ بھی جبر کا قائل ہے۔ چنانچہ جوہانس سنگر کے خیال کے مطابق کائنات کی ہر چیز قانونِ قدرت کے ماتحت ہے اور اس سے انحراف نہیں کر سکتی۔ برطانوی فلسفی ہابس کا نظریہ تھا کہ کائنات اور انسان کی ہر حرکت قانونِ اسباب کے ماتحت ہے۔ نفسیات کے ماہرین کا خیال بھی یہی ہے کہ انسان اپنی مرضی کا مختار نہیں ہے بلکہ ذہنی اور جسمانی حالات اس کے ارادے اور عمل کو جس رخ چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں۔

مرسلہ: نعمان قادری۔ میرپور

مجھے اپنے ہوٹل کے لیے تم جیسے ایماندار لڑکے کی ضرورت تھی۔ تم اسی ہوٹل میں کام شروع کردو۔"

"تو جناب اس طرح میں نے اس ہوٹل میں کام شروع کردیا۔ میرا کام کاؤنٹر پر بیٹھنا تھا۔ وہ ہوٹل رات گیارہ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ گیارہ کے بعد میں اسی ہوٹل میں سوجایا کرتا۔ اس شریف آدمی نے میرے لیے ایک فولڈنگ چارپائی اور بستر وغیرہ کا بندوبست کردیا تھا۔ میں ہوٹل بند ہوجانے کے بعد اپنی کتابیں پڑھتا رہتا۔ میری انگریزی اور اردو بہت اچھی ہوگئی تھی۔

اس طرح مجھے اس ہوٹل میں کام کرتے اور رہتے ہوئے پانچ برس بیت گئے۔ جی جناب۔ پورے پانچ برس۔ اس دوران میں میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

میں اب جوان ہوگیا تھا لیکن زمین پر میرے پاؤں نہیں تھے۔ میں ہوا میں معلق تھا۔ کوئی زندگی نہیں تھی میری۔ کچھ بھی نہیں تھا میرے پاس۔ سوائے تلخ ماضی کے اور بدحالی کے۔ جبکہ میرا کوئی مستقبل نہیں تھا۔

ایک دن مجھے ایک دفتر میں کام کرنے کی آفر مل گئی۔ یہ آفر اس ہوٹل میں آنے والے ایک کسٹمر نے دی تھی۔ وہ مجھے اکثر دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی ہم ایک دوسرے سے باتیں کرلیا کرتے تھے۔

وہ مجھ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے دفتر میں ایک جگہ خالی ہے۔ میں اپنی اپلی کیشن لے کر اس کے دفتر پہنچ جاؤں۔ بہت ممکن ہے کہ دفتر میں ملازمت کے بعد میری زندگی کا نیا دور شروع ہوجائے۔

میں دوسرے دن اس کے بتائے ہوئے دفتر پہنچ گیا۔ ہوٹل کے شریف مالک نے میری بہت حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس کی مہربانیوں سے میرے پاس کپڑے بھی اچھے ہوتے تھے اور جوتے بھی تھے۔

مجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس شخص کا کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی بیک گراؤنڈ نہیں ہے، والدین نہیں ہیں۔ میں ایک معزز و نجیب کا فرد معلوم ہوتا تھا۔

دفتر میں مجھ سے پوچھا۔ "تمہاری تعلیم کتنی ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے سچ سچ بتادیا۔

"کیا مطلب۔"

"مطلب یہ ہے جناب کہ میں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن شاید بہت سے پڑھے لکھوں سے بہت بہتر ہوں۔"

"دیکھیں جناب۔ یہ دفتر ہے۔ ایک باقاعدہ دفتر۔ اور یہاں اس قسم کی تعلیم نہیں دیکھی جاتی۔ جس تعلیم کا آپ ذکر کررہے ہیں۔"

"جناب مجھے معلوم تھا کہ میں جہاں جاؤں گا۔ مجھ سے اسی قسم کی بات کی جائے گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ سچ ہے۔ آپ چاہیں تو میری قابلیت کا امتحان لے سکتے ہیں۔ اس کے بعد جو آپ کا فیصلہ ہو۔"

"میں چونکہ ایک انوکھا امیدوار تھا۔ اسی لیے وہ سب حیران تھے۔ اتنی دیر میں وہ صاحب بھی آگئے۔ جنہوں نے مجھے یہاں بلایا تھا۔"

انہوں نے مجھے منیجر سے ملوادیا۔ منیجر بھی مجھ سے باتیں کرکے بہت متاثر ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے جناب۔ میں آپ کو اپنے رسک پر اس دفتر میں ملازمت دے رہا ہوں۔ آپ اپنا شناختی کارڈ لے کر آجائیں۔"

"اوخدا یہ میرے لیے ایک اور کڑا امتحان تھا۔ میں اپنا شناختی کارڈ کہاں سے لاتا۔ اس ملک میں شناختی کارڈ تو ان ہی کا بنتا ہے جن کا بیک گراؤنڈ ہوتا ہے۔ میرا تو کوئی بیک گراؤنڈ ہی نہیں ہے۔ بس یہ ہے جناب میری داستان۔ جو کچھ ہوا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔"

"اوہ۔" جہانگیر صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ "بہت دکھ ہوا ہے یہ سب سن کر۔"

"کیا فائدہ جناب۔" میں تلخ ہونے لگا تھا۔ "کون مجھے سمجھے گا، کون مجھے اپنائے گا، کوئی نہیں، خدا بھلا کرے۔ میرے ان ماں باپ کا جو مجھے پیدا کرکے کچرے پر پھینک گئے۔ کیا ضرورت تھی مجھے زندہ رکھنے کی۔ اگر اسی وقت میرا گلا دبادیتے تو شاید میں ان دکھوں سے بچ جاتا جو مجھے دیکھنے پڑے ہیں۔"

"تم بہت باہمت ہو بیٹے۔" جہانگیر صاحب نے کہا۔ "ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ کسی نے تمہاری طرح بقا کی جنگ لڑی ہو۔"

"جہانگیر صاحب۔ آپ میری زندگی کے شاید ان تین چار آدمیوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میری کہانی سن لی ورنہ میں تو کسی کو بتاتا بھی نہیں ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں بتانے کا۔ یہ معاشرہ ظاہر کو دیکھتا ہے بیٹا۔ کسی کو اس بات سے دلچسپی نہیں ہوگی کہ کوئی تمہیں کچرے میں پھینک گیا تھا اور اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں

ہے۔ انہیں دل ہی دل میں تمہارے ناجائز ہونے سے ہوگی۔ وہ تمہیں ایسی نظروں سے دیکھیں گے جیسے تم کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔"

"جی ہاں۔ جانتا ہوں میں۔ اسی لیے میں کسی کو نہیں بتاتا ہوں۔"

"اچھا بیٹا۔ میں تمہیں اپنا ایڈریس سمجھا رہا ہوں۔" جہانگیر صاحب نے کہا۔

"ارے نہیں صاحب۔ اتنی بھی مہربانیاں نہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ پر بھی انگلیاں اٹھنے لگیں۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ اور میں کون سا کسی کو بتانے جا رہا ہوں۔"

انہوں نے اتنی محبت سے اصرار کیا کہ میں نے سوچ لیا کہ ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ ان سے اجازت لے کر میں ہوٹل کی طرف واپس آگیا۔

ابھی تک وہی ہوٹل میرا ٹھکانا تھا۔ اس کا مالک بہت کمزور اور بیمار رہنے لگا تھا۔ مجھ پر اس شخص کے احسانات تھے۔ اس نے اپنے بچے کی طرح میری پرورش کی تھی۔

وہ کبھی میرے راستے کی رکاوٹ نہیں بنا۔ حالانکہ میں اس کے ہوٹل کے لیے بہت مفید ثابت ہوا تھا لیکن جب میں نے کہیں ملازمت کی بات کی تو اس نے فوری طور پر اجازت دے دی۔

میں جب واپس پہنچا تو اس نے میرے چہرے سے اندازہ لگالیا تھا کہ میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ میں اس کے سامنے بیٹھ کر کسی بچے کی طرح رونے لگا تھا۔

"ارے کیا ہوا۔ کیوں بچوں کی طرح رو رہا ہے؟" ہوٹل والے نے پیار سے پوچھا۔

"بابا۔ تم یہ بتاؤ مجھے موت کیوں نہیں آتی۔" میں سسک رہا تھا۔ "میں تو ایک بے نشان آدمی ہوں۔ اگر ایک بے نشان مر بھی گیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

"میں اب کہاں سے اپنے ماں باپ پیدا کروں۔" میں نے کہا۔ شناختی کارڈ بنوانے کے لیے ماں باپ کا ہونا ضروری ہے۔ اور جو ہم جیسے ہوں ان کے لیے اس زمین پر کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے مر جانا چاہیے۔

"اوہ۔" بے چارہ ہوٹل والا بھی خاموش ہو گیا تھا۔ "ہاں بیٹے۔ یہ بات تو ہے۔ لیکن اس ہوٹل میں تو ایسی کوئی بات کسی نے نہیں کی ہوگی نا۔"

"بابا۔ تم نے نہیں کی وہ بات دوسری ہے کیونکہ تم مجھے بچپن سے جانتے ہو۔ مجھے کبھی شناختی کارڈ کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ کیونکہ میں کبھی کسی اسکول میں نہیں گیا۔ کسی کالج کی شکل نہیں دیکھی۔ کبھی بینک میں اکاؤنٹ نہیں کھلوایا۔ کبھی اپنا پاسپورٹ نہیں بنوایا اور کبھی مرا بھی نہیں ہوں کیونکہ ان سب معاملات میں شناختی کارڈ کی ضرورت ہوتی ہے اور جو شناختی کارڈ بنوالیتا ہے۔ اس کے بارے میں کنفرم ہو جاتا ہے کہ اس کی ماں بھی ہوگی۔ باپ بھی ہوگا۔ لیکن میں، میں کہاں سے ماں باپ کو لاؤں۔"

ہوٹل والے مجھے تسلیاں دینے والے انداز میں میرے بالوں پر انگلیاں پھیرتا رہا۔ "میں سب سمجھتا ہوں بیٹے لیکن تم اداس نہ ہو۔ خدا کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا۔"

"خدا بھی ماں باپ والوں کے لیے راستہ نکالتا ہے۔ کچرے پر پڑے ہونے بچے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"نہیں روشن۔ یہ کفر ہے۔ اور پھر تمہیں کس بات کی فکر ہے۔ اگر نوکری نہیں ہے تو نہ سہی۔ یہ ہوٹل تو ہے نا۔ اس میں ہم پیسا لگا کر اس کو خوب ترقی دیں گے۔ تم آرام سے اس ہوٹل کو چلاتے رہنا۔"

"پھر بھی بابا۔ میں اس محرومی کا کیا کروں۔ کیا کروں۔"

اس بے چارے کے پاس میرے اس سوال کا کیا جواب تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ میں دو چار دن بہت اداس رہا۔ پھر آہستہ آہستہ ہوٹل کی مصروفیت نے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

چار پانچ دنوں کے بعد مجھے ان بزرگ کا خیال آگیا جو مجھے ایڈریس سمجھا کر گئے تھے۔ جنہوں نے اپنا نام جہانگیر بتایا تھا۔

وہ بے چارے میرے لیے کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے میری داستان سن لی تھی۔ اتنا ہی بہت تھا۔ پھر بھی دل چاہ رہا تھا کہ میں ان کے پاس جاؤں۔ ان سے ملوں اور میں ان کے پتے پر پہنچ گیا۔

ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ جس کے گیٹ پر پروفیسر جہانگیر کی تختی لگی ہوئی تھی۔ یعنی وہ پروفیسر تھے۔ شاید اسی لیے وہ میری باتیں سن رہے تھے۔ مجھ سے ہمدردی کر رہے تھے۔ ان کے علم نے ان کے سینے کو کشادہ کر دیا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ فوراً اندر ڈرائنگ روم میں لے جاکر بٹھایا۔ "ہاں۔ میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔"

"دیکھ لیں جناب۔ آپ کی کشش مجھے کھینچ لائی ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا مسئلہ حل ہوا؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں جناب۔ وہ مسئلہ ایسا ہے کہ شاید کبھی حل نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میری کوئی شناخت نہیں ہے۔ کون مجھے شناخت دے گا۔"

"میں دوں گا۔" جہانگیر صاحب نے کہا۔

"جی۔ آپ" میں نے حیران ہوکر ان کی طرف دیکھا۔ "آپ کیسے دیں گے۔"

"ہاں۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔" جہانگیر صاحب نے کہا۔ "تو کیا میں تمہیں اپنا نام نہیں دے سکتا۔"

"آپ۔ لیکن آپ۔" مجھ سے کچھ کہا نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں ہاں۔ مجھے تم جیسے نوجوان کو اپنا بیٹا بناتے ہوئے فخر ہوگا۔"

"لیکن جناب یہ تو دیکھیں کہ اس معاشرے میں میری کیا حیثیت ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ بھی نہیں۔ میں کچھ گھٹیا لوگوں کی گناہوں کی تخلیق ہوں۔ کچرے میں سے اٹھایا ہوا کوئی غلیظ جسم۔ نہیں صاحب۔ آپ ایک معزز اور شریف آدمی ہیں۔ میں اپنی زندگی کا داغ آپ کے دامن پر نہیں لگا سکتا۔"

"یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔" جہانگیر صاحب نے کہا۔ "تم میں اور دوسروں میں فرق ہی کیا ہے۔ تمہاری بھی دو آنکھیں ہیں، دو ہاتھ ہیں، دو پیر ہیں، بس بات ختم ہوگئی، تم ذہین ہو شریف ہو۔"

"لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ مجھ میں کیسا گندہ خون دوڑ رہا ہے۔"

"کوئی خون گندہ نہیں ہوتا بیٹا۔ خون تو وہی ہوتا ہے، سرخ۔ گندگی تو فطرت ہوتی ہے۔ تمہاری فطرت میں دیکھ چکا ہوں۔ تم ایک اعلیٰ فطرت کے انسان ہو اسی لیے میں تم سے ایسی بات کر رہا ہوں۔"

"لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ یہ سب کیسے ممکن ہے۔ کون اس بات پر یقین کرے گا۔"

"یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ بہت پہلے میرا ایک بیٹا انتقال کر چکا ہے۔ تم اس کی جگہ لینے آگئے ہو۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

جہانگیر صاحب نے آواز دی۔ "رضیہ آجاؤ۔ تم کو بیٹے سے ملوا دوں۔"

ایک باوقار بزرگ خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔

جہانگیر صاحب نے مجھ سے کہا۔ "روشن۔ یہ تمہاری والدہ ہیں۔ ماں ہیں تمہاری۔"

"ماں۔" میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں بری طرح رو رہا تھا۔ اور میرے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی رو رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار میں کسی کے گھر میں بیٹھا تھا۔ گھر کا ماحول ملا تھا۔ پہلی بار کسی نے کہا تھا کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ پہلی بار کوئی باپ بن کر پیار بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

یہ سب کچھ پہلی بار ہوا تھا۔

اس کے بعد تو آسانیاں ہوتی گئیں۔ میں جہانگیر صاحب کے یہاں شفٹ ہوگیا کیونکہ اب میں ان کا بیٹا تھا۔ وہ ایک وسیع حلقے میں جانے جاتے تھے۔ ان کی کوششوں سے میرا ب فارم بنا۔ کئی اور دستاویز میرے ہاتھ میں آگئیں۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرا شناختی کارڈ بن گیا۔

اس کے بن جانے کے بعد میری شناخت ہوگئی۔ میرا بھی اب ایک بیک گراؤنڈ تھا۔ ایک خاندان تھا۔ اس کے بعد یہ بھی طے ہوگیا کہ میرا مذہب کیا ہے۔ میرا مسلک کیا ہے۔

اب میں جہانگیر صاحب کے یہاں ایک پُرسکون زندگی گزار رہا ہوں لیکن کیا اس معاشرے سے مجھے پوچھنے کا حق نہیں ہے کہ جب کوئی مجھ جیسا ہو تو وہ اپنی شناخت کے لیے کیا کرے۔ وہ اپنے والدین کہاں سے لائے۔"

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایسے شخص کے خانوں میں والدین کی جگہ ریاست یا حکومت کا نام لکھ دیا جائے اور اس نام کو قبول کرلیا جائے۔ اس کے بعد اسے معاشرے میں وہی اہمیت دے دی جائے جو دوسروں کو دی جاتی ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس سے کتنا فائدہ ہوگا۔

یہاں جتنے بھی دہشت گردی کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کی کوئی شناخت نہیں ہوتی کیونکہ وہ سب مجھ جیسے ہوتے ہیں اور انہیں آسانی کے ساتھ کسی بھی راستے پر لگایا جاسکتا ہے۔"

محترم ایڈیٹر

میں نے کئی بار پڑھا کہ آپ کے ہاں نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اس بات نے مجھے تحریک دی اور میں نے ایک اہم مگر عجیب و غریب شخصیت کے حالات لکھ ڈالے۔ یقین کریں اس کے اس عجیب و غریب کاروبار پر پہلے مجھے یقین نہیں آیا تھا مگر آنکھوں دیکھی بات کو جھٹلا نہیں سکتا۔

محمد وسیم خان
(کراچی)

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اداس رہنا یا ہونا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

عارف خان بھی ایسے ہی آدمی تھے۔ اداسی ان کا ٹریڈ مارک بن کر رہ گئی تھی۔ جب ان سے جان پہچان کی ابتداء ہوئی تھی اس وقت بھی وہ بہت اداس تھے۔

میں اس محلے میں نیا نیا آیا تھا۔ اس لیے میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ محلے میں ایک ریسٹوران تھا۔ انتہائی خستہ سا، جس کا نام اس کے ستم ظریف مالک نے عالی شان رکھا

تھا۔ عالی شان ہوٹل۔

جب کہ وہ ہرگز عالی شان نہیں تھا۔ بلکہ اس کی حالت انتہائی گئی گزری تھی۔ میں اس ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا۔ اتفاق سے جس میز پر جگہ ملی اس کے سامنے والی کرسی پر عارف خان بیٹھے تھے۔

ایک اداس سا شخص جس کے سامنے نہ جانے کب سے چائے کی پیالی رکھی ہوئی ہو گی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا، گہری سانس لیتا پھر خلا میں تکنے لگتا۔

یقیناً اس کے ساتھ کوئی بہت بڑی ٹریجڈی ہوئی ہو گی۔ شاید کسی عزیز کی موت وغیرہ۔ ایسی مکمل اداسی اسی صورت میں آتی ہے۔

میں کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر جب برداشت نہیں ہوا تو میں نے دریافت کیا۔ "جناب! خیر تو ہے نا؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک غم زدہ سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "جی...... جی ہاں سب ٹھیک ہے...... سب ٹھیک ہے۔"

"آپ شاید اسی محلے میں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی...... جی ہاں اور آپ؟"

"میں آج ہی شفٹ ہوا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "وسیم نام ہے میرا۔"

"اچھا سمجھ گیا آج صبح ٹرک سے جو سامان اتارا جا رہا تھا وہ آپ کا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے اپنی گردن ہلائی۔

"میرا نام عارف ہے۔ عارف خان۔ آپ کے مکان سے آگے آٹھواں مکان ہے میرا۔"

"عارف صاحب اب تو میں آپ کا پڑوسی ہو گیا ہوں، اس لیے اگر مناسب سمجھیں تو بتا دیں شاید میں آپ کے کسی کام آسکوں۔"

"کیا بتاؤں بھائی۔" اس نے پھر ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ "جس دکھ میں، میں رہتا ہوں۔ پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں۔ ایسا لگتا ہے انسان صرف رونے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے۔"

"خدا خیر کرے عارف صاحب، آپ بتائیں آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"ارے بھائی اریزبا میں ایک بس کھائی میں جا گری۔ پندرہ آدمی اس حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔"

"ارے یہ تو برا ہوا۔ تو آپ کا کوئی عزیز اس میں ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"کیسی بات کرتے ہیں، میرا کوئی اریزبا کیوں جانے لگا۔"

"تو پھر آپ کی یہ اداسی...... یہ سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ ارے بھائی وہ انسان تھے جیتے جاگتے انسان جو ذرا سی دیر میں موت کی بے رحم آغوش میں چلے گئے۔ کیا ضروری ہے کہ اپنے کسی عزیز رشتے دار کی موت پر ہی رویا جائے؟ انسان تو انسان ہوتا ہے جسے ایک دوسرے کا درد سمجھنا چاہیے۔"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے اس کی تائید میں گردن ہلا دی۔ وہ مجھے ایک دل چسپ کردار محسوس ہوا تھا۔ ایسے کردار بھی بہت کم ہی ہوتے ہوں گے۔

"جناب! کیا آپ یقین کریں گے کہ میں پچھلے ہفتے دو دنوں تک بھوکا رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"اریزبا والوں کے لیے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے نہیں بھائی۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"اریزبا کا حادثہ تو کل کا ہے۔"

"تو پچھلے ہفتے کیا ہوا تھا؟"

"ارے بھائی! میکسیکو میں ایک نوجوان جہاز اڑاتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔" اس نے بتایا۔ پھر ایک گہری سانس لی۔ "نہ جانے اس کے گھر والوں پر کیا قیامت گزری ہو گی۔ انہوں نے اس کے لیے کیسے کیسے خواب دیکھ رکھے ہوں گے لیکن موت نے سارے خواب چکنا چور کر دیے۔"

"ایک بات بتائیں، آپ کی زندگی تو بہت عذاب والی ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ اس طرح تو دنیا کے ہر حصے میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی حادثہ تو ہوتا ہی رہتا ہے اور آپ ہر حادثے کے بعد اسی طرح اداس ہو جاتے ہوں گے۔"

"ہاں بھائی یہ بات تو ہے۔" اس نے پھر ایک گہری سانس لی۔ "میری تو ساری زندگی اسی میں گزر گئی ہے۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو بے حس بنا لوں لیکن یہ ہوتا ہی نہیں ہے،

بس جہاں کوئی خبر سنی اور دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔"

واقعی بہت دل چسپ کیس تھا۔ "آپ ایسا کریں اخبار پڑھنا اور ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیں۔" میں نے مشورہ دیا۔ "اس طرح خبریں سن سن کر آپ ہلکان نہیں ہوں گے؟"

"بھائی صاحب میں یہ بھی کر کے دیکھ چکا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کہیں نہ کہیں سے ایسی کوئی نہ کوئی خبر مل ہی جاتی ہے پھر میرا حال برا ہو جاتا ہے۔ خیر چھوڑیں میں بھی کہاں کی داستان لے کر بیٹھ گیا۔ میں نے آپ کے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔ آپ کے بیوی اور بچے؟"

"جی نہیں، دو سال پہلے میری اہلیہ کا انتقال ہوا ہے۔" میں نے بتایا۔ "بچہ کوئی نہیں ہے۔"

"اوہو! کیسے انتقال ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"بس صاحب ہیپا ٹائٹس ان کی موت کا سبب بن گیا تھا۔" میں نے بتایا۔

"ارے یہ کیا خبر سنا دی آپ نے۔" وہ اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ "ارے صاحب! ابھی تو خود آپ کی بھی عمر زیادہ نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کی مرحومہ بھی جوان ہی ہوں گی۔ ہائے ہائے ایسی جوان موت...... خدا کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ ارے! کیا کروں میں۔" اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

میرا یہ حال تھا کہ ایک سکتے کے عالم میں اس کو دیکھے جا رہا تھا۔ جس قدر وہ واویلا کر رہا تھا اور جس انداز سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اتنا تو اپنی بیوی کی موت پر خود میں بھی نہیں رویا ہوں گا۔ کیسی مضحکہ خیز پوزیشن تھی کہ میں خود اسے چپ کرا رہا تھا۔

"ارے صاحب بس اب چپ بھی ہو جائیں۔ خدا کی یہی مصلحت تھی۔ جانے والوں کو کون روک سکتا ہے بس اس کی مغفرت کی دعائیں کریں۔"

"نہیں بھائی صاحب نہیں، صبر نہیں آ رہا۔ کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ ہائے اتنی جوان موت۔ یا خدا ان کی بیوی کی جگہ خود میں کیوں نہیں مر گیا! ارے کیا میں یہی دیکھنے کے لیے زندہ ہوں۔"

عجب معقول آدمی تھا کم بخت۔ اس پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ میری بیوی کی موت پر وہ اتنا شور مچانے والا کون ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ایسی نازک پوزیشن کسی مرحومہ کے شوہر کی نہیں ہوئی ہوگی جتنی میری ہو گئی تھی۔ اس نے تو مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

بڑی مشکل سے وہ چپ ہوا تو میری جان میں جان آئی۔ پھر میری طرف دیکھ کر شرمندہ سی مسکراہٹ سے بولا۔

"معاف کرنا بھائی۔ لیکن میں کیا کروں، میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔ کسی کے مرنے کی خبر سن ہی نہیں سکتا، جگر چھلنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے خود کشی کر لوں۔"

"میرا ایک مشورہ مانیں گے۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں اگر ماننے والی بات ہوئی تو کیوں نہیں مانوں گا۔"

"میرا مشورہ ہے کہ آپ کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھائیں۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟" وہ برا مان گیا تھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے کہ میں پاگل ہوں جو انسان کے غم میں آنسو بہاتا رہتا ہوں۔ آپ کیوں انسانیت کا پیار چھین لینا چاہتے ہیں۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی آپ لوگوں کی طرح پتھر دل اور بے رحم ہو جاؤں۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔ انسان کے لیے دکھی ہونا تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن آپ کا یہ دکھ ابنارمل سا ہو جاتا ہے۔ اتنا اوور ہونا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح خود آپ کی صحت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"واہ صاحب واہ، کمال کرتے ہیں آپ بھی۔" اس نے کہا۔ "ارے کوئی کسی کے غم میں رو کے تو دکھائے، پوری دنیا خوشی کی ساتھی ہوتی ہے، آنسوؤں کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ خدا نے شاید اسی لیے مجھے پیدا کیا ہے۔ یہ میرا فرض ہے۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنے دیں۔"

اس پاگل کو سمجھانا بے کار ہی تھا۔ اس لیے میں خاموش ہو گیا۔

اس کے بعد بھی محلے میں اکثر اس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ویسے وہ بہت نیک اور گرم جوشی سے ملتا تھا لیکن اب اس کا کیا علاج کہ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ لگا رہتا تھا۔

ایک بار میں نے اس سے دریافت کیا۔ "جناب! آپ کام کیا کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جاب وغیرہ۔"

"ہاں بھائی! ایک جگہ جاب تھی میری لیکن صاحب کے بچوں کی وجہ سے ختم ہو گئی۔" اس نے بتایا۔

جراجمہ

جرموم شہر کے باشندے جو عربوں اور بزنطینیوں کے سرحدی علاقے میں آباد تھے۔ انہوں نے اسلام کے ابتدائی دور میں عربوں اور بزنطینیوں کی باہمی جنگوں میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بزنطینی مورخ انہیں مادریہ کا نام دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ مذہباً عیسائی تھے لیکن مذہب کے معاملے میں ان کا رویہ سرد مہرانہ تھا۔ عربوں نے جب انطاکیہ فتح کیا تو جراجمہ پر بھی چڑھائی کرنے کے لیے انہوں نے ایک دستہ زیر قیادت حبیب بن مسلمہ الفہری روانہ کیا۔ بقول البلاذری اور ابن الاثیر جراجمہ عربوں کے لیے ہراول اور جاسوسی کی خدمات بجالانے کے لیے رضامند ہوگئے۔ نیز یہ کہ وہ جبل اللکام کے دور کی پاسبانی کریں گے اور عربوں کے ساتھ ان چھوٹے قلعوں کی محافظ فوجوں میں بھی بھرتی ہوں گے جو شام کو آنے والے اور شام سے باہر جانے والے راستوں کے محافظ تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو جزیے سے مستثنیٰ کردیا گیا اور انہیں یہ بھی حق دیا گیا کہ اگر وہ جنگی معرکوں میں حصہ لیں گے تو انہیں مال غنیمت سے بھی حصہ دیا جائے گا لیکن ان لوگوں کی وفاداری مشکوک تھی وہ عربوں کو دغا دینے میں کبھی بھی نہیں چوکتے تھے۔ بقول تھیوفینیز امیر معاویہؓ کے عہد میں قیصر قسطنطین نے جراجمہ کو شام کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ چنانچہ جراجمہ کے فوجی دستوں کی مدد سے یونانی افسروں کی زیر قیادت جبل اسود سے بیت المقدس تک کے درمیانی علاقے پر قبضہ جمالیا۔ نیز لبنان کے خطے کے سادے پہاڑوں پر اپنا اقتدار قائم کرلیا بہت سے بھاگے ہوئے یونانی الاصل غلام بھی جراجمہ کے ساتھ آملے اور کچھ کوہستانی اضلاع کے باشندے بھی ان کے ساتھ

''صومالیہ کے بچے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''ان سے آپ کا کیا تعلق؟''

''یہ لیں آپ کو معلوم ہی نہیں ہے کہ صومالیہ کے بچوں پر کیا قیامت ٹوٹی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''مفلسی اور بھوک نے انہیں موت تک پہنچا دیا تھا۔ کاش آپ ان کی ویڈیو دیکھ لیتے۔ جسم پر گوشت نام کی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔ ان کی کھال ان کی ہڈیوں سے چپک گئی تھی۔''

''جی ہاں یہ سب تو میں دیکھ چکا ہوں لیکن آپ کی جاب کا ان سے کیا تعلق؟''

''بس جناب کیا بتاؤں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں ان بچوں کے غم میں ہر وقت روتا رہتا تھا۔ دفتر تو ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا اس کے بعد ان بچوں کے غم میں رونا شروع کردیتا۔''

''اور انجام یہ ہوا کہ آپ کو اس چکر میں دفتر سے نکال دیا گیا۔'' میں نے کہا۔

''جی ہاں۔'' وہ کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔ ''اب کیا کروں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔''

میں نے محلے کے کچھ اور آدمیوں سے بھی اس کے بارے میں کچھ ایسا ہی سنا۔ ''ارے بھائی میں نے تو اتنا مخلص ہمدرد انسان اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔'' ایک نے بتایا۔

''کیوں جناب آپ نے کیا خوبی دیکھ لی؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے بھائی کیا بتاؤں۔ ایک بار اس کے سامنے میں نے اتفاق سے اپنے ایک پھوپا کی موت کا تذکرہ کردیا تھا بس اس کے بعد اس نے میرے پھوپا کے غم میں جب رونا شروع کیا تو اسے چپ کرانا مشکل ہوگیا۔ خود پھوپا کے ماں باپ اور بھائی بہن بھی ہکا بکا رہ گئے تھے۔''

''کمال کا آدمی ہے۔'' مجھے وہ وقت یاد آگیا جب وہ میری بیوی کا ذکر سن کر رو دیا تھا۔

یا تو وہ ذہنی مریض تھا یا پھر واقعی اس کا دل اتنا گداز، اتنا نرم اور اتنا حساس تھا کہ کسی کی خبر سن کر بھی بے چین ہو جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پوری دنیا میں وہ اپنی مثال آپ ہی ہوگا۔

اس قسم کا ایک تجربہ ایک بار پھر ہوا۔

میں جلدی جلدی گھر سے نکل کر دکان کی طرف جا رہا تھا۔ گھر میں کچھ مہمان آگئے تھے اور چائے بناتے وقت پتا

ہو گئے۔ چنانچہ اس خطرناک صورت حال کو روکنے کے لیے امیر معاویہؓ نے قیصر سے گفت و شنید کی اور دونوں کے درمیان ایک صلح نامہ طے پایا جس کے مطابق انہوں نے سالانہ خراج 3000 سونے کے سکے 8000 قیدیوں کی رہائی اور 50 اصیل گھوڑے دینے کی شرط قبول کرلی۔ قیصر نے یہ وعدہ کیا کہ وہ جراجمہ کا ساتھ چھوڑ دے گا اور انہیں آدمی، ہتھیار اور رسد غرض کسی شکل میں مدد نہ پہنچائے گا۔ بعد میں اس گروہ کو امیر معاویہؓ کے ہاتھوں کچھ نقصان بھی پہنچا اور 49ھ/669ء یا 50ھ/670ء میں انطاکیہ اور آگے شمال کی طرف خاص جراجمہ کے علاقے میں نط (جاٹ) بسا دیے گئے۔ جب خلیفہ عبدالملک 69-30ھ/689-688ء میں عبداللہ ابن زبیرؓ سے برسرِ پیکار تھا نیز اس کے ساتھ ہی عمرو بن سعید اشدق کی بغاوت فرو کرنے میں بھی منہمک تھا جس کو خود اس نے دمشق کا عامل بنایا تھا۔ قیصر جسٹینین دوم نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے جراجمہ کو شام پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس لشکر کے ساتھ جراجمہ کے علاوہ مقامی کسانوں اور بھاگے غلاموں کی بھی ایک بڑی تعداد آملی۔ چنانچہ اس مہم جو قوم کے حملے ختم کرنے کے لیے خلیفہ کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے پڑے اور اس کا ذمہ لیا کہ انہیں ہر ہفتے ایک ہزار دینار ادا کیے جائیں گے۔ اس کے بعد خلیفہ نے قیصر سے انہی شرائط پر صلح کی جن پر امیر معاویہؓ نے قیصر سے اس وقت کی تھی جب وہ اہلِ عراق کے ساتھ جنگ میں مصروف تھے لیکن جلد ہی قیصر نے اپنے مطالبوں میں اضافہ کردیا اور خلیفہ نے بامر مجبوری قبرص، ارمینیا اور آئبیریا کا آدھا خراج قیصر کو دینا منظور کیا۔ چنانچہ قیصر نے 12 ہزار جراجمہ کو واپس بلا لیا جو بزنطی علاقے میں آباد ہو گئے۔

مرسلہ: سہیل اصغر۔ لاہور

چلا کر چیخنے ختم ہو گئی ہے۔

میں چیخنی ہی لیے جا رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ گلی میں عام طور پر اندھیرا رہتا تھا اس وقت بھی اندھیرا تھا۔ جب میں نے ایک بند کیبن کی آڑ میں کسی کے رونے کی آواز سنی۔ کوئی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور ساتھ ہی ہلکی ہلکی آواز میں واویلا کرتا جا رہا تھا۔

ہائے تم بھی چلے گئے۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم زیادہ دنوں تک ساتھ نہیں دو گے، چھوڑ جاؤ گے مجھے۔ تم کو میرا ذرا بھی خیال نہیں رہا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہارے بعد میرا کیا ہوگا۔

میں ٹھٹک گیا۔ آواز عارف خان کی تھی۔

میں کیبن کے پاس پہنچ گیا۔ وہ عارف خان ہی تھا جو لکڑی کے کیبن کی دیوار کا سہارا لیے روئے جا رہا تھا۔ اس طرف چونکہ اندھیرا تھا اس لیے وہ پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیا تھا۔

”ارے کیا ہوا عارف صاحب؟“ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ ”خیریت تو ہے؟ اس طرح یہاں چھپ کر کیوں رو رہے ہیں؟“

”بس جناب! میری قسمت میں آنسو ہی رہ گئے ہیں۔“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔

”کچھ پتا تو چلے کیا ہوا؟“

”اس دفعہ میرے خاندان کا میرے گھرانے کا نقصان ہوا ہے بھائی صاحب۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”او تو کوئی ذاتی دکھ پہنچا ہے۔“

”جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ اب وہ کیبن کی آڑ سے باہر نکل آیا تھا۔

”چلیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو بتا دیں۔“

”میرے دادا حضور تھے۔“ اس نے بتانا شروع کیا۔

”اوہ! تو آپ کے دادا حضور انتقال کر گئے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ارے نہیں بھائی۔ ان کے انتقال کو تو تین برس ہو گئے۔“ اس نے بتایا۔

”تو پھر اب کیا ہوا ہے۔“

”میرے دادا حضور اپنی جوانی کے زمانے میں ایک بار تاشقند جا چکے ہیں۔“

”تو پھر؟“

''آپ نے خبریں نہیں سنیں۔ تاشقند میں زلزلہ آیا ہے، بہت سے لوگ مر گئے۔''

جی چاہا کہ اب اس کا گلا ہی گھونٹ دوں۔ پھر بھی خود پر ضبط کر کے پوچھ لیا۔ ''عارف صاحب! تاشقند کے زلزلے سے آپ کا اور آپ کے مرحوم دادا کا کیا تعلق؟''

''کمال کرتے ہیں آپ۔ اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔'' وہ باقاعدہ برا مان گیا تھا۔ ''دیکھیں، دادا حضور ایک بار تاشقند جاچکے تھے تو وہاں سے ان کی یادیں بھی وابستہ ہوں گی۔ اب عالم ارواح میں جب دادا حضور نے زلزلے کی خبر سنی ہوگی تو ان کی روح کو کتنا دکھ ہوا ہوگا۔ وہ اس وقت کتنی بے چین ہوگی۔ بس اس کی بے چینی محسوس کر کے رو رہا ہوں۔''

چونکہ ایسے پاگل پنے کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اس لیے میں اس پر لعنت بھیج کر آگے بڑھ گیا۔ کم بخت نے بدمزہ کر دی تھی۔ بہرحال جب میں چھٹی لے کر گھر پہنچا تو اس وقت تک سبحان بور ہو کر جاچکے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ عارف خان محلے سے غائب ہوگیا۔

یعنی وہ کئی دنوں تک دکھائی نہیں دیا۔ میں نے جب ایک دو آدمیوں سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ عارف خان مکان چھوڑ کر کہیں جاچکا ہے۔

اس وقت مجھے پتا چلا کہ اس کا مکان کرائے کا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور وہ اپنے مکان میں اکیلا ہی رہتا تھا۔

خدا جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ویسے وہ ایک منفرد کردار تھا۔ اپنی نوعیت کا ایک۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے مشہور شاعر میر تقی میر اس کو دیکھ لیتے تو رونے کے معاملے میں اس کو اپنا استاد مان لیتے۔ کیونکہ اردو شاعری میں میر صاحب کا رونا دھونا بہت مشہور ہے لیکن میر صاحب تو غم جاناں یا خود اپنی ذات کے لیے رویا کرتے تھے جب کہ یہ کم بخت تو پوری دنیا کے لیے روتا ہے۔ بے چارے میر صاحب اس کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔

بہرحال میں اس سے مایوس ہوگیا تھا کہ شاید وہ اب نہیں ملے گا تو ایک دن اچانک راہ چلتے ملاقات ہوگئی۔ راہ چلتے کا مطلب یہ ہے کہ میں اسٹاپ کی طرف جارہا تھا اور وہ ایک شاندار سی گاڑی میں تھا جب وہ گاڑی اچانک میرے پاس آکر رکی تو میں اسے دیکھ کر حیران ہی رہ گیا تھا۔ وہ گاڑی خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔

''ارے وسیم صاحب۔'' اس نے مجھے آواز دی۔

میں اس کی آواز سن کر رک گیا۔ ''عارف صاحب آپ!''

''کہاں جارہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ اپنے ایک عزیز کی طرف جارہا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''چلیں، پھر کبھی چلے جائیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''آج اتنے دنوں کے بعد تو آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔ آئیں بیٹھ جائیں میں آپ کو اپنا دفتر دکھادوں۔''

میں تو اسے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ اچانک کہاں غائب ہوگیا تھا اور اب تو اس کی گاڑی اور بھی حیران کر رہی تھی اس لیے میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا۔

''عارف صاحب! آپ کہاں غائب ہوگئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''چلیں۔ اطمینان سے چل کر بیٹھتے ہیں۔ پھر آپ کو سب بتادوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہماری ملاقات دو ڈھائی تین سال کے بعد ہو رہی ہے۔''

''جی ہاں۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی دیر سے ہم ساتھ بیٹھے تھے اور اس نے رونے دھونے کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس بالکل ہشاش بشاش تھا۔ اس کی اداسی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ہم گلشن کی ایک بلڈنگ کے پاس آگئے۔

''آجاؤ وسیم صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''اس کی دوسری منزل پر مجھ غریب کا ایک چھوٹا سا دفتر ہے۔''

میری حیرت تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اس کا دفتر تو چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی سلیقے سے ڈیکوریٹ کیا ہوا تھا۔ دو عدد کمپیوٹرز پر کام بھی ہو رہا تھا۔ ایک کمپیوٹر کو ایک لڑکی آپریٹ کر رہی تھی اور دوسرے کو ایک ادھیڑ عمر مرد۔

ہم جب اس دفتر میں داخل ہوئے تو وہ دونوں ہمیں دیکھ کر احتراماً کھڑے ہوگئے۔ ایک طرف شیشے کا ایک کیبن تھا۔ عارف اس کیبن میں بیٹھا کرتا تھا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ اس کیبن میں لے آیا۔ ''تشریف رکھیں وسیم صاحب۔'' اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود میز کی دوسری طرف کی مرکزی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اب یہ بتائیں چائے چلے گی یا کافی؟'' اس نے

پوچھا۔

"پہلے تو بھائی میری حیرت دور کریں کہ یہ سب کیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی دور ہو جائے گی۔" وہ ہنس پڑا۔ "چائے یا کافی کے بعد۔"

"تو پھر چائے منگوالیں۔"

چائے پینے کے دوران میں خاموشی رہی۔ وہ تو شاید کچھ اور سوچ رہا ہو لیکن میں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہے۔

چائے پینے کے بعد اس نے انٹرکام پر کسی کو آنے کے لیے کہا۔ میں چپ چاپ دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی ایک رجسٹر لیے داخل ہوئی جس کو میں کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

"بیٹھ جاؤ ثریا۔" عارف خان نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سامنے بیٹھ گئی۔

"ہاں اب بتاؤ۔ آج کی کیا رپورٹ ہے؟" عارف خان نے پوچھا۔

"دو جگہ جانا ہے سر۔" لڑکی نے رجسٹر دیکھ کر بتایا۔ "عصر کی نماز کے بعد۔ ایک واسع صاحب ہیں ان کا انتقال ہوا ہے۔ ان کے دو بیٹے ہیں دونوں الگ الگ کاروبار کرتے ہیں۔ ایک بیٹی ہے جس کی شادی ایک انکم ٹیکس آفیسر سے ہوئی ہے۔"

"گڈ۔" وہ مسکرا دیا۔ "اور مرنے والے کو کیا تکلیف تھی۔"

"ان کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ چار دن کارڈیو ویسکولر میں تھے۔ انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کراچی کے پرائیوٹ اسکول میں حاصل کی۔ پھر نیشنل کالج سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد انگلینڈ چلے گئے۔ چار سال وہاں رہے۔"

"اور واسع صاحب کے والدین!"

"جی سر۔ ان کے والد میرٹھ روڈ پر ایک ریسٹورنٹ چلاتے تھے۔ جس کا نام مون لائٹ تھا۔ ان کی ماں ایک سوشل ورکر تھیں۔ شہناز نام تھا ان کا۔"

"کیا وہ دونوں ہیں؟"

"نہیں ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔"

"بس اتنا بہت ہے۔" عارف خان نے کہا۔

"آپ خود جائیں گے سر۔ یا کسی اور کو بھیجیں گے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"نہیں میں خود جاؤں گا۔" عارف خان نے کہا۔ "اور ساجد کا کیا ہوا؟"

"اس کو فارغ کر دیا ہے سر۔" لڑکی نے بتایا۔

"اس کم بخت کو تو شوٹ کر دینا چاہیے۔" عارف غصے سے بولا۔ "اس کی وجہ سے پورے تین ہزار کا نقصان ہوا ہے۔ اس کو روتے روتے اچانک ہنس پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"پتا نہیں سر اس نے ایسا کیوں کیا۔" لڑکی نے کہا۔

"اس کی حماقت کی وجہ سے وہ پارٹی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اب وہ ہمیں کبھی نہیں بلائیں گے۔"

میں تو حیران ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ نہ جانے یہ سب کیا تھا۔

بہرحال جب وہ لڑکی اس کے کمرے سے باہر چلی گئی تو میں نے دریافت کیا۔ "عارف صاحب! یہ سب کیا سلسلہ ہے؟ آپ کا کاروبار کیا ہے؟ کاؤنٹس ڈاؤن ہوتے ہیں؟"

"ارے بھائی اب آپ سے کیا چھپانا۔" وہ ہنس پڑا۔ "ارے بھائی اپنے دل کا احساس ہوا میرا کاروبار بن گیا ہے۔"

"کیا مطلب!"

بھائی ایک بار ایک مارکیٹ کے باہر اچانک مجھے سائبیریا کے ان دو نوجوانوں کی یاد آ گئی جو برف کے تودے میں دب کر مر گئے تھے۔ بس پھر کیا تھا میں نے وہیں رونا شروع کر دیا۔ اس دوران میں اچانک ایک صاحب میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ بہت ہی معقول صورت کے، قیمتی لباس میں۔ انہوں نے پوچھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا۔ اس پر انہوں نے پوچھا۔ "ایک بات بتائیں کیا آپ ہر کسی کے لیے رو سکتے ہیں یا صرف انٹرنیشنل معاملات پر روتے ہیں۔"

"نہیں جناب! میں تو لوکل معاملات پر بھی روتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھے کسی کی موت کی خبر سنا دیں۔ پھر میرا رونا دھونا خود ہی دیکھ لیجیے گا۔"

"ویری گڈ۔" اس نے کہا۔ "پرسوں میرے ڈیڈ کا انتقال ہوا ہے۔ آج ان کا سوئم ہے۔ کیا آپ ان کے لیے رو سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں، یہ دیکھیں شروع ہو رہا ہوں۔"

"نہیں...... نہیں یہاں نہیں۔ میری کوٹھی چل کر۔ وہاں بہت سے مہمان ہوں گے بس ان کے سامنے شروع ہو جایئے گا۔ آپ کو پانچ ہزار روپے دوں گا۔"

"آپ اپنے ڈیڈی کی موت پر خود کیوں نہیں روتے؟" میں نے پوچھا۔

"کیسی بات کرتے ہیں۔" وہ برا مان گیا تھا۔ "میرے گھر پر ملٹی نیشنل کمپنیز کے مالکان آئیں گے۔ بڑے بڑے آفیسرز اور وزرا ہوں گے۔ ان کے سامنے میرا رونا دھونا میری ڈگنیٹی کے خلاف ہوگا۔ ہمارے طبقے میں لوگ رویا نہیں کرتے بلکہ زیادہ سے زیادہ اتنا ہوتا ہے کہ ایک منٹ کے لیے سر جھکا کر خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ رونا دھونا لوئر کلاس کے لوگوں کا کام ہے۔"

"بس بھائی جان وہ دن ہے اور آج کا دن یہی میرا کاروبار بن گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "دور دور سے ڈیمانڈ آتی ہے اور اب تو میں نے سات آٹھ آدمیوں کی ایک ٹیم بھی بنائی ہے۔"

"کیسی ٹیم؟"

"یہی رونے والوں کی۔" اس نے کہا۔ "ہوتا یہ ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی وقت میں تین چار بکنگ آجاتی ہیں تو کہیں خود چلا جاتا ہوں کہیں ٹیم کے دوسرے لوگ چلے جاتے ہیں۔"

"او خدا! اب سمجھا۔" میں نے حیرت زدہ انداز میں ایک گہری سانس لی۔ "اور خان صاحب یہ بتائیں آپ کا معاوضہ کتنا ہوتا ہے۔"

"یہ تو سیشن کے لحاظ سے ہوتا ہے۔" اس نے بتایا۔

"سیشن کیا؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھیں کوئی پارٹی تو صرف موت کے دن کے لیے ہائر کرتی ہے۔" اس نے بتایا۔ "اس کے پچیس ہزار ہیں۔ کوئی موت کا دن اور کچھ دنوں کے لیے ہائر کرتے ہیں اس کے لیے دس ہزار کی رعایت دے دیتا ہوں۔ یعنی چالیس ہزار اور بعض پورا پیکج کرتے ہیں۔"

"اور یہ پورا پیکج کیا ہوتا ہے؟"

"اس میں موت کا دن، سوئم، دسواں اور چالیسواں تک شامل ہوتا ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ "بس یہ سمجھ لیں کہ اسٹاف وغیرہ کو دے کر بھی مہینے کے دو ڈھائی لاکھ بچ جاتے ہیں۔"

"یہ تو اچھی خاصی رقم ہے لیکن یہ سب ہوتا کیسے ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ نے اچانک جا کر رونا دھونا شروع کر دیا تو کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کون ہیں، کیا ہیں؟ مرنے والے سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟"

"اس کے لیے تو مرنے والے یا والی کی پوری انفارمیشن مجھے پہلے دے دی جاتی ہے۔" اس نے بتایا۔ "کہاں کام کرتا تھا، کتنے بچے تھے، زندگی کہاں گزاری، کون کون سے اسکول اور کالج میں تھا۔ یعنی اس کی زندگی کے سارے پارٹیکولرز میرے پاس آجاتے ہیں اگر کسی نے پوچھ لیا تو ان ہی باتوں کا حوالہ دینا پڑ جاتا ہے۔"

"کمال ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔ "میں نے ایسا بزنس اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔"

"ایک بات بتاؤں، ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ آسان نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "روتے ہوئے جگر کا خون ہو جاتا ہے۔ یہاں تو لوگ اپنے سگوں کی موت پر نہیں رویا کرتے لیکن ہمیں غیروں کے لیے جا کر رونا پڑتا ہے۔"

"واقعی آپ بہت مشکل کام کر رہے ہیں عارف صاحب۔"

"اب آپ مل ہی گئے ہیں تو ذرا خیال رکھیے گا۔" اس نے کہا۔ "اگر کبھی کوئی ایسی پارٹی مل جائے تو فوراً میری طرف بھیج دیں، آپ کا بھی دس پرسنٹ۔"

"نہیں عارف خان صاحب! میرے ارد گرد جو لوگ ہیں وہ اپنے عزیز و اقارب کی موت پر خود ہی رو لیا کرتے ہیں۔ وہ دکھوں اور آنسوؤں کو باہر سے امپورٹ نہیں کرتے جو بھی ہوتا ہے وہ ان کے اندر ہی ہوتا ہے۔"

میں عارف خان سے اجازت لے کر اس کے دفتر سے باہر آگیا۔

(نوٹ: ہو سکتا ہے کہ یہ سارا پلاٹ آپ کو غیر حقیقی محسوس ہو اسے آپ تخیلی کہانی سمجھیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ ذرا اردگرد اپنے معاشرے کو دیکھیں۔ اس مصروف ترین دور میں کون کس کے لیے آنسو بہاتا ہے۔ جس معاشرے کے افراد اپنے بوڑھے والدین کو اولڈ ہومز میں داخل کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے بھول جاتے ہیں کیا وہ لوگ ان والدین کی موت پر کرائے پر رونے والے نہیں منگواتے ہوں گے؟ آپ خود دیکھ لیں پھر مجھے شوق سے جھٹلائیں)

ماحول

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
کہنے کو یہ صرف بانیہ کی اغی کا واقعہ ہے مگر اسے آئینہ بنا کر دیکھیں تو یہ آپ کو معاشرے میں بکھری بزاروں اموؤں کا قصہ لگے گا۔ اس طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے ورنہ ہمارا معاشرہ لعنت بن جائے گا۔

خورشید اختر
(لاہور)

”نہیں چاہیے مجھے تیری سکینڈ ہینڈ جوانی۔“ ڈی جے کی تیز آواز پر نغمہ گونج رہا تھا۔ سبھی لطف اندوز ہورہے تھے۔ مہندی ہال کے درمیان میں جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ چاروں طرف کرسیوں پر بیٹھے ہوئے خواتین و حضرات، بچے، کھلکھلاتی ہوئی لڑکیاں جوش و خروش سے تالیاں پیٹ رہی تھیں۔ ماحول انتہائی سحر انگیز تھا۔ درمیان میں میری بارہ سالہ بیٹی بانیہ اور میرا چودہ سالہ بھتیجا سنی اس گانے پر بہت خوب صورت ڈانس کر رہے تھے۔ لوگ انگشت بدنداں

تھے۔ سب جھوم رہے تھے۔ میں نے فخر سے ادھر اُدھر دیکھا۔ سب ہی متوجہ تھے۔ میری پیاری سی بیٹی بانیہ سیاہ رنگ کا شارٹ بلاؤز اور ٹخنے اسکرٹ میں کھلے بال لیے تھرکتی ہوئی پری لگ رہی تھی۔ گانا ختم ہوگیا تھا۔ سنی اور بانیہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے تھے۔ لوگ بے انتہا تعریف کررہے تھے۔ تالیاں بجا رہے تھے اور ونس مور ونس مور کا شور مچا رہے تھے۔ مسکراتے ہوئے بانیہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے بانہوں میں بھرلیا اور ماتھا چوم کر ٹشو پیپر سے اس کا ماتھا صاف کرنے لگی۔ لڑکی والوں کی طرف سے کوئی خاتون میری طرف بڑھیں اور بولیں۔

"آپ کی بیٹی ہے؟"

"جی۔" میں نے فخر سے کہا۔

وہ مسکرا کر بولیں۔ "بہت زبردست ڈانس کرتی ہے۔"

میرے منہ سے نکلا۔ "ماشااللہ۔" مگر مجھے ایسا لگا جیسے وہ طنزیہ ہنسی ہنسی ہوں مگر مجھے کیا، لوگ جل بھی تو جاتے ہیں۔ میں نے فخریہ گردن اکڑائی اور وہ بے چاری جل ہوکر دوسری طرف کو چل دیں۔

آج میرے دیور ندیم کی مہندی تھی۔ خوب صورت اور سب سے منفرد نظر آنا تو ہمارا حق تھا۔ شادی ہی کون سا روز روز ہوتی ہیں۔

میرا نام نبیلہ ہے میرے میکے والے کافی ماڈرن ہیں۔ میری شادی وسیم سے ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ میرے سسرال والے تھوڑے بیک ورڈ ہیں۔ میری ساس نے گھر پر اپنی حکومت قائم رکھنے کی بڑی کوشش کی مگر میں بھی صاحب ہوں ان کی چلنے ہی نہ دی حالانکہ تین بیٹیوں کی اوپر تلے پیدائش کے بعد بھی وسیم میرے ہی قبضے میں رہے اور ساس کی وفات کے بعد تو بس میری ہی حکومت چلنے لگی۔ وسیم گھر سے بالکل لاتعلق ہوگئے۔ مکان ساس کے نام تھا جو اب وسیم اور ندیم کے نام تھا۔ تین بیٹیوں کے بعد احتشام میری گود میں آیا تو میں اور وسیم خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ میں ایک بے حد ذمے دار ماں ہوں۔ سارے خاندان میں میری بے حد تعریف ہوتی ہے۔ میرے میکے والے اکثر میرے بہترین ہونے کی مثالیں دیا کرتے ہیں۔ میں اپنی تینوں بچیوں کو بہت جچتے، اپ ٹو ڈیٹ اور جدید طرز کے کپڑے پہناتی ہوں۔ میری بیٹیاں جہاں جاتی ہیں منفرد دکھائی دیتی ہیں۔

خاص طور پر میری بیٹی بانیہ تو بہت ہی میچور باتیں کرتی ہے۔ میرے اپنے بھائی اقبال اور بہن سعدیہ سے بہت ہم آہنگی ہے۔ ہر ہفتے کی شب... ان دونوں کے بچے میرے گھر ویک اینڈ گزارنے چلے آتے ہیں۔ رات بھر اکٹھے رہنے سے بچوں میں بہت زیادہ انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی ہے۔ میری اپنی سوچ یہ ہے کہ جیسے بڑوں کی اپنے ہم عمروں کے ساتھ دوستی ہونی چاہیے اسی طرح بچوں کو بھی اپنے ہم عمروں کے ساتھ ہی انڈر اسٹینڈنگ رکھنی چاہیے۔

ندیم میرا دیور ایک سرکاری محکمے میں کام کرتا ہے۔ اچھی بھلی تنخواہ ہے مگر میرے شوہر ایک پرائیوٹ ادارے میں کام کرتے ہیں۔ ان کی آمدنی تھوڑی ہے اس لیے انہیں کسی اور جگہ پر پارٹ ٹائم جاب کرنا پڑتی ہے۔ وہ صبح نکل جاتے ہیں اور رات کو قریباً ساڑھے آٹھ بجے گھر آتے ہیں جبکہ ندیم شام کو پانچ بجے ہی گھر آجاتا ہے۔ ندیم کی ہی پسند سے اس کی شادی فاطمہ سے طے پائی ہے۔ فاطمہ کا گھرانا خاصہ قدامت پسند گھرانا ہے۔ مجھے تو پسند نہیں تھا مگر ندیم کی ضد تھی کہ شادی فاطمہ سے ہی کرنی ہے۔ اس شادی پر میں نے اپنے اور اپنی تینوں بچیوں کے لیے انتہائی جدید کپڑے بنوائے تھے۔ میں تو ویسے بھی اپنی بچیوں کے کپڑے انگریزی ڈراموں کو دیکھ دیکھ کر سلیکٹ کرتی ہوں۔ اگلے دن برات تھی۔ ہم فاطمہ کو بیاہ کر گھر لے آئے۔ فاطمہ کے گھر والوں نے فاطمہ کو بہت جہیز دیا تھا۔ ہمارا گھر بھر گیا تھا۔

اس کی چوتھی کی رسم تھی۔

میرے میکے والے بھی آئے ہوئے تھے اور سب میری بے انتہا تعریفیں کررہے تھے۔ فاطمہ کے گھر والے اسے لے جانے کے لیے آئے تھے۔ فاطمہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ ندیم بھی اسے والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جب وہ سب لوگ جانے کے لیے تیار ہوئے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ فاطمہ نے اپنے جہیز کے کپڑوں سے سیاہ رنگ کا عبایہ نکالا، اسے پہنا اور اپنا چہرہ تک ڈھانپ لیا۔ میں نے ندیم کی طرف دیکھا۔ ندیم گویا اس کے اس حلیے سے مطمئن نظر آرہا تھا۔ وہ چلی گئی مگر مجھے بے حد غصہ آرہا تھا۔ میں اس کے ساتھ کیسے رہوں گی، یہ سوچ مجھے پریشان کررہی تھی۔ وسیم آج گھر ہی تھے میں نے ان سے کہا۔

"بھلا یہ کوئی طریقہ ہے، نئی نویلی دلہن برقعہ پہن کر چل دی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ اچھے کپڑے ہی نہ بنانی بھلا جب کسی نے دیکھنا ہی نہیں تو پہننے ہی کیوں؟"

وسیم صرف مسکرا دی اور میں کچن میں چلی گئی۔

فاطمہ اور میرے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس کے کمرے میں ٹی وی پر ہر وقت مذہبی پروگرام چلتے رہتے تھے جبکہ شام کو رومانوی، ایکشن اور کرائم سیریلز کے ڈرامے دیکھنا میری کمزوری تھی۔ ڈرامے ختم ہوتے ہی وسیم آجاتے تو میں سب کو کھانا دینے میں مصروف ہو جاتی۔ رات دیر تک وسیم کے ساتھ سارا دن کی باتیں کرتی۔ بچوں کی باتیں ڈسکس کرتی، بچوں کو جلدی سلا دیتی، جو ڈراما رہ جاتا اسے میں رات کو ایک بجے دوبارہ ٹیلی کاسٹ ہونے پر دیکھتی۔

فاطمہ نے آتے ہی گھر کی کافی ذمے داریاں بانٹ لی تھیں۔ اس بات سے میں کافی مطمئن تھی مگر اس کا بچیوں کے معاملات میں انٹرفیئر کرنا مجھے قطعی پسند نہیں تھا۔

شادی کی مووی بن کے آگئی تھی۔ میں نے بڑے شوق سے ڈی وی ڈی پر مووی لگائی اور فاطمہ کو آواز دی۔

"آجاؤ فاطمہ مووی دیکھتے ہیں۔" وہ آگئی۔ میں نے نوٹ کیا کہ ہانیہ اور سنی کے ڈانس شروع ہوتے ہی وہ بہانے سے کچن میں چائے بنانے چلی گئی۔ مجھے برا لگا مگر اب ایک اور بات جو مجھے بری طرح کھٹک رہی تھی وہ یہ کہ وسیم اکثر مجھے فاطمہ کے معاملے میں سمجھاتا کہ فاطمہ اچھے گھرانے سے آئی ہے، ان کا ماحول بے حد اچھا ہے بھلا دیکھو میرے بچے اسکول سے ڈھائی بجے آتے ہیں کھانا وغیرہ دے کر وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کرتے ہیں اور میں جو رات دیر تک ڈرامے دیکھتی ہوں۔ چار پانچ بجے اپنے بیٹے احتشام کو لے کر میں اپنے بیڈ روم میں دو تین گھنٹے ضرور سو جاتی ہوں۔ چھ بجے قاری صاحب آجاتے ہیں اور بڑی دو بچیاں ٹی وی لاؤنج میں ہی بیٹھ کر ان سے سپارہ پڑھ لیتی ہیں۔

میں سو کر اٹھی تو فاطمہ میرے کمرے میں بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ میں مسکرا کر بولی۔ "کبھی ہوتم تو کبھی ادھر آتے نہیں جھجکتی ہو۔"

وہ دھیمی مسکراہٹ سے بولی۔ "ایک بات کرنی ہے۔"

"ہاں بولو، میں سن رہی ہوں۔"

"بھابی آپ قاری صاحب سے بچیوں کو قرآن نہ پڑھائیں اور اگر ان سے ہی پڑھوانا ہے تو آپ ان کے ساتھ خود بیٹھا کریں۔"

میرا تو پارہ چڑھ گیا۔ "کیوں...... تم نے ایسی بات کیوں کی؟ قاری صاحب نیک آدمی ہیں اور میری بچیاں ابھی اتنی چھوٹی سی ہیں۔ ایسی بات کرنے سے پہلے تم کو سوچنا چاہیے تھا۔"

وہ پشیمان ہوگئی اور بولی۔ "بھابی میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ آج کل کا ماحول ایسا نہیں ہے کہ بچیوں کو اکیلے اس طرح ایک نامحرم شخص کے ساتھ بیٹھنے کا موقع دیا جائے۔ آگے آپ کی مرضی۔" وہ اپنا لہجہ مزید دھیما کرکے بولی۔ "بھابی، میں آپ کی تینوں بچیوں کو قرآن پاک پڑھا دیا کروں؟"

میں تو مشتعل ہوگئی۔ "بس بس رہنے دو تمہیں کیا معلوم قاری حضرات آج کل اسکولوں میں ہونے والی پڑھائی جیسا ہی پڑھاتے ہیں۔ جو ہو رہا ہے ہونے دو۔"

وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں مطمئن ہوگئی گویا کہ اب وہ میری بیٹیوں کے معاملات میں دخل نہ دے گی مگر ابھی ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ میرا بھتیجا سنی ہفتے کی شام کو موٹر سائیکل پر ہانیہ اور دانیہ کو لینے آگیا۔ دونوں تیار ہو کر اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ماموں کے گھر چلی گئیں۔ فاطمہ کو پھر موقع مل گیا۔ چلی آئی میرے پاس اور کہنے لگی۔

"بھابی جب یہ بچیاں اپنے ماموں کے گھر جاتی ہیں تو کیا ان کی ممانی انہیں اپنے پاس سلاتی ہیں؟"

مجھے غصہ تو بے حد آیا مگر میں نے رسانیت سے کہا۔ "نہیں بھابی، بھابی تو اپنے بیڈ روم میں سوتے ہیں بچے سارے ٹی وی لاؤنج میں کھیلتے باتیں کرتے ہیں اور جسے جہاں جہاں جگہ ملتی ہے سو جاتے ہیں۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ تھوڑے تشویش زدہ لہجے میں بولی۔ "بھابی یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ بچوں کو خاص طور پر لڑکیوں کو کسی کے گھر اس طرح رات گزارنے کو نہ بھیجا کریں۔"

میں نے غصے میں کہا۔ "وہ کسی کا گھر نہیں میرے بھائی کا گھر ہے۔"

وہ سمجھاتے ہوئے بولی۔ "بھابی ٹھیک ہے مگر بھی رشتے نازک رشتے ہوتے ہیں۔ ابھی سے اپنی لڑکیوں کو بچانا بہت ضروری ہے۔ یہیں سے خرابی کی شروعات ہوتی ہیں۔"

"بس بس۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھو میں کوئی جاہل عورت نہیں

ہوں جو رشتوں کو نہ سمجھ سکوں اور ہاں..... آئندہ میری لڑکیوں کے معاملے میں تمہیں کچھ سوچنے یا دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' غصے میں بولتی ہوئی میں کچن کی طرف بڑھی اور وہ شرمندہ سی ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شام کو اس نے مجھے خود ہی بلا لیا جیسے اس کے اور میرے درمیان کوئی تلخی ہوئی ہی نہیں۔

فاطمہ نے کچھ دن کے بعد مجھے بتایا کہ اس کے ہاں خوش خبری ہے میں بھی خوش ہو گئی۔ تینوں بچیوں اور وسیم کے سامنے کہہ دیا۔

''تمہاری چاچی کے ہاں ایک بے بی آنے والا ہے۔''

بچیاں بے حد خوش ہوئیں۔ ندیم نے ہمیں اس خوشی میں کھانے کی دعوت دے دی۔ میں تو دعوت کہیں باہر لینا چاہتی تھی مگر فاطمہ باہر جانے پر راضی نہ ہوئی اس نے خود ہی گھر میں کافی آئٹم بنا لیے۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا تو ہم نے مسکرا کر ندیم اور فاطمہ کو شکریہ ادا کرتے ہوئے آنے والے بے بی کی مبارک باد دی۔ اچانک دانیہ نے سوال کیا۔

''چاچی دنیا میں بے بی کہاں سے آتے ہیں؟''

میں نے پریشان ہو کر وسیم کی طرف دیکھا تو انہوں نے صورت حال کو سنبھال لیا، بولے۔ ''بیٹا جی، جب کسی میاں بیوی کو بے بی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اللہ میاں کو ایک اپلی کیشن دیتے ہیں اور جب اللہ پاک منظور کر لیتے ہیں تو دنیا میں بے بی بھیج دیتے ہیں۔''

''کہاں؟'' اس نے پھر سوال کر دیا۔

''جنتی اسپتال میں حوریں ننھے بے بی کو پھولوں والی ٹوکری میں لاتی ہیں اور بے بی کی ماما کے حوالے کر دیتی ہیں۔'' وسیم نے سمجھا کر کہا تو بچیاں مطمئن ہو گئیں اور ہم سب خوشی سے کھانے میں مصروف ہو گئے۔

فاطمہ کو اب گرمیوں میں ڈھیلے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ وہ بازار گئی تو اپنے لیے چھ جوڑے لے آئی۔ میرے بھی دو جوڑے لائی اور مجھے دیتے ہوئے بولی۔

''بھابی یہ دو جوڑے میں آپ کے لیے لائی ہوں اور یہ دو جوڑے شلوار قمیص کے ہیں ہانیہ کے لیے لائی ہوں۔''

''ہانیہ کے لیے کیوں وہ تو ابھی ان کپڑوں کے قابل نہیں ہے۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔

''اصل میں بھابی ہانیہ بڑی ہو رہی ہے جس طرح کے بغیر بازو کے اسکرٹ اور شارٹ آپ اس کو پہناتی ہیں اب نہ پہنایا کریں۔ اسے دوپٹا لینا سکھائیں۔''

وہ میرے لیے کپڑے لائی تھی میں ایک دم سے غصہ نہیں کر سکی تھی سو آرام سے بولی۔ ''جب میں سمجھوں گی کہ اب اس کے لیے ایسے کپڑے لازم ہیں تو پہنا دوں گی۔ تم دے دو جب مناسب سمجھوں گی سلوا دوں گی۔''

وہ کچھ نہ بولی مسکرا کر سب کپڑے اس نے مجھے دے دیے۔

فاطمہ ڈلیوری کے سلسلے میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی پھر کچھ دن کے بعد اس کے گھر ایک بیٹے نے جنم لیا۔ میں بچیوں کو لے کر اس کے والدین کے گھر گئی۔ سارا دن بہت مصروفیت میں گزرا۔ فاطمہ کا بیٹا بہت پیارا تھا۔ ندیم نے اس کا نام عبداللہ رکھا۔ بچیاں بھی بے حد خوش تھیں اور پھر ہم اپنے گھر آ گئے۔

فاطمہ کے جانے سے میری مصروفیات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے وہ یہاں تھی تو گھر کے آدھے کام سنبھال لیا کرتی تھی۔ اب سب کچھ مجھے کرنا پڑ رہا تھا۔ دن کو چار بجے سونا تو میرا لازمی تھا۔ سات بجے میں اٹھتی تو قاری صاحب بچیوں کو پڑھا چکے ہوتے۔ بچیاں اپنے اپنے ہوم ورک میں مشغول ہوتیں تو میں مطمئن ہو جاتی۔ میں کتنی خوش نصیب ماں ہوں میری بیٹیاں کتنی اچھی ہیں۔ ناسمجھ، معصوم میں سوچتی اور خود ہی مسکرا دیتی۔ آٹھ بجے کے بعد وسیم آ جاتے۔ ندیم آج کل آفس سے سیدھا فاطمہ کے پاس چلا جاتا رات کو سونے کے لیے آتا۔ وسیم دس بجے سو جاتے بچیاں بھی سو جاتیں اور ساڑھے دس بجے میرے پاس وقت ہی وقت ہوتا۔ میں اپنے بیڈ روم میں ہلکی آواز میں انڈیا کے چینل لگا لیتی اور جو ڈرامے رات کو آٹھ بجے نہ دیکھ سکی تھی وہ رات کو دوبارہ دیکھا۔ چپ ہونے پر دیکھتی۔ ایک کے بعد ایک ڈراما لگتا چلا جاتا اور مجھے سوتے سوتے ایک بج جاتا۔ آج کل ایک انڈین چینل پر جو ڈراما چل رہا تھا وہ خاصا سسپنس والا ڈراما تھا۔ جو بھی قسط رہ جاتی تو سارا دن اسی سوچ میں گزرتا کہ اس قسط میں کیا ہوا ہو گا۔

اس ہفتے کی شام کو قاری پھر بچیوں کو لینے آ گیا۔ وسیم نے پہلی بار منع کیا۔

''ثانیہ بچیوں کو نہ بھیجا کرو اور اگر بھیجا کرو تو تم خود ساتھ جایا کرو۔''

''لو بھلا اگر میں ساتھ چلی گئی تو آپ کیسے رہیں گے میرے بغیر۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''میری فکر نہ کرو میں کھانا پکا دیا کرو۔ میں گھر آ کر خود

ہی اوون میں گرم کر کے کھالیا کروں گا۔ ویسے بھی تو دس بجے سو ہی جاتا ہوں۔''

''اچھا جناب اس بار جانے دیں اگلی بار میں ان کو خود لے کر جاؤں گی۔'' وسیم نے غیر مطمئن انداز میں سر ہلایا اور کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

اس دن بچیاں اسکول سے آئیں کپڑے بدلے، دوپہر کا کھانا کھایا اور ٹی وی لاؤنج میں ہوم ورک کرنے بیٹھ گئیں۔ میں نے ایک مطمئن نظر ان پر ڈالی اور کہا۔

''دیکھو بچو چار بجنے والے ہیں میں احتشام کو لے کر اپنے کمرے میں سونے جا رہی ہوں۔ باہر کی کنڈی لگا لو کوئی آئے تو پوچھے بغیر نہ کھولنا۔ ہاں قاری صاحب آئیں تو تم تینوں قرآن پاک کا سبق پڑھ لینا۔'' تینوں نے فرمانبرداری سے کہا۔

''جی ماما، ٹھیک ہے۔'' اور میں اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی۔ میں بھرپور نیند سو رہی تھی کہ شاید لائٹ چلی گئی اور گرمی سے میری آنکھ کھل گئی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی میں نے اپنے کمرے میں رکھا فون اٹھایا اور ساتھ ہی ٹی وی لاؤنج میں رکھا فون ہانیہ نے اٹھالیا۔ فون ہانیہ کی دوست مریم کا تھا۔ گرمی سے میری نیند اڑ گئی تھی۔ میں غیر ارادی طور پر دونوں کی باتیں سننے لگی۔ مریم کہہ رہی تھی۔

''ہانیہ کیا کر رہی ہو؟''

ہانیہ بے زاری سے بولی۔ ''لائٹ چلی گئی ہے تم تو جانتی ہو اس وقت ماما سو رہی ہوتی ہیں اور اس وقت ٹی وی پر انڈیا کا ڈراما ری پیٹ ہوتا ہے ماما سے چوری چھپے ہم ڈراما لگا کر ہم بہنیں دیکھتی ہیں اب لائٹ چلی گئی ہے۔ تم بتاؤ تم نے ڈراما دیکھا؟''

''ہاں ہاں میں تو دیکھ چکی۔'' ڈراما انجوائے کر لی۔

ہانیہ نے بے صبری سے پوچھا۔ ''بتاؤ کیا ہتا رو گیت (ہیروئن) کے ساتھ جو لاسٹ ٹائم ریپ ہوا تھا تو آج کیا بتا؟''

مریم نے بتایا۔ ''ارے یار وہ تو پریگننٹ ہو گئی۔''

ہانیہ ہنس دی۔ ''کیا واقعی...... یہ تو ہونا ہی تھا۔ اجے نے اس کے ساتھ ریپ جو کیا تھا تو پریگننٹ ہونا تو بہت ضروری تھا ناں۔''

یہ ہانیہ کہہ رہی تھی۔ ہانیہ جسے بڑوں کے سامنے بولنا نہیں آتا تھا۔

''ارے ہاں ہانیہ انڈین چینل تو بڑے بے باکی سے اس طرح کے ریپ دکھا بھی دیتے ہیں۔ اب تم یاد کرو پرسوں کرائم پیٹرول پر بھی چھوٹی سی بچی کے ساتھ بھی کچھ ہوا تھا ناں، بھلا ہمیں تو پتا بھی نہیں تھا یہ سب۔ آپ کی ماما تو پھر بھی آپ کو منع کرتی ہیں کبھی اپنے سامنے بٹھا کر انڈین چینل نہیں دیکھنے دیتیں۔''

''مگر ہمارے گھر کا ماحول تو اور بھی کھلا ہے۔ میری ماما بالکل بھی منع نہیں کرتیں۔ ہم ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر یہ سب کچھ دیکھتے ہیں ورنہ ہمیں کیا پتا تھا کہ پریگننٹ کیسے ہوتے ہیں۔''

ہانیہ بولی۔ ''ہاں ہاں میری ماما سمجھتی ہیں کہ ہم بہت معصوم ہیں ہمیں کچھ نہیں پتا مگر ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ چاچی مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ وہ کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں تو ان کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں مگر ماما ان کو بے وقوف سمجھتی ہیں۔ ماما تو ان کو دقیانوسی روح کے نام سے بلاتی ہیں۔''

مریم نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''باقی رہی سہی کسر تمہارے اس کزن سنی نے پوری کر دی۔ اس بار اس نے کیا کیا تمہارے ساتھ؟''

ہانیہ ہنسنے لگی اور بولی۔ ''کیا بتاؤں...... گندی چھیڑ خانی کرتا ہے میرے ساتھ۔ سونے نہیں دیتا تنگ کرتا رہتا ہے۔ ممانی جان تو اپنے کمرے میں سوئی پڑی رہتی ہیں۔ انہیں کیا پتا کہ ہم سارے بچے ٹی وی لاؤنج میں کیا کیا کرتے ہیں۔''

''اچھا ہانیہ میری ماما آگئی ہیں پھر بات ہو گی۔'' مریم نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ مجھے ایسا لگا کہ پسینا میرے پیروں کے نیچے تک بہہ گیا ہے۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ ٹیلی فون کا ریسیور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ ہانیہ فون رکھ کر کھیل میں لگ گئی تھی۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میری تربیت جس پر مجھے فخر تھا۔ آج میرے سامنے رہی تربیت میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ میں بڑی دیر تک خوفزدہ سی ہاریں لٹکائے بیڈ پر بیٹھی رہی۔ میں یہ سب باتیں وسیم کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا اور پھر فون اٹھا کر فاطمہ کے والدین کا نمبر ملایا۔ اس کی بہن سے کہا فاطمہ سے میری بات کروا دیں۔ سلام دعا اور خیریت کے فوراً بعد میں نے فاطمہ سے کہا۔

''فاطمہ میری بچیوں کا ماحول بے حد خراب ہو گیا ہے مجھے تمہارے ماحول کی اور تمہاری تربیت کی ضرورت ہے۔ تم میرے گھر کا ماحول ٹھیک کرنے کے لیے جلدی سے گھر آجاؤ۔''

خطا کار

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم
ایک اور سچ بیانی کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ یہ روداد میری مرحومہ واقف کار نور کی ہے۔ اس کے ساتھ کیسا عجب ہوا۔ بے چاری تمام عمر خوشی کے لیے ترستی رہی۔ آپ بھی ملاحظہ کریں کہ وہ کیسی حوصلہ مند تھی۔ امید ہے آنکھیں نم کردینے والی یہ روداد آپ کو بھی پسند آئے گی۔

صدف آصف
(کراچی)

"اُفوہ، یہ کیا مصیبت ہے اتنے سال گزر گئے پھر بھی تمہیں گاڑی میں سفر کرنا نہیں آیا۔ یہ دیکھو، ایسے سیٹ بیلٹ باندھتے ہیں۔" وجاہت جانے جتا کر سنگل کیا ہے، اپنی بڑائی جتانے سے باز نہ آیا۔ شوہر کے جتانے پر وہ ایک دم ہراساں ہوگئی۔ خوش قسمتی سے اسی لمحے بیلٹ نکل آئی۔ اسے باندھنے کے بعد ہی نور کچھ پرسکون ہوئی۔

"یہ کیا کر رہی ہو کم عقل عورت۔ اتنے پیسے خرچ کرکے بالوں کی ری باؤنڈنگ کروائی ہے۔ جاہلوں کی طرح لپیٹ کر

ساری لک تباہ کر دو گی۔" وہ ایک بار پھر دھاڑا۔ نور بے ساختہ کپکپا اٹھی۔ اسے ان کھلی زلفوں سے پریشانی ہو رہی تھی جو ہوا سے اڑ اڑ کر اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہائی وے پر گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ اسے بند کھڑکیوں میں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ اسی لیے مجبوراً وجاہت کو ائرکنڈیشن بند کر کے گاڑی کے شیشے کھولنے پڑتے۔ ایک دفعہ وجاہت کی ضد پر نور کی سانس بند ہونے لگی تھی بس اسی دن سے وہ اس معاملے پر مصالحت سے کام لیتا ورنہ وہ ایسے مزاج کا نہیں تھا۔ اب بیوی کو جوڑا باندھتا دیکھ کر بلاوجہ کی کھینچاتانی شروع کر دی یوں کہیں کا غصہ کہیں نکالا۔ نور کے سڈول بازو اٹھے کے اٹھے رہ گئے سرمئی آنکھوں میں درد جیسے ساکت ہو گیا۔

"دیکھو...... میرا یہ چیریٹی کا فنکشن بہت اہمیت کا حامل ہے اس معاملے میں کوئی بے پروائی نہیں برتنا تم خود ہر جگہ موجود رہنا۔ دن بدن کم ہوتی ریٹنگ کو بڑھانے کے لیے میں نے جو پلاننگ کی ہے دیکھنا وہ ایک بار پھر مجھے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دے گی اس طرح نہ صرف عوام کی ہمدردیاں بلکہ ان کے دل بھی جیت لوں گا۔ انتظام پورا رکھنا اگر نے کا ذرا سجا گئے" وجاہت اب موبائل پر اپنے عزیز دوست اور مینیجر ارشد کے ساتھ حیدرآباد میں منعقد ہونے والے شو کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گیا تھا۔

اپنے اوپر سے اس کی توجہ ہٹتے ہی اور منتقل ہونے پر نور نے سکون کی سانس لی۔ شوہر کی ان باتوں سے کچھ نفرت سی محسوس ہوئی اب وہ قہقہہ لگا رہا تھا۔ نور نے مڑ کر اسے بغور دیکھا وہ ابھی بھی اتنا ہی پروقار اور مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا جس پر اس کا دل ایک دم نثار ہوا۔ کیوں نہ ہوتا ایک سلیبرٹی تھا۔ اپنی فٹنس اور اسکن کا خیال رکھتا تھا۔ فیشن کی دنیا کی ایک ماہر شخصیت سے دلکشی بڑھانے کے لیے ہر چھ مہینے بعد مشورے لیتا، اپنا مکمل میک اوور کرواتا، ہیئر اسٹائل، ڈریس، شوز سب کچھ منفرد وہر دفعہ نئے انداز میں لوگوں کے سامنے آتا۔ لڑکیاں اس کے پیچھے پاگل ہونے لگتیں۔ بہت اچھی آواز نہ ہونے کے باوجود اپنی شخصیت کے چارم کو کیش کروانے والا "وج خان"۔ اسی لیے اب تک ملک کے مشہور پاپ سنگر کے تخت پر براجمان تھا۔

"کاش کوئی ایسی جگہ بھی ہوتی جہاں لوگوں کی روح کا میک اوور کیا جاتا ہو تو میں وجاہت کو وہاں لے جاتی۔" نور کے دل سے ایک دم خواہش ابھری۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا شوہر گائیکی کی دنیا میں اتنا کامیاب نہ ہو پاتا مگر اسے اپنا

آپ اس طرح سے پیش کرنے کا سلیقہ تھا کہ مداح اس کی شخصیت کے چارم میں کھو کر باقی باتوں کو بھول جاتے۔ جن میں زیادہ تر ٹین ایج گروپ سے تعلق رکھنے والوں کا ہجوم تھا۔

وجاہت خان سے پیار کرنا اس کی زندگی کی اتنی خطا تھی جس نے اسے زندگی سے ہی دور کر دیا۔ پھر تو جیسے خطاؤں کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ نور نے آنسو چھپانے کے لیے سنگلاسز آنکھوں پر چڑھا لیے۔

☆☆☆

وہ اپنے شوہر کے ساتھ بڑے سے ہال میں داخل ہوئی تو روشنیوں کی چکاچوند سے اس کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔ پوری تقریب میں میڈیا کے لوگ چھائے ہوئے تھے جو "وج خان" کے حوالے سے خبریں اس کے مداحوں تک پہنچا رہے تھے۔ وہ ایک صوفے پر جا بیٹھی۔ اس کی توجہ کا مرکز شوہر ہی تھا۔ بیچاری مشرقی بیوی جو ٹھہری، وجاہت ہمیشہ کی طرح نور کا وجود فراموش کیے۔ ایک ابھرتی ہوئی کم عمر اداکارہ مارٔہ احمد پر ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں نرمی، گداز لہجہ، بہترین انداز گفتگو، مارٔہ احمد اس کی دل آویزی کے سحر میں جکڑی یوں کھڑی تھی کہ جیسے اپنی جگہ سے ہلی بھی تو شیشے کی طرح کرچی کرچی ہو کر بکھر جائے گی۔ نور کو تشویش ہوئی کہ اس کی سانس بھی تو جا رہی ہے یا نہیں۔ وہ ایک جادوگر کے سامنے جو کھڑی تھی۔ اس کے سحر سے نکلنا ایسا کچھ آسان نہ تھا۔ نور کا تجربہ تو یہی کہتا تھا کہ آخر اس نے اپنی زندگی رول دی تھی۔

ان دونوں کے بڑھتے ہوئے التفات دیکھ کر نور نے اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔ کبھی ایسا ہی وقت تو نور پر بھی آیا تھا۔ اسے ایک دم وجاہت، مارٔہ، تقریب میں موجود ہر چیز یہاں تک کہ اپنے وجود سے بھی گھن آنے لگی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔

"اس شخص کو تو سنگر نہیں ایکٹر ہونا چاہیے تھا۔ پکا ڈرامے باز ہے شاید اسی لیے اتنا کامیاب ہے۔" نور کا دل اچاٹ ہوا ایک دم اپنا چھوٹا سا پیارا گھر ذہن میں در آیا۔ اماں، بابا، دونوں بھائی اور چھوٹی بہن سبھی حیدرآباد میں تو ہیں۔ وہ جب بھی اس شہر میں آتی اس پر ایک عجیب سا ڈیپریشن طاری ہونے لگتا۔

"اف، میری ایک غلطی کی سزا اتنی سخت۔ اے محبت تیرا انجام اتنا بھیانک ہوگا یہ تو میں نے کبھی سوچا نہ تھا" اس کا سر گھومنے لگا۔ شوہر کی طرف مدد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ وہ

ننھی سی لڑکی کے کان میں کوئی سرگوشی کرنے میں مصروف تھا۔ مائرہ کا نقل نقل کرتا قہقہہ نور کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگا۔ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔ تیزی سے لیڈیز واش روم کی طرف بڑھی۔

ایسے مصنوعی ماحول میں اسے ایک دم سناٹا سا محسوس ہوئی عجلت میں واش بیسن پر جھکی۔ پیٹ میں جو کچھ تھا باہر نکل گیا۔ میک اپ کی پروا کیے بغیر منہ پر پانی کے چھپاکے مارے۔ اس کی دلکشی کو سولہ سنگھار کی ضرورت نہ تھی اس کے باوجود شوہر کی مرضی پر وہ سج سنور کر اس کے ساتھ پارٹیوں میں جاتی جہاں اسے سراہا جاتا۔ بے تحاشا سراہا جاتا۔ اس کا دل پھر بھی ناخوش ہی رہتا۔ کیوں کہ وہ جس سے تعریف سننے کی متمنی تھی تو وہ بیوی کے علاوہ ہر دوسری عورت کو سراہنے میں مشغول ہوتا۔

نور نے سامنے لگے بڑے سے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

"کیا میں واقعی جاہل ہوں یا ایک جاہل کے ساتھ گزارہ کر رہی ہوں۔ اس لیے خطاکار ہوں" اس نے اپنی سوچتی سوچتی آنکھوں میں جھانک کر خود سے سوال کیا۔ جہاں مستقل اداسی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

"جاہل عورت یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خطا ہے کہ میں نے تم جیسی عورت سے شادی کی۔ ابھی بھی میرے پیچھے لڑکیوں کی لائن لگی ہوئی ہے اپنے آپ کو سدھار لو ورنہ پچھتاؤ گی۔" صبح کا منظر آئینہ میں فلم کی طرح چلنے لگا۔ بات چھوٹی سی تھی۔ وجاہت کے اعزاز میں یہاں ایک پارٹی منعقد کی گئی تھی۔ نور کے سر میں درد تھا۔ اس نے جانے سے انکار کیا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اتنی سنائی کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکل گئی۔ اس نے خود کو خاموشی سے حالات کے سپرد کر دیا۔ شفاف آئینے میں ایک اجنبی عکس اس کے سامنے تھا۔ وہ کتنا بدل گئی تھی۔ اماں ابا کی لاڈلی نوری سے نور تک کا سفر اس کی روح تک نشان زدہ ہو چکا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ایک بار اپنے گھر جا کر اماں کی گود میں سر رکھ کر سو جائے۔ ایک طویل پرسکون نیند۔ تھکن نے اس کے چہرے پر ڈیرے جمائے ہوئے تھے۔ شادی کے دس سال بعد بھی وہ وجاہت کو سمجھ نہیں پائی تھی... ساری خوشیاں تو چند دنوں میں ہی ہوا ہو گئیں۔ جن کے زعم میں اس نے اپنے بابل کا گھر چھوڑا تھا۔ اب تو شوہر کی اونچی اڑان کا ساتھ دینے کے لیے بھی اس کے کمزور پروں میں تھوڑی سی بھی طاقت نہ رہی۔

ان کی وجاہت سے پہلی ملاقات کراچی میں اپنی خالہ کے گھر پر ہوئی۔ وہ اپنے خالہ زاد بھائی سلمان کی شادی میں شریک ہونے گھر والوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ وجاہت اور سلمان یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ اس وقت وجاہت صرف فنکشنوں میں شوقیہ گایا کرتا تھا۔ دوستوں پر مشتمل ان کا چھوٹا سا ایک بینڈ بھی تھا۔ آج کی طرح وہ ایک سپر اسٹار نہیں بنا تھا۔

نور کے خالو کا شمار پیسے والوں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے بیٹے کی شادی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ سلمان کے دوستوں نے مہندی کی رات محفل موسیقی کا انتظام کیا تھا۔ وجاہت کے گروپ کو بھی دعوت دی گئی۔ فنکشن شروع ہو چکا تھا۔ نور سب سے آگے کی نشست پر بیٹھی دلچسپی سے پروگرام دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس کی... نگاہیں غزل گاتے ہوئے وجاہت سے جا ٹکرائیں۔ کچی عمر تھی ہر چمکتی چیز سونا ہی دکھائی دیتی۔ دل کو کچھ ہوا اور وہ اپنا آپ ہار بیٹھی۔

وجاہت بھی اس کچی کلی سی سرمئی آنکھوں والی معصوم لڑکی کے حسن کی تاب نہ لا سکا۔ ویسے بھی حسین لڑکیاں اس کی کمزوری تھیں۔ کئی افیئرز اس کی زندگی میں قائم ہو چکے تھے، پر اس بار وہ سچ مچ گھائل ہو گیا کیونکہ اس سے قبل اتنی مکمل خوبصورتی دیکھی بھی جو نہ تھی۔

سلمان کے دوست کی حیثیت سے اس نے شادی کی ساری تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نوری کو اپنی نگاہوں اور کیمرے کے فوکس پر رکھا یہی باتیں ان دونوں کے قریب آنے کی وجہ بنیں۔ ولیمے والے دن سب سے چھپ کر موبائل نمبرز کے تبادلے بھی ہو گئے۔ یوں محبت کی گاڑی ایک انجانی سمت بڑھنے لگی۔

نوری اپنے گھر والوں کے ساتھ حیدرآباد لوٹ آئی پر رابطے منقطع نہ ہو پائے۔ روز فون پر باتیں ہوتیں نوری کی معصومانہ باتیں وجاہت کے دل پر اثر کرنے لگیں۔ اب تک اس کا واسطہ کافی بولڈ لڑکیوں سے پڑا تھا پر نوری کی الگ بات تھی۔ وہ اس سے شادی کرنے پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ پر اس سے قبل اسے اپنے کیریئر کو وقت دینا تھا۔ اسی لیے وجاہت اپنا پہلا البم نکالنے میں مصروف تھا کہ نوری کے فون نے اسے پریشان کر دیا۔ اس مرحلے پر وہ شادی کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔

"وجی، کچھ کرو پلیز ابا نے پھوپی کے بیٹے منیر رحمان سے میری شادی کی تاریخ طے کر دی ہے" نوری نے اسے روتے ہوئے بتایا۔ ان دونوں کی منگنی بچپن سے طے تھی۔ اس

سے قبل تو اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ پر نوری اب اپنے دل کا کیا کرتی جو ہمک ہمک کر وجاہت کا ساتھ مانگنے جا رہا تھا۔ اس کی سحر انگیز باتیں، پیار بھرے دعوے، نغز لیتیں، ایسے تقاضے بھلا سیدھا سادھا سا منیر پورے کر سکتا تھا۔

''اچھا کچھ کرتا ہوں۔'' وجاہت کے ٹالنے والے لہجے پر وہ بھڑک اٹھی۔

''دیکھو اگر تم سے شادی نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گی۔ پلیز اپنی امی بہن کو یہاں لے کر آؤ۔'' نوری نے دھمکی دینے کے بعد رو رو کر اس سے رشتہ بھیجنے کا کہا۔

''میں نے اماں سے بھی تمہارا ذکر کیا پر وہ تمہارا نام سننے کو بھی تیار نہیں کہتی ہیں کہ منیر تو چار زرزا کا ڈکٹ ہے اور وجاہت ایک نکھٹو سا گلوکار وہ تمہیں ساری عمر تنگ رکھیں رہنے کے علاوہ کیا دے گا؟'' وہ شاید مکمل طور پر پیچھے ہٹ جاتا مگر نوری نے جذبات میں آ کر اسے اپنے گھر میں ہونے والی ساری باتیں بتا دیں۔

''اچھا آنٹی جی اب تو آپ خود اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیں گی۔'' وجاہت کی آنا کا ناگ پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ اپنی بڑی بہن اور ماں کو لے کر دوسرے دن ہی نوری کے گھر پہنچ گیا۔ توقع کے مطابق وجاہت کو انکار کر دیا گیا۔ ساتھ ہی اس کی ماں، بہن کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا گیا۔

''میں نے سب کچھ کیا تمہارے لیے اپنی ماں بہنوں کو ذلیل بھی کروا دیا۔ اپنی محبت میں کھرا اترا، اب تمہاری باری ہے'' وجاہت کے فقرے نے نوری کے اندر آگ سی بھر دی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی رگیں کاٹ لیں۔ اسپتال پہنچ گئی۔ خودکشی کا کیس بن گیا، گھر والے زیر عتاب آ گئے۔ ساری برادری میں بات پھیل گئی۔ بیٹی کی حرکت پر عارف علی کا سر شرم سے جھک گیا۔ انہوں نے نوری کے گھر آنے کے بعد ہاتھ جوڑ کر وجاہت سے درخواست کی کہ اپنی امانت لے جاؤ۔ یوں ایک ہفتے میں ہی قریبی رشتے داروں کو جمع کر کے اسے سادگی سے وجاہت خان کے ساتھ بیاہ دیا۔ نکاح کے بعد وجاہت نے بڑی شان سے نوری کی ماں سے نگاہیں ملائیں، وہ نظریں چرانے پر مجبور ہو گئی کہ بیٹی والی تھی جب اسی نے مان نہ رکھا تو غیر سے کیا شکوہ۔

ان لوگوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نوری پر اپنے گھر اور دل کے دروازے بند کر دیے نوری اسی دن مر گئی۔

یہاں سے ایک نئی نور نے جنم لیا۔ ایک پل کی خطا نے ساری عمر ایسا رلایا کہ وہ ہنسنا ہی بھول گئی۔ نوری کو یوں لگا جیسے اس نے محبت نہ کی ہو زندگی کی سب سے بھیانک خطا کی ہو۔ سسرال والوں کی نگاہوں میں اس کی دو کوڑی کی عزت بھی نہ تھی۔ اسے منہ سے تو بھگوڑی نہیں کہا جاتا پر ان کے رویے چیخ چیخ کر کہتے کہ ان کے دلوں میں اس کا مقام گھر سے بھاگ کر آنے والی لڑکیوں سے بدتر نہیں۔ آنسو پونچھ جاتے اگر وجاہت اس کی محبت کی قدر کرتا۔ وہ، جس کے لیے گھر والوں کو چھوڑا، زندگی سے منہ موڑا اس نے ہی زندگی تنگ کر کے رکھ دی۔ ہر وقت کے طعنے تشنے، جاہل ہونے کا خطاب، کم عقل، ناعاقبت اندیش عورت کہنے کے ساتھ ساتھ طلاق کی تلوار بھی سر پر لٹکا رکھی تھی۔

نور جو ساری کشتیاں جلا کر آئی تھی کس منہ سے واپس جاتی۔ یہ ستم زدہ، گیا صبر سے گزارا کرنے لگی۔ جیسا وہ چاہتا تھا ویسی بنتی چلی گئی۔ پانی کی طرح ڈھلتی چلی گئی پر وہ خوش نہ ہوا اس کی تو فطرت ہی ہر جانی ٹھہری اندر کا مرد مطمئن ہی نہ ہو پاتا۔

بس ایک کرم یہ ہوا کہ نور اس کے لیے لکی ثابت ہوئی۔ اس سے شادی کے بعد پہلا البم مارکیٹ میں آتے ہی سپرہٹ ہو گیا۔ اس کے بعد تو جیسے کامیابیوں کی نئی داستانیں رقم ہونے لگیں۔ وہ تھوڑا توہم پرست واقع ہوا تھا۔ ایک نجومی کے پاس جاتا تھا جس نے اسے حساب لگا کر بتایا کہ اس کی بیوی کے دم سے یہ دولت پیسا اور شہرت ہے۔ نور اس کے لیے خوش قسمتی کا ستارہ ہے۔ وہ جب تک اس کے ساتھ رہے گی بلندیوں کا سفر جاری رہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بیوی کی مرضی نہ ہونے پر بھی اسے ہر جگہ اپنے ساتھ لے کر جاتا۔ لاتعداد افیئر چلانے کے باوجود دوسری شادی کا بھولے سے بھی نہ سوچا۔ ضرورت بھی نہ تھی۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ ہر مقام پر ''وج خان!'' کے ساتھ ساتھ نور کو بھی بھرپور پذیرائی ملتی۔ جب ہر جگہ اس کی ''بے بی ڈول'' سی بیوی کی تعریفیں ہوتیں تو وہ یوں فخر سے سر اونچا کرتا جیسے اس بات میں بھی کوئی ذاتی کمال ہو۔ وہ اسے خوب سجا سنوار کر حسن کے ہتھیاروں سے لیس کر کے تقریبات میں لے کر جاتا۔ یہ بات اس کی وجہ تسکین بنی۔ اب تو ان دونوں کے دو بیٹے تھے جن سے وجاہت بے تحاشا پیار کرتا تھا۔ اس کا شمار ویسے بھی ان مردوں میں کیا جاتا تھا ''جنہیں اپنی اولاد اور دوسروں کی بیویاں اچھی لگتی ہیں''۔

نور نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو ہاتھ سے پونچھا جو ماضی سے حال تک کا سفر کرنے میں قطار در قطار چلے آئے تھے۔

وہ ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کرنے والے دو علیحدہ علیحدہ حصوں میں بٹ چکے تھے، ساتھ رہتے تھے پر دل کے پاس نہیں تھے۔ ان دونوں کے بیچ ایک ناقابل عبور خلیج حائل تھی جسے نور چاہ کر بھی عبور نہیں کر پا رہی تھی۔ وجاہت میں تو ایسی کوئی چاہ بھی نہ تھی۔

☆☆☆

"بھابی جلدی سے اسپتال پہنچ جائیں۔ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وجی خان اسٹیج سے نیچے گر گیا ہے، کافی سیریس چوٹیں آئی ہیں۔" ارشد کا فون اٹینڈ کرتے ہی وہ کرسی پر بے دم ہو کر گر گئی جیسا بھی تھا وہ اس کا شریک حیات تھا۔ یہ بات سن کر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ نور نے جلدی سے کالی چادر اوڑھی اور چیخ کر ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہا۔ پرس تھام کر باہر بھاگی۔

اسے یہ پتا تھا کہ وجاہت اس بار حیدرآباد ایک خاص پلاننگ سے آیا ہے۔ اسی لیے دونوں بیٹوں فہد اور فواد کو اپنی بہن کے گھر چھوڑ کر آیا تھا۔ نور کی پوچھنے یا مشورہ دینے کی مجال نہ تھی اس لیے بہت ہی سب خاموشی سے بارہا اس کے دیے ہوئے احکامات پر عمل کرتی رہتی۔ پچھلے دنوں سے اس کی ریٹنگ نیچے گر رہی تھی۔ ایک نئے سنگر کو مارکیٹ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ ناقدین اسے مستقبل کا نمبرون اسٹار قرار دے رہے تھے۔

وجاہت خان کے لیے یہ خبر بہت مایوس کن تھیں۔ نمبرون کی کرسی چھوڑنا اس کے لیے آسان کام نہ تھا۔ اپنی پوزیشن بچانے کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگانے کو بھی تیار تھا۔

کافی سوچ و بچار کے بعد اس نے عوام اور میڈیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے کے لیے کچھ دوستوں کی مدد سے حیدرآباد میں ایک چیریٹی شو کا انتظام کیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اسٹیج پر چڑھے گا اور پھر گرنے کی ایکٹنگ کرے گا۔ اس کا اسٹاف پہلے ہی الرٹ رہے گا۔ اسے فوراً تھام لیا جائے گا۔ اس حادثے کی خبر سن کر ایک ہلچل مچ جائے گی۔ ہلکی پھلکی چوٹ پر پٹی لگوا کر وہ پندرہ منٹ کے بریک کے بعد واپس اسٹیج پر آ کر ایک چھوٹی سی تقریر کرے گا کہ اس کے دل میں معذور بچوں کا کتنا درد ہے۔ حادثے کے باوجود عوام کو مایوس نہیں ہونے دے گا اس کے بعد ایک لازوال پرفارمنس

واجب

ایک عربی اصطلاح۔ فقہ میں وہ کام جس کا کرنا ضروری ہو۔ یہ فرض اور نفل کی درمیانی شکل ہے۔ نفل کے برعکس اس کے نہ کرنے پر گناہ ہوتا ہے مگر فرض کاموں سے کم۔ نماز وتر واجب ہے۔ عیدالاضحیٰ پر قربانی بھی واجب ہے۔ فرض سے انکار کفر یا الحاد ہوتا ہے لیکن واجب سے انکار میں ایسا درجہ نہیں۔ واجب مختلف دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر مختلف معنی دیتا ہے۔ مثلاً واجب الوجود یعنی وہ وجود مطلق یعنی خدا۔ واجب الادا یعنی وہ چیز جو ادا کرنی ہو مثلاً قرضہ وغیرہ واجب الاطاعہ وہ جس کی تقلید کی جائے۔ یعنی "نبی"۔

مرسلہ: عاطف حسن، شیخوپورہ

واجد علی شاہ

(1827 ...... 1887ء)

آخری تاجدار اودھ، والی اودھ۔ امجد علی شاہ کے بیٹے۔ فن تعمیر میں عمیق دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ تخت نشین ہوتے ہی باغات، عمارات کی تعمیر شروع کی۔ ساتھ اس کے فن موسیقی، رقص و شعر و سخن میں بھی اکثر کھوئے رہتے۔ جشن بہاریہ قیصر باغ اور دادرے تخلیق کیے۔ جانوروں کے شوقین و دلدادہ اور انہیں زیور تکلم پارسا، خجستہ صورت، درد جگر، صدائے ملک، فلک آشیاں جیسے خطابات سے نوازتے تھے۔ 1847ء میں بعد از وفات والد، نوعمری میں تخت نشین ہوئے۔ فوج اور انتظامیہ کو منظم کیا مگر جلد ہی ذوق جمالیات کے باعث بدنظمی پھیل گئی اور 31 جنوری 1856ء کو انگریزوں نے بادشاہ کو معزول کر کے اودھ کو اپنی نوآبادیاتی سلطنت میں شامل کر لیا۔ معزولی کے بعد دو سال تک فورٹ ولیم اور مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند رہے۔ نظر بندی کے بعد بھی کلکتہ میں رہائش رکھی اور وہیں وفات پائی۔ بہت سی کتب تصنیف کیں۔ جن میں چند ایک بیان کی جاتی ہیں۔ دستور واجدی، ہیئت حیدری، صوت المبارک، صحیفہ، سلطانی، جوہر عروض وغیرہ۔ اکثر کتب نایاب ہیں۔

مرسلہ: نادر شاہ، کوہاٹ

دے کر میڈیا پر چھا جائے گا۔ اس نے کچھ صحافیوں کو ذاتی طور پر اس جبرتی شو میں شرکت کی دعوت بھی دی، جو اس کے ہمدرد جانے جاتے تھے۔

"کیا ہوا سب خیر تو ہے؟" ڈرائیور نے گاڑی جیسے ہی اسپتال کے احاطے کے قریب لگائی وہ اندر کی طرف تیز تیز چل دی۔ ارشد راستے میں ہی مل گیا۔ نور نے بے قراری سے پوچھا۔ میڈیا والے اس کے تاثرات لینے کے لیے مائک لے کر آگے بڑھے مگر اس نے سب سے شائستگی سے معذرت کرلی۔ ارشد ایسے وقتوں میں بہت کام آتا تھا وہ اسے بڑی مہارت سے بھیڑ سے نکال کر دوسری منزل پر لے گیا جہاں وجاہت ایڈمٹ تھا۔ وجاہت خان کے مداحوں اور چاہنے والوں کے ایک ہجوم نے اسپتال پر اپنا ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ میڈیا والے الگ خبروں کے متلاشی تھے۔

"ایک ٹانگ میں فریکچر ہوگیا ہے اسٹیج کافی بلند تھا شکر کریں جان بچ گئی۔" ارشد کو اس بھولی عورت پر ہمیشہ ترس آتا تھا۔ اس نے سچائی بتانے کے بعد اپنے منہ پر تالا سا ڈال لیا۔

"یہ سب ہوا کیسے؟" اس نے سوال پھر دہرایا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے اس کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں وجاہت خان کو ایمرجنسی میں رکھا گیا تھا۔

"بھابی...... آپ کو رج کی پلاننگ کیا پتا نہ تھی؟" وہ تھوڑا ہچکچایا۔ نجانے بیوی کو کچھ بتایا بھی ہے یا نہیں لمحہ بھر کو خاموش ہو کر اس کے چہرے کو تکنے لگا۔

"ہونہہ...... لیکن وہ سب تو کل ہونا تھا" نوری کے جواب نے اسے تسکین دی کہ واقعی بھابی سب باتوں سے آشنا ہیں۔

"جی...... بس وہ آج پریکٹس کے طور پر اسٹیج کا جائزہ لے رہے تھے کہ کہاں سے کرنا ہے اور کس طرف سے آکر اسٹاف انہیں سنبھالے گا کہ اچانک صاحب نے نیچے جھانکا اور توازن بگڑ گیا، پاؤں یوں سلپ ہوا کہ فرش پر جا گرے" اس نے آنکھوں دیکھا احوال بیان کیا۔ نور نے ایک سوگواری بھری آنکھوں سے دیکھا ٹلنے لگا۔

"ارے...... کراچی جانے کا انتظام کرو ہم جلد از جلد یہاں سے واپس جا رہے ہیں۔" نوری نے سیل فون پر اپنے فیملی ڈاکٹر سے مشورہ لینے کے بعد ارشد سے کہا تو وہ سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

اے انسان! "تم کیا کرتے ہو کبھی میری بات بھی مان لیا کرو بس شارٹ کٹ ڈھونڈتے رہتے ہو۔" نوری نے بیڈ پر لیٹے "ملیئر فی زرج خان" کو دیکھا اور اسے دل ہی دل میں مخاطب کیا۔

یہ اللہ کی پلاننگ تھی انسان کیا سمجھتا ہے خود تو بے بس اور مجبور ہے۔ ایک جھوٹا زرا سا مارا جانے کے لیے بڑا پلان بنانے والا کیسی کسمپرسی کی حالت میں اسپتال کے بستر پر دراز تھا۔ اس وقت تو ہلنے کی پوزیشن میں بھی نہ تھا۔ وجاہت خان اس حادثے کے بعد سے ملک بھر کے چینلوں کی بریکنگ نیوز بنا ہوا تھا۔ کہیں اس کے فن کو سراہا جا رہا تھا تو کہیں اس کی اچھائیوں کے نغمے گائے جا رہے تھے۔ اس کے بارے میں چھوٹی سی خبر دینے میں بھی چینلز ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ یہ سب تو اس کی توقعات سے بھی بڑھ کر ثابت ہوا، افسوس صد افسوس۔ وہ ان لمحوں سے لطف کشید کرنے سے بے نیاز اس بستر پر معذوروں کی طرح پڑا تھا۔ سہولتوں سے عاری چھوٹا سا یہ اسپتال، جائے حادثہ سے نزدیک واقع تھا اسی لیے فوری طور پر وجاہت کو یہاں لایا گیا۔ جہاں عام زندگی میں وہ علاج کروانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"یہ وہی شخص ہے نا جو ہر وقت اپنے آپ کو سجانے سنوارنے میں ہلکان رہتا تھا اس وقت کیسا حال سے بے حال ہو رہا ہے۔" نور کو عجیب سا دکھ ہوا۔ شوہر کو اسپتال کے سفید گاؤن پہنے دیکھ کر جس میں دواؤں کی بو بسی ہوئی تھی، نور نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تکلیف کے اثرات کے ساتھ رنگت بھی کچھ پیلی سی تھی۔ پاؤں پر پلاسٹر چڑھا کر باندھ دیا گیا تھا۔ ایک جگہ سر پر بھی جنڈ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بال منتشر تھے، سکون کی دواؤں کے زیر اثر وہ مدہوشی کی کیفیت میں تھا۔ ہمیشہ مہنگی سی مہکتی خوشبوؤں میں بسے رہنے والے اپنے محبوب اور شاندار شوہر کی حالت پر نوری کا دل بھر آیا۔ برسوں پہلے والا شوخ و چنچل اس کی محبت میں پاگل ہونے والا وجاہت خان اس کی نگاہوں میں پھرنے لگا۔

وہ بستر کے نزدیک رکھی بینچ گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئی اپنی تھرتھراتی انگلیاں وجاہت کے گھنے بالوں میں پھیرنے لگی۔ ایک دم اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ نوری ایک دم ڈر کر پیچھے ہٹ گئی اس کی وجہ سے نیند جو ٹوٹ گئی تھی۔ رنجانے کیا ہوا وہ سمجھ نہ پائی۔ وجاہت کی آنکھوں سے اسے دیکھ کر محبت کی روشنیاں پھوٹنے لگیں۔

"نور تم کہاں تھیں؟ کب سے پکار رہا تھا۔ اتنی آواز میں دے رہا تھا کہ گلا خشک ہوگیا...... تم بہت اچھی ہو مجھے بھی

چھوڑ کر نہ جاؤ پلیز...... میں بہت برا ہوں میری ساری خطاؤں کو معاف کر دینا' وہ ایک دم نور کا ہاتھ تھام کر بچوں کی طرح رو دیا۔ شاید بلندی سے پستی کا سفر طے کرتے ہوئے اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے یا موت کو اتنے قریب دیکھ کر اپنے گناہ یاد آ گئے۔ جو بھی ہوا تھا پر نور کو شوہر کے ہاتھوں کی گرمجوشی اور محبت کا یہ انداز بہت بھلا لگا۔

''کچھ نہ بولو نہ، ناراض ہو بھی، تم بہت اچھی ہو نور شاید قدرت نے مجھے تمہارا دل دکھانے کی یہ سزا دی ہے۔ کئی سالوں سے میں نے تمہارے ساتھ جو برا رویہ استوار کر رکھا تھا بس ایک بار اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانے دو تمہارے دل پر لگنے والے سارے زخموں کا ازالہ کر دوں گا۔'' وجاہت کی آنکھیں اس کے لہجے کی سچائی کا مکمل ساتھ دے رہی تھیں۔ نور کو لگا جیسے پیاسی دھرتی پر کن من بارش کی بوندیں گرنے لگی ہوں۔ اس کی پیاسی روح سیراب ہونے لگی۔

''نہیں، کہیں نہیں جاؤں گی کبھی نہیں۔'' نور نے اس کی تسلی کے لیے منہ سے اقرار کیا ورنہ وہ جاتی بھی تو کہاں جاتی کون سا روزن اپنے پیچھے کھلا چھوڑ آئی تھی۔ وجاہت خوف زدہ بچے کی طرح اسے تکے جا رہا تھا۔ نور کی آنکھوں سے جیسے پانی کے سوتے پھوٹ پڑے پر اس کا دل جانتا تھا کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔

☆☆☆

''نور...... تم میری آنکھوں کا نور ہو تمہاری وجہ سے میری بیماری دور بھاگ رہی ہے۔ پلیز تم بس ہر وقت میرے سامنے ہی رہا کرو۔'' نور نے اسٹک کی مدد سے چلنے میں اسے مدد دی تو وجاہت نے بیوی کو دیکھ کر پیار سے کہا۔ وہ ایک مہینے سے پلاسٹر کی وجہ سے گھر پر ہی تھا۔ باہر کی ساری سرگرمیاں ماند پڑیں تو بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزارنا بہت اچھا لگنے لگا۔ زندگی کو ایک نیا پیچ ملا۔ وہ دونوں زندگی کو انجوائے کرنے میں مشغول ہو گئے۔

نور بھی ایک دم فریش ہو گئی تھی کہ وجاہت کے سارے کام وہ اپنے ہاتھوں سے انجام دے رہی تھی مگر تھکن کا نام و نشان نہ تھا۔ جب سے روح کی تشنگی مٹی اسے لگا جیسے اس کے اندر تر و تازگی اتر آئی ہو۔ چہرے کی کھوئی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ ہر وقت مصروف رہتی اپنے ہاتھوں سے منہ دھلاتی کھانا کھلاتی دواؤں کی پابندی کراتی اپنے سہارے سے واک بھی کرواتی۔ وجاہت شرمندہ ہونے لگتا۔ اس کے کہنے کے باوجود نور نے میل نرس کا انتظام نہیں کروایا، زندگی سے جیسے تھکن کا خاتمہ ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ وہ اپنے محبوب کی سنگت میں مسرور تھی۔ پوری شادی شدہ زندگی میں اس کی جھولی میں کبھی ایسے ماہ و سال نہ گرے تھے۔ جو بیماری کے چند دنوں میں اس نے پالیے۔ وہ وجاہت کی مکمل توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اسے لگنے لگا جیسے کہ ساری خطائیں معاف ہو گئیں ہوں۔ سالوں کی محرومی کا میٹھا پھل اسے ملنے لگا ہو۔ وہ خوش رہنے لگی اور ہمیشہ ایسے ہی خوش رہنا چاہتی تھی۔

وجاہت کا پیر ٹھیک ہو گیا۔ اب ڈاکٹرز مطمئن تھے۔ صبح سے اسے اپنے روٹین کے کاموں پر جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ بھی گھر میں پڑے پڑے بور ہو رہا تھا۔ صبح اسے اپنے آفس جانا تھا۔ ارشد کے کئی فون آ چکے تھے۔ کچھ نئے پروجیکٹ سائن کرنے تھے۔ اسی لیے وہ جلدی سو گیا۔ نور نے برابر میں لیٹے شوہر کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کروٹ بدل کر نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆☆☆

او...... جاہل عورت...... کہاں ہو...... کچھ عقل بھی ہے کہ...... نہیں...... آج پہلی بار آفس جا رہا ہوں۔ یہ اتنے خراب کپڑے استری کروائے ہیں...... ویسے ہی دیر ہو رہی ہے۔ اب کیا پہنوں؟ غلطی ہو گئی جو تم جیسی پھوہڑ عورت سے شادی کر لی سدھر جاؤ ورنہ میرے لیے دوسری شادی کرنا مشکل نہیں۔'' وہ سپنوں کی وادیوں میں وجاہت کا ہاتھ تھامے گھوم رہی تھی کہ اچانک چیخنے چلانے کی آواز پر جلدی سے بستر سے اٹھ کر ڈریسنگ روم کی طرف بھاگی۔ جہاں سے وجاہت کے دھاڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ رات کو استری کیے جانے والے کپڑے لہرا لہرا کر تقریر کر رہا تھا۔ نور کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ ایک ٹک شوہر کا کھلتا بند ہوتا منہ دیکھ رہی تھی۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر وہ لڑکھڑائی۔ وہ بدل نہیں سکتا تھا کبھی بھی نہیں...... یہ ادراک بڑا جان لیوا تھا...... وہ چکرا کر گر گئی۔

خطا یہ نہیں تھی کہ وجاہت سے اس نے پیار کیا۔ خطا یہ بھی نہ تھی کہ سب کو ناراض کر کے اس سے شادی کر لی۔

اس کی سب سے بڑی خطا یہ تھی کہ اس سنگ دل...... اس ہرجائی کی فطرت سمجھتے ہوئے بھی ایک بار پھر اسے دل میں جگہ دے بیٹھی۔ اب محبتوں کا تاوان تو تا عمر ادا کرنا ہی تھا۔

قابلِ احترام مدیراعلیٰ سرگزشت

سلام تہنیت

انسان کی قدر و قیمت میں کیا دولت کی وجہ سے اضافہ ہوتا ہے؟ کیا انسان بے قدر و قیمت ہے؟ دولت کے ترازو میں اب خونی رشتے، ممتا و شفقت بھی تلنے لگی ہے؟ شاید میرے حالاتِ زندگی سے کوئی ایک شخص بھی سبق حاصل کرلے تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی کا حاصل یہی ہے۔

مطالب المولیٰ

(حیدر آباد)

پتا نہیں وہ کیسی گھڑی تھی جب میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی۔

اس کی ضرورت اس دن پیش آئی جب میں اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ جرمے جرمے کی خبریں تھیں۔ میں ابھی ایک جرمے کی خبر پڑھ ہی رہا تھا کہ میری بیوی درداتے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے تیور ہمیشہ کی طرح خراب تھے۔

''کیا کررہے ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔

"بیٹا۔ صومالیہ کی ایک خبر پڑھ رہا تھا۔" میں نے بتایا۔ "وہاں کے حالات بہت خراب ہوتے جارہے ہیں۔"

"تو پھر آپ کو کیا ہے۔ کیا آپ کے اخبار پڑھنے سے وہاں کے حالات بدل جائیں گے۔"

"نہیں بیٹا۔ حالات نہیں بدلیں گے لیکن میری نالج میں تو اضافہ ہوگا۔"

"اب اس عمر میں نالج میں اضافہ کرکے کیا ملے گا آپ کو۔" اس نے کہا۔ "اب تو آپ فرشتوں کے بارے میں جانکاری حاصل کریں۔"

"بیٹا۔ تمہاری یہی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

"بھئی چھوڑیں یہ سب۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے میکے والے آرہے ہیں۔ ایک تو ان کا آنا اتنا کم ہوتا ہے۔ بے چارے کبھی کبھی تو آتے ہیں۔"

"خدا کا خوف کرو۔ تمہارے میکے والے ہر ہفتے تو پڑے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور تم کہہ رہی ہو کہ کبھی کبھی آتے ہیں۔"

"اچھا اچھا رہنے دیا یہ سب۔ یہ لیں لسٹ۔ اور بازار سے سامان لے کر آجائیں۔" درخشاں نے ہزار کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں۔ اس میں سے اپنے خرچ کے لیے کچھ مت رکھ لیجیے گا۔ گھر میں اور پیسے نہیں ہیں۔"

اس کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی تھی۔ خدا جانے کیا سمجھ رکھا تھا اس نے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ آدمی جب ریٹائر ہو تو اس کے لیے یہی عقل مندی ہے کہ وہ زندگی سے بھی ریٹائر ہو جائے۔

بہت سے لوگ ریٹائر ہوجانے کے بعد اس لیے مزے میں رہتے ہیں کہ ان کے پاس پینشن کی اچھی خاصی رقم آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ دفتر سے اور بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

میں نے کلیئرنگ اور فارورڈنگ کی ایک فرم میں پورے تیس سال ملازمت کی تھی۔ پورے تیس سال، میں نے اپنی زندگی کے خوبصورت دن اس فرم کی نذر کردیے تھے لیکن حاصل کیا ہوا تھا کچھ بھی نہیں۔

اس فرم کے مالک بدھ بھائی انتہائی کنجوس انسان تھا۔ نام تو اس کا کچھ اور تھا لیکن وہ دیکھنے سے بدھو معلوم ہوتا تھا اسی لیے ہم اسے بدھو بھائی کہا کرتے۔

میں جب دفتر سے جانے لگا یعنی جب اس دفتر میں میرا آخری دن تھا تو بدھو بھائی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

میری طرح اس کی عمر بھی ڈھل چکی تھی لیکن دولت نے اس کے چہرے کی رونق برقرار رکھی ہوئی تھی۔

"طالب صاحب۔ آج تو اس دفتر میں آپ کا آخری دن ہے۔" اس نے کہا۔

"جی جناب۔"

"ہم آپ کے بہت احسان مند ہیں۔ آپ نے اس دفتر میں پورے تیس سال لگا دیے ہیں۔ آپ نے اسی دفتر میں کام کرتے ہوئے شادی کی۔ اسی دفتر میں کام کرتے ہوئے آپ کی اولادیں ہوئیں۔ اب آپ کے بچے بھی جوان ہوچکے ہیں۔"

"جی جناب۔ اس میں کیا شک ہے۔ بہت کچھ ملا ہے یہاں سے۔ جب تک زندگی رہی اس دفتر کو نہیں بھلا سکوں گا۔"

"ہماری فرم نے یہ سوچا ہے کہ کل آپ کے جانے پر ایک الوداعی پارٹی دی جائے۔" اس نے بتایا۔ "یہ ہر ایک کے ساتھ نہیں ہوتا لیکن آپ کی بات دوسری ہے۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے جناب۔"

"اور ہاں۔ کل فرم کی طرف سے آپ کو ایک چیک بھی دیا جائے گا۔" اس نے کہا۔ "اگرچہ یہ آپ کی اتنے دنوں کی خدمت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوگا پھر بھی آپ کا یہ حق بنتا ہے۔"

میں بدھو بھائی کے احسان کے بوجھ تلے دبا جارہا تھا۔ وہ شخص میری مشکل آسان کرنے جارہا تھا۔ گھر کے کتنے کام پڑے ہوئے تھے۔ میرے کمرے کی چھت ٹپکنے لگی تھی۔ اس کی مرمت کروانی تھی۔

بدھو بھائی کے کمرے سے نکلا تو دفتر کے ساتھیوں نے گھیر لیا۔ سب ہی پوچھ رہے تھے کہ بدھو بھائی نے کیا کہا۔

میں نے جب سب بتایا تو ہر ایک میری قسمت پر رشک کرنے لگا۔

"بہت بڑی بات ہے طالب صاحب۔" ایک نے کہا۔ "ورنہ یہ آدمی تو کسی کو ایک پائی بھی نہ دے۔"

"ہاں جی۔ بس اللہ کی مہربانی ہے۔"

"میرے اندازے کے مطابق کم از کم دس لاکھ کا تو چیک ہوگا۔" دوسرے نے خیال ظاہر کیا۔ "دو بھی میں کم بتا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی ہو۔"

"ارے بھائی۔ کم از کم بیس لاکھ ہوں گے۔" تیسرے نے کہا۔

اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں اور میں دفتر والوں سے مل کر گھر واپس آگیا۔ میں نے فی الحال کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں سب کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

بہرحال دوسرے دن میں آرام سے سو کر اٹھا۔ کیونکہ اس دن مجھے دفتر تو جانا نہیں تھا۔ شام کو تیار ہو کر پارٹی میں جانا تھا جو دفتر کی طرف سے میرے اعزاز میں دی جا رہی تھی۔

دفتر پہنچا تو والہانہ استقبال ہوا۔ درمیان کے ہال میں پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا۔ کولڈ ڈرنک کے ساتھ ساتھ سموسے بھی رکھے ہوئے تھے۔

بدبد بھائی بھی ایک طرف بیٹھے پیار بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے کچھ ساتھیوں نے میرے لیے کچھ تقریریں کیں۔ جن میں کچھ الٹی سیدھی تعریفیں کی گئیں اس کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ میں کچھ بولوں، میں نے بھی بدبد بھائی کی اس فرم کی تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملا دیے۔

میں نے اپنی تقریر میں بدبد بھائی کو اس دور کا حاتم طائی ثابت کر دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ میں یہاں کی بے شمار یادیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

خوب خوب تالیاں بجائی گئیں۔ اس کے بعد بدبد بھائی کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بھی میری تعریفیں کیں اور آخر میں یہ کہا کہ فرم کی طرف سے طالب صاحب کو پورے دس ہزار روپوں کا چیک پیش کیا جا رہا ہے۔

دس ہزار کا سن کر میرے تو بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ کہاں تو میں دس پندرہ لاکھ سوچ کر بیٹھا تھا اور کہاں صرف دس ہزار۔

لعنت ہو ایسی کنجوسی پر اور اس پر بدبد بھائی کا اس انداز سے ہر طرف دیکھنا جیسے اپنی آدھی سلطنت میرے نام کر دی ہو۔

دس ہزار کا چیک لیتے ہوئے ایسی شرمندگی ہو رہی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ دفتر کے ساتھی تک ایسی دریا دلی پر بھک رہ گئے تھے۔

بہرحال بات پیسوں کی تھی۔ تو ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے صرف دس ہزار ملے تھے۔ اچھا ہوا کہ میں نے گھر میں تذکرہ نہیں کیا تھا ورنہ میری بہو دردانہ طعنے دے دے کر میرا دماغ خراب کر دیتی۔

اب ایسے آدمی کی کیا عزت اور وقعت۔ جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اسی لیے میں دن رات اپنے کمرے میں ہی پڑا رہتا اور میری بہو یہ سمجھتی تھی کہ میں سوتے لاتے ہوئے زندگی بارا کرتا ہوں۔ کیا زمانہ آگیا تھا۔

بہرحال اس کے دبے ہوئے ہزار کے نوٹ کو لے کر میں مارکیٹ آگیا۔ ڈھیر سا سامان منگوالیا تھا اس نے۔ وہ سب لے کر جب گھر پہنچا تو اس کے میکے والے آچکے تھے اور ڈرائنگ روم سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں نے کچن میں جا کر سارا سامان اور بقایا پیسے اس کے حوالے کر دیے تھے۔

"ٹھیک ہے ابا۔ سب چیزیں آگئیں اور میرے میکے والے بھی آچکے ہیں۔" دردانہ نے کہا۔ "اب آپ ایسا کریں۔ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ جائیں۔ آپ کا کھانا آپ کے کمرے میں آجائے گا۔"

"کیا مطلب؟" میں بھنا گیا تھا۔ "کیا میں تمہارے گھر والوں کے سامنے نہیں آسکتا۔"

"کیا کریں گے ابا۔" دردانہ نے کہا۔ "سب آپس میں ہنس بول رہے ہیں۔ آپ خوامخواہ ہمارے درمیان بیٹھ کر بور ہوں گے۔ آپ اپنے کمرے میں جا کر وہ کتاب پڑھیں جو آپ کل خرید کر لائے تھے۔ کیا نام ہے اس کا۔ موت کا منظر۔ اس کو پڑھتے رہیں۔"

دردانہ کی باتیں سن کر میں بھنا گیا تھا۔

یعنی اس گھر میں میری اب کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ "بہو۔ تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اپنے دوست برکت صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ابا۔" دردانہ خوش ہوگئی تھی۔ "آپ ضرور جائیں اور کوشش کریں کہ وہاں زیادہ سے زیادہ دیر تک رہ سکیں۔ آخر وہ بھی تو یہاں آکر جانے کا نام نہیں لیتے۔"

"اچھا بیٹا جا رہا ہوں میں۔ خدا تم کو خوش رکھے۔"

میں اپنے دوست برکت کے پاس آگیا جو ہمارے

محلے سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ وہ بھی میری طرح ایک ریٹائرڈ بندہ تھا۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد میری طرح اس کو صرف دس ہزار نہیں ملے تھے بلکہ چالیس لاکھ ملے تھے اسی لیے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ اس کے بیٹے اور بہوئیں اس کے آگے پیچھے ہوا کرتیں۔

میں برکت کے پاس جا کر خاموش ہو گیا۔ ''کیا بات ہے میرے یار۔'' اس نے اداس دیکھ کر پوچھا۔ ''کوئی پرابلم ہو گئی ہے کیا۔''

''یار برکت۔ اپنی زندگی تو دو کوڑی کی ہو گئی ہے یار۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''گھر میں اپنی کوئی عزت ہی نہیں ہے۔'' میں نے اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

''یہ دنیا واقعی پیسوں کی ہے۔'' وہ بھی میری داستان سن کر اداس ہو گیا تھا۔ ''انسان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں رہی۔''

''یار میرا دل چاہتا ہے کہ یا تو میں خودکشی کر لوں یا یہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں۔''

''ایسی حماقت بھی مت کرنا۔'' برکت نے کہا۔

''تو پھر کیا کروں۔''

''فرض کرو۔ اگر تمہارے پاس پانچ کروڑ روپے آ جائیں تو تمہارے حالات بدل جائیں گے۔'' اس نے پوچھا۔

''خدا کے لیے ایسی بے تکی باتیں نہ کرو۔''

میرے سوال کا جواب دو۔ تمہارے حالات بدلیں گے یا نہیں۔

''ظاہر ہے بدل جائیں گے۔''

''تو پھر یہ سمجھ لو کہ پانچ کروڑ روپے آ گئے۔''

''ارے کہاں سے آ گئے۔''

''تم کو یہ شو کرنا ہو گا کہ تمہارے پاس پانچ کروڑ آ گئے ہیں۔'' برکت نے کہا۔ ''اس کے لیے تمہیں باقاعدہ ایک ڈراما کرنا پڑے گا۔''

''ڈراما کیسا؟''

''فرض کرو۔ تم نے دس بارہ سال پہلے ساؤتھ افریقا کی کسی ڈربی کا ٹکٹ خریدا تھا۔ جس کو رکھ کر تم بھول گئے۔ اب تمہارے نام پانچ کروڑ کا انعام نکل آیا تھا۔ تم کو پتا بھی نہیں چل سکا لیکن وہ اتنے ایماندار لوگ تھے کہ برسوں تک تمہیں تلاش کرتے رہے پھر اب تم سے رابطہ کیا ہے اور تمہارے اکاؤنٹ میں پیسے ٹرانسفر ہو گئے ہیں لیکن تم ان پیسوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''خدا کے بندے یہ سارا ڈراما ہو گا کیسے؟ کہاں سے آئے گا ڈربی کا ٹکٹ۔ کہاں سے آئے گا فون۔''

''تم فکر مت کرو۔ سارا بندوبست میں کر دوں گا۔ اتفاق سے میرے پاس ڈربی کا ایک پرانا ٹکٹ پڑا ہوا ہے۔ جو بے کار پڑا ہوا ہے۔ جسے میں نے یادگار کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ وہ میں تم کو دے دوں گا۔ گھر والوں کو یقین دلانے کے لیے تم وہی ٹکٹ دکھا دینا۔''

''چلو۔ اتنا ہو گیا۔ اور وہ فون۔ جنوبی افریقا سے فون کون کرے گا۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔ افریقا میں میرا بھتیجا ہے وہ تم کو فون کر دیا کرے گا اور تم گھر والوں کو نمبر دکھا کر یہ یقین دلاتے رہنا کہ لاٹری کے منتظمین کا فون ہے۔ تم کو تھوڑی سی اداکاری کرنی ہو گی۔''

''لیکن میرے دوست یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے۔''

''جب تک چلا سکتے ہو چلاؤ۔'' برکت نے کہا۔ ''زندگی کے آخری لمحات میں تو کچھ خوشیاں سمیٹ لو چاہے جھوٹ ہی کے سہارے سہی۔ لیکن اس طرح تم پُرسکون رہو گے۔ تمہاری یہ والی کیفیت ختم ہو جائے گی۔ ڈپریشن سے نجات مل جائے گی۔''

''چلو مان لیا۔'' میں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''لیکن اس کی ابتدا کیسے ہو گی۔''

''یار کیا یہ بھی بتانا ہو گا۔ دیکھو سب سے پہلے ساؤتھ افریقا سے فون آئے گا۔ اس کے بعد تم اپنے سامان، اپنی کتابوں، الماریوں درازوں وغیرہ کی اس طرح تلاشی لینا جیسے کچھ تلاش کر رہے ہو۔ یہ پہلا مرحلہ ہو گا۔ اس کے بعد دو چار دنوں کے وقفے سے پھر ایک فون آئے گا اور اس بار گھر والوں کے سامنے بلند آواز میں بولنا۔''

''ارے جناب۔ بس دو دن ٹھہر جائیں۔ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں کہاں رکھ کر بھول گیا ہوں لیکن وہ ہے میرے ہی پاس۔ بس دو دن رُکے رہیں۔''

یہ جملہ میں اپنے گھر والوں یعنی بیٹے اور بہو کو سنانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ برکت نے مجھے جو کچھ بتایا تھا۔ میں

نے اسی پر عمل شروع کر دیا تھا۔
پہلے تو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ پورے سامان کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا اس دوران میں بہو چھانک جھانک کر دیکھ چکی تھی لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے تو یہ امپریشن دینا تھا کہ میری کوئی پرانی چیز گم ہو گئی ہے۔ جس کو تلاش کرتا چلا جا رہا ہوں۔
میں نے کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے بھی پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ لیکن جب ساؤتھ افریقا سے برکت کے بھتیجے کا فون آ گیا اور میں نے پلاننگ کے تحت رٹے جملے بولے تو پھر بیٹے نے سوال کیا۔ ''کیا بات ہے ابو۔ آپ کیا رکھ کر بھول گئے ہیں۔''
''وہ ایک ٹکٹ ہے چھوٹا سا۔'' میں نے سرسری انداز میں بتایا۔
''کیسا ٹکٹ؟'' بہو نے چونک کر پوچھا۔ ''جس کے لیے آپ نے پورا کمرا الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔''
''ڈربی کا ٹکٹ۔'' میں نے بتایا۔ ''اب سے بارہ سال پہلے خریدا تھا۔''
''یہ ڈربی کیا ہوتی ہے۔'' بیٹے نے پوچھا۔
''بیٹے۔ پوری دنیا میں گھوڑوں کی سب سے بڑی ریس ہوتی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اس میں اربوں کے انعامات ہوتے ہیں میں نے یوں ہی ایک ٹکٹ خرید کر رکھ لیا تھا۔''
''تو پھر کیا ہوا۔''
''میں نہیں جانتا۔ میرا مطلب ہے کہ ڈربی کے منیجر کا فون تو آ رہا ہے۔ لیکن وہ کچھ بتا نہیں رہا۔''
''پوچھیں اس سے کہ وہ کیوں فون کر رہا ہے۔'' بیٹے کی آواز جذبات کی شدت سے کانپنے لگی تھی۔
''اس نے دو دن کے بعد فون کرنے کو کہا ہے۔'' میں نے بتایا۔
اس دن میں نے بیٹے اور بہو کے رویے میں ایک واضح تبدیلی دیکھی۔ بہت دنوں کے بعد انہوں نے اپنے ساتھ کھانے پر بٹھایا تھا ورنہ میرا کھانا میرے کمرے میں ہی بھیج دیا جاتا تھا۔
اس رات سب بہت خوش تھے۔
میں بھی بظاہر ان کی خوشی میں ان کا ساتھ دے رہا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں نے یہ کیسی مصنوعی خوشی حاصل کر لی تھی اور یہ ڈھونگ کب تک

حیرت انگیز مماثلت

☆ ابراہم لنکن 1846ء میں کانگریس کے لیے منتخب ہوئے۔
جان ایف کینیڈی 1946ء میں کانگریس کے لیے منتخب ہوئے۔
☆ ابراہم لنکن 1860ء میں صدارت کے لیے منتخب ہوئے۔
جان ایف کینیڈی 1960ء میں صدارت کے لیے منتخب ہوئے۔
☆ ابراہم اور کینیڈی سات سات الفاظ پر مشتمل ہیں۔
☆ دونوں ہی سول رائٹ سے متعلق تھے۔
☆ دونوں کے ایک ایک بچے وائٹ ہاؤس کی رہائش کے دوران انتقال کر گئے۔
☆ دونوں صدور جمعہ کے دن گولیوں کا نشانہ بنے۔
☆ دونوں صدور کے سر میں گولی ماری گئی۔
☆ لنکن کے سیکریٹری کا نام کینیڈی تھا۔
☆ کینیڈی کے سیکریٹری کا نام لنکن تھا۔
☆ دونوں کے قاتل جنوبی علاقے کے تھے۔
☆ دونوں کو کامیاب کرانے میں جنوبی ریاست کے جانسن کی کوشش تھی۔
☆ اینڈریو جانسن جس نے لنکن کو کامیاب کرایا۔ 1808ء میں پیدا ہوا تھا۔
☆ لینڈن جانسن جس نے کینیڈی کو کامیاب کرایا 1908ء میں پیدا ہوا تھا۔
☆ جان ولکس بوتھ جس نے لنکن کو قتل کیا 1839ء کو پیدا ہوا۔
☆ لی ہاروے اوسوالڈ جس نے کینیڈی کو قتل کیا 1939ء کو پیدا ہوا۔
☆ دونوں کے قاتل تین ناموں سے مشہور تھے۔
☆ دونوں قاتلوں کے نام پندرہ الفاظ پر مشتمل تھے۔
☆ لنکن کینیڈی : تھیٹر میں قتل ہوئے۔
☆ کینیڈی جس کار میں قتل ہوئے اس کا نام لنکن تھا۔
☆ بوتھ تھیٹر سے فرار ہوا اور گودام سے پکڑا گیا۔
☆ اوسوالڈ گودام سے فرار ہوا اور تھیٹر سے پکڑا گیا۔
☆ بوتھ اور اوسوالڈ ٹرائل سے پہلے قتل کر دیے گئے۔
☆ قتل سے ایک ہفتے پہلے لنکن منرو، میری لینڈ میں تھے۔
☆ قتل سے ایک ہفتے پہلے کینیڈی مارلن منرو کے ساتھ تھے۔

مرسلہ: منعم اولیا

رہ سکتا تھا۔

دوسرے دن سارا تھہ افریقا سے پھر فون آگیا۔ اس بار میں نے گھر والوں کے سامنے بلند آواز میں بتا دیا کہ ہاں وہ ٹکٹ مل چکا ہے۔

اس کے بعد بہت دیر تک دوسری طرف کی باتیں سنتا رہا۔ پھر فون بند کرکے بیٹے اور بہو کی طرف دیکھا۔ "کیا ہوا ابو۔ کیا بات ہوئی۔ وہ کیا کہہ رہے تھے؟"

"بیٹے۔" میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "وہ یہ بتا رہا تھا کہ میرے اس ٹکٹ پر میرا انعام نکل آیا تھا لیکن کسی نے کلیم نہیں کیا۔ برسوں کے بعد ان لوگوں کو پتا چلا کہ اس نمبر کا ٹکٹ کس کے پاس ہے۔"

"لیکن انہیں کیسے پتا چلا کہ اس نمبر کا ٹکٹ آپ کے پاس ہے۔" بہو نے پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے۔ جس وقت اس ریس کا ٹکٹ خریدا جاتا ہے تو پوری تفصیل لکھنی پڑتی ہے۔ اپنا نام، پتا، شہریت وغیرہ سب جا کر وہ کنفرم کرتے ہیں۔"

"ابو یہ تو بتائیں کتنے کا انعام نکلا تھا؟" بیٹے نے پوچھا۔

"ٹھیک ہی رقم تھی۔"

"پھر بھی کتنا تھا۔"

"پانچ کروڑ۔" میں نے بتایا۔

"کیا؟ پانچ کروڑ؟" ان دونوں کی سانسیں جیسے رک سی گئی تھیں۔ "یعنی ایک دو تین چار پانچ، پانچ کروڑ۔"

"ارے بھائی کیا ہوگیا ہے تم دونوں کو۔" میں نے کہا۔ "اتنے بے خود کیوں ہوئے جا رہے ہو۔"

"ابو یہ بات ہی ایسی ہے۔" بیٹے نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "ابو آپ نے کیسی زبردست خبر سناری ہے۔"

"ابو، میں آپ کے لیے بنانا شیک بنا کر لاتی ہوں۔" ریحانہ نے کہا۔

غرضیکہ اس دن سے اس گھر میں میری آؤ بھگت شروع ہوگئی۔ دونوں بچھے جا رہے تھے۔ انتہا یہ کہ محلے والوں نے بھی احترام کرنا شروع کردیا تھا۔

وہ دکاندار حضرات جو پہلے مجھے دیکھ کر اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا کرتے۔ اب خود ہی آوازیں دیا کرتے۔ "ارے طالب صاحب، کبھی ہم غریبوں پر تو نظر کرلیا کریں۔"

"طالب صاحب۔ میں نے ٹھنڈی بوتل کے لیے چھوٹے کو بھیج رہا ہے۔ دو منٹ تو رک جائیں۔"

پتا یہ چلا کہ ریحانہ نے محلے کی کسی عورت کو یہ خوشخبری سنائی تھی اور اس نے پورے محلے میں یہ خبر پھیلا دی۔

پورے محلے میں میری ایک جھوٹی شان ہوگئی تھی۔

اور اس جھوٹی شان کا خمیازہ اس وقت بھگتنا پڑا۔ جب محکمۂ ٹیکس کے کچھ لوگ میرا پتا پوچھتے ہوئے میرے پاس آگئے۔

"جناب۔ آپ قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔" ایک نے کہا۔

"کیسی خلاف ورزی؟"

"آپ کے پاس پانچ کروڑ ہیں۔ لہٰذا آپ پر ویلتھ ٹیکس لاگو ہوگیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "آپ کو پچیس لاکھ دینے ہوں گے۔ کل ٹیکس کے محکمے میں تشریف لے آیئے گا۔"

اب میں پھنس چکا تھا۔ بہت بری طرح۔

ٹیکس کے محکمے کو پچیس لاکھ کہاں سے لا کر دیتا۔ اگر سچ بتا دیتا تو میری ساکھ کا کیا ہوتا۔

اس کے بعد بہو کا کیا رویہ ہو جاتا۔ محلے میں میری جو جھوٹی عزت بن چکی تھی۔ اس کا کیا ہوتا، میں تو اس ترکیب پر عمل کر کے پچھتا رہا تھا۔

بالآخر میں نے سب کو سچ بتا ہی دیا۔

ٹیکس والے تو میری حالت پر افسوس کرتے ہوئے چلے گئے لیکن جب بہو اور بیٹے نے یہ سنا کہ میں نے یہ جھوٹ کس لیے بولا تھا تو میں نے ان کی آنکھوں میں بھی پشیمانی دیکھی۔

"سوری ابو۔" میرے بیٹے نے کہا۔ "ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ ہم سے اتنے مایوس اور بددل ہو چکے ہوں گے۔"

"ہاں ابو۔" بہو نے بھی کہا۔ "ہم نے جو کچھ کہا۔ اس پر ہم شرمندہ ہیں۔"

میں نے مسکرا کر دونوں کو گلے لگا لیا تھا۔ مجھے گھر والوں کی محبت مل گئی تھی اور یہ محبت پانچ کروڑ سے کہیں زیادہ تھی۔

احسان

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم
سرگزشت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ 91ء سے اسے پڑھ رہا ہوں۔ نہ صرف پڑھ رہا ہوں بلکہ جمع کر کے رکھ بھی رہا ہوں۔ تقریباً تمام شمارے میرے پاس محفوظ ہیں اور اسے میں قیمتی خزانے کی طرح سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قاری تو پرانا ہوں لیکن تحریر پہلی بار ارسال کر رہا ہوں۔ بس لکھنے کا اسٹائل عام ڈگر سے ہٹ کر اختیار کیا ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ اس کا مرکزی کردار میں خود ہوں اور تمام باتیں سچ ہیں۔
نوید
(لاہور)

اس وقت میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔
انسان جب زندگی اور موت کے دوراہے پر ہو تو پھر اس کے لاشعور اور شعور میں صرف ایک خواہش رہ جاتی ہے اور وہ ہے زندہ رہنے کی خواہش۔
کچھ دن اور جینا چاہتا ہے۔ کسی حال میں مرنا نہیں چاہتا۔ حالانکہ میں سخت تکلیف میں تھا۔ میرا ایک گردہ ناکارہ ہوگیا تھا۔ ڈیالسس پر تھا، تڑپتا رہتا تھا اس کے

باوجود زندہ رہنے کی خواہش دامن سے چمٹی ہوئی تھی۔

میں شہر کے ایک اچھے اسپتال میں تھا۔ یہاں کے ڈاکٹرز اس شعبے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے صاف صاف بتا دیا تھا۔ "نوید صاحب۔ آپ کا علاج صرف ایک ہے اور وہ ہے گردے کی تبدیلی۔ اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں ہے۔"

"اب میں گردہ کہاں سے لاؤں ڈاکٹر صاحب؟"

"اس کے لیے آپ کے گھر والوں کو آپ سے تعاون کرنا پڑے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یا تو گھر کا کوئی شخص اپنا گردہ دے دے یا باہر کا کوئی شخص گردہ ڈونیٹ کرے۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں نے شادی نہیں کی تھی اس لیے بیوی بچے نہیں ہیں۔ بھائی ہے لیکن وہ کینیڈا میں رہتا ہے۔ اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میرے لیے اپنی زندگی خراب کرے۔"

"اوہ۔" ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ تو بہت مشکل سچویشن ہے۔"

"ڈاکٹر آپ ہی لوگوں کو کچھ کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"ایک بات بتائیں کیا آپ سگریٹ پیتے ہیں۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ بالکل بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس دھواں اڑانے والی بلا سے بہت دور رہا ہوں۔"

"اور شراب؟"

"ارے نہیں ڈاکٹر صاحب۔ جو شخص سگریٹ کے بھی قریب نہ جاتا ہو وہ شراب کیسے پیے گا۔"

"لڑکیوں کی صحبت سے کوئی دلچسپی ہے۔"

"توبہ کریں۔ عورت نام کی مخلوق سے تو وحشت ہوتی ہے۔ اسی لیے شادی نہیں کی۔"

"دنیا کی سیر سے کوئی دلچسپی ہے۔"

"ارے صاحب۔ میں اپنا محلہ چھوڑ کر باہر نہیں جاتا۔ دنیا کی سیر تو بہت دور کی بات ہے۔"

"مذہبی رجحان۔ میرا مطلب ہے کہ دین کی جانب سے کوئی دلچسپی۔"

"کوئی خاص نہیں۔ بس مسلمان سمجھتا ہوں اپنے آپ کو۔ میرے خیال میں اتنا ہی بہت ہے۔" میں نے کہا۔

"کوئی اور دلچسپی کوئی اور مشغلہ۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں نے اس قسم کی کوئی مصیبت نہیں پالی۔ حتیٰ کہ لائبریری تک نہیں رکھتا۔ اخبار بھی نہیں پڑھتا ہوں۔"

"خدا کے بندے۔" ڈاکٹر اس دفعہ جھنجھلا کر بولا۔ "جب تمہاری زندگی میں کچھ ہے ہی نہیں تو پھر کس لیے زندہ رہنا چاہتے ہو۔"

"یہ کیا بات کی ڈاکٹر صاحب آپ نے۔" میں ناراض ہو گیا تھا۔ "زندہ رہنا تو ہر انسان کا حق ہے۔ اگر میں بھی رہنا چاہتا ہوں تو اس میں کیا برائی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے سمجھ گیا۔" ڈاکٹر اکتا کر بولا۔ "لیکن گردے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

"وہ میں کہاں سے کروں ڈاکٹر صاحب۔"

"ایک منٹ۔" ڈاکٹر کو جیسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ "ایک صاحب آئے تھے میرے پاس۔ وہ اپنا گردہ ڈونیٹ کرنا چاہتے تھے۔ اپنا فون نمبر لکھوا کر گئے ہیں۔"

"پلیز ڈاکٹر۔ کسی طرح پکڑیں ان کو۔"

"ہو سکتا ہے وہ کچھ پیسوں کی ڈیمانڈ کریں۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ دس بیس ہزار روپے دے دوں گا ان کو۔" میں نے کہا۔

"کمال کرتے ہیں آپ۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ صرف دس بیس ہزار میں کوئی آپ کو اپنا گردہ دے دے گا۔ لاکھوں کی ڈیمانڈ ہوتی ہے مسٹر۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ پلیز۔ ایک بار ان سے ملا تو دیں۔ میں انہیں منانے کی کوشش کروں گا ورنہ پیسوں کا بندوبست تو کہیں سے کرنا ہی پڑے گا۔"

"اوکے۔ میں ان کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "خدا کرے ان کا فون نمبر مل جائے۔"

دوسرے دن ڈاکٹر نے بتایا کہ ان صاحب سے بات ہو گئی ہے اور وہ اگلے دن تم سے ملنے آ رہے ہیں۔ ان کا نام نگلن ہے۔

نام چاہے جو بھی ہو لیکن میرے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ ایک شخص مجھے اپنا گردہ دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ نگلن میاں کتنے پیسوں کی ڈیمانڈ کرتے ہیں۔

میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ میں ان کے پیروں پر گر جاؤں گا۔ رو رو کر ان سے ایک گردے کی بھیک مانگوں گا اگر انہوں نے دے دیا تو میری زندگی بچ جائے گی۔

دوسری شام کو کلن میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ان کو ڈاکٹر ہی اپنے ساتھ لایا تھا۔ کلن نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ ”فکر مت کرو پہلوان۔ اب میں آ چکا ہوں۔ ارے تیری موٹی صورت پر تو تین چار گردے قربان کیا۔“

”بہت بہت شکریہ کلن بھائی۔“

”بس بس یہی چاہیے۔“ کلن اچھل پڑا۔ ”مجھے زندگی بھر اپنا بھائی سمجھتے رہیو اور تم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔“

”نوید صاحب۔ کلن صاحب اپنا گردہ مفت دینے کو تیار ہیں۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”آپ سے ایک پیسا بھی نہیں لیں گے۔“

”کیا؟“ میں حیران رہ گیا تھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ایسا ہی ہے بھائی میاں۔“ کلن نے کہا۔ ”حیران مت ہو۔ آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے۔ اپنے ہم تو مرتے ہوئے کتنے کو بھی گردہ دینے کو تیار ہو جائیں۔ تم تو پھر بھی اس سے بہتر ہو۔“

”پھر بھی کلن صاحب۔ آپ کی کوئی نہ کوئی خدمت تو ضرور کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”بھائی میاں۔ بس خدمت یہی ہوگی کہ کلن خان پیار کو ترسا ہوا ہے۔ اپنا پرایا کوئی نہیں ہے۔ بس اپنا بڑا بھائی سمجھ لینا۔ پھر دیکھ لینا کلن خان تو اب میں کیسی محبت کرتا ہے۔ یہ تو دنیا اسی کی ہے بھائی میاں۔ عزت کا جواب عزت، محبت کا جواب محبت۔“

میں نے فرط جذبات سے کلن خان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کلن خان۔ آج سے تم میرے بڑے بھائی ہو۔ میں تم کو زندگی بھر اپنا دوست سمجھوں گا۔“

”لو جی۔“ کلن خان نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ”اب جلدی سے تم لوگ اپنا کام دکھاؤ۔“

”ابھی تو کئی مرحلے ہیں کلن صاحب۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”بلڈ گروپ دیکھنا ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کا جسم آپ کے گردے کو قبول کرتا ہے یا نہیں۔“

”اپنے قری کی چیز ہر ایک کو قبول ہوتی ہے۔“ کلن خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب مجھے بھی اندازہ ہو گیا کہ کلن خان ایک شگفتہ مزاج انسان ہے۔ اب گردے کی چاہے جو بھی پوزیشن ہو۔ ایک مخلص دوست مجھے مل رہا تھا۔ کلن خان کے مخلص ہونے میں کیا شک تھا۔ جو شخص بغیر کسی لالچ کے اپنا گردہ کسی کو ڈونیٹ کر رہا ہو۔ وہ کتنا بڑا انسان ہوگا۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔

بہرحال تین چار دنوں کے بعد ڈاکٹر نے خوش خبری سنا دی کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے اور کلن خان کا گردہ مجھے لگایا جا سکتا ہے۔

وہ دن میرے لیے کیسی خوشی کا ہوگا۔ اس کا اندازہ صرف اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔ زندگی ایک بار پھر قریب آ گئی تھی۔ وہ زندگی جو گردے کی وجہ سے دور ہونے لگی تھی۔

بہرحال گردے کی تبدیلی کا مرحلہ بھی مکمل ہو گیا۔ کلن خان کا ایک گردہ میرے بدن میں منتقل ہو چکا تھا۔ اب میں دوبارہ ایک صحت مند انسان تھا۔ ایک ہفتے کے بعد ہم دونوں کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

میں یہ چاہتا تھا کہ کلن خان کو اپنے ساتھ لے چلوں لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ ”بھائی میاں محبت ہے تمہاری، میں پھر آؤں گا تمہارے پاس۔“

میں نے اس وقت بھی کلن خان کو کچھ پیسے دینے چاہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ”نہیں بھائی میاں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس تمہاری محبت چاہیے۔“

بہت بڑا آدمی تھا کلن خان۔ بہرحال ایک مہینے تک اس کا کوئی پتا نہیں چلا۔ میں بھی اب بالکل تندرست ہو چکا تھا۔ زخم بھر گیا تھا میرا۔

ایک شام میرے کئی دوست میرے گھر پر مبارکباد دینے کے لیے جمع ہوئے۔ میں نے شاید یہ نہیں بتایا ہے کہ میں ایک شاعر اور ادیب تھا۔

بہت بڑے حلقے میں مجھے احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ پچھلے دنوں میری ایک کتاب آئی تھی۔ نظریہ ارتقا۔ اس کتاب نے بڑی پذیرائی حاصل کی تھی۔

سارے دوست میری صحت کی مبارکباد دینے کے ساتھ ساتھ میری کتاب پر گفتگو کے لیے بھی جمع ہوئے تھے۔ ابھی ہم نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اپنی باتیں شروع کی تھیں کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔

ہو سکتا ہے کہ پھر کوئی دوست آ گیا ہو۔ میں نے دروازہ کھولا تو کلن خان کھڑا تھا۔ اس کو دیکھ کر اچھا بھی لگا تھا اور ایک الجھن سی بھی ہوئی تھی۔

اس کا آنا سر آنکھوں پر لیکن اس وقت میرے گھر میں دانشور جمع تھے۔ ان کے درمیان کسی غیر ادبی انسان کی موجودگی اکورڈ ہو سکتی تھی۔

بہر حال میں اس کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

میں نے سب سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ ''یہ کلن خان صاحب ہیں انہوں نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔''

''بھائی میاں احسان بھی تو بتاؤ۔'' کلن خان نے بلند آواز میں کہا۔ ''بھائیو۔ ذرا سی بات ہے اور بہت بڑی بات بھی ہے۔ میں نے ان کو اپنا گردہ دیا ہے اور وہ بھی ایک پائی لیے بغیر۔''

بہت عجیب سا لگا تھا۔ اس کم بخت کو یہ سب بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ بہر حال، دوستوں نے بڑی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کے اس جذبے کی تعریفیں کیں۔

کلن خان بھی ایک طرف بیٹھ گیا گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ختم ہوا تھا۔

''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا نوید صاحب کی آپ نے جو نظریہ ارتقا پر اپنے ماحول کے حوالے سے بحث کی ہے وہی سب سے اہم ہے۔ کیونکہ ڈارون کے بعد کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔ سب ہی ڈارون کو حرفِ آخر سمجھ کر بیٹھ گئے تھے۔''

''کیا نوید نے کوئی کتاب لکھی ہے۔'' اچانک کلن خان نے پوچھ لیا۔

''جی ہاں۔ میں نے نظریہ ارتقا پر کتاب لکھی ہے۔'' میں نے جز بز ہوتے ہوئے بتایا۔

''بھائی میاں۔ اب یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ نظریہ ارتقا کیا ہوتا ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر تم نے لکھی ہے تو پھر زوردار ہی ہوگی۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔'' ایک صاحب نے ہنس کر پوچھا۔

''یہ لو۔ میں نے نوید بھائی کو اپنا گردہ دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم ہوگا تو کس کو ہوگا۔'' کلن خان نے کہا۔ سب ہنسنے لگے تھے جبکہ میں بری طرح شرمندہ ہو گیا تھا۔ اس کم بخت کو اس وقت ایسی بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

''بھائی میاں۔ ہیرو ہیروئن کے نام کیا رکھے ہیں؟'' کلن خان نے پوچھا۔

''ہیرو ہیروئن۔ کون سے ہیرو ہیروئن۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے بھائی۔ کتاب لکھی ہے تو اس میں ہیرو ہیروئن تو ہوں گے نا۔''

''نہیں خان صاحب۔'' میں خون کے گھونٹ پی کر بولا۔ ''یہ اس ٹائپ کی کتاب نہیں ہے۔ یہ فلسفہ کی کتاب ہے۔''

''بھائی میاں۔ چاہے کسی کی بھی ہو۔ تم ہیرو ہیروئن کے ذکر کے بغیر کتاب نہیں لکھ سکتے۔''

''یہ آپ کو کیسے معلوم۔'' اب مجھے اس کی بکواس سے غصہ آنے لگا تھا۔

''اچھی طرح جانتا ہوں میں بھائی میاں۔ تمہارا گردہ ان ہی چکروں میں تو خراب ہوا تھا اس لیے تو میں نے تمہیں اپنا گردہ دیا ہے۔''

وہاں موجود لوگ منہ پھیر کر ہنسنے لگے تھے۔

میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کلن صاحب۔ یہ ادب کے معاملات کچھ اور ہوتے ہیں۔ آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے دخل نہ دیں۔''

''بھائی میاں۔ جس نے اپنا گردہ دے رکھا ہو وہ اس سے کوئی بات چھپایا نہیں کرتے۔''

بہت ہی دل مکدر ہوا تھا۔ میرے ادیب دوست تو زیر لب مسکراتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اب صرف میں اور کلن رہ گئے تھے۔

دوستوں کے جانے کے بعد میں کلن پر برس پڑا۔ ''دیکھیں کلن صاحب یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے مجھے اپنا گردہ دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ میرے ہر معاملے میں دخل دیں۔''

''بھائی میاں۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔ اب میں تمہارے ادب وغیرہ کے معاملے میں نہیں بولا کروں گا۔ خدا جانے تم لوگ کیا بولتے رہتے ہو۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔''

وہ کچھ ناراض ہونے لگا تھا۔ ایک خیال بھی آیا کہ اس بے چارے کو نظریہ ارتقا وغیرہ کے بارے میں کیا معلوم۔ یہ جو کچھ بول رہا ہے اپنی سادگی میں بول رہا ہے۔

یہ سوچ کر میں نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ کچھ دیر بعد اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

بستر پر لیٹا ہی تھا کہ موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ ارم کا فون تھا۔ دو مہینوں کے بعد آیا تھا۔ وہ ملک سے باہر گئی ہوئی تھی اور اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس دوران میں مجھ پر کیسی قیامت گزر چکی ہے۔ وہ یہ تو جانتی تھی کہ میں گردے کی تکلیف میں مبتلا ہوں لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے جانے کے بعد میں ڈیالیسس اور گردے کی تبدیلی کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مرحلے میں آجاؤں گا۔

میں نے جب بتایا تو وہ پریشان ہوگئی۔ "میرے خدا۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔"

میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ تم گھر والوں کے ساتھ باہر گئی ہوئی تھیں۔ خواہ مخواہ تمہارا موڈ خراب ہو جاتا۔ ویسے تم فکر مت کرو میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ خدا کے ایک نیک بندے نے مجھے اپنا گردہ دے دیا ہے اور میں بہت تیزی سے صحت یاب ہو رہا ہوں۔"

"نوید۔ میں ابھی ابھی تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"اس وقت رات ہو رہی ہے۔ ایسا کرو کل رانی باغ پہنچ جاؤ۔ یادیں تازہ کریں گے پھر واپسی میں کہیں ڈنر کرتے ہوئے آجائیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں کل شام رانی باغ پہنچ رہی ہوں۔"

رانی باغ دراصل ایک خوبصورت سا باغ تھا جہاں سکون کے متلاشی بیٹھے رہتے۔ ہم بھی اکثر چلے جایا کرتے تھے اور میں اسے اپنی غزلیں سناتا رہتا۔

اس پارک میں بیٹھنے کے بعد لگتا جیسے ساکت ہو کر رہ جاتے تھے۔ محبت کرنے والوں کو بس گوشۂ تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں دوسری شام رانی باغ پہنچ گیا۔ ارم پہلے سے موجود تھی۔ اسی جگہ جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے۔ اس نے فرطِ جذبات سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "نوید۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔"

"پہلے کچھ ہوگیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہوں۔"

اور اس وقت۔ جی ہاں اسی وقت گلن خان پر نظر پڑ گئی۔ وہ کم بخت نہ جانے کہاں سے اس پارک میں بھی آ گیا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر بچنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا تھا اسی لیے وہ تیر کی طرح ہمارے پاس آ گیا۔

"ارے بھائی میاں۔ دل خوش ہو گیا تم کو دیکھ کر۔" پھر اس نے ارم کی طرف دیکھا۔ "اور یہ بی بی کون ہے۔"

ارم مسکرا دی۔ "یہ۔ یہ میری دوست ہیں ارم۔" میں نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے تعارف کروایا۔

"ارم بی بی۔ ناچیز کو گلن خان کہتے ہیں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔ "شاید تمہیں یہ تھوڑی نہ معلوم ہو لیکن میں یہ بتا رہا ہوں کہ میں نے ہی نوید بھائی کو اپنا گردہ دیا ہے۔"

کم بخت نے پھر گردے کی داستان چھیڑ دی تھی۔

عجائب الدنیا

☆ دنیا کی سب سے کم عمر ماں، لیما پیرو کی "لینا میڈینا" کو کہا جاتا ہے۔ وہ 1939ء میں بڑے آپریشن کے ذریعے ساڑھے چھ پاؤنڈ کے بچے کی ماں بنی۔ اس وقت لینا کی عمر پانچ سال سات ماہ تھی۔ بچے نے اسے پہلی بار ماں تب پکارا جب وہ دس سال کی تھی۔

☆ دنیا کی سب سے دراز عمر ماں ستیہ بھاما مہاپاتر کو کہا جاتا ہے۔ انڈیا کی 65 سالہ ریٹائرڈ اسکول ٹیچر ستیہ بھاما نے شادی کے پچاس سال بعد ٹیسٹ ٹیوب سسٹم کے ذریعے 9 اپریل 2003ء کو صحت مند بچہ جنم دیا۔

☆ جینی بلیک لے کو دو بچوں کے درمیان سب سے کم وقفے والی ماں کہا جاتا ہے۔ اس نے 3 ستمبر 1999ء کو جوزف روبرٹ کو اور 30 مارچ 2000ء کو اینی جیسیکا جائس کو جنم دیا۔

☆ ایلزبتھ این بیل کو دو بچوں میں طویل ترین وقفے والی ماں کہا جاتا ہے۔ اس نے بلنڈا کو 19 مئی 1956ء میں اور جوزف کو 20 نومبر 1997ء میں جنم دیا۔ دونوں بچوں کے درمیان 41 سال 185 دن کا وقفہ ہے۔

☆ سرکاری طور پر سب سے زیادہ بچے پیدا کرنے والی ماں روسی سلطنت کے شہنشاہ فیوڈور ویسلیو (1707۔1782) کی پہلی بیوی کو کہا جاتا ہے۔ اس نے 69 بچوں کو جنم دیا تھا اس نے 16 ٹوئنز، 7 ٹرپلیٹ (ایک ساتھ تین بچے) اور چار بار چار چار بچوں کو جنم دیا تھا۔

☆ 1999ء کے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق سن انتونیو چلی کی لیونٹینا البینا نے 64 بچوں کو جنم دیا جس میں 55 اب تک زندہ ہیں۔

مرسلہ: عائشہ جو نیجو۔ اونٹاریو، کینیڈا

"واہ۔ آپ نے تو واقعی بہت ثواب کا کام کیا ہے۔"
ارم نے اس کی تعریف کی۔

"ہاں بی بی۔ اس دور میں تو کوئی کسی کو ایک بوتل خون نہیں دیتا لیکن میں نے گردہ دے دیا۔ بے چارے کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ آج کل کا مہمان تھا بے چارہ۔ میں نے سوچا چلو گردہ دے ہی دو۔"

"کلن صاحب۔ کیا آپ کوئی بات گردے کے علاوہ نہیں کر سکتے؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

"میاں زندگی میں گردوں کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ "اگر کوئی کسی کو اپنا گردہ دے دے تو یہ سمجھ لو کہ اس نے اپنی آدھی جان کسی اور کے حوالے کر دی ہے۔ کیوں بی بی۔" اس نے تائید کے لیے ارم کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"اچھا جی۔ میں تو چلا۔ تم دونوں باتیں کرو۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بھائی میاں۔ اگر کبھی میرے گردے میں تکلیف ہو تو مجھے بتا دینا۔ میرا مطلب ہے اس گردے میں جو تمہارے پاس ہے۔"

"جی ہاں ضرور بتا دوں گا۔" غصے سے میری سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ کم بخت صرف گردہ گردہ کیے جا رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ارم نے ہنسنا شروع کر دیا۔ "خدا کی پناہ۔ یہ تم نے کون سی مصیبت پال لی ہے۔"

"کیا بتاؤں۔ یہ مصیبت اس ڈاکٹر نے میرے گلے ڈال دی ہے۔ جس نے میرا آپریشن کیا ہے۔ میں تو اس شخص سے تنگ آ چکا ہوں۔"

"ایک بات تو ہے۔ اتنی بڑی قربانی کوئی نہیں دیتا۔" ارم نے کہا۔

"ہاں۔ یہی سوچ کر تو خاموش ہو جاتا ہوں ورنہ جی تو چاہتا ہے کہ کم بخت کو گولی مار دوں۔"

"چلو چھوڑو۔ موڈ مت خراب کرو۔ کہیں اور چلتے ہیں۔"

ہم پارک کے گیٹ سے باہر نکلے ہی تھے کہ کلن خان پھر ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کو دوبارہ دیکھ کر میں بھنا کر رہ گیا تھا۔ "اب کیا بات ہے بھائی میاں۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے ارم کی طرف اشارہ کیا۔

"جی فرمائیں۔" ارم نے پوچھا۔

"شاید آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا کہ میں نے بھائی میاں کو اپنا گردہ دیا ہے۔" اس نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ یقین ہے مجھے۔ خود نوید صاحب نے بھی یہی بتایا ہے۔"

"نہیں۔ آپ یہ سمجھ رہی ہوں گی کہ ہم دونوں آپ سے مذاق کر رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ "میں یہی یقین دلانا چاہ رہا ہوں کہ یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں نے واقعی اپنا گردہ ان کو دے دیا ہے۔"

اب بات میری برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ میں نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "تیری اور تیرے گردے کی ایسی کی تیسی۔ ابھی چل میرے ساتھ اسپتال۔ واپس لے اپنا گردہ۔ مجھے تیرا منحوس گردہ نہیں چاہیے۔ چل اسپتال۔ ابھی نکال کر دیتا ہوں۔"

"اب کہاں سے دو گے بھائی میاں۔ اب تو میں دے چکا۔"

"نہیں چاہیے مجھے۔" مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ "کم بخت تیرے گردے نے میری زندگی عذاب کر کے رکھ دی ہے۔"

میں نے غصے میں آ کر اس کے ایک دو ہاتھ مار دیے۔ لوگ بھی یہ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو چکے تھے۔ کلن خان نے مجھ سے اپنا گریبان چھڑا لیا تھا۔

"چلو چھوڑو چلتے ہیں۔" ارم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "خواہ مخواہ تماشا بن رہا ہے۔"

"میں جان سے مار دوں گا اس کم بخت کو۔ اس سے کہو اپنا گردہ واپس لے۔"

"یہ لو۔" کلن خان نے لوگوں کی طرف دیکھا۔ "اسے کہتے ہیں۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ ایک تو میں نے اس شخص کو اپنا گردہ دے دیا ہے اور....."

پھر وہی گردہ۔ میں ارم، کلن خان اور لوگوں کو چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ لعنت ہے۔ مجھے اس شہر ہی میں نہیں رہنا تھا۔ جہاں کلن خان کا منحوس وجود ہو۔

میرا خیال ہے کہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہی تھی کہ میں نے کسی سے گردہ لے لیا تھا اور وہ بھی کلن خان جیسے آدمی سے۔

میری دعا ہے کہ اول تو خدا آپ کو اس قسم کی تکلیف نہ دے اگر خدانخواستہ ہو بھی جائے تو کلن خان جیسے کسی آدمی سے اس کا گردہ لینے کی حماقت نہ کریں۔

محترم

محترم مدیر سرگزشت

آداب عرض

راقم کی زندگی میں ایک لفظ "محترم" چڑ بن کر سما گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا آپ بھی ملاحظہ کریں کہ اس لفظ سے مجھے الرجی کیوں ہے۔ کیوں میں چڑنے لگا ہوں۔

انور

(ملتان)

میں نے اپنا بیگ اٹھایا۔ اپنی عینک لگائی اور گھر سے باہر آگیا۔

اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ اس گلی میں یا تو کتے گھوم رہے تھے یا پھر میں گھوم رہا تھا۔ میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ بس وہاں سے چلے جانا تھا۔ کہیں بھی، کسی کے بھی پاس۔

میرے جسم پر جو لباس تھا وہ بھی بہت عجیب تھا۔ میں نے جلدی میں شیروانی پہن لی تھی اور ایک پرانی سی شلوار

بھی ہو سکتا ہے کہ میں اس حلیے میں بیان شیروانی دکھائی دے رہا ہوں لیکن مجھے اس وقت اس کی بھی پروا نہیں تھی۔

گلی میں ہی رحیم پہلوان مل گیا۔

نہ جانے وہ کیسا پہلوان تھا جو ہر وقت بیمار ہی رہا کرتا۔ کبھی جوڑوں کا درد، کبھی بخار، کبھی کھانسی، لیکن اس کی کہانیاں بہت زوردار ہوا کرتی تھیں۔

اس نے خود ایک بار بتایا تھا کہ ایک بار اس کی ٹکر ٹارزن سے بھی ہو گئی تھی۔ میں چونکہ اس وقت بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا کہ ٹارزن ایک فرضی کردار ہے اسی لیے خاموشی سے رحیم پہلوان کی باتیں سنتا رہا۔ جبکہ محلے کے کئی لوگ حیرت سے اس کی ٹارزن والی داستان سنتے رہے تھے۔

بہرحال تو اس رحیم پہلوان سے گلی میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ نہ جانے وہ اتنی رات گئے گلی میں کیا کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ لپک کر میرے پاس آ گیا۔ ”ارے انور صاحب۔ آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں۔“

”کسی کام سے جا رہا ہوں رحیم بھائی۔“ میں نے بتایا۔

”بھائی جان۔ آج تو آپ کی شادی کی رات ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ نئی دلہن کو چھوڑ کر کام سے جا رہے ہیں۔“ پھر اس نے معنی خیز انداز میں اپنی ایک آنکھ دبائی۔ ”آ گیا، میرے ساتھ۔ میرے پاس دو چار تحفے رکھے ہوئے ہیں۔“

میں جھلا کر رہ گیا۔ ”تم غلط سمجھ رہے ہو رحیم بھائی“ میں نے کہا۔ ”میں ایک ایمرجنسی میں کہیں جا رہا ہوں۔“

”تو چلو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ محلے والے اس وقت کام نہیں آئیں گے تو پھر کب آئیں گے۔“

”نہیں رحیم بھائی۔ تمہارا بہت شکریہ۔“ میں نے اس سے جان چھڑائی۔ ”کوئی ایسا کام نہیں ہے۔ جو کسی کو تکلیف دوں۔ میں ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔“

”جاؤ۔ خدا نگہبان۔“

میں آگے بڑھ گیا۔ گلی سے باہر آ کر سوچنے لگا کہ مجھے اب کہاں جانا چاہیے۔ میں بہت بھنا کر گھر سے نکل تو آیا تھا لیکن فی الحال کوئی منزل ہی نہیں تھی۔

یہ بھی اچھا ہوا کہ کسی نے مجھے اس طرح گھر سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ شادی کا گھر تھا۔ ہر کمرے میں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ خواہ مخواہ ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔

پھر مجھے اپنا دوست ممتاز یاد آ گیا۔ رخصتی کے بعد تک وہ ہمارے ساتھ ہی ہمارے گھر آیا تھا۔ چلو شب بخیر کہہ کر وہ واپس چلا گیا تھا۔ وہ اپنے فلیٹ میں اکیلا رہا کرتا تھا۔

اس وقت میرے لیے اس کے فلیٹ سے زیادہ مناسب جگہ کوئی نہیں ہو گی۔ اس لیے میں اس طرف چل دیا۔ اس کم بخت کا فلیٹ اچھے خاصے فاصلے پر تھا اور رات کے وقت کسی سواری کے ملنے کا امکان بھی نہیں تھا اسی لیے پیدل ہی چلنا پڑ رہا تھا۔

خود سوچیں ایک نئے نویلے دولہا کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔

بہرحال جب میں نے ممتاز کے دروازے پر دستک دی اور اس نے دروازہ کھولا تو مجھے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ”ارے انور۔ تم۔ اس حال میں۔ تمہاری تو شادی ہوئی ہے۔ خیریت تو ہے نا۔ کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے کیا۔“

”نہیں یار۔ کوئی ایمرجنسی نہیں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے اندر تو بٹھاؤ۔“

”آؤ۔ آؤ۔“ اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور میرے لیے پانی لینے چلا گیا۔ ایک گلاس پانی پی کر کچھ ہوش بحال ہوئے تھے۔

”یار۔ میں سمجھ گیا تیرے ساتھ کیا ہوا ہے۔“ ممتاز نے کہا۔ ”میں نے بہت سی فلموں میں ایسا دیکھا ہے۔“

”کیا دیکھا ہے فلموں میں۔“ میں غرایا۔

”یہی کہ شادی کی پہلی ہی رات کو دلہن گھر سے بھاگ جاتی ہے اور دولہا پورے شہر میں اسے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔“

”بکواس مت کر۔ میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر یہ ہوا ہو گا کہ تو اب خود سمجھ لے، شادی سے پہلے کسی ڈاکٹر وغیرہ کو دکھا لیتا تو۔“

”چپ کر۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا؟“

”وہی اپنی پرانی بدقسمتی۔ جس نے آج بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔“ میں نے بتایا۔ ”میری بیوی بہت اچھی

ہے۔ بہت خوبصورت۔ لیکن میں اپنی بدقسمتی کا کیا کروں۔"

"بھائی کس بدقسمتی کی بات کر رہا ہے تیرے ساتھ تو چار پانچ قسم کی بدقسمتیاں لگی ہوئی ہیں۔"

"نہیں۔ صرف ایک۔ جس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تجھے معلوم ہے کہ میری اس بدقسمتی کی ابتدا کہاں سے ہوئی ہے۔"

"تو ہی بتادے۔"

"حمیدہ سے۔ اس کو تو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی اور میں دل ہی دل میں اسے بہت پسند کرتا تھا۔ وہ بھی جب مجھ سے ملتی تو بہت نرمی اور پیار سے باتیں کیا کرتی۔ ایک بار وہ میری خاطر کالج کے کچھ غنڈوں سے بھی لڑ گئی تھی۔"

"ہاں۔ وہ واقعہ یاد ہے مجھے۔ یہ جھگڑا کینٹین میں ہوا تھا۔"

"میں چائے پینے گیا تھا اور بھی لڑکے لڑکیاں موجود تھیں۔ ان میں حمیدہ بھی تھی اور ایک طرف سراج کا گروپ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ تم تو جانتے ہو کہ اس گروپ کے لونڈے مجھے کیا کہا کرتے تھے۔"

"ہاں یاد ہے مجھے۔ وہ سب تمہیں افلاطون کہہ کر چھیڑتے تھے۔"

"اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں کینٹین میں داخل ہوا اور سراج گروپ کے ایک لڑکے نے ہانک لگائی۔ ہوشیار، خبردار، افلاطون صاحب کینٹین میں تشریف لا رہے ہیں۔"

میں سلگ کر رہ گیا۔ کیا بدتمیزی تھی۔ مجھے اپنی سبکی محسوس ہو رہی تھی اور یہ حرکت اس لڑکی یعنی حمیدہ کے سامنے ہوئی تھی۔ جس کو میں دل ہی دل میں پسند کرنے لگا تھا۔

میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کینٹین سے باہر چلا جاؤں لیکن اسی وقت حمیدہ ان لڑکوں پر چڑھ دوڑی۔ اس نے ذرا سی دیر میں دنیا بھر کی باتیں سنا کر رکھ دیں۔ وہ میری محبت میں ان سے جھگڑا کر بیٹھی تھی۔"

تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ میں نے حمیدہ کا ہاتھ تھاما اور اسے کینٹین سے باہر لے آیا۔ وہ غصے میں بھری ہوئی

تھی۔ ”چھوڑ دیں مجھے“ اس نے کہا۔ ”میں ان کم بختوں کو مزہ چکھادوں گی۔“

”جانے دو حمیدہ۔ لعنت بھیجو۔“ میں پیار سے بولا۔ ”تم خود کو ہلکان کرتی ہو۔ یہ بدمعاش لوگ ہیں۔ تم ان کے منہ نہ لگو۔“

”لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتی انور صاحب کہ کوئی آپ کی توہین کرے۔“ اس نے کہا۔

”یار ممتاز، یہ سنتا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے اپنی زندگی کا حاصل مل گیا ہو۔ تم کو تو معلوم ہے کہ حمیدہ کالج کی سب سے طرحدار لڑکی تھی۔“

”ہاں نہ جانے کتنے اسے دیکھ دیکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے۔“ ممتاز نے کہا۔

”اور وہی لڑکی مجھ سے یہ کہہ رہی تھی کہ وہ میری توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک طرح سے اس نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا تھا ورنہ کون کسی کے لیے پریشان ہوا کرتا ہے۔“

”جی بھائی۔ اس کے بعد تو میں حمیدہ کا ہو کر رہ گیا۔ تم کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں نے اس کی پڑھائی میں اس کی کتنی مدد کی تھی۔ ہم دونوں کے پاس سائیکولوجی تھی... اور سائیکولوجی کے پریکٹیکل بک بنا بنا کر اس کو دیتا رہا۔ اس دن کے بعد سے ہم کالج میں برملا ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔“

”ہاں۔ یار۔ سارا نقشہ میری نگاہوں کے سامنے ہے۔“ ممتاز نے کہا۔ ”برا مت ماننا۔ اس زمانے میں خود میں بھی تجھ سے جلنے لگا تھا۔“

”یہی حال بہت سوں کا تھا میرے دوست۔“ میں مسکرا دیا۔ ”ہم کالج کے لان میں بیٹھے رہتے۔ وہ کبھی کبھی میرے لیے اپنے گھر سے کوئی چیز بنا کر لے آتی۔ اس وقت احساس ہوتا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے بعد کتنی سرشاری آجاتی ہے۔ دنیا کے رنگ کتنے خوبصورت ہو جاتے ہیں۔“

”اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“ ممتاز نے پوچھا۔ ”یہ آج تک معما ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے سے دور کیوں ہو گئے۔“

میں وہی بتا رہا ہوں۔ ہمارے درمیان ہر قسم کی باتیں تو ہو رہی تھیں لیکن ابھی تک محبت کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ تم خود کہو کیا اب وہ وقت نہیں آگیا تھا کہ میں اس سے اپنے دل کی بات کہہ دیتا۔

”کیوں نہیں۔“

”بس تو ایک دن لان میں بیٹھ کر میں نے اس سے اظہار محبت کر دیا اور یہ سنتے ہی وہ بھڑک اٹھی۔“

”بھڑک اٹھی۔ وہ کیوں۔“ ممتاز نے حیرت سے پوچھا۔

”اس نے کہا تھا انور صاحب۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔ میں تو آپ کا احترام کرتی ہوں۔ آپ میرے لیے بہت قابل احترام ہیں۔ پلیز۔ ایسی باتیں کر کے اپنا رتبہ کم نہ کریں۔ میں نے آپ کا احترام کیا ہے۔ اور کرتی رہوں گی۔“

”یار۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ کیسا احترام ہوا۔“

”یہی تو اصل کہانی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”حمیدہ نے پھر بتایا کہ انور صاحب میں تو آپ کی شخصیت کا احترام کرتی ہوں۔ آپ کی علمیت کی مداح ہوں۔ پلیز ان جذبوں کو محبت کے ساتھ آلودہ نہ کریں۔ مجھ کو اپنا احترام ہی کرنے دیں۔“

ممتاز ہنس پڑا۔ ”یار۔ اب یہ معما حل ہو گیا کہ تو نے اچانک حمیدہ کو چھوڑ کیوں دیا تھا۔“

”ظاہر ہے۔ اس کے بعد اس کے ساتھ رہنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اس سے ملنا ترک کر دیا۔ وہ اپنی جگہ۔ میں اپنی جگہ۔“

”اس کے بعد بہت دنوں تک میری زندگی میں کوئی نہیں آئی۔ پھر انوری آگئی۔“

”کون انوری! تیرے محلے والی۔“

”ہاں۔ میرے برابر کے گھر والی۔“ میں نے بتایا۔

”استاد۔ اس کے ساتھ بھی تیری کہانی بہت زوروں پر ہوا کرتی تھی۔“ ممتاز نے کہا۔ لیکن اس کے ساتھ بھی تیرا نباہ نہیں ہو سکا۔ کیوں؟“

”مت پوچھو۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”وہ واحد لڑکی تھی جس نے کھلے دل سے مجھے اپنا سمجھا۔ جب بھی کوئی ضرورت ہوتی اس کی نگاہیں میری طرف اٹھ جاتیں۔ ورنہ لڑکیاں تو ایسے معاملات میں بہت محتاط ہوا کرتی ہیں۔“

”یہ بات تو ہے“ ممتاز نے تائید کی۔ ”لیکن ہوا کیا تھا۔“

"وہی بتا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کا یہ حال تھا کہ اسے چھوٹی سے چھوٹی چیز کی بھی ضرورت ہوتی تو وہ مجھے دیکھتی۔ مجھ سے بیان کرتی اور میں اس کی ضرورت پوری کرنے کے بعد بے پناہ خوشی محسوس کیا کرتا۔ کوئی تو ہے۔ جس نے مجھے اس قابل سمجھا۔ انتہا یہ بھی کہ اس کے موبائل میں بیلنس بھی میں ہی ڈلوایا کرتا تھا۔"

"پھر تو بہت ہی زبردست قربت ہوئی۔"

ہاں یار۔ ایک بار ایسا ہوا کہ وہ مارکیٹ میں میرے ساتھ چل رہی تھی کہ اس کے موبائل کا بیلنس ختم ہو گیا۔

"پلیز انور صاحب۔ میرے نمبر پر بیلنس ڈلوا دیں۔" اس نے التجا کی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ابھی لو۔"

میں نے فوراً سو روپے کا بیلنس ڈلوا دیا۔ پھر وہ مجھ سے ایکسکیوز کر کے ایک طرف کھڑی ہو گئی اور کسی سے باتیں کرنے لگی۔ ایک منٹ۔ دو منٹ دس منٹ اور میں بھناتا رہا۔ وہ کبھی ہنستی کبھی منہ بناتی۔ کبھی لہرانے لگتی۔ کچھ عجیب صورت حال چل رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ بیلنس ختم ہونے کے بعد ہی وہ میرے پاس آئی تھی۔ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے بھنا کر اس سے پوچھا۔ "یہ تم اتنی دیر تک کس سے باتیں کرتی رہی ہو۔"

"خرم سے۔" اس نے بتایا۔

"کون خرم؟"

"میرا بوائے فرینڈ۔ جس سے میں محبت کرتی ہوں۔"

"کیا؟" میں تو بھونک سا رہ گیا تھا۔ "تم کسی اور سے محبت کرتی ہو۔ تو پھر مجھ سے کیا ڈراما ہے۔"

"کیسی بات کر رہے ہیں سر۔ آپ کا تو میں احترام کرتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"یہ لو۔ اب یہاں بھی کم بخت احترام بیچ میں گھس آیا تھا۔ اس کم بخت لفظ سے جان ہی نہیں چھوٹ رہی تھی۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ جس میں لڑکیاں صرف میرا احترام ہی کرتی رہ جاتی ہیں۔ احترام سے آگے کوئی بڑھنے کو تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ تم خود سوچ سکتے ہو۔ میں نے اس کے بعد کیا کیا ہوگا۔"

"ظاہر ہے کہ اسے چھوڑ دیا ہوگا۔"

"ہاں میں نے چھوڑ دیا کیونکہ میں صرف احترام کے لیے نہیں بنا ہوں۔ میرے اپنے بھی احساسات ہیں۔ اپنے بھی جذبات ہیں۔ لیکن سارے جذبات کم بخت احترام کی بھینٹ چڑھ گئے۔"

میری داستان سن کر ممتاز بری طرح ہنسے جا رہا تھا اور میرا یہ حال تھا کہ کم بخت کا گلا ہی گھونٹ دوں۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ آج کیا ہوا۔ آج کیوں بھاگ آئے ہو۔" ممتاز نے پوچھا۔

"مت پوچھ یار رہنے دے۔" میں منہ بنا کر بولا۔

"نہیں یار بتا تو سہی۔ آج کیا ہوا۔"

"آج جب میں اپنی بیوی کے پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ تھام کر محبت کی ابتدا کی تو اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔"

"کیوں۔" ممتاز نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

"کہنے لگی کہ یہ سب نہ کریں سر۔ کیونکہ میں آپ کا بے حد احترام کرتی ہوں۔" میں نے بتایا۔

میرا اتنا بتانا تھا کہ ممتاز ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ وہ پیٹ پکڑ کر پورے کمرے میں ناچتا پھر رہا تھا۔ میں نے اس کو دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں اور ناراض ہو کر اس کے فلیٹ سے باہر آ گیا۔

بہرحال میری اس کہانی کا انجام یہ ہوا کہ بیوی کو سمجھانے میں کئی دن لگ گئے مجھے کہ دیکھو بیگم۔ احترام اپنی جگہ لیکن میاں بیوی کے درمیان ایک دوسرا رشتہ بھی ہوتا ہے۔

اگر تم صرف احترام ہی کرتی رہ گئیں تو ہماری نسلیں کہاں سے وجود میں آئیں گی۔ بس یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے احترام کا چکر ختم کر دیا۔

اس کہانی کو پڑھنے والوں سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اپنی شخصیت کو اتنا محترم بنانے کی کوشش نہ کریں کہ آپ کے اور دوسروں کے درمیان خلیج پیدا ہو جائے۔ بقول سلیم احمد مرحوم کے۔

"دیوتا بننے کی حسرت میں معلق ہو گئے۔ اب ذرا نیچے اتر کے آدمی بن جائیے۔"

فن کار

جناب ایڈیٹر صاحب

تسلیم و بندگی

مجھے مارکیٹنگ کا وسیع تجربہ ہے۔ ہر روز سینکڑوں لوگوں سے ملتا رہتا ہوں لیکن اس شخص نے تو حیران کردیا۔ میں خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایک مشہور و معروف ٹی وی اسٹار مجھے اس طرح حیران کردے گا۔ میں دھوکا دہی کا شکار بن جاؤں گا۔ واقعی اس دنیا میں کیسے کیسے فن کار سانس لے رہے ہیں۔

ثاقب احمد

(کراچی)

میں دفتر میں ایک جوڑے کے ساتھ سر کھپا رہا تھا۔ انہوں نے ہمارے پروجیکٹ میں ساتویں فلور پر ایک فلیٹ بک کرایا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ انہیں تبدیل کرکے پانچویں فلور پر کردیا جائے۔ پانچ سے سات فلورتک فیس ایک ہی تھی۔ جس وقت وہ بکنگ کے لیے آئے تھے تو تینوں فلورز پر فلیٹ خالی تھے اور انہوں نے اپنی مرضی سے ساتویں فلور پر بک کرایا تھا کیونکہ نزدیک ہی ایک پرانی چھ منزلہ بلڈنگ تھی جس کی وجہ سے پانچ فلور تک فلیٹ روشنی اور ہوا اتنی حاصل نہیں کر پاتے لیکن اس سے اوپر کے فلیٹ پوری ہوا اور روشنی حاصل کرتے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ساتواں فلور منتخب کیا تھا مگر اب وہ چاہ رہے کہ فلیٹ پانچویں فلور پر کر دیا جائے۔ میں انہیں سمجھا رہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے اور وہ یہ ضد تھے کہ کسی طرح اسے ممکن بنایا جائے۔ دوسری صورت میں ان کی بکنگ منسوخ کی جائے۔

میں ایک بڑی بلڈر کمپنی سے منسلک ہوں۔ گزشتہ میں سال میں اس کمپنی نے بے شمار پروجیکٹ مکمل کرکے عوام کے حوالے کیے ہیں اور ان کا تعمیراتی معیار ہمیشہ اچھا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے پروجیکٹ سب سے مہنگے ہوتے ہیں۔ بیچنے کے بعد بھی ان کی ویلیو کم نہیں ہوتی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی رہتی ہے جب کہ تعمیرات پروجیکٹ عام طور سے مکمل ہونے کے بعد ڈی ویلیو ہو جاتے ہیں کیونکہ ابتدائی سالوں میں ان کے تعمیراتی نقائص کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ میری کمپنی کی نہ صرف عوام میں ساکھ اچھی ہے بلکہ اپنے ملازمین کے لیے بھی کمپنی کا رویہ اچھا ہے۔ میں نے بیس سال پہلے گریجویشن کے بعد یہاں معمولی سی پوسٹ سے جاب شروع کی تھی اور اب میں منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ میں نئے بک ہونے والے پروجیکٹ آفس میں ہوتا تھا اور جب بکنگ مکمل ہو جاتی تو ہیڈ آفس واپس چلا جاتا۔

نیپئی ہائی رائز ٹاور پروجیکٹ جاری تھی اس کی کل بارہ منزلیں تھیں اور سب سے اوپر پینٹ ہاؤسز تھے۔ شہر کی پرائم لوکیشن اور آس پاس پوش آبادیوں کی وجہ سے اس پروجیکٹ کی اہمیت آغاز سے بہت اچھی تھی۔ پھر کمپنی کا اصول تھا کہ وہ تعمیراتی کام کے آغاز کے بعد بکنگ شروع کرتی تھی اور اسی وجہ سے بکنگ کے روز اول سے لوگوں نے یلغار کی ہوئی تھی۔ ایک ہفتے میں نصف پروجیکٹ بک ہو گیا تھا۔ جب کہ تعمیراتی شعبے میں کساد بازاری کی وجہ سے یہ حال ہے کہ اچھے اچھے پروجیکٹ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں اور ان کی بکنگ مکمل نہیں ہوتی ہے۔ لوگوں نے چن چن کر اچھی لوکیشن کے فلیٹ بک کرا لیے۔ سب سے پہلے نچلے فلورز بک ہوئے تھے اس کے بعد اوپر کی فلورز کی باری آئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ایک دو مہینے میں تمام پروجیکٹ بک ہو جائے گا۔ ویسے نوے فیصد بکنگ پر ہمارا ہدف پورا ہو جاتا تھا۔ مگر مجھے لگ رہا تھا اس بار سو فیصد بکنگ ہو جائے گی۔ میں اور میرا عملہ خوش تھا کیونکہ سو فیصد بکنگ پر سب کو اضافی بونس ملتا۔ مگر

اس وقت ان میاں بیوی نے میرا دماغ خراب کر رکھا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور میرے نائب مدثر نے اندر جھانکا۔ ”سر ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

میں نے اشارے سے ایک منٹ رکنے کو کہا اور ان میاں بیوی سے بولا۔ ”دیکھئے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی اور کا فلیٹ آپ کو دے دیا جائے۔“

”تب ہم بکنگ منسوخ کرنا پسند کریں گے۔“ خاتون نے تنک کر کہا۔ ”ہمیں نہیں چاہیے آپ کا فلیٹ جب کہ آپ ہم سے معمولی سا کوآپریٹ بھی نہیں کر رہے ہیں۔“

”بات معمولی کی نہیں، ممکن کی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے تو میں کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ خود سوچیں کوئی مجھ سے کہے کہ اس کا بک کیا ہوا فلیٹ چینج کر کے آپ کا بک کرایا ہوا فلیٹ اسے دے دیا جائے تو یہ کیسے ممکن ہوگا۔ ہماری بات چھوڑیں کیا آپ مانیں گے؟“

”ہرگز نہیں۔“ خاتون نے کہا۔

”تب کوئی دوسرا کیسے مانے گا؟“

بہر حال وہ نہیں مانے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بکنگ کے بارے میں مشورہ کر کے بتائیں گے۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ خاتون بکنگ منسوخ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں اور حضرت ان کے سامنے اتنی سے بے بس لگ رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے مدثر کو کال کی۔

”کون صاحب ہیں اور کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“

”سر یہ ڈسکاؤنٹ پر بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”ڈسکاؤنٹ پروجیکٹ سے تم بھی واقف ہو۔“

”جی سر لیکن یہ پروجیکٹ سے ہٹ کر کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”میں نے بھی انہیں یہی بتایا ہے لیکن سر یہ آپ سے ملاقات پر اصرار کر رہے ہیں۔“

میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ایک اور دماغ کی دہی کرنے والا ہوگا اور میں نے انکار کا سوچا مگر مدثر سے کہا۔ ”او کے بھیج دو۔“

چند لمحے بعد جو شخص اندر آیا وہ پہلی نظر میں مجھے جانا پہچانا لگا تھا۔ عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ پچاس کا بھی نہیں تھا مگر سر کے سارے بال بالکل سفید ہو گئے تھے۔ بہت سرخ و سفید چہرہ جس پر معمولی سی جھریاں تھیں۔ اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے سائے سے

تاثرات تھے۔ اس کا اصل نام کچھ اور ہے لیکن میں اصل نام نہیں لکھ سکتا اس لیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اس کا نام آغا شفیع تھا۔ اس کی شخصیت متاثر کن تھی۔ میں نے بے ساختہ کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا اور اسے کرسی پیش کی۔ اس نے بیٹھ کر اپنا تعارف کرایا۔ "میں آغا شفیع حسن ہوں۔"

"جی آغا صاحب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"شرمندہ نہ کریں میں تو درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

"میرا اسسٹنٹ بتا رہا تھا کہ کوئی ڈسکاؤنٹ کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم پہلے ہی ایک مہینے تک بکنگ پر دس فیصد ڈسکاؤنٹ دے رہے ہیں اور یہ کم سے کم بھی کوئی ڈیڑھ لاکھ روپے بنتا ہے۔ اس ایک مہینے میں بک کرانے والے ڈیڑھ لاکھ کا فائدہ تو فوری حاصل کر لیں گے۔"

"میں اس سے کچھ ہٹ کر چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں نقد ادائیگی کرنا چاہتا ہوں۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ "مکمل ادائیگی؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ایک یہی پونجی رہ گئی ہے مجھے ڈر ہے یہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے اس لیے میں یہ فلیٹ لینا چاہتا ہوں۔"

"اس صورت میں آپ کو دس فیصد ڈسکاؤنٹ مزید ملے گا۔"

"پھر بھی مجھے بیس لاکھ روپے ادا کرنے ہوں گے اور میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔"

اس پروجیکٹ میں صرف تھری بیڈ اور فور بیڈ ڈرائنگ، ڈائننگ کے ساتھ تھے۔ سب سے اوپر چھ بیڈ روم والے پینٹ ہاؤس تھے۔ دو منزلیں مکمل طور پر پارکنگ کے لیے مخصوص تھیں اور گراؤنڈ پر بہت بڑا شاپنگ مال بن رہا تھا جس میں ہزار سے اوپر دکانیں اور شو رومز تھے۔ تھری بیڈ والے فلیٹ کی کم سے کم قیمت بھی پچیس لاکھ تھی اور یہ بھی آخری تین فلورز یعنی دس سے بارہ تک کی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا ڈسکاؤنٹ کے ساتھ بھی اسے بیس لاکھ دینا تھا مگر وہ کچھ اور رعایت چاہتا تھا۔ میں نے اس سے معذرت کی۔ "ہم اس سے زیادہ رعایت نہیں دے سکتے ہیں۔"

"میں پوری قیمت دے رہا ہوں۔" وہ نرمی سے بولا۔

"یہی تو مسئلہ ہے آپ پوری قیمت نہیں دے رہے ہیں۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کیا بات ہے صاحب آپ ہمیں رعایت تو کیا لفٹ دینے کو تیار نہیں ایک زمانہ تھا کہ لوگ دل و جان لٹانے کو آمادہ ہو جاتے تھے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "آپ مجھے جانے پہچانے لگ رہے ہیں۔"

"کبھی لوگ ایک جھلک دیکھ کر پہچان جاتے تھے اور دیوانہ وار پیچھے آتے تھے۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اچانک مجھے جھٹکا لگا اور مجھے یاد آ گیا۔ میں نے بے تیقنی سے کہا۔ "آپ... آپ وہی آغا شفیع ہیں جو ٹی وی پر کام کرتے ہیں۔"

"کرتا تھا۔" اس نے تصحیح کی۔ "جیسے اب لوگ نہیں پہچانتے اسی طرح اب ٹی وی والے بھی نہیں پہچانتے۔"

آغا شفیع آج سے دس سال پہلے ٹی وی ڈرامے کا بہت بڑا نام تھا۔ وہ جس ڈرامے میں ہوتا تھا لوگ اسے دیکھنے سے پہلے ہی ہٹ قرار دیتے تھے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا لوگ اس کے لیے پاگل ہوتے تھے۔ اپنے حسن و جمال اور اپنی شخصیت کی وجہ سے وہ صنف نازک میں بے حد مقبول تھا۔ اس کے بے شمار اسکینڈل مشہور ہوئے اور ساتھی اداکاراؤں سے لے کر سوسائٹی کی اعلیٰ بیگمات تک بے شمار عورتوں سے اس کے تعلقات رہے تھے۔ کہتے ہیں ایک عرب ملک کی شہزادی اس کے پیچھے ایسی پاگل ہوئی کہ سب چھوڑ چھاڑ کر کراچی میں ڈیرے ڈالے بیٹھی رہتی تھی۔ خاندان والے اسے سمجھا کر تھک گئے تو حکومت کی مدد سے اسے واپس بھیجا گیا تھا۔ آغا شفیع نے بعد میں اپنے ایک انٹرویو میں ڈھکے چھپے انداز میں کہا تھا کہ اسے شہزادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ اس سے جو حاصل کرنا چاہتا تھا وہ حاصل کر چکا تھا۔

دس سال پہلے آغا شفیع پر شہرت اور دولت دونوں برس رہی تھیں۔ اس نے فلم میں بھی کام کیا تھا مگر یہ تجربہ ناکام رہا۔ بہرحال اس سے اس کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اپنی شہرت کے عین عروج پر اچانک ہی اس نے شو بزنس چھوڑ دیا۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب طرح کی افواہیں آنے لگی تھیں۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ اسے اس شہزادی نے اغوا کرا کے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اب وہ اس

کا فیدی ہے۔ ایک کہانی یہ تھی کہ آغا شیخ نے زندگی میں پہلی بار کسی سے محبت کی اور اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ اس صدمے نے اسے اتنا دل برداشتہ کیا کہ اس نے شوبزنس اور دنیا چھوڑ دی۔ وہ گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ ایک خبر یہ بھی کہ آغا نے کسی بڑے آدمی کو کروڑوں کا چونا لگایا اور ساری دولت سمیٹ کر خاموشی سے ملک سے فرار ہو گیا اور اب اس کا کچھ پتا نہیں کہ وہ دنیا میں کہاں ہے۔ مگر یہ سب رسالوں اور اخباروں میں آنے والی کہانیاں تھیں، ان کی کبھی تصدیق نہیں ہوئی اور نہ ہی آغا شیخ کے بارے میں پھر کوئی خبر آئی۔

"سوری آغا صاحب... آئی ایم ریئلی سوری میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔ قصور میری یادداشت کا بھی نہیں ہے۔ دس سال طویل عرصہ ہوتا ہے ورنہ میں آپ کا کوئی ڈراما مس نہیں کرتا تھا۔ باہر ہوتا تو ڈرامے آن ائر جانے کے وقت تک گھر پہنچ جاتا تھا۔"

"ہاں میاں آپ کا قصور نہیں ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "لوگ اللہ کو وہ دن یاد نہ کریں تو اسے بھول جاتے ہیں۔ میں تو پھر بھی ایک فانی اور عام انسان ہوں۔"

"آپ عام نہیں ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میرا نہیں خیال کہ شوبزنس میں آپ جیسا مقبول فرد اور کوئی رہا ہو۔ جیسے فلموں میں وحید مراد جیسی مقبولیت اور کسی کو نہیں ملی اسی طرح ٹی وی پر آپ کا موازنہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ پہلی بار مسکرایا۔ "بہت عرصے بعد کسی فرد کے منہ سے ایسی بات سن رہا ہوں ورنہ اب جو پہچان جاتے ہیں ان کے نزدیک بھی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے آپ کے فین اب بھی ہیں۔" میں نے کہا اور پھر ان سے پوچھ کر ان کے لیے چائے اور ریفریشمنٹ لانے کو کہا۔ فون رکھ کر میں نے ان کی طرف دیکھا اور از راہ تذکرہ پوچھا۔ "آغا صاحب... آپ اچانک غائب ہو گئے اور پھر کچھ پتا نہیں چلا۔ ہاں اسٹوریاں بہت سی تھیں۔"

"آپ نے کس اسٹوری پر یقین کیا؟"

"سچی بات ہے کسی پر نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے وہ سب بنائی ہوئی کہانیاں لگی تھیں۔"

"سب کہانیاں بنائی ہوئی نہیں ہوتی ہیں۔" اس نے کہا۔ "ان میں کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے۔"

میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "آپ کا مطلب ہے اس میں کوئی کہانی سچی تھی؟"

اس نے سر ہلایا۔ "بالکل... آپ نے شہزادی رانی کہانی پڑھی ہوگی؟"

میں اچھل پڑا تھا۔ "وہ سچ تھا؟"

"ہاں وہ سچ تھا۔ میں ایک رات ایک محفل میں شریک تھا وہاں سے واپسی پر راستے میں کچھ مسلح افراد نے مجھے زبردستی روکا اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کشتی میں تھا اور دو دن بعد میں شہزادی کے محل میں تھا۔"

"اس نے آپ کو اغوا کرایا تھا؟"

"بالکل بھی تو پولیس یا حکومت نے کچھ نہیں کیا۔ بدقسمتی سے دنیا میں میرا کیا تھا کوئی والی وارث بھی نہیں تھا جو میرے لیے آواز بلند کرتا۔ پھر دباؤ بھی ہوگا اس لیے حقیقت سامنے نہیں آئی اور کسی نے مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"آپ سچ مچ وہاں قید تھے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "پورے چار سال۔"

میں سوچ سکتا تھا کہ شہزادی نے اسے کیوں قید میں رکھا ہوگا لیکن میں یہ بات کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر اس کا دل بھر گیا اور اس نے مجھے آزاد کر دیا۔ لیکن بالکل اسی انداز میں۔ ایک رات میں اپنے عالی شان قید خانے میں سویا اور پھر آنکھ کھلی تو ایک کشتی میں تھا۔ وہاں بھی مجھے دوبارہ بے ہوش کر دیا گیا اور جب دوبارہ آنکھ کھلی تو کراچی کے ایک ویران ساحل پر پڑا تھا۔"

"میرے خدا اتنی عجیب اسٹوری۔"

"میری جیب میں ایک پرچہ اور دس ہزار ڈالرز کی رقم تھی۔ مجھے چھوڑنے کے لیے آنے والے میری نگرانی بھی کرتے رہے تھے کہ کوئی میری جیب پر ہاتھ نہ صاف کر جائے کیونکہ جب میں اٹھا تو انہیں جاتے دیکھا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی موٹر بوٹ میں آئے تھے۔ اب میرے پاس یہی پونجی تھی کیونکہ شوبزنس سے جو کمایا تھا وہ اڑا دیا۔ کرائے کے بنگلوں میں رہا۔ صرف ایک کار اپنی ہوتی تھی۔ شامیں ہوٹلوں اور کلبوں میں گزرتی تھیں۔ جہاں پیسا پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اس لیے میری رقم بھی پانی کی طرح بہہ گئی۔"

"پرچے میں کیا لکھا تھا؟"

"یہی کہ میں اپنی زبان بند رکھوں اگر منہ سے ایک

لفظ کا لاتو میری زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے گی۔"

"جو لوگ ایک مشہور ترین شخص کو یوں اٹھا کر لے جائیں اور اسے چار سال قید رکھیں تو ان سے ڈرنا چاہیے۔"

"میں نے بھی اسی لیے زبان بند رکھی۔ بلکہ شوبزنس اور میڈیا سے دور رہا۔ دس ہزار ڈالرز سے میں نے بزنس شروع کیا۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ عزت سے گزارا ہو رہا ہے۔ میں کسی کو اپنے ماضی کے بارے میں نہیں بتاتا ہوں۔ آپ میں نہ جانے کیا بات محسوس ہوئی کہ بول بیٹھا۔ ابھی کہانی بھی سنا دی۔ اُمید ہے آپ اسے خود تک محدود رکھیں گے۔"

"آپ کا یہ راز میرے سینے میں رہے گا۔" میں نے یقین دلایا۔ "شاید آپ اس لیے بول گئے کہ میں آپ کا فین ہوں۔"

"شاید۔" اس نے سر ہلایا۔

کچھ دیر بعد چائے اور پھر رخصت آ گئی۔ کھانے کے دوران میں وہ اپنے بارے میں بتاتے رہے۔ وہ بڑی میڈ گارمنٹ کے بزنس سے منسلک تھے۔ اب ان کا مال اس ملک تک جاتا تھا جس کی شہزادی نے انہیں چار سال اپنا قیدی، محبوب اور مہمان بنا کر رکھا تھا۔ مگر انہوں نے دوبارہ مجھ سے فلیٹ پراسس میں ڈسکاؤنٹ کی بات نہیں کی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں مہذب آدمی تھے سمجھ گئے کہ میں اس سے زیادہ نہیں کروں گا۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ کروں۔ جب وہ جانے لگے اور میں انہیں دروازے تک چھوڑنے آیا تو میں نے پوچھا۔ "آپ کتنی رقم دے سکتے ہیں؟"

"ستر لاکھ روپے۔"

"آپ مجھے کانٹیکٹ نمبر دے دیں، میں کمپنی اونر سے بات کرتا ہوں ممکن ہے وہ کوئی گنجائش نکالیں مگر میں وعدہ نہیں کر رہا ہوں۔"

"یہ بھی آپ کی مہربانی ہے۔" انہوں نے کہا اور مجھے اپنا سیل نمبر دے دیا۔ "دراصل آج کل بزنس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ مکان تھا مگر وہ فروخت کر دیا اب کرائے پر رہ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ کی کمپنی وقت پر قبضہ دیتی ہے۔ یہاں قابت مل جائے تو میں تین سال انتظار کر سکتا ہوں۔"

"اب تو چند مہینے رہ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہماری کمپنی عموماً وقت سے پہلے تعمیراتی کام مکمل کر لیتی ہے اور پھر باقاعدہ تقریب میں ہم اونرز کو فلیٹ کی چابی دیتے ہیں۔"

ان کے جانے کے بعد میں اپنے معمول کے کام نمٹاتا رہا میں نے سوچا تھا کہ دفتر سے آف ہونے کے بعد حاجی صاحب سے بات کروں گا۔ کمپنی کے مالک عرف عام میں حاجی صاحب کہلاتے تھے۔ وہ کئی بار حج پر جا چکے تھے۔ مگر شام کو گھر جانے تک وہ میرے ذہن سے نکل گیا۔ اگلے دن میں دفتر آیا تو وہی جوڑا اپنی بکنگ منسوخ کرانے آیا ہوا تھا۔ وہ ڈھائی لاکھ روپے کی پے منٹ کر چکے تھے۔ اس دن بھی ان سے ایک گھنٹے مغز ماری کی کہ انہیں ڈھائی لاکھ روپے ایک پروسس کے تحت اور کچھ کٹوتیوں کے بعد واپس کیے جائیں گے جن کا ذکر مفصل طور پر الاٹمنٹ لیٹر میں موجود تھا۔ مگر وہ نہیں مان رہے تھے اور کورٹ میں جانے کی دھمکیاں دے رہے تھے اس پر میں نے کہا۔

"آپ شوق سے کورٹ جائیں مگر بہتر ہوگا اس سے پہلے کسی وکیل کے پاس جائیں اور اس سے مشورہ کر لیں۔"

خاتون وکیل کی بجائے کورٹ جانے کو تیار تھیں مگر ان کے شوہر نے عقل مندی کا ثبوت دیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ رقم کیسے اور کتنے دنوں میں واپس ملے گی۔ میں نے اسے زبانی بتایا تو اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ عام طور سے دس فیصد رقم کاٹ لی جاتی ہے اور چھ چھ مہینے کی تین قسطوں میں ادا کی جاتی ہے۔ مگر ہماری کمپنی چھ مہینے میں ادا کرتی ہے اور صرف پروسسنگ فیس کاٹی جاتی ہے جو ایگریمنٹ میں الگ سے لکھی بھی ہوتی ہے۔ خاتون کو اس پر بھی اعتراض تھا۔ یہ معاملہ نمٹا کر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اب یہ لوگ ہیڈ آفس کا دردِ سر تھے۔ وہی ان سے ڈیل کرتے۔ پھر مجھے آغا شیخ کا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ حاجی صاحب کو اس جوڑے کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں بھی بتا دوں۔ ہو سکتا ہے وہ مزید رعایت دیں۔ میں نے حاجی صاحب کو کال کی اور انہیں پہلے فلیٹ بکنگ کی واپسی اور پھر آغا شیخ کے بارے میں بتایا۔ اتفاق سے اس پروجیکٹ پر آنے کے بعد یہ ان سے پہلا رابطہ ہوا تھا۔ پہلے تو وہ حیران ہوئے۔

"کوئی ہمارے پروجیکٹ کی بکنگ بھی کینسل کرتا ہے۔"

حاجی صاحب کی حیرت بجا تھی کیونکہ میری یادداشت میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اگر کوئی کسی وجہ سے آگے

ادا بھی نہیں کر پاتا تھا تب بھی وہ فائل اپنی ادا کی ہوئی رقم سے زیادہ ہی پر کسی اور پارٹی کو بُک کردیتا تھا۔ یہ پہلا بار ہوا تھا کہ بکنگ کینسل ہوئی تھی۔ ”سر انہونی بھی تو ہوتی ہے۔“ میں نے کہا اور پھر انہیں آغا شفیع کے بارے میں بتایا۔

”کیا بات ہے میاں آج تو تم مجھے حیران کررہے ہو۔ آغا شفیع اور ہمارے پروجیکٹ میں فلیٹ بک کرانے آئے تھے۔“

”آپ انہیں جانتے ہیں۔“

”میاں جب بکنگ دی دیکھا تو ان سے اچھا ادا کار کوئی اور نہیں لگتا تھا۔ بیگم کے نزدیک تو یہ ایسے تھے کہ خدانا خواستہ اگر وہ ہندو ہوتیں تو ان کی پوجا کرتیں۔“

حاجی صاحب بھی آغا شفیع کے فین نکلے تھے۔ میں نے مختصر الفاظ میں ان کی کہانی سنائی اور پھر ان کے ڈسکاؤنٹ کی درخواست پیش کی۔ خلافِ توقع حاجی صاحب فوراً مان گئے۔ ”بھئی جیسا یہ کہہ رہے ہیں ویسا کر دو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ہماری دعوت قبول کریں۔“

”تب بہتر ہے آپ ان سے براہِ راست بات کر لیں۔“ میں نے کہا اور آغا شفیع کا نمبر انہیں دے دیا۔ اس کے دو دن بعد حاجی صاحب نے بکنگ کینسل ہونے والے فلیٹ کے بارے میں حکم دیا کہ وہ آغا شفیع کو پندرہ لاکھ میں دے دیا جائے۔ اگرچہ حاجی صاحب پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ آغا شفیع جو چاہ رہے ہیں ویسا ہی کیا جائے مگر مزید دو لاکھ کے ڈسکاؤنٹ نے مجھے بھی حیران کیا تھا۔ اگلے دن آغا شفیع آئے اور فلیٹ کی فائل ان کے حوالے کردی گئی۔ فی الحال صرف الاٹمنٹ دی جا رہی تھی۔ کیونکہ لیز تعمیر مکمل ہونے کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔ آغا شفیع بہت خوش تھے اور میرا بھی شکریہ ادا کررہے تھے کہ میں نے ان کے لیے کوشش کی۔ حالانکہ میں نے صرف ذکر کیا تھا اور حاجی صاحب بھی ان کے فین نکل آئے۔

مارکیٹ کی سست روی کی وجہ سے بکنگ مکمل ہونے میں تین مہینے کا وقت لگ گیا تھا مگر میں نے اور میرے اسٹاف نے سو فیصد بکنگ کا ہدف مکمل کرلیا۔ اس پر ہمیں اسپیشل بونس ملا تھا اور ملازمتن میں سے تین افراد قرعہ اندازی کے ذریعے کمپنی کی طرف سے عمرے پر بھیجے گئے تھے۔ اتفاق کی بات ہے جن کا نام نکلا ان میں، میں بھی شامل تھا۔ اس پر حاجی صاحب نے مجھے برقرار رکھا مگر ایک اور ملازم کو شامل کرلیا۔ تاکہ دو غریب ملازم جن کی استطاعت نہیں ہوتی وہ بھی اللہ کے گھر کی زیارت کر سکیں۔ بیگم کب سے کہہ رہی تھیں اور انہوں نے کچھ رقم بھی جمع کی تھی۔ اس لیے جب مجھے کمپنی کے خرچ پر جانے کا موقع ملا تو میں نے بیگم کو اپنے خرچ پر ساتھ لے لیا۔ پندرہ دن ہم نے دیارِ حرم میں گزارے۔ اس وقت مجھے لگا کہ میں نے آغا شفیع کے لیے جو کیا تھا شاید اللہ نے اس معمولی سی نیکی کا صلہ دیا ہے۔ تین دن کی چھٹی کے بعد میں دفتر واپس آیا۔ پروجیکٹ مکمل ہوگیا تھا اس لیے میں واپس ہیڈ آفس آگیا تھا۔ یہاں میری غیر موجودگی میں مدثر معاملات دیکھ رہا تھا اس نے مجھے مبارک باد دینے کے بعد جو پہلی اطلاع دی وہ یہ تھی۔

جبیلہ

وادی حنیفہ کے مغربی کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں جو عیینہ اور درعیہ کے درمیان نجد میں واقع ہے۔ وادی حنیفہ کے دائیں کنارے جو ٹیلے موجود ہیں وہ مقامی روایات کے مطابق قبورِ صحابہ کہلاتے ہیں اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آنحضورؐ کے ان صحابہ کی قبور ہیں جو عقربا کی لڑائی میں شہید ہوئے تھے۔ ابن بشر کے بقول جبیلہ 850ھ/1446ء میں آل یزید کے قبضے میں تھا جس پر موسیٰ بن ربیعہ بن مانع مریدی نے جو آلِ سعود کا ایک جدِ امجد تھا حملہ کردیا اور جلد ہی اس پر قبضہ کرلیا۔ وہ جبیلہ اور عقربا کا ذکر بطور میدانِ کارزار بار بار کرتا ہے جہاں آلِ سعود کی ترقی پذیر طاقت اور العرفہ کے بنو خالد کے بارسوخ امرا کے درمیان 1133ھ/1721ء اور 1172ھ/1758ء میں معرکے ہوتے رہے۔ یہ علاقہ ریاض سے حجاز جانے والی دو شاہراہوں کے سنگم پر واقع ہے۔ ان میں سے ایک سڑک اس پتھریلے علاقے سے چکر کاٹتی ہوئی گزرتی ہے جو وادی حنیفہ کے مشرقی کنارے اور ریاض کے درمیان واقع ہے اور دوسری سڑک وادی حنیفہ کے ساتھ ساتھ جبیلہ تک چلی گئی ہے۔ انہی سڑکوں کے ذریعے اس قصبے کو ریاض تک عقربا کے باغ کی پیداوار فروخت کرنے کے لیے رسائی ہوجاتی ہے۔ 1961ء میں ایک نئی سڑک تعمیر کی گئی ہے جو ریاض سے جنوب مشرق کو شعب لجا پر واقع بازو سے نوتیں کو جاتی ہے۔

مرسلہ: نعمان توفیق۔ حیدرآباد

”ثاقب صاحب وہ جو صاحب آپ سے خاص ڈسکاؤنٹ حاصل کرنے آئے تھے اور جنہیں بہت کم قیمت میں فلیٹ دیا گیا تھا۔ انہوں نے فائل سیل کردی ہے۔“

اگرچہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اکثر لوگ جنہیں ان کی کسی خصوصیت کی وجہ سے رعایت ملتی ہے وہ اسے کیش کرانے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے ہیں۔ مگر آغا شفیع کا کہنا تھا کہ اسے یہ فلیٹ اپنے لیے چاہیے تھا اور انہوں نے اسے سیل کر دیا تھا۔ اس کے باوجود یہ ایسی بات نہیں تھی جس پر زیادہ توجہ دی جاتی۔ ڈسکاؤنٹ حاجی صاحب نے انہیں اپنی مرضی سے دیا تھا انہوں نے صرف درخواست کی تھی اس لیے وہ مرضی کے مالک تھے کہ جیسے چاہتے اس سے فائدہ اٹھاتے۔ جب مجھے اطلاع مل گئی تھی اس لیے میں سمجھا کہ یقیناً حاجی صاحب کو بھی بتا دیا گیا ہوگا۔ پھر کام ذرا جو سارا جمع تھا ایک ہفتہ تو اسے سمیٹنے میں لگ گیا۔ صبح آنا وقت پر تھا اور جانے کا کوئی وقت نہیں ہوتا تھا۔ اس دن بھی میں رات خاصی دیر تک رکا رہا۔ پھر دفتر سے نکل رہا تھا کہ حاجی صاحب سے سامنا ہوگیا۔

”آپ میاں ابھی تک دفتر میں تھے؟“

”جی سر کام سمیٹ رہا تھا۔ بس اب نکل رہا ہوں۔“

”ان کا سناؤ آغا صاحب پھر بات ہوئی ان سے؟“

”نہیں سر وہ اب کیسے ہوگی انہوں نے تو فائل ہی سیل کر دی۔“

حاجی صاحب حیران رہ گئے۔ ”فائل سیل کر دی کب؟“

”آپ کو نہیں پتا؟ جب میں عمرے پر تھا اسی دوران میں ہوا یہ کام واپس آیا تو وڑ نے بتایا۔“

”میرے علم میں تو نہیں آیا۔“ حاجی صاحب سوچتے ہوئے بولے۔ ”میں نے ایک بار کال کی تھی مگر نمبر بند جا رہا تھا۔“

”ہوسکتا ہے سر موبائل مس ہوگیا ہو۔ یا اس وقت بند ہو۔“

”ہوسکتا ہے۔“ حاجی صاحب بولے۔ ”خیر فروخت بھی کر رہا تو اس کا رائٹ تھا۔“

گھر کی طرف جاتے ہوئے میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگرچہ حاجی صاحب نے بھی وہی بات کی تھی جو میں نے سوچی تھی کہ فائل رکھنا یا فروخت کرنا آغا شفیع کا اختیار تھا انہوں نے اگر استعمال کیا تھا تو اس پر ہمارے اعتراض کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کے باوجود مجھے کچھ کھٹک رہا تھا۔ میں نے موبائل نکالا۔ آغا شفیع کا نمبر ابھی تک میرے پاس محفوظ تھا۔ میں نے نمبر ڈائل کیا تو جواب آیا کہ آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ اس طرح کی ریکارڈنگ سنی تھی مگر توجہ نہیں دی کہ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ میرے ایک سالے صاحب اسی موبائل سروس کمپنی میں کام کرتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان سے پوچھوں گا کہ اس ریکارڈنگ کا مطلب کیا ہے؟ گھر آتے آتے یہ بات پھر ذہن سے محو ہوگئی۔ بیوی بچوں اور دوسرے تیسرے مسائل سامنے آکھڑے ہوں تو انسان کو دوسری باتیں کہاں یاد رہتی ہیں؟

وقت گزرتا رہا اور رفتہ رفتہ یہ بات ذہن سے بالکل ہی محو ہوگئی۔ کوئی چھ مہینے بعد کی بات ہے۔ چھٹی کے دن میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ایک چینل سے پرانے ڈرامے دہرائے جاتے ہیں۔ اس دن اتفاق سے آغا شفیع کے ڈرامے کی پہلی قسط تھی یہ کوئی بیس سال پرانا ڈراما تھا اور اس وقت آغا شفیع اتنے جوان تھے کہ ڈراموں میں کالج کے لڑکے کا کردار بھی ادا کرتے تھے۔ بیگم کچن میں تھیں۔ جب سے عمرے سے آئی تھیں تو انہوں نے ٹی وی دیکھنا کم کر دیا تھا خاص طور سے ڈرامے اور تفریحی پروگرام دیکھنا بند کر دیے تھے۔ وہ دوپہر کا کھانا لگنے کی اطلاع دینے آئیں تو ان کی نظر ٹی وی پر گئی اور انہوں نے تاسف سے کہا۔

”کیا خوب صورت آدمی تھا بے چارے کے ساتھ بہت برا ہوا۔“

میں چونکا۔ اس وقت آغا شفیع ہی اسکرین پر آرہے تھے اور بیگم نے یقیناً انہیں کے بارے میں بات کی تھی میں نے پوچھا۔ ”تم جانتی ہو ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”ہاں جانتی ہوں، یہ بات پھیلی نہیں تھی مگر آپ نورین کو جانتے ہیں جو میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی پچھلے دنوں شاپنگ کرتے ہوئے ملی تھی۔“

”ہاں جانتا ہوں۔“

”اس کی بڑی بہن سے آغا شفیع کا چکر چل رہا تھا وہ اٹھارہ سال کی کالج گرل تھی اس نے اسے پھنسا لیا تھا۔ مگر اس سے پہلے بات بگڑتی خدا نے اس لڑکی کو محفوظ رکھا۔“

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ آغا شفیع بڑا اشرفی تھا مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ عام لڑکیوں پر بھی ہاتھ صاف کر جاتے تھے۔“

"آپ نہیں جانتے شاید.... جب میں کالج میں تھی تو ہر دوسری لڑکی اس کی دیوانی تھی۔ آپ جانتے ہیں جب لڑکی کسی کی دیوانی ہو جائے تو اسے بے وقوف بنانا اور اس کا استحصال کرنا کتنا آسان ہو جاتا ہے۔ خود میرے کالج کی دو لڑکیاں اس کے ہاتھوں اپنا سب کچھ لٹا چکی تھیں اور ان میں سے ایک نے تو خودکشی کی کوشش بھی کی تھی کیونکہ وہ اُمید سے ہو گئی تھی۔"

کیونکہ بچے نہیں تھے اس لیے ہم میاں بیوی کھل کر بات کر رہے تھے۔ "میرے خدا یہ شخص اتنا گرا ہوا نکلے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے بتانے کا خیال نہیں رہا آٹھ مہینے پہلے یہ ہمارے پروجیکٹ میں فلیٹ لینے آئے تھے اور حاجی صاحب نے انہیں خاصا بڑا ڈسکاؤنٹ دیا کیونکہ وہ بھی ان کے پرستار تھے۔ ایک مہینے بعد انہوں نے فلیٹ کی فائل سیل کر دی۔"

"بلاشبہ اداکار بہت اچھا تھا لیکن اس کا کریکٹر.... بس اللہ ایسے لوگوں سے بچائے۔ نورین بتاتی ہے ذاتی زندگی میں انتہا درجے کا بدتمیز اور بدمزاج شخص تھا۔ شراب بے انتہا پیتا تھا۔ شادی اسی وجہ سے نہیں کی کہ کھل کر عیاشی کرتا رہے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔ ہاں جس لڑکی سے چکر چلاتا اسے سب سے پہلے شادی کا جھانسا ہی دیتا تھا۔ حیرت ہے یہ باہر کیسے نکل آیا؟"

"یہاں بھی اپنا کام دکھا گیا نا.... مرے سے مرا اسے فائل بیچنے پر ساٹھ لاکھ کا فائدہ ہوا ہوگا۔ تم نے ٹھیک کیا اسے قدرت کی طرف سے سزا ملی۔"

"بالکل کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔" بیگم نے کہا اور اوپر سے بچوں کو آواز دینے لگیں کہ کھانا لگ رہا ہے وہ نیچے آجائیں۔ بچے آگئے تھے اس لیے میں بیگم سے بات جاری نہ رکھ سکا کہ وہ منہ دکھانے کے لائق کیوں نہیں رہا۔ بے شک اسے چار سال قید میں گزارنے پڑے اور اس کا کیریئر ختم ہو گیا لیکن اس کی خوب صورتی آج بھی برقرار تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اب اس کا ماضی داغدار ہو گیا تھا۔ وہ خود کسی کو نہیں بتاتا تھا کہ وہ بھی کتنا بڑا فن کار رہا ہے۔ ایک زمانہ اس کا پرستار تھا۔ اب میں ہر چھٹی والے دن اس کا ڈراما ضرور دیکھتا تھا۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ اسے کال کر کے بتاؤں کہ میں آج کل اس کا پرانا ڈراما دیکھ رہا تھا۔ میں نے کال کی تو جواب میں وہی ریکارڈنگ سنائی دی۔ میں نے اپنے سالے کو کال کی اور اس کا مطلب پوچھا تو اس نے کہا۔ "ثاقب بھائی اس کا مطلب ہے نمبر کے مالک نے اپنا نمبر بند کرا دیا ہے یا پھر کمپنی نے کسی وجہ سے اس کا نمبر بند کر دیا ہے۔"

"کیا تم معلوم کر کے بتا سکتے ہو کہ اس نے نمبر خود بند کرایا ہے اور اس کے پاس تمہاری کمپنی کا کوئی اور نمبر ہے تو مجھے وہ بھی چاہیے۔"

"کل آفس جا کر معلوم کر سکوں گا آج تو چھٹی ہے۔"

اگلے دن میرے سالے صاحب نے مجھے دفتر میں فون کیا۔ "ثاقب بھائی آغا شفیع نامی بندے نے خود نمبر بند کرایا ہے اور اسی دن انہوں نے نیا نمبر بھی لیا تھا وہ نوٹ کر لیں۔"

میں نے نمبر نوٹ کر لیا۔ یہ خلافِ معمول بات تھی کہ آدمی اپنا ایک نمبر بند کرا کے اس کی جگہ دوسرا نمبر حاصل کر لے۔ ایسا آدمی اسی صورت میں کرتا ہے جب اسے کسی سے چھپنا یا بچنا ہو۔ میں نے اسے دفتر سے کال نہیں کی مگر جب چھٹی کر کے جا رہا تھا تب اسے کال کی۔ پہلی بار میں اس نے کال ریسیو نہیں کی لیکن جب میں نے دوبارہ کی تو اس نے ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

"آغا صاحب میں ثاقب احمد بات کر رہا ہوں۔" میں نے اپنی کمپنی کا حوالہ بھی دیا تو ایک لمحے کو اسے چپ لگ گئی پھر اس نے سوال کیا۔

"آپ نے یہ نمبر کہاں سے حاصل کیا؟"

"آغا صاحب تلاش کرنے والے سب تلاش کر لیتے ہیں۔" میں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ "آپ تو اس کے بعد سے ایسے غائب ہوئے کہ اپنا نمبر تک بند کرا لیا۔"

”سوری میں ذرا مصروف ہوں آپ پھر کال کیجیے گا۔“ اس نے رکھائی سے کہا اور کال کاٹ دی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ نجم نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ شخص ذاتی زندگی میں سخت بدتمیز واقع ہوا تھا۔ اس نے اپنی اداکاری سے مجھے اور پھر حاجی صاحب کو بے وقوف بنایا تھا۔ پچیس لاکھ روپے مالیت کا فلیٹ اس نے صرف پندرہ لاکھ میں حاصل کر لیا تھا اور اسے فروخت بھی کر دیا۔ اس نے اپنا کام نکال لیا تھا اس لیے اب اسے ظاہری اخلاق برتنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ لعنت ہے۔ اب میں اس کا ڈراما بھی نہیں دیکھوں گا۔ رات کو یہ بات میں نے نجم کو بتائی تو انہوں نے کہا۔

”مجھے تو یہ شخص ویسے ہی ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس وقت بھی اس سے نفرت تھی جب لڑکیاں اس کے پیچھے پاگل ہوتی تھیں۔“

”ویسے یہ بات ہے کہ اگر وہ اب بھی شوبزنس میں ہوتا تو لڑکیاں اس عمر میں بھی اس کی دیوانی ہوتیں۔“

نجم نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا کہہ رہے ہیں اب کون اس کا دیوانہ ہوگا میں نے تو سنا ہے اس کے قریبی جاننے والے بھی اس سے نہیں ملتے ہیں۔ وہ خود لوگوں سے منہ چھپاتا ہے۔“

”وہ کہاں سے ایسے حساس ہو گیا جو اس بات پر لوگوں سے منہ چھپائے وہ تو آج بھی سینہ تانے گھوم رہا ہے۔“

”تو کیا اس نے پلاسٹک سرجری کرالی؟“

”پلاسٹک سرجری؟“ میں نے سوال کیا۔ ”اسے کیا ضرورت ہے؟“

”آپ کیا ہو گیا ہے آپ کو جس آدمی کا چہرہ تیزاب سے پورا جل جائے تو اسے پلاسٹک سرجری کی ضرورت ہوگی یا نہیں۔“

میں جو نیم دراز ہو کر لیٹا ہوا تھا چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ”کیا... کیا کہا تم نے؟“

”آغا شفیع کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا گیا تھا۔ وہ بری طرح جھلس گیا تھا۔ اس کے بعد ہی تو وہ غائب ہوا تھا۔“

”مگر اس بارے میں تو کہیں کوئی خبر نہیں آئی تھی۔“

”اس لیے کہ یہ چھپائی گئی تھی۔ اس پر تیزاب پھنکوانے میں ایک غیر ملک کی شہزادی بارث تھی جس کا اس سے چکر تھا اور اس کے خاندان والے اسے زبردستی لے گئے تھے تب اس نے یہ کام کیا۔ اللہ جانے اسے آغا شفیع کے کسی دوسرے افیئر کی خبر ہو گئی تھی یا اس نے اسے کسی کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے نورین کی وجہ سے معلوم ہو گیا۔ اس کی پاگل بہن اس سے دھوکا کھانے کے باوجود اس سے رابطے میں تھی اور اسی سے پتا چلا تھا ورنہ یہ خبر اخبار ٹی وی یا کہیں اور نہیں آئی تھی۔“

میں ہم بہ خور سا بیٹھا تھا۔ آغا شفیع کے ساتھ جو ہوا سو ہوا مجھے اس سے اتنا غرض نہیں تھا مگر پھر وہ کون تھا جو آغا شفیع کے نام سے ہمیں دھوکا دے گیا تھا بلکہ اصل میں حاجی صاحب کو دھوکا دے گیا تھا۔ اس کے پاس آغا شفیع کے نام کے کاغذات ہی نہیں تھے بلکہ وہ صورت میں بھی اس سے بہت ملتا تھا۔ دس سالوں میں آدمی کی صورت کچھ نہ کچھ تبدیل ہوتی ہے خاص طور سے جب وہ بڑھاپے کی طرف جا رہا ہو مگر اس کے نقوش بالکل آغا شفیع جیسے تھے۔ میں نے اسی وقت اپنے لیپ ٹاپ پر انٹرنیٹ سے آغا شفیع کی اس دفت کی تصاویر نکالیں جب وہ اپنے عروج پر تھا اور اس کے بعد غائب ہو گیا تھا انہیں غور دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ شخص آغا شفیع ہی تھا۔ ہو سکتا ہے نجم کی بات درست ہو کہ اس نے پلاسٹک سرجری کرائی ہو۔ مگر پلاسٹک سرجری بگڑے نقوش کو ایک حد تک ٹھیک کر سکتی ہے انہیں مکمل طور پر بحال نہیں کر سکتی۔ ایسی سرجری کم سے کم ہمارے ہاں تو نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے نیٹ پر اس کے بارے میں بھی سرچ کیا مگر کوئی خاص معلومات نہیں ملی تھیں۔ میں نے نجم سے کہا۔

”کیا تم نورین سے معلوم کر سکتی ہو کہ آغا شفیع کہاں رہتا ہے۔ اگر اس کی بہن اس سے رابطے میں ہے تو اسے معلوم ہوگا۔“

”ابھی تو بہت رات ہو گئی ہے میں کل اس سے معلوم کر رہی ہوں گی۔“ نجم نے کہا۔ اب میں بے چین اور سخت متجسس تھا۔ وہ شخص آغا شفیع تھا یا کوئی اس نام سے ہمیں بے وقوف بنا گیا تھا۔ اگر وہ آغا شفیع نہیں بلکہ کوئی جعلساز تھا تو ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ حاجی صاحب کی نظروں میں میری ساکھ خراب ہو جاتی اگر ان کو اس کی جعلسازی کا علم ہو جاتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے بھی اس میں شامل سمجھ لیا جاتا۔ مالکان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے ان کا مزاج ہر پل بدلتا رہتا ہے۔ لیکن پہلے میں اپنے لیے اس معاملے کی تہہ تک پہنچنا

چاہتا تھا۔ اگلے روز دفتر کے لیے نکلتے ہوئے میں نے بیگم کو تاکید کی کہ وہ نورین سے بات کرے اور پھر دفتر پہنچتے ہی کال کر کے معلوم کیا۔ وہ بولیں۔ ''خیریت تو ہے آپ کچھ زیادہ ہی بے چین نہیں ہو رہے ہیں؟''

''اس کے پیچھے ایک بات ہے لیکن پہلے تم یہ معلوم کرو پھر میں گھر آ کر بتاؤں گا۔''

میں نے بیگم کو بھی تجسس لاحق کر دیا تھا اور اس وجہ سے مجھے یقین تھا کہ وہ شام تک لازمی نورین سے بات کر کے کچھ نہ کچھ معلوم کر لیں گی۔ ممکن ہے فوری طور پر نورین بھی نہ بتا سکے اور وہ کہیں سے معلوم کرے تو شام تک ہی معلوم ہوتا۔ میں کام کی وجہ سے ذرا دیر سے گھر پہنچا تو بیگم کھانا لگا رہی تھیں۔ اس لیے ہم دونوں کو انتظار کرنا پڑا جب بچے سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئے تو بیگم موسم کی مناسبت سے چائے بنا کر لاؤنج میں لے آئیں۔ میں ٹی وی دیکھ رہا تھا انہوں نے اشاروں میں بتا رہا تھا کہ کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے۔ انہوں نے چائے کا مگ مجھے تھمایا اور بولیں۔ ''پہلے آپ بولیے۔''

میں نے اسے آغا شفیع کے بارے میں بتایا جس نے ہمارے پروجیکٹ میں فلیٹ بک کرایا تھا۔ وہ حیرت سے سن رہی تھیں۔ ''آپ نے یہ تو بتایا تھا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ بہت خوب صورت اور آغا شفیع جیسا ہے۔''

''تم نے ہی تو کہا تھا کہ وہ پلاسٹک سرجری کرا سکتا ہے۔''

''میں نے غلط کہا تھا۔'' وہ اطمینان سے بولیں۔ ''آج میں نے نورین سے بات کی تو اصل کہانی سامنے آئی۔ پہلی بات تو یہ کہ آغا شفیع گزشتہ دس سال سے گوشہ نشین ہے اور اس نے پلاسٹک سرجری بھی نہیں کرائی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نورین کی بہن جو اس سے محبت کرتی تھی اب اس کی بیوی ہے اور وہ دونوں ڈیفنس میں رہتے ہیں ان کے چار بچے بھی ہیں۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس کا مطلب ہے وہ شخص جعلی آغا شفیع بنا ہوا ہے۔''

''بالکل یہی بات ہے۔'' بیگم بولیں۔ ''میری ثمرین سے بات ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ آغا شفیع تو دس سال سے اس بنگلے سے باہر نہیں نکلا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ کوئی اور تھا لیکن اس کے پاس آغا شفیع کے نام کا آئی ڈی کارڈ تھا۔''

''آغا شفیع کسی ایک شخص کا نام تھوڑی ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کی صورت آغا شفیع سے ملتی تھی اس لیے آپ آسانی سے دھوکا کھا گئے ورنہ ہمارے ہاں جعلی شناختی کارڈز بنوالینا کون سا مسئلہ ہے۔'' بیگم نے کہا تو میں نے سوچا کہ بات تو وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔

''کیا آغا شفیع سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''یہ تو میں نے ثمرین سے پوچھا نہیں مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ اس سے ملنا بھی چاہیں گے۔ ویسے امکان یہی ہے کہ وہ انکار کر دے گا کیونکہ وہ اپنے کچھ بہت قریبی لوگوں کے اور کسی سے نہیں ملتے ہیں۔''

''ثمرین نے اس حادثے کے بعد آغا شفیع سے شادی کی اس کا مطلب ہے وہ اس سے سچی محبت کرتی ہے۔''

''واقعی ورنہ ایسے شخص کے ساتھ رہنا بہت دل گردے کا کام ہے جس کا چہرہ خوب صورت ترین سے بھیانک ترین ہو چکا ہو۔''

''ایسا کرو ثمرین کو کال کرو اور اس سے پوچھو۔''

بیگم نے ثمرین کو کال کی اور سلام دعا کے بعد اس سے کہا۔ ''میرے ہسبنڈ ذیب احمد آغا صاحب سے ملنا چاہتے ہیں.... پلیز یہ ضروری ہے۔''

میں نے اشارے سے کہا کہ وہ مجھ سے کال پر بات کرے۔ ثمرین نے یہ بات آگے کی تو ثمرین بہ مشکل مانی مگر اس نے آغا شفیع سے بات کرا دی۔ بیگم نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ کچھ دیر بعد آغا شفیع کی مخصوص اور خوب صورت آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

اس آغا شفیع کی شباہت ملتی تھی مگر آواز ویسی نہیں تھی اس وقت میں نے غور نہیں کیا تھا ورنہ ڈراموں میں آغا شفیع کا منفرد لہجہ ہوتا تھا۔ وہ جس طرح سے ذرا اٹک کر بولتے تھے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور یہ بھی بتایا کہ میں ان کا فین ہوں۔

''میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''آغا صاحب میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں یہ بہت ضروری ہے میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں اور آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''کس سلسلے میں؟''

میں نے اسے جعلی آغا شفیع کے بارے میں بتایا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''میں نے اس بارے

میں سنا ہے یہ کوئی پہلی بار ایسا نہیں ہوا ہے۔"

"آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دھوکا دہی کا کیس ہے اور اس شخص نے صرف ہم سے نہیں بلکہ اور نہ جانے کتنے لوگوں سے آغا شفیع بن کر فراڈ کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ آجائیے، آنے سے پہلے کال کر کے بتا دیجیے گا۔ میں صبح دس سے شام چھ بجے تک ملوں گا۔"

"میں حاضر ہوتا ہوں۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

اگلے دن دفتر سے میں نے فلیٹ کے ریکارڈ سے آغا شفیع کی لگی ہوئی تصویر اور آئی ڈی کارڈ کی کاپی لی۔ میں چار بجے دفتر سے نکلا تھا۔ کمپنی کا ہیڈ آفس نرسری کے پاس ہے یہاں سے ڈیفنس آدھے گھنٹے سے بھی کم کی ڈرائیو پر تھا۔ آغا شفیع کا بنگلا ڈیفنس کے آخری حصے میں ساحل کے سامنے تھا یہ زیادہ بڑا تھا دو سو چالیس گز کا پلاٹ ہوگا مگر بنگلے کی ساخت اور اندر موجود دو عدد گاڑیاں بتا رہی تھیں کہ آغا شفیع پرتعیش زندگی بسر کر رہا ہے۔ گیٹ پر چوکیدار تھا اس نے اندر اطلاع پہنچائی کیونکہ میں پہلے ہی آغا شفیع سے بات کر چکا تھا اس لیے مجھے فوری اندر بلا لیا۔ وہ اپنی اسٹڈی میں میرے منتظر تھے۔ اس نے چہرے پر کپڑے کا نقاب لگا رکھا تھا اور صرف ان کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان آنکھوں سے بھی واضح تھا کہ اس کا چہرہ تیزاب کا شکار ہوا ہے۔ جسمانی طور پر وہ بالکل ٹھیک لگ رہے تھے۔ بلکہ فٹ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے میرے لیے چائے کا کہا اور پھر مجھ سے پوچھا۔

"مسٹر ثاقب اب بتائیے آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

میں نے آغا شفیع کی تصویر اور آئی ڈی کارڈ کی کاپی اس کے سامنے رکھی۔ "آپ نے کبھی اس شخص کو دیکھا ہے۔"

"سلیم شاہد۔" اس نے بے ساختہ کہا میں چونکا۔

"آپ اسے جانتے ہیں۔"

"بالکل یہ سلیم شاہد ہے جس زمانے میں، میں کام کرتا تھا تو یہ مجھ سے ملنے آیا تھا کیونکہ مجھ سے شباہت کی بنا پر لوگ اسے آغا شفیع ہی سمجھتے تھے۔ میں خود حیران رہ گیا تھا مگر اس میں اور مجھ میں فرق ہے۔ اس کے کان اور بھنویں اس کی اور میری نہ ہونے کے برابر ہیں اس میں اور مجھ میں یہی فرق تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے ڈراموں میں کام دلایا جائے میں نے

کچھ پروڈیوسروں سے ملوایا لیکن ان کا کہنا تھا کہ اس میں اداکاری کی صلاحیت نہیں ہے۔"

"صلاحیت تو ہے اسی وجہ سے تو یہ چونکا گیا۔" میں نے کہا اور اسے تفصیل سے بتایا کہ اس نے کیا کیا تھا۔

"اس سے پہلے بھی میں نے کئی ایسی کہانیاں سنی ہیں جب اس نے آغا شفیع بن کر لوگوں کو دھوکے دیئے، کیا آپ نے اس کے خلاف ایف آئی آر لکھوائی ہے؟"

"نہیں کیونکہ عملی لحاظ سے یہ جرم نہیں ہے۔ ہم نے اسے خود دھوکا دینے دیا اور انہوں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ ہاں اس نے خود کو آغا شفیع قرار دیا تو یہ جرم ہے۔"

"اس کی ایف آئی آر تو کٹ سکتی ہے کیونکہ آغا شفیع میں ہوں۔"

میں ہچکچایا پھر کہا۔ "اصل میں اب تک یہ ساری بات ہمارے کمپنی مالک کو نہیں بتائی ہے وہ اسے ہی آغا شفیع سمجھ رہے ہیں۔ کیا آپ سلیم شاہد کے بارے میں مزید کچھ جانتے ہیں؟"

"میں نے آخری بار دس سال پہلے اسے دیکھا تھا اور میرے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ جو شخص میرے نام سے لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے وہ سلیم شاہد ہی ہے۔"

اب مجھے آغا شفیع کے بارے میں تجسس لاحق ہو گیا تھا اگرچہ نورین نے نجم کو بتایا تھا کہ اس پر تیزاب اسی شہزادی نے ڈلوایا تھا جس نے اس سے محبت کی تھی۔ مگر اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ میں نے آغا شفیع سے اس بارے میں سوال کیا تو وہ خاموش ہو گیا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دوبارہ نہیں پوچھا۔ البتہ سلیم شاہد جن لوگوں سے ملتا تھا یا اٹھتا بیٹھتا تھا میں نے ان کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں۔ پھر میں نے حاجی صاحب سے بات کی اور ان کو سلیم شاہد کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی حیران ہوئے تھے۔ "ثاقب میاں تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے۔"

"حاجی صاحب اس شخص کو سزا دلوانی چاہیے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انہوں نے اپنی فرنچ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "چھوڑو میاں... اب کہاں تھانے اور پولیس کے چکر میں پڑیں۔ ہم نے تو فن کے نام پر یہ رعایت دی تھی اور اس آدمی نے ثابت کر دیا کہ وہ آغا شفیع نہیں لیکن فنکار ضرور تھا۔"